پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

صفحہ	عنوان	مصنف	تعارف
07	تھر پیا سا ہے	منزہ سہام	
08	کچھ اپنی باتیں	کاشی چوہان	اپنے قارئین سے مخاطب مدیر کی کچھ دلداریاں
10	احوال	مدیر	قارئین کے خطوط اور حال احوال کا دلچسپ سلسلہ
36	پکھی واس	بشیر احمد بھٹی	بہاول پور سے غربت کی کوکھ سے جنم لینے والی ایک سچ بیانی
42	سزا کی جزا	سلمیٰ غزل	رشتوں کے ہیر پھیر سے وجود میں آنے والی ایک کہانی
52	ہم نام	ایم اشفاق بٹ	لالہ موسیٰ سے ایک شخص کی ناقابل فراموش سچ بیانی
58	کفارہ	محمد عمیر شہزاد	ہری پور سے ایک دوشیزہ کی عبرت انگیز کہانی
63	ذرا سی بھول	مور شاہد حسین	بلوچستان سے رشتوں کو پامال کرتی خامہ فرسائی
68	کس پہ اعتبار کریں	قمر تابندہ	کراچی سے دوستی کی بھیانک شکل دکھاتی سچ بیانی
72	بے رنگ حیات	شاہد محمود مغل	کاموکے سے ایک جوڑے کی بے رنگ حیات کا ماجرا
76	سلگتے ارماں	محمد عزیز منے	لڈن، وہاڑی سے ایک ملک دشمن کا احوال
82	آخری خواہش	نور محمد بھٹو	ستی سے ایک دوشیزہ کی آخری خواہش کا عجب احوال
85	میں مطمئن ہوں	محمد بلال فیاض	ملتان سے ایک ظالم عورت کے سفاک ظلم کی تصویر
92	آتشِ جنوں	سلیم فاروقی	چٹان سا حوصلہ رکھنے والے ایک نوجوان کی سرگزشت
110	دِل اک شہرِ خموشاں	محمد شہزاد کنول	شارجہ دبئی سے زخم محبت لیے ایک پریم کہانی
120	بے جڑ کے پودے	رئیسہ خالد	سرحد پار سے ایک ایسی سچائی جو جیتے جی درگور کردے
127	کملی	صائمہ نفیس	کراچی سے ایک معصوم دوشیزہ کے مجرم بننے کی داستان
132	بابا عمر دین	ممتاز احمد	سرگودھا سے ایک یادگار چشم کشا اسٹیشن کہانی
140	ناگن	اعجاز احمد نواب	ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا زندگی کا ایک رنگ
162	دشمن زندہ ہے	سنبل	کراچی سے دوست دشمن کی پہچان کراتا ایک شعلہ
172	کون بنے گا کروڑ پتی	محمد سرفراز ناز	فیصل آباد سے جرائم کی دنیا کے راز عیاں کرتا شعلہ
185	ستم	محمد تقی	ستم کی خرابی سے وجود میں آنے والا ایک سچ کراچی سے
190	سچی توبہ	ارشد اجمیری	گناہوں سے تائب ہونے والے ایک شخص کی کہانی
194	تجھ سا ڈھونڈوں کہاں	مجید احمد جائی	ملتان سے محبت اور حالات کا شکار ہونے والے مرد کا قصہ
202	تہی داماں	ثناء کنول اللہ دتہ	لودھراں سے مکافات عمل کی ایک لرزہ خیز داستان
206	مکھنی	ارشد علی ارشد	خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد ایک عجوبہ لڑکی کی داستان
228	مسئلہ یہ ہے	ادارہ	آپ کے مسائل کا حل، سچی کہانیاں کا لازوال سلسلہ
238	سخن آباد	قارئین	شعراء کے کلام سے آباد ایک سخن فہم سلسلۂ خاص
242	کھٹل	سرور شاد	سخن آباد سے جاگیردارانہ نظام کا شکار ایک حسینہ کی داستانِ الم
000	متفرقات	☆☆☆☆	چنیدہ، چنیدہ معلوماتی اقتباسات قارئین کے ذوقِ مطالعہ کے لیے

فون: 34930470 - 021-34939823 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی سٹی پریس OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 720 روپے/افریقہ 65 ڈالر/کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر/ایشیا یورپ 55 ڈالر/ قانونی مشیر ایم جے بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔ رابطہ نمبر: 34939823

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

معروف اخبارات میں شائع ہونے والے منزہ سہام مرزا
کے کالمز پر مشتمل کتاب ''اُجلے حروف'' شائع ہوچکی ہے

ملکی وسیاسی مسائل، معاشرتی ناہمواریوں سے نبرد آزما آج کے دگرگوں حالات
سے پردہ اُٹھاتے منزہ سہام مرزا کے بے باک قلم سے چشم کشا تحریریں

کتاب منگوانے کا پتا:
110 'آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

تھر پیاسا ہے

معصوم ننھے مُنے فرشتے اپنی ماؤں کے راج دلارے، پیاری سی بٹیا ماں کی سہیلی......سب خاک ہوئے......بھوکے، پیاسے، بلکتے، تڑپتے اپنی ماؤں کی گودوں میں دَم توڑ گئے......پھر بھی نا آسمان گرا نہ ہی زمین پھٹی......دو وقت کی روٹی کے لیے ترستے ہوئے پتا نہیں کتنے اور زمین کا رزق ہونے جارہے ہیں......اپنے آپ کو زندہ انسان کہتے ہوئے شرم آتی ہے......نوالے حلق میں اَٹکنے لگتے ہیں، پانی کڑوا زہر ہوجاتا ہے۔ جب ان معصوموں کے کمزور چھوٹے چھوٹے ہاتھوں پر نظر پڑتی ہے......اُبلی ہوئی آنکھیں سوال کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، جیسے کہتی ہوں: جو نوالے تم کھاتے ہو، ہم ان کو ترستے ہیں......ہمیں بھی پیٹ بھر غذا دو......بہت گرمی ہے، پانی تو دو......ہم بھی جینا چاہتے ہیں، ہمیں بھی جینے دو اور اگر ہم جی نہیں سکتے تو ایک بار صرف ایک بار پلیٹ بھر کھانا دے دو......ٹھنڈا میٹھا پانی دے دو......صرف ایک بار پھر ہمیں زندہ زمین میں گاڑ دینا......ہم حرفِ شکایت بھی زبان پر نہیں لائیں گے......لیکن ایک بار صرف ایک بار......

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

منزہ سہام

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کچھ اپنی باتیں

سال بھر پہلے کی بات ہے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا، مجھ ایسے کہانیوں کے مارے کی جیب سے کیا نکلتا بس یہی چند ہزار، چند سو روپے، ایک مشقت زدہ موبائل اور کہانیوں کے پلندوں سے بھرا ہوا بیگ۔ ڈاکوؤں نے جب مجھ سے بیگ چھینا تو میں نے کہا کہ بھائی اس میں سوائے کاغذوں کے ڈھیر کے اور کچھ نہیں، تمھیں اس کا ایک ٹکا نہیں ملنا لیکن میرے لیے خزانے سے کم نہیں۔ اسے رہنے دو۔ نہ جانے اس ڈاکو کو کیسا تجربہ رہا تھا، وہ جو پہلے آرام سے بیگ لے رہا تھا اب اس نے ایک جھٹکے سے بیگ چھین کر اپنے کاندھے پر ٹانگ لیا۔ انھوں نے سب مسافروں کو لوٹا اور خراماں خراماں اپنی راہ لی۔

اب گھر تک کا سفر کوئی دس میل باقی تھا، جیب میں ایک ٹکا نہیں، پاس موبائل نہیں کہ کسی کو خبردار کرتا، سو میں بھی خراماں خراماں اپنی راہ چل پڑا۔ وہ بیگ جس کا وزن بعض اوقات مجھے بوجھ لگتا تھا، جس کا وزن میرے قدموں کو بوجھل بوجھل کر دیتا تھا۔ آج کاندھے پر نہیں تھا تو مجھے لگا کہ میرے کاندھوں پر بیٹھے فرشتے اُداس اور سوگوار ہو گئے ہیں، تنہائی اور خالی پن کے احساس نے میرے قدموں کو اس قدر بے وزن کر دیا تھا کہ مجھے ایسے لگا کہ میں خلا میں سفر کر رہا ہوں۔ دس میل کا سفر دس ہزار میل کے برابر لگنے لگا۔ میرے ساتھ ایک اور لٹا پٹا شخص چل رہا تھا کہنے لگا آج ہی تنخواہ ملی تھی ظالموں نے سب چھین لی۔ میں نے پوچھا کتنے پیسے تھے، کہنے لگا چھ ہزار روپے، یعنی اس کی تنخواہ چھ ہزار تھی، جس غربت کے مارے کی تنخواہ ہی چھ ہزار ہو اور وہ بھی چھین لی جائے اس کے غم کا تصور کر کے کلیجہ پھٹ جائے، میں بھی چلتا رہا وہ بھی کچھ دیر میرے ساتھ چلتا رہا۔ پھر اس نے ایک موٹر سائیکل والے کو لفٹ کا اشارہ کیا، وہ موٹر سائیکل والا فرض سمجھ کر رک گیا اور اس لٹے پٹے شخص کو لے کر یہ جا وہ جا۔ ویسے یہ شہر کراچی بھی عجیب ہے ایک طرف لاشوں، گولیوں اور لوٹ کھسوٹ کے شور میں گھرا رہتا ہے تو دوسری طرف اس کے باسی بھی پورے پاکستان سے نرالے ہیں۔ اس شہر میں لوگوں کو لفٹ دینے کا اتنا شوق ہے کہ آپ سڑک پر پیدل بھی چل رہے ہوں تو سواری والے خود رک کر پوچھتے ہیں کہ بھائی کیا لفٹ چاہیے؟ آپ کی گاڑی خراب ہو جائے تو ہر دوسرا گزرنے والا رکے گا اور اپنے ٹول پانے لے کر آپ کے ساتھ کچھ نہ کچھ مدد کرنے کی کوشش ضرور کرے گا، بس میں کوئی بزرگ بس چڑھ جائے، اس بزرگ کو سیٹ دینے کے لیے بعض اوقات میں نے مقابلہ بھی ہوتے دیکھا ہے، اس شہر کے باسی سخی اتنے ہیں کہ جسے کوئی اور کام نہ آئے وہ گداگری شروع کر دیتا ہے، رمضان میں پورے ملک سے لوگ اپنے شہروں کو چھوڑ کر یہاں چندہ مانگنے آتے ہیں، ملک کی تمام بڑی خدمت خلق کرنے والی تنظیموں کا تعلق اسی شہر بے اماں سے ہے، ہر چوک پر غریبوں کے لیے مفت کھانے کے دستر خوان بچھے ملتے ہیں جہاں بکرے کے سالن سے صبح شام بلا تخصیص تواضع کی جاتی ہے، ہوٹلوں کے باہر مفلسوں کی قطاریں لگی ملتی ہیں جہاں اس سخی شہر کے لوگ آتے ہیں۔ کوئی سو بندوں کے کھانے کے پیسے دے جاتا ہے کوئی دو سو تو کوئی ہزار بندوں کے کھانے کے پیسے دے جاتا ہے۔ اور ہوٹل والے بھی سبحان اللہ...... ایک مرتبہ ایک ریستوران میں ہم کچھ شاعر دوست کھانا کھا رہے تھے، اس ریستوران میں باہر فٹ پاتھ پر غرباء کو مفت کھانا کھلایا جا رہا تھا، شاید مٹن قورمہ تھا۔ اس قورمے کی مہک ایسی شاندار تھی کہ میں نے بیرے سے کہا کہ ہمیں بھی وہی قورمہ لا کر دو جو باہر بیٹھے ہوؤں کو کھلایا جا رہا ہے، اس نے کہا کہ یہ کھانے کے لیے آپ کو فٹ پاتھ پر بیٹھنا پڑے گا، یہاں یہ کھانا نہیں مل سکتا، میں نے کہا بھائی جتنے پیسے کہو گے اتنے ہی دیں گے، کہنے لگا نہیں یہ کسی نے اسپیشل آرڈر پر صرف غرباء کے لیے بنوایا ہے، آپ وہاں بیٹھ جائیں آپ کو مفت مل جائے گا۔ دو کروڑ کی آبادی والے اس بدنام شہر میں جہاں میری متاعِ حیات لوٹ لی گئی تھی کسی کے فاقوں سے مرنے کا واقعہ کبھی پیش نہیں آیا۔ عجیب شہر ہے، ایک جانب اتنا سنگدل کہ مثال نہیں ملتی اور ایک جانب اتنا رحمدل سخی کہ اس کی بھی مثال نہیں ملتی۔

میں چل رہا تھا، رستے میں کئی لوگوں نے لفٹ کی پیشکش کی مگر نہ جانے کیوں میں بے وزن قدموں سے چلتا ہی چلا گیا، نہ پیسے یاد آ رہے تھے نہ موبائل، میرا دل تو میرا بیگ بند کر رہا تھا۔ میں نے کوئی دو دن پہلے ایک کہانی لکھی تھی وہ بھی اسی میں تھی، میری ڈائری، جس میں سرِ راہ سرزد ہونے والی باتوں اور شعروں کو لکھ لیا کرتا تھا وہ اس میں تھی، کچھ لکھاریوں کی کہانیوں کے مسودے تھے جو میں کام کی زیادتی کی وجہ سے گھر لے جا رہا تھا کہ رات گئے ان کی ایڈیٹنگ کر لوں گا، میری یو ایس بی تھی جس میں میرا بہت سا قیمتی کام محفوظ تھا، آہ وہ کہانی جو میں نے اپنا لہو سینچ کر لکھی تھی، آہ وہ کہانیاں جو دوسرے لکھاریوں نے اپنے ارمانوں میں بھگو کر ہمیں بھیجی تھیں، وہ سب کی سب وہ ظالم کسی کچرے کے ڈھیر میں پھینک دیں گے۔

اسی سوچ میں غلطاں میں نے دس میل کا سفر پیدل طے کیا اور گھر پہنچا، وہاں دروازے پر دو نوجوان تازہ تازہ سے طالب علم، جن کے چہرے چاند کی طرح چمک رہے تھے، جن کے وجود سے گلاب سی مہک آ رہی تھی، میرے منتظر تھے، اور میرا بیگ ان کے ہاتھوں میں تھا۔ معلوم ہوا کہ ڈاکوؤں نے بیگ میں کسی قسم کی نقدی نہ پا کر اسے سڑک پر پھینک دیا، جسے ان نوجوانوں نے اٹھایا، اور اس بیگ میں موجود بے شمار دستاویز کی مدد سے میرا پتا کھوجا اور بیگ پہنچانے میرے گھر آ گئے۔ تب سے آج تک میں جب بھی کسی رہزنی کی واردات کے بارے میں سنتا ہوں تو میرے ذہن میں ان ڈاکوؤں کا چہرہ نہیں ابھرتا، ان کا ایک نقش بھی مجھے یاد نہیں مگر ان لڑکوں کی مہک، ان کی صورت، ان کی تازگی مجھے معطر کر دیتی ہے، کیونکہ یہی تو میرے لوگ ہیں، میرے شہر کے لوگ، میرے وطن کے لوگ، میرے دل کے لوگ......

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو! موسم کی بے اعتباریوں میں اضافہ ہوگیا ہے، کیوں...... اس لیے کہ ہمارے ملک میں بڑے بڑے عذاب پلے ہوئے ہیں اور یہ عذاب صرف عوام کے حصّے میں آتے ہیں۔ عوام کسی ملک کی ترقی اور خوش حالی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے اپنے اُداس ہیں، ہمارے اپنوں کی آنکھوں سے سوال جھانک رہے ہیں جن کا کوئی واضح اور موثر جواب نہیں مل رہا۔

اے برسرِ حکمرانو! ابھی دیر نہیں ہوئی، ابھی قول و قرار کے دن پورے نہیں ہوئے۔ آؤ اور عوام کی آنکھوں کے گرد جمی نا امیدی کی دھول کو صاف کردو۔ خوابوں کی تعبیروں کو روشن کردو کہ ابھی بہت دیر نہیں ہوئی۔ دل تو بوجھل ہے مگر جینا بہت ضروری ہے، خواب دیکھنا بھی بہت ضروری ہے، آؤ عہد کریں کہ اگر ہمیں ترقی کو پانا ہے تو ہمیں خود میں ذمے داری کا احساس پیدا کرنا ہے۔ پہلا قدم ہمیں خود اٹھانا ہے، تب ہی تو ترقی پر پہلا حق بھی ہمارا ہوگا۔

بہت ساری نیک تمناؤں کے ساتھ احوال کا آغاز کرتے ہیں۔

اس ماہ احوال میں یہ پہلی آمد ہے انیل حسین قربان پٹھان کی، سندھ یونیورسٹی، جامشورو سے۔ لکھتے ہیں۔ محترم کاشی چوہان صاحب! امید ہے اُس خالقِ دو جہاں سے آپ اور آپ کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ ساری تبدیلیاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سب سے پہلے احترام پر نظر پڑی۔ آپی منزہ سہام نے عورت کے بارے میں بہت عمدہ لکھا ہے، خاص کر کے مجھے یہ لائن بہت پسند آئی۔ ''سمندر کی جانب سے چلنے والی ٹھنڈی ہوا کو آج اپنے بالوں سے کھیلنے دیتے ہیں'' اللہ پاک منزہ آپی کو صحت و زندگی عطا فرمائے اور اب آتے ہیں آپ کی طرف۔ آپ کی شیر اور سپاہی والی کہانی کا تو کوئی جواب نہیں، بہت خوب صورت نصیحت کی ہے آپ نے۔ ''واقعی'' محبت فاتح عالم ہے اور تمام کی تمام کہانیاں اچھی ہیں۔ ندا ہاشمی کی ''الہام'' عمران مظہر کی ''شرارتی جنات'' ارم ناز کی ''زندہ لاش'' عادل حسین کی ''تیسری منزل'' بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ میں نے ایک کہانی ارسال کی تھی آپ کو ''دل ٹوٹ گیا'' کے عنوان سے، مگر شمارے میں شامل نہ ہوئی، اس کا جواب مجھے ضرور دیجیے گا۔ اس بار احوال میں شامل ہو رہا ہوں، امید ہے ضرور جگہ ملے گی۔ اگلے ماہ کہانی کے ساتھ شامل رہوں گا۔ قارئین اور لکھاری سب کو میرا سلام و دعا۔

☆ انیل! احوال میں حاضری لگ گئی۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ تمہارا بھرپور تبصرہ بھی ہم تک پہنچ جائے گا اور کہانی کے بارے میں تو ہماری فون پہ بات ہوچکی ہے۔ میری بھی خواہش ہے کہ جلدی سے تم سچی کہانیاں میں بطور لکھاری شائع ہو۔

✉ یہ احوال میں ہمارے ساتھ ہیں، ہمارے بہت پیارے اور منجھے ہوئے لکھاری اور شاعر ڈاکٹر صغیر احمد عاجز جہلم سے۔ لکھتے ہیں۔ جنوری 2014ء کا شمارہ بڑی تگ و دو کے بعد ملا...... بہ ہر حال مل گیا اور لے لیا، مزے کی بات بلکہ حقیقت کہہ لیجیے کہ ''سچی کہانیاں'' دن بدن نکھرتا جا رہا ہے۔ بلاشبہ ہمارے ملک میں اور بھی بہت سے معیاری پرچے دستیاب ہیں، مگر میرا، آپ کا، بلکہ ہم سب کا ''سچی کہانیاں'' سب پر سبقت لے جا رہا ہے اور میں یہ حقیقت بھی تسلیم کرنے اور کروانے میں کوئی عجز نہیں سمجھتا کہ اس کے قارئین کی تعداد بھی بڑھوتی کی جانب گامزن ہے۔ سرورق جاذبِ نظر ہونے کے ساتھ ساتھ باقی مواد (تحاریر وغیرہ) بھی معیار کا بھرم رکھے ہوئے ہے۔ اجتماعی حوالہ جات سے بات کی جائے تو یہ بات ہے تمام لکھاری حقِ قلم ادا کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ پریم چند اور بانو قدسیہ صاحبہ جیسی مقتدر اور معتبر شخصیات کی قلم کاریاں جس شمارے کی زینت بن جائیں، اس میں انفرادیت اور جاذبیت نہ ہو، یہ ممکن ہی نہیں۔ جویریہ سلیم صاحبہ کی ''برسات'' بہترین تخلیق ہے۔ ''زندگی پنجرہ چاندی کا'' ہمارے معاشرے کی موجودہ اسلوب کا عکاس ہے۔ ''زنجیر ٹوٹ گئی'' بھیا، جس نے ٹوٹنا ہوتا ہے وہ چیز ٹوٹ کر ہی رہتی ہے، اصل اور نسب کی بات ہوتی ہے۔ ''اُٹھ باندھ کمر'' مدنی فدا صاحب کی پُر اثر تو ہے ہی مگر محنت، محبت کا پرچار بھی ہے اور پیغام بھی کہ معاشرتی اُتار چڑھاؤ زندگی کا خاصہ ہیں، دلبرداشتگی مسائل کا حل نہیں ہوتا۔ ''اجالوں کا ماتم'' لاجواب تحریر ہے۔ غلام مصطفیٰ صاحب کی ''امر نامہ'' اچھی کاوش ہے۔ زاہدہ حنا کی ''تم کون ہو'' واقعی ایک جادوئی تخلیق ہے۔ ان کا لکھنے کا ایک اپنا انداز ہے۔ جس کو سمجھنے کے لیے سمجھ چاہیے۔ شارجہ والے شہزادے کی لکھت ''عمر کی نقدی'' پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ آخر میں دعا گو ہوں اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔

☆ محترم! صغیر بھائی امید ہے اب آپ کو کوئی گلہ نہ ہوگا۔ بس یہ سمجھ لیا کریں۔ آپ کی تحریر، کسی بھی

www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

صورت میں ہو، ہمارے پاس ایک امانت ہوتی ہے اور ہمیں امانت میں خیانت کرنا تو آتی ہی نہیں۔

✉ لڈن ضلع وہاڑی سے منشی محمد عزیز مے احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ڈیئر کاشی چوہان جی! محبتوں بھرا اسلام۔ عشق ومحبت کے معاملے میں چوں کہ حساب نہیں ہوتا ہے، لیکن سچی کہانیاں کے ساتھ محبت کا ایک ثبوت آپ کی معرفت اپنے دوستوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ مارچ سے سچی کہانیاں کا باقاعدہ خریدار بن چکا ہوں، پھر بھی جب 28 فروری تک سچی کہانیاں نہیں ملا تو حاصل پور بک اسٹال والے کو فون کیا تو اس کا جواب اثبات میں تھا، بس پھر کیا تھا۔ آن دی ڈیوٹی ہونے کے باوجود بائیک وہیں اڈے پر کھڑی کی اور بذریعہ بس حاصل پور پہنچ گیا۔ راستے میں محمد اقبال زمان صاحب سے بات کی تو انہوں نے بتایا ''26 فروری کو سچی کہانیاں آپ کو بھیج دیا گیا ہے۔'' میں پھر بھی رہ نہ سکا اور اسّی روپے اضافی کرائے کی مد میں خرچ کر کے سچی کہانیاں لے آیا۔ مارچ کا سرورق اوپر خوب صورت اور نیچے ڈراؤنا تھا۔ اشتہارات سے گزر کر اداریے ''احترام'' تک پہنچا جہاں منزہ باجی ''عورت'' کی شان بیان کر رہی تھیں۔ ''کچھ اپنی باتیں'' میں کاشی بھائی محبت اور رواداری کا درس دے رہے تھے۔ احوال کا پہلا خط رانا محمد شاہد صاحب کا تھا۔ مبارک ہو رانا جی اور اب کیسی طبیعت ہے آپ کے ''پاپا جانی'' کی، اللہ تعالیٰ انہیں تندرستی اور عمر خضر عطا فرمائے (آمین) کوہاٹ کے آصف عامر بھیا! آپ کب حاضری لگوا رہے ہیں احوال میں؟ شہریار احمد! جی آیا نوں، بجن آ دن رکھیں ٹھرن، عادل حسین کراچی! کیا خوب انداز ہے آپ کا، انداز گفتگو گویا کچھ بھی نہ کیا اور کہہ بھی گئے۔ ''چودہ مارچ'' نصرت سرفراز صاحبہ کی یہ تحریر حیرت انگیز تھی۔ بشریٰ سعید کی ''محافظ'' بھی بہت خوب صورت تحریر تھی۔ ''ہم زاد'' کے ذریعے خلیل احمد انجم صاحب نے ایک طرف تو نماز پنجگانہ کی اہمیت وافادیت سے آگاہ کیا ہے اور دوسری طرف شیطان صفت نام نہاد عالموں کا پردہ فاش کیا ہے۔ ''الہام'' ندا ہاشمی کی ''زندہ لاش'' ارم ناز کی ''سکھ سنتری'' شیخ صاحب کی ''آسیب'' صفدر علی حیدری صاحب کی زبردست ہیں۔ ''خوشبو کہاں گئی؟'' ویلڈن کاشی بھیا! کہاں سے ڈھونڈ کے لاتے ہیں ایسی زبردست تحریریں۔ شکیلہ انجم طارق گلابو، بشیر احمد بھٹی، جنات کی طرف سے ملنے والی ''نشانی'' کے ساتھ حاضر تھے۔ ''شرارتی جنات'' عمران مظہر کی درمیانے درجہ کی تحریر ہے۔ عصمت پروین عظیمی اپنی فیملی کے ساتھ پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات سنا رہی تھیں، ''انوشکا'' حافظہ مون صاحبہ بہن بھائی کے سچے رشتے سے متعلق کہانی لائی ہیں۔ اشفاق عباسی ہری پور سے ''وہ خوشبو وہ پائل'' کے ساتھ حاضر تھے۔ ''خونی مجسمہ'' ملک صفدر عباس اعوان صاحب کی یہ تحریر پراسرار کہانیاں نمبر میں سب سے خوفناک کہانی تھی۔ خونی بدروح بھی ایک ڈراؤنی کہانی تھی۔ انجم فاروق ''قصہ ایک روح کا'' لائے ہیں۔ ''سوکن'' کیا ''بلا'' ہے، یقیناً نفیسہ فضل کی والدہ مرحومہ کی سوکن ''نرالی ٹائپ'' کی تھیں جو مرنے کے بعد بھی اپنی سوکن کو سکون سے جینے نہ دیا۔ ''اپسرا یا ناگن'' سلیم اختر کی یہ کہانی ایک فوجی کی آپ بیتی جسے ماں کی تربیت اور دعائیں بچا گئیں۔ الماس فاطمہ ارمان ''ناگ اور ناگن'' کے عنوان سے اچھا دھاری ناگوں کی حیرت انگیز اور ناقابل یقین کہانی ڈھونڈ کے لائی ہیں۔ جاوید راہی ''زہریلا انتقام'' کے عنوان سے ایک اسٹیشن ماسٹر کی آپ بیتی بیان کر رہے تھے۔ ناگن نے بہت زبردست انتقام لیا تھا اپنے ناگ کی موت کا۔ تخن آباد میں تمثیلہ لطیف، عادل حسین اور ڈاکٹر صغیر احمد زبردست رہے۔ کاشی بھیا! اللہ آپ سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے (آمین)۔

☆ منشی بھیا! اتنا بھرپور تبصرہ! آپ ہمارے لیے بڑے قیمتی ہیں، مگر تبصرہ مختصر اور جامع ہو تو پڑھ کر لکھاری

کے لیے محبت پورے رنگوں سمیت آموجود ہوتی ہے۔

✉ مور شاہد حسین۔ حب چوکی، بلوچستان سے اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں، لکھتے ہیں۔ کاشی چوہان بھیا محبت بھرا اسلام قبول ہو۔ امید ہے آپ، آنٹی منزہ سہام، سچی کہانیاں کا تمام اسٹاف اور قارئین حضرات بالکل خیر وخیریت سے ہوں گے۔ خدا سب پر اپنی رحمتوں، نعمتوں کا نزول فرمائے۔ آمین۔ سب سے پہلے دل کی ایک بات شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو میں نے پہلی ہی نظر میں اسے پسند کرلیا۔ اس کے بعد مت پوچھیں کیا ہوا۔ میں روز سولی پر لٹک کر اس کا انتظار کرتا تھا۔ کبھی میرے گھر کو کبھی مارکیٹ میں سج دھج کے اس کا ملنا میں کیسے بھول سکتا ہوں اور رات کو جب دنیا نیند کے مزے لے رہی ہوئی ہے تب ''وہ'' اور میں رات کی اس تنہائی میں مصیبت کے مزے لوٹ رہے ہوتے ہیں۔ میں اسے اپنے ہاتھوں میں پکڑے اس کی خوب صورتی اور نئے نئے انداز میں کھو سا جاتا ہوں جو کبھی اسے اپنے سینے پر سلا دیتا ہوں۔ آپ کیا سمجھے؟ ارے بھیا میں اپنے محبوب رسالے سچی کہانیاں کی بات کر رہا ہوں آپ بھی نا قسم سے...... ہاہاہاہا...... سچی کہانیاں کا پراسرار نمبر بہت عمدہ تھا، اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ اتنا معیاری پرچہ مہیا کرنے پر بے حد نوازش۔ مبارک باد۔ ٹائٹل پر خوب صورتی سے سجی محترمہ کی زلفیں ہمیں اپنی شہزادی کی یاد دلا گئی اور ساتھ میں چھوٹی تصویر نے چونکا دیا۔ پراسرار نمبر کے لیے ٹائٹل اچھا تھا۔ دو ورق پلٹے تو مرحوم سہام مرزا کا دیدار ہوا۔ اللہ پاک ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ خوف ناک تحریروں کا انداز بے حد پسند آیا۔ آنٹی منزہ سہام کا اداریہ ''احترام'' بہت خوب، انہوں نے بڑی بات کردی ہے۔ ان کو ''اجلے حروف'' کی اشاعت پر بہت بہت مبارک ہو۔ آپ کی ''کچھ اپنی باتیں'' جیسے بکھرے موتی۔ باکمال ہو بھیا۔ محفلِ احوال میں خوب رونق تھی۔ کافی نئے چہرے چمک رہے تھے۔ فریدہ فری یوسف زئی، غلام رسول گل، منشی خورشید احمد کنول، شہریار احمد، عادل حسین، ایم اشفاق بٹ، عینی شاہ نواز، نزہت ناز، کاشف عبید، شفقت حسین، محمد حفیظ اللہ خان، ذیشان ریاض، ظفر اللہ رند، شاہد سلیم، فیض الحسن، سلیم خان اور ہارون زمان صاحب بھلے کرے آیا۔ ''خوش آمدید۔'' رانا محمد شاہد، خدا آپ کے والد صاحب کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ منشی محمد عزیز بھیا محفل میں سب چلتا ہے یار۔ ثمینہ ناز بہنا آپ کا مشرقی انداز بے حد پسند آیا۔ محمد شہزاد کنول اور عظیم الدین انصاری آپ بھی کچھ بولیں نا۔ آنٹی بشریٰ سعید احمد اور تمثیلہ لطیف کیسی ہیں آپ؟ بی بی حافظہ مون شاہ پرخلوص دعاؤں کا شکریہ۔ بی بی مریم شاہ کہاں غائب ہیں۔ ممتاز احمد بھیا ہم ٹھیک ہیں خدا کے فضل وکرم سے بس دعا کیا کرو۔ سدرہ انور علی بہنا 09 مارچ، ادی تحسین جونیجو 04 مارچ اور فیصل ندیم بھٹی 19 اپریل۔ ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' جگ جگ جیو۔ ظالمو کیک تو کھلاؤ۔ اسلم آزاد، عظمیٰ شکور، مجید احمد جائی۔ کنول عمران خان، رضوانہ کوثر آپ سب کیسے ہیں۔ آپی نصرت سرفراز آپ سے آپ کا چھوٹا بھائی ناراض ہے آپ نے اورنگی ٹاؤن سے لے کر آزاد کشمیر تک کا ذکر کیا لیکن آپ حب چوکی والے چھوٹے بھائی کو بھول گئی۔ عامر زمان عامر، عمران مظہر، کی کمی محسوس ہوئی۔ محمد اسماعیل بروہی، شاہد فراز، غازی صدام حسین، ام عادل، قرۃ العین زینب، صائمہ سحر اپنی جھلک ہی دکھا دیں پلیز۔ اپنوں کی محفل اختتام پذیر ہوئی اب چلتے ہیں کہانیوں کی دنیا میں۔ نصرت سرفراز ''14 مارچ'' خلیل احمد انجم ''ہم زاد'' بشریٰ سعید احمد ''محافظ'' اچھی کاوشیں تھیں، آخر تک سسپنس سے پُر تھیں۔ ندا ہاشمی ''الہام'' ارم ناز ''زندہ لاش'' شیخ معظم الٰہی ''سکھ سنتری'' صفدر علی حیدری ''آسیب'' مختصر مگر جامع پراسرار تھیں۔ انکل سلیم فاروقی ''آتش جنوں'' مجھور سالے کی جان

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ "خوشبو کہاں گئی" ایک انوکھی منفرد کہانی تھی۔ شکیلہ انجم طارق "گلابو" بشیر احمد بھٹی "نشانی" عمران مظہر "شرارتی جنات" ان کا اچھوتا خیال تھا۔ مختصر عصمت پروین عظمٰی "انہونے واقعات" حافظ مون شاہ "انوشکا" اشفاق عباسی "وہ پائل" اچھی تھیں۔ اعجاز احمد نواب "ناگن" بہت زبردست سلسلہ ہے۔ ملک صفدر عباس اعوان "خونی مجسمہ" شاہد سلیم "خونی بدروح" انجم فاروق "قصہ ایک روح کا" نفیسہ فضل "سوکن" عمدہ تحریریں تھیں۔ عادل حسین "تیسری منزل" محمد سلیم اختر "اپسرا یا ناگن" الماس فاطمہ ارمان "ناگ اور ناگن" جاوید راہی "زہریلا انتقام" بے حد پسند آئیں۔ ارشد علی ارشد "ملکھنی" بہت عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ "دخن آباد" سب کے خیال اچھے تھے۔ احمد سجاد بابر "روشنی والے" حمیرا خان "ایک کہانی" اور صدف آصف "کالا انڈا" واقعی بہت خاص کہانیاں تھیں، اچھوتی اور حیرت انگیز قاری کو اپنی گرفت میں جکڑ کے رکھنے والی جاندار تحریریں تھیں۔

☆ پیارے مور شاہد! تمہاری پرچے سے محبت کو کیا نام دوں، محبت اپنا آپ منوا کر رہتی ہے۔ تمہاری محبت پہ ہمیں بہت مان ہے بس یہ ہمیشہ یاد رکھنا۔

⊠ جاوید علی۔ چیچل آباد سے پہلی بار احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں، محترم کاشی بھیا۔ خدا پاک آپ پر رحمتوں، نعمتوں کی بارش کرے آمین۔ احوال یہ ہے کہ یکم مارچ کو میں گھر میں لگے درخت کے نیچے رکھے صوفے پر بیٹھا سچی کہانیاں کا مطالعہ کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، میں نے جا کر دروازہ کھولا سامنے مور شاہد حسین مسکرا رہے تھے۔ لو بھئی چائے کا وقت دیکھ کر آ گئے، میں نے انہیں گلے لگایا۔ ہر ماہ تمہیں یاد دلانا پڑتا ہے کہ اس ماہ خط ضرور لکھنا ہے، اس کے باوجود بھی تم نے کبھی خط نہیں لکھا۔ 5 تاریخ تک بھرپور تبصرے کے ساتھ تمہارا خط کاشی بھیا کی میز پر ہونا چاہیے، ورنہ مجھ سے تو اچھی طرح واقف ہو۔ مور شاہد حسین نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا اور چلا گیا بس بڑے بھیا کا حکم سر آنکھوں پر رکھتے ہوئے میں نے کاغذ اور قلم سے اپنائیت کا اظہار کیا جو ذہن میں آیا سو لکھ دیا۔ اگر آپ کو میری چھوٹی سی تحریر پسند آئے تو جی بسم اللہ پسند نہ آئے تو زبردستی بھی پسند کرنی ہوگی، کیوں کہ آپ کو کچھ اپنی باتیں، تحریر پر عمل کرنا ہی پڑے گا۔ بھیا آپ نے عہد کیا ہے کہ جس جس آدمی کو شکایت ہے اسے دور کرو گے، بس ایک گزارش ہے کہ اس خط اور تصویر کو رسالے کی زینت بناؤ، خدا آپ کا ہمیشہ حامی و ناصر ہو۔ (آمین) سچی کہانیاں پراسرار نمبر بے حد پسند آیا، تمام کہانیاں اسرار سے پر تھیں، مگر مجھے "خوشبو کہاں گئی، شرارتی جنات، 14 مارچ، محافظ، کالا انڈا، بے حد پسند آئی، باقی تمام تحریریں بھی اچھی تھیں۔

☆ پیارے جاوید! آپ کو احوال میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، اُمید ہے اگلے ماہ بھی آپ سے انہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔

⊠ ظفر اللہ رند، ڈیرہ مراد جمالی سے لکھتے ہیں۔ کاشی چوہان صاحب مارچ کا تازہ شمارہ میرے ہاتھ میں ہے جو کہ یکم مارچ کو ملا اور دو مارچ کو اتوار ہے، تین مارچ کو بذریعہ ڈاک بھیج رہا ہوں۔ ٹائٹل تو اس مرتبہ بہت ہی خوب صورت ہے۔ آگے بڑھے تو منزہ آنٹی کا احترام آیا۔ منزہ آنٹی جی آپ نے سو فیصد درست فرمایا ہے، ہمیں عورت کا احترام کرنا چاہیے۔ کاشی بھائی آپ کی کچھ اپنی باتیں جو ایک سچائی پیش کر رہی تھیں۔ ماشاء اللہ احوال میں پہنچ گئے اللہ اللہ کر کے آگے بڑھنے لگے، ارے یہ کیا، ہم غریب لوگ

کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہے ہیں۔ سچ میں کاشی بھائی آپ نے سارے نئے لکھاریوں کا دل جیت لیا، ورنہ ہم تو تصور میں بھی نہیں سوچ سکتے کہ ہمارے ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو سچی کہانیاں میں جگہ مل سکتی ہے۔ شکریہ! اب آتے ہیں احوال کی طرف۔ غلام رسول بھائی آپ کی رفتار تو تیز ہے جیسے آئے ویسے ہی گئے۔ ندیم بھٹی صاحب آپ کو 22 ویں سالگرہ دل و جان سے مبارک ہو۔ صفدر عباس بھائی ایک بات تو بتاؤ آپ نے رسالے کے ساتھ ظلم کیا یا کڑاہی کے ساتھ اور کاشی بھائی آپ کو غصہ کیوں آیا۔ ارے بھائی یہ ملک صاحب کی کڑاہی ہے اُس کی اپنی مرضی ہے، باقی کہانیاں پڑھ نہیں سکے، ہمیں امید ہے کہ اچھی ہی ہوں گی۔ کنول صاحبہ آپ درست کہہ رہی ہیں۔ میں بھی آپ کے حق میں ہوں۔ پلیز چوہان صاحب یہ سرورق کا فولڈنگ والا سسٹم بند کریں تو اچھا ہوگا۔ شکریہ! اب اجازت

☆ پیارے ظفر اللہ رند! شاعری شائع ہو رہی ہے، احوال میں خط بھی سب پڑھ رہے ہیں......اور حکم!!

⊠ ظفر علی ابڑو، ملیر کراچی سے شاملِ احوال ہیں، لکھتے ہیں۔ کاشی چوہان بھائی بہت سی دعاؤں کے پھول آپ کے نام۔ سچی کہانیاں میں پہلی بار شامل احوال ہونے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے آپ دل سے خوش آمدید کہیں گے۔ تازہ شمارہ گزشتہ کئی سالوں کے پراسرار نمبروں پر بہت بھاری لگا۔ پہلے پرچوں میں کہانیاں اتنی بہترین نہیں آ رہی تھیں جو چند ماہ سے نظر آ رہی ہیں۔ اب شمارہ ہر لحاظ سے عمدہ ثابت ہو رہا ہے۔ آپ کے آتے ہی سات سمندر پار اور سرحد پار سے کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ سچی کہانیاں ایک ایسا جریدہ ہے جسے پڑھنے والا اپنے ذہن میں معلومات کا خزانہ جمع کر لیتا ہے، کیوں کہ میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اس پرچے سے، مگر سچی کہانیاں کا خاموش قاری تھا، اب لکھنے کا حوصلہ مور شاہد حسین نے دیا ہے۔ مور شاہد حسین جب بھی فون کرتے، بس یہی کہتے کہ اس بار خط لکھنا ہے اور میں نئے نئے بہانے سے ٹالتا رہا، مگر اب اس کی محبت اور آپ کی محنت و لگن نے خاموشی توڑ دی۔ وقت کی کمی اور مصروفیات کی وجہ سے پرچہ زیرِ مطالعہ ہے دلی معذرت۔ اگر احوال میں تھوڑی سی جگہ ملی تو آپ کا ہمیشہ ممنون اور مشکور رہوں گا۔

☆ پیارے ظفر ابڑو! بھیا تم تو ہمارے پڑوسی نکلے۔ اب اگر دوستی پکی کرنی ہے تو ہمارے پرچے میں ہر ماہ ہمارا احوالی بننا ہوگا۔

⊠ فیض رسول بہاولپور سے عرض کرتے ہیں۔ جناب مدیر سچی کہانیاں کاشی بھائی السلام علیکم کے بعد عرض یہ ہے کہ میں خدا کے فضل و کرم سے بالکل خیریت سے ہوں اور امید ہے کہ آپ بھی خیریت سے ہوں گے۔ سچی کہانیاں کا پرانا قاری ہوں۔ ہمیشہ لکھنے کا ارادہ کرنے میں وقت گزر جاتا تھا لیکن اس بار بڑی ہمت کر کے خط لکھنے بیٹھ گیا۔ براہ مہربانی اس چھوٹی سی کوشش کو سچی کہانیاں کے قیمتی اوراق میں جگہ دیں، آپ کی عین نوازش ہوگی۔ میں لاہور میں جاب کرتا ہوں۔ گرین ٹاؤن کے علاقے میں سچی کہانیاں بہت لیٹ آتا ہے، براہ مہربانی اس مسئلے کو حل کریں، تاکہ سچی کہانیاں بروقت مل جائے۔ ماہ مارچ کا سچی کہانیاں سامنے میز پر ہے۔ پراسرار کہانیوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو زندگی کے عجیب عکس دکھا رہا ہے۔ انتہائی قابلِ تحسین اور قابلِ ستائش ہے۔ پلیز یہ سرورق والا نیا انداز ختم کریں، اکثر پڑھتے ہوئے مڑ جاتا ہے۔ امید ہے آپ میری اس چھوٹی سی گزارش پر غور ضرور کریں گے۔

☆ پیارے فیض رسول! آپ کے آمد نے ہمارا مان بڑھا دیا، آپ کی شکایت متعلقہ شعبے تک پہنچ چکی

www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ اگلے ماہ آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉ شفقت حسین۔ حب چوکی سے شاملِ احوال ہیں، لکھتے ہیں۔ پیارے بھائی کاشی چوہان کیسے ہیں آپ۔ سب سے پہلے تہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کروں گا کہ آپ نے خط کے ساتھ میری تصویر بھی لگا دی۔ مارچ کا پرچہ میرے سامنے ہے۔ ماڈل سے ہیلو ہائے کے بعد فہرست دیکھی رائٹرز حضرات کے نام پڑھے، ایک دم 92 صفحہ پر آپ کی کہانی خوشبو کہاں گئی، پڑھی بے حد پسند آئی اور آپ کا نیا سلسلہ کچھ اپنی باتیں لاجواب ہے، آتشِ جنوں، ملھنی، ناگن تینوں سلسلے اچھے ہیں اور مجھے بے حد پسند ہیں۔ ہمیشہ کی طرح سلسلے دلچسپ اور بھرپور تھے۔ صدف آصف کی کالا انڈا، جاوید راہی کی زہریلا انتقام اور نفیسہ فضل کی سوکن اچھی تھیں، جبکہ اشفاق عباسی کی وہ پائل بھی اچھی تھی۔ ملک صفدر عباس کی خونی مجسمہ، شکیلہ انجم کی گلابو، صفدر علی حیدری کی آسیب، حافظ مون شاہ کی انوشکا پسند آئیں۔ ارم ناز کی زندہ لاش، لاش کا زندہ ہونا پھر مرجانا سمجھ میں نہیں آیا۔ مصروفیات کے باعث جو پڑھا پیشِ خدمت ہے۔ کہانیاں اچھی اور معیاری تھیں۔ خط بڑی مصروفیات کے عالم میں لکھ رہا ہوں۔ اب اجازت ایک بار پھر تہ دل سے آپ کا شکریہ۔

☆ پیارے شفقت! تم نے جو لکھ دیا، ہمیں دل و جان سے قبول ہے۔ بس احوال میں غیر حاضر نہ ہونا۔

✉ امجد علی، چیزل آباد حب چوکی سے پہلی بار شامل احوال ہیں، لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں کے مدیر اعلیٰ اور مدیر السلام علیکم۔ میں سچی کہانیاں کے معیار کی تعریف نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ یہ معیار ہی تو اس کی پہچان ہے اور اس پہچان کی خاص وجہ آپ ہیں۔ سچی کہانیاں میں ہر مزاج کے لوگوں کے لیے مواد موجود ہے۔ زبردست تحریریں ہوتی ہیں۔ ڈیئر برادر میں اکثر خوف ناک رسالے پڑھتا ہوں۔ جب مجھے پتا چلا کہ مارچ کا سچی کہانیاں پراسرار نمبر ہوگا تب سے میں انتظار کی سولی پر لٹک کر شدت سے منتظر تھا، کیوں کہ مجھے پر اسرار کہانیاں بے حد پسند ہیں۔ آپ کی خوشبو کہاں گئی، نصرت سرفراز کی 14 مارچ، ارم ناز کی زندہ لاش، ملک صفدر عباس اعوان کی خونی مجسمہ، ندا ہاشمی کی الہام اور اس کے علاوہ خلیل احمد انجم کی ہمزاد پسند آئیں۔ جاوید راہی زہریلا انتقام، احمد سجاد بابر روشنی والے، انجم فاروق قصہ ایک روح کا، حمیرا خان ایک کہانی اور صدف آصف نے بھی کالا انڈا جیسی اعلیٰ کہانیاں پڑھنے کو دیں۔

☆ امجد علی! احوال میں ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ تبصرہ مختصر مگر مزیدار کیا آپ نے۔ اگلے ماہ ہمارے ساتھ ہوں گے نا آپ ان ہی صفحات پر۔

✉ سدرہ انور علی۔ جھنگ صدر سے احوال میں شریک ہیں، لکھتی ہیں۔ محترم بھیا کاشی چوہان السلام علیکم! اس اُمید کے ساتھ حاضر ہوں کہ آپ، تمام اسٹاف اور سچی کہانیاں پڑھنے والے تمام لوگ صحت و ایمان کی اچھی حالت میں ہوں گے۔ پراسرار نمبر یکم مارچ کو ملا۔ ٹائٹل بہت زیادہ پسند آیا، کیوں کہ اس پر میرا سلطان کی کوئین حورم سلطان براجمان تھیں اور ذرا سی نیچے نظر پڑی میرا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ منزہ آنٹی کا اداریہ، احترام، بے شک کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔ کچھ اپنی باتیں نے تو رُلا ہی دیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ کپڑا پھٹے ہاتھوں سے دل پھٹے باتوں سے۔ احوال میں تمام خطوط بہترین تھے لیکن محمد عزیز، ممتاز بھیا، مجید احمد اور تحسین جونیجو کے خطوط بہت زیادہ پسند

دنیا میں کس جگہ سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کو زرِ مبادلہ بھیجیے

اندرون ملک =/720 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرِ سالانہ

ملک	زرِ سالانہ	ملک	زرِ سالانہ
کویت	55امریکی ڈالرز	ایران	55امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55امریکی ڈالرز	سری لنکا	55امریکی ڈالرز
یو اے ای	55امریکی ڈالرز	جاپان	55امریکی ڈالرز
مصر	55امریکی ڈالرز	لیبیا	55امریکی ڈالرز
یونان	55امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55امریکی ڈالرز
فرانس	55امریکی ڈالرز	جرمنی	55امریکی ڈالرز
برطانیہ	55امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55امریکی ڈالرز
ناروے	55امریکی ڈالرز	پولینڈ	55امریکی ڈالرز
امریکہ	65امریکی ڈالرز	کینیڈا	65امریکی ڈالرز
افریقہ	65امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے

110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

فون نمبرز: 021-34939823,34930470

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

آئے۔ رانا محمد شاہد آپ کے والد محترم کے لیے دعا گو ہوں، اللہ انہیں صحت اور لمبی عمر دے۔ محمد عزیز ویلکم جی موسٹ ویلکم۔ جنگ ہو نہ ہو اسلحہ تو ہونا چاہیے۔ ملکہ احوال تحسین جونیجو کبھی کبھی خاموشی میں بھی وہ سب کہہ دیتی ہے جو اکثر زبان نہیں کہتی۔ ممتاز احمد بھیا دعائیں دینے کا بہت شکریہ، لیکن دیکھیں آپ بھول گئے۔ میری برتھ ڈے 9 مارچ کو ہوتی ہے۔ فیصل ندیم سالگرہ بہت مبارک ہو، خدا آپ کی زندگی خوشیوں سے بھر دے۔ عینی شاہ، عادل حسین، شہریار، ذیشان ریاض سچی کہانیاں میں آمد پر خوش آمدید۔ کاشی بھیا آپ نے کہا تھا فون پر کہ صرف رائٹر اور کہانی کا نام لکھنا ہے۔ اگر ایک لائن کے تبصرے کی بھی اجازت دے دیتے آپ تو بہت اچھا ہوتا، اس طرح کیسے کسی کو پتا چلے گا کہ کون سی کہانی اچھی ہے۔ نصرت سرفراز کی 14 مارچ پسند آئی۔ بشریٰ سعید احمد کی محافظ بہت سنسنی خیز تھی۔ خلیل احمد انجم کی ہمزاد، عورت اور لال مرچ سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے۔ ندا ہاشمی کی الہام، زندہ لاش ارم کی، شیخ معظم الٰہی کی سکھ سنتری، صفدر علی حیدری کی آسیب بہت لاجواب تحریریں تھیں جنات کی کہانیوں میں شکیلہ انجم کی گلا بو اس طرح کی کہانیاں پہلے بھی بہت پڑھ چکے ہیں۔ کاشی بھیا کی خوشبو کہاں گئی؟ بہت پسند آئی۔ عمران مظہر کی شرارتی جنات تو بہت ہی زناٹے دار تحریر تھی، پڑھ کر دل خوف سے لرز اُٹھا۔ ناگن اچھی جا رہی ہے۔ ملک صفدر عباس اعوان کی خونی مجسمہ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ شاہد سلیم کی خونی بدروح، کسی کو ناجائز تنگ کرنا اف میری تو روح تک سسک اُٹھی۔ انکل سلیم اختر کی کہانی ''اپسرا یا ناگن'' بہت پسند آئی ان کی تحریریں بہت اچھی لگتی ہیں۔ آتش جنوں کی تعریف کے لیے زمین آسمان کے قلابے ملاؤں یا چاند ستاروں کے سمجھ نہیں آتی۔ سخن آباد میں تمام لوگوں کی شاعری پسند آئی۔ پر اسرار نمبر یہاں تک تو بہت لاجواب تھا باقی ابھی پڑھنا باقی ہے۔ رابیل خان عطاری، زرینہ جونیجو، عکاشہ سحر، صفیہ کجل شاہ، صائمہ سحر، خلیل جبار، عبدالروف عدم، اشعر جواد، قراۃ العین، عزیز انکل، فہیم انکل سلام کے بعد عرض ہے کہ آپ سب کہاں غائب ہیں؟ پلیز لوٹ آئیں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔

☆ سدرہ صاحبہ دیکھیے آپ کا پورا خط لگ گیا۔ پُر اسرار نمبر 2 آئے گا اور ضرور آئے گا، ابھی سے ہوشیار باش ہو جائیں۔

✉ یہ برقی نامہ آیا ہے بُورے والا سے، ہمارے بہت پیارے لکھاری دوست اور شاعر عامر زمان عامر کا۔ لکھتے ہیں۔ قابلِ قدر آنٹی رخسانہ سہام، مدیرِ اعلیٰ منزہ آپی اور پیارے کاشی آداب! سال نو کا دوسرا شہ پارہ (فروری کا شمارہ) ہماری عقیدتوں کے اُفق پہ قدرے تاخیر سے طلوع ہوا، بہرکیف پرچہ دیکھ کے حسنِ ترتیب سے انتظار کی تشنگی جاتی رہی۔ منزہ جی آپ کا ''اعزاز'' تمام اہلِ قلم کے لیے باعث صد اعزاز ہے۔ کاشی ولولہ انگیز جذبات اور عقیدتوں کے آنچل میں لپٹی، کُٹی تمہاری محبوبہ سے مل کے اچھا لگنے کا مطلب ہے کہ تمہاری تمہید کے گلہائے عقیدت بہت پسند آئے۔ سب سے پہلے احوال نگر میں محترمہ ثانیہ بھٹی براجمان ہیں۔ ثانیہ جی خوش آمدید، بہت اچھا لگتا ہے جب کوئی اپنا پھر سے اپنے آنگن میں لوٹ آتا ہے، بہت ساری دعائیں آپ کے نام۔ ثمینہ بہن آپ نے عمدہ تبصرہ کیا ہے گڈ، عبدالعزیز بھیا درست کہا، آپ کی بات سے کوئی ہو نہ ہو، میں متفق ہوں۔ رضوانہ کوثر گو کہ تھرو آؤٹ پرچے کا مطالعہ اچھی بات ہے لیکن آپ اشتہارات (کمرشل) بھی انہماک سے پڑھ کے کمنٹس کرتی ہیں حیرت ہے مجھے۔ علاوہ ازیں بزم احوال میں رانا محمد شاہد، سدرہ انور، منشی عزیز اور کنول عمران کے بے لاگ تبصرے اچھے لگے اور ہاں احوال میں اپنی تصویر تو ظاہر ہے اچھی ہی لگنی تھی نا...... اور میرا تبصرہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں، جویریہ سلیم کی برسات شاہکار تحریر ہے۔ ''زندگی

پنجرہ چاندی'' کا ایسا سوال ہے شاید جس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ ''ابھاگن'' جو کرو گے سو بھرو گے، خدا کی لاٹھی بہت بے آواز ہے۔ زنجیر ٹوٹ گئی روایتی موضوع ہے۔ ''اُٹھ باندھ کمر'' یہ تو ہر گھر کا قصہ ہے۔ اُجالوں کا ماتم زبردست رہی۔ ''امر نامہ'' اچھی بنت کاری کی گئی ابتدا میں مگر انجام ادھورا ہی چھوڑ دیا جائے تو کہانی اپنی افادیت اور تاثر کھو بیٹھتی ہے۔ ''سڑک چھاپ'' بہت خوب الماس فاطمہ ارمان۔ ''پھر بہار آئی ہے'' ممتاز احمد کی وکھری نوعیت کی سچ بیانی ہے۔ ''مرے آنگن کا تحفہ'' خوب صورت موضوع ہے۔ ''منتر'' منشی پریم چند کی شاہکار تحریر ہے اردو ادب کا سرمایہ ہیں ایسے شہ پارے۔ اعجاز احمد نواب کی ''ناگن'' زبردست ہے۔ ''تم کون ہو'' زاہدہ حنا کا پہلا شعلہ بھڑک کے معاشرتی ناسور کا عکس اپنی تپش کی صورت پیش کر رہا تھا، ویل ڈن زاہدہ! ''واحد حل'' کی صورت میں کا غذائی سمندر میں لنگر انداز ہیں حمیرا خان! خوب صورت انداز بیان جارحانہ منفرد اسلوب، محمد اقبال زمان نے پیکر شجاعت نڈر پولیس آفیسر محمد اسلم یوسف زئی المعروف ''چوہدری اسلم'' ہمت و استقلال کی لازوال داستان لائے۔ سچی کہانیاں کا مقبول سلسلہ تین مرد تین کہانیاں اپنے تئیں سب ہی اچھی کہانیاں ہیں تب ہی تو پاکستان کے صفحہ اول کے پرچے کی زینت بنی ہیں لیکن ''باز'' اور ''ابابیل'' اس سلسلے کی سب سے اچھی کہانی ہے۔ یہ دستگیر شہزاد کی عمدہ کاوش ہے۔ ایک مافوق الفہم پراسرار عجوبہ داستان ملکھنی مقبول ترین ہو رہی ہے۔ شعرائے کرام کی رنگا رنگ شاعری سے آراستہ خوب صورت مستقل سلسلہ ''سخن آباد'' میں طاہر اقبال بورے والا سے نظم ''چاند'' کی صورت سرفہرست رہے۔ اور سب سے آخر میں اس ماہ کی سب سے خاص تحریر ''یہ رشتہ و پیوند'' عظیم قلم کار محترمہ بانو قدسیہ کے قلم کا شاہکار ہے۔ جس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

☆ لیجیے عامر! آپ کا احوال میں بھرپور تبصرہ شامل اشاعت ہے۔ اب جلدی سے کوئی کہانی بھیج دو بھائی۔

✉ غلام مرتضیٰ۔ قمبر شہداد کوٹ سے پہلی بار احوال میں رقم طراز ہیں۔ محترم کاشی چوہان، امید ہے آپ اور سچی کہانیاں کا پورا اسٹاف بخیریت ہوں گے۔ اس سے پہلے میں آپ کو اپنا تعارف کرا دوں۔ میرا نام غلام مرتضیٰ ہے۔ میرا تعلق قمبر شہداد کوٹ سندھ کے ایک گاؤں سے ہے۔ جب سے آپ سچی کہانیاں کے صدارتی عہدے پر فائز ہیں، میں تب سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ مور شاہد حسین کی مہربانی ہے جو اس نے سچی کہانیاں کو سب ہی سے قریب کر دیا۔ دسمبر 2013 کا پہلی بار سچی کہانیاں پڑھا تھا، بے حد پسند آیا تھا۔ مارچ 2014 کا پراسرار نمبر بہت اعلیٰ سلیکشن کا حامل ہے۔ تمام کی تمام سچی داستانیں دلچسپ اور اسرار سے بھرپور تھیں۔ یہ آپ کا کمال ہے کہ آپ نے اچھے انتخاب کیے۔ آپ کی اس محنت اور لگن نے اب تو سچی کہانیاں پڑھنے کا عادی بنا دیا ہے، اس لیے کہ یہ ایک رسالہ ذہن کی نشوونما کے لیے غذا بھی ہے اور معلومات کا خزانہ بھی ہے۔ اب تازہ شمارے کی بات ہو جائے۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ محترمہ منزہ سہام کا اداریہ ''احترام'' اور آپ کے دل کی کچھ اپنی باتیں بے حد پسند آئیں۔ احوال میں تصویر والا انداز بے حد اچھا لگا۔ سب کی سب کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ آپ کی کہانی ''خوشبو کہاں گئی'' اچھوتی تھی، اس کے علاوہ 14 مارچ، محافظ، تیسری منزل، شرارتی جنات، زہریلا انتقام کے رائٹرز نے خوب محنت اور سچائی سے پراسرار کہانیاں پڑھنے کو دیں۔ مصروفیات کے باعث اتنا ہی پڑھ پایا ہوں، باقی پرچہ زیر مطالعہ ہے۔ اب اجازت سلام و دعائیں اور نیک تمنائیں سب یاد کرنے والوں کے نام۔

☆ پیارے بھائی غلام مرتضیٰ! آپ کی محبت سر آنکھوں پر۔ تصویر آپ کے خط کے ساتھ احوال میں شامل ہے۔ اب تو آپ اپنی حاضری یقینی بنائیں گے نا۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

✉ یہ پہلی بار احوال میں آمد ہے۔ عمران علی کی حب چوکی، بلوچستان سے۔ لکھتے ہیں، محترم کاشی چوہان۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے، گوکہ آپ کے حلقہ اپنائیت میں شامل ہونے کی پہلی بار کوشش کر رہا ہوں، اس کا سبب آپ کی بے پناہ محبت ہے۔ آپ سے ایک دو دفعہ فون پر بات کرکے ایسا لگا کہ بہت عرصے سے آپ سے واقف ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ آج کے دور میں اتنی محبت اور اپنائیت کسی میں موجود ہے۔ پرچے کی شروعات منزہ سہام جی کے اداریہ "احترام" سے کی۔ انہوں نے بہت اچھا لکھا، "کچھ اپنی باتیں" بہترین لکھتے ہو آپ، یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ سچی کہانیاں میں بہت ہی منفرد اور خوشگوار تبدیلیاں آئی ہیں جو کہ بے حد اچھی لگیں اور پسند آئی ہیں۔ سب کی سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھی، مگر مجھے احمد سجاد بابر کی "روشنی والے" حمیرا خان کی "ایک کہانی" اور صدف آصف کی "کالا انڈا" بے حد پسند آئیں۔ آپ کی کہانی "خوشبو کہاں گئی" دل میں اتر گئی۔ آتشِ جنوں اور ملٹھنی پسندیدہ سلسلے ہیں۔ سخن آباد میں سب کے خیال اچھے تھے۔ سب کی شاعری مزہ دے گئی، کسی ایک کا نام لینا دوسروں سے زیادتی ہے۔ اب اجازت اس شعر کے ساتھ۔

ٹوٹا ہوں تیرے ہجر میں یہاں
اب تو لبوں پہ کوئی دعا بھی نہیں رہی

☆ عمران علی اب تو خوش ہونا آپ! خوش آمدید کہنے سے بہتر ہے آپ کو، آپ کا خط شائع کرکے خوش کیا جائے، اگلے ماہ آپ کا انتظار رہے گا۔

✉ راولپنڈی سے فرزانہ نگہت عرض کرتی ہیں۔ بے حد پیاری منزہ باجی۔ سلامت تا قیامت باشد۔ اللہ تعالیٰ آپ پر بے پناہ رحمتوں برکتوں کا نزول فرمائے (آمین) آپ کے تعاون کی تہ دل سے مشکور ہوں۔ سچی کہانیاں میں جگہ پانا اعزاز سے کم نہیں۔ یہ نئی سچی کہانی حاضرِ خدمت ہے۔ امید ہے سچی کہانیاں کے حسین دامن میں ضرور جھلملائے گی۔ آپ کی پسند و صوابدید پر۔ اللہ آپ کو شاد و آباد رکھے، آمین والسلام۔

☆ نگہت جی! آپ کا خط احوال کی زینت بن گیا، مگر آپ سے گلہ صرف اتنا ہے کہ تبصرہ ہر بار کی طرح غائب؟ امید ہے اگلے ماہ آپ کا بھرپور تبصرہ ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔

✉ غلام رسول گل، جیکب آباد سے لکھتے ہیں۔ بھائی صاحب سلام، دعائیں اور نیک تمنائیں آپ کے نام۔ میں آپ کی حوصلہ افزائی اور ساتھی قارئین کی پسندیدگی کے لیے سب کا شکر گزار ہوں۔ ماہنامہ سچی کہانیاں کی کیا تعریف کریں۔ گزشتہ پرچوں سے پراسرار شمارہ ابتدا سے آخری لفظ تک اسرار سے بھرپور تھا۔ ہر ماہ ایک خاص شکایت رہتی تھی کہ ہمارے ہاں ماہنامہ سچی کہانیاں وقت پر نہیں ملتا تھا۔ اس پریشانی کا ذکر جب سور شاہد حسین سے کیا تو انہوں نے ایک آسان حل بتایا کہ آپ سچی کہانیاں کے سالانہ خریدار بن جائیں۔ اب ماشاءاللہ شمارہ وقت پر مل جاتا ہے، مگر قائداعظمؒ کے بقول کام کام اور کام سارا دن مصروف رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ چند کہانیاں ہی پڑھی ہیں۔ 28 فروری کو ایک بجے میں اپنے آفس میں بالکل فارغ بیٹھا تھا کہ اچانک ڈاک بابو آئے اور لفافے میں بند سچی کہانیاں کا پراسرار نمبر دے کر چلے گئے۔ ٹائٹل کا نیچے والا حصہ دیکھ کر بری طرح چونکا۔ اداریہ "احترام" پسند آیا۔ کچھ اپنی باتیں آپ نے ایک خوب صورت کہانی کے ساتھ اچھا سبق بھی دیا۔ ارے یار واہ محفل میں ہم بھی ہیں، بے حد شکریہ۔ خوشبو کہاں گئی، نشانی، ناگ اور ناگن، روشنی والے، خوب صورت تحریریں رہیں۔ 14 مارچ اور محافظ نے چونکا دیا۔ زندہ لاش، ذہن یقین کرنے سے قاصر تھا۔ تیسری منزل، خونی مجسمہ،

سوکن، ایک کہانی اچھی تھیں۔ انوشکا، پاشا نے اپنی بہن کو آخر جن سے نجات دلا ہی دی، پسند آئی۔ سکھ سنتری پاکستان کے لیے اپنی جانیں قربان کردینے والے عظیم لوگوں کی یاد دلا گئی۔ خونی بدروح نے چونکنے پر مجبور کردیا۔ جتنی کہانیاں پڑھی ہیں ان پر تبصرہ حاضر ہے۔ اب تو آپ خوش ہوئے نا بھائی صاحب یا اب بھی کوئی شکایت ہے؟

☆ ارے واہ گل! تم نے تو کمال کردیا۔ بڑا زبردست تبصرہ کیا۔ مجھے امید نہیں، سو فیصد یقین ہے جلد ہی تم احوال میں چھا جاؤ گے۔

✉ کراچی سے ہمارے نئے لکھاری اور شاعر دوست عادل حسین لکھتے ہیں۔ پیارے کاشی جی! اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ مارچ کا سچی کہانیاں پراسرار نمبر کی صورت جلوہ گر ہوا۔ کیا خوب صورت نمبر پیش کیا ہے آپ نے! میری طرف سے بہت مبارک۔ ٹائٹل بھی خوب ہے۔ میری کہانی غزل اور خط شاملِ اشاعت کرنے پر شکریہ۔ منزہ آپی کا اداریہ بھی خوب صورت ہے۔ بے شک عورت کسی بھی روپ میں ہو، قوموں کی عزت انہی کے دم سے ہے۔ منزہ آپی کو اُجلے حروف، کی اشاعت پر مبارکباد۔ کاشی جی! کیا خوب صورت باتیں کہہ دی ہیں آپ نے۔ بھئی دِل خوش ہوگیا۔ آپ کے عہد میں، میں بھی برابر کا شریک ہوں۔ اللہ سب کے دِلوں میں ایسا ہی جذبہ پیدا کردے۔ پرفیکشن میں امپروومنٹ مشکل ہے مگر آپ کر رہے ہو۔ اللہ کامیاب کرے۔ سب ہی خطوط اچھے ہیں۔ جہانِ حیرت کی تمام کہانیاں ہی خوب ہیں۔ سب سے زیادہ خوب صورت نصرت سرفراز صاحبہ کی 14 مارچ، بشریٰ سعید احمد کی محافظ اور خلیل احمد انجم کی ہم زادگی، باقی سب بھی ٹھیک ہیں اور جناتی کہانیاں پڑھ کر ہم بھی کئی بار خوف میں ڈوب گئے۔ کاشی جی کیا خوب کہانی پیش کی ہے آپ نے مبارک۔ شکیلہ انجم طارق کی گلابو پڑھ کر مزا آ گیا۔ بشیر احمد بھٹی صاحب کی نشانی بھی اچھی ہے۔ شرارتی جنات بھی اچھی لگی۔ ملک صفدر صاحب کی خونی مجسمہ اور انجم فاروق کی قصہ ایک روح کا بہت پسند آئیں، ناگ بیتیاں تینوں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں اور خاص کہانیاں بھی خوب صورت، لیکن احمد سجاد بابر صاحب کی روشنی والے پورے پرچے کی جان ہے۔ پڑھ کر ایمان بھی تازہ ہوگیا۔ احمد سجاد صاحب بہت مبارک ایسی کہانی پیش کرنے پر۔ آتشِ جنوں اور ملٹھنی حسب روایت خوب چل رہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے، میں لوگوں کے بہت سے مسائل کا حل ہوتا ہے۔ اللہ اس نیک کام کو قبول کرے۔ سخن آباد ہمیں بہت اچھا لگا۔ ہم جو تھے۔ ہاہاہا...... سب نے خوب کلام پیش کیا ہے۔ ہمیں جو بہت پسند آیا نظموں میں وہ مجھ کو آواز دے دستگیر شہزاد کی نظم، شفق عنایت کی سرد ہواؤں کو خصوصی تاکید اور ثانیہ بھٹی کی عشق آتش اور فریدہ فری صاحبہ کی تمہارے خواب۔ غزلوں میں سب نے ہی خوب لکھا لیکن سب سے زیادہ ہمیں پسند آئی عامر زمان عامر کی۔ آپ کے حکم کے مطابق اختصار سے کام لیا ہے، کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کیجیے گا۔ سب کو سلام اور دعائیں، بشرطِ زندگی پھر ملاقات ہوگی۔

☆ پیارے عادل! اختصار سے کام لے کر آپ نے ہمارا دل جیت لیا۔ آپ کا بھرپور تبصرہ بہت پسند آیا۔

✉ یہ ہیں عمران فائق صاحب، کامل پور، موسیٰ ضلع اٹک سے، لکھتے ہیں۔ جناب ایڈیٹر صاحب! اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں آپ کے ڈائجسٹ "سچی کہانیاں" کے قارئین کی فہرست میں شامل ہوں لیکن کبھی قلم اُٹھانے کی جستجو نہیں کی۔ آپ کے اس معیاری ڈائجسٹ میں شاعری کا مخصوص گوشہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا اور مجھے "سچی کہانیاں" میں شامل ہونے کا بہانہ مل گیا، لہٰذا اپنی ایک غزل اور خط ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے شائع فرما کر ممنون فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ڈائجسٹ کو مزید ترقی عطا فرمائے اور آپ کو جزائے کاملہ عطا فرمائے۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆ پیارے عمران دیکھیے آپ کا خط بھی شائع ہوگیا اور غزل بھی۔ اب آپ وعدہ کریں کہ احوال سے غیر حاضر نہیں ہوں گے۔

✉ فیصل ندیم بھٹی، چک نمبر 58 شمالی، ضلع سرگودھا سے عرض کرتے ہیں۔ السلام علیکم محترمہ منزہ سہام صاحبہ، محترم جناب کاشی بھیا اور تمام اسٹاف ماہنامہ سچی کہانیاں۔ اس ماہ کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ سب سے پہلے منزہ سہام صاحبہ کا احترام پڑھا، جس میں عورت کے احترام کی نصیحت سے بھرپور الفاظ قابلِ تعریف ہیں اور عورت کے بغیر تو کائنات بھی نامکمل ہے، کیوں کہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔ کاشی بھیا کی کچھ اپنی باتیں میں مختصر کہانی کے آخر میں جو عہد ہے، آج ہر شخص کو اس عہد کی ضرورت ہے۔ واقعی کاشی بھیا محبت فاتح عالم ہے، کیوں کہ کائنات کی ابتدا ہی محبت ہے۔ اب کچھ تبصرہ کہانیوں پر نصرت سرفراز کی، 14 مارچ کہانی کے آخر میں بہت غیر یقینی اختتام ہے۔ بشریٰ سعید کی کہانی محافظ، قابل تعریف کہانی ہے۔ ندا ہاشمی کی کہانی الہام میں کشف کے وارد ہونے کا ذکر ہے۔ یہ حقیقت ہے اللہ تعالیٰ صرف خاص بندوں کو نوازتا ہے۔ زندہ لاش، سکھ سنتری کہانی بہت پسندیدہ رہی۔ آتش جنوں، سلیم فاروقی کا سلسلہ بہت دلچسپی کے مرحلے میں ہے۔ کاشی بھائی کی کہانی، خوشبو کہاں گئی، اس شمارے کی بہترین کہانی ہے۔ گلابو شکیلہ انجم کی کہانی جن اور انسان کی محبت کی داستان کمال ہے، باقی زیرِ مطالعہ ہے، کیوں کہ شمارہ دیر سے ملا۔ محمد شہزاد کنول بھائی شارجہ میں رہ کر پاکستان سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ تمام قارئین اور اسٹاف کو سلام اور ڈھیروں دعائیں۔

☆ بھائی فیصل سلامت رہیے۔ تبصرہ اچھا کیا آپ نے۔ بہت جلد آپ کی کہانی بھی سچی کہانیاں کی زینت بننے والی ہے۔

✉ عظمیٰ شکور سرگودھا سے خوف کے مارے تھر تھر کانپتی احوال میں پہنچی ہیں، لکھتی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب آداب، ماریں گے کیا؟ خوف سے دانت بج رہے ہیں۔ اُف معصوم کانپتے ہاتھوں میں ڈریکولا، مطلب سچی کہانیاں۔ ایک ساتھ ساری پراسرار کہانیاں شائع کر ڈالیں۔ مجھ جیسے کمزور دِل لوگوں کا بھی خیال نہ کیا۔ سانس بحال ہوں تو کچھ عرض کروں۔ جنات اور روحیں ذہن سے اِدھر اُدھر ہوں تو کچھ بولوں، ہائے شکر کریں میں بچ گئی، ورنہ گئی تھی۔ وہ تو بھلا ہو ہمارے شاعر حضرات کا کہ اپنی شاعری سے دِل کو بہلا دیا۔ بہت شکریہ، ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی صاحب اتنی پیاری غزل پڑھنے کو ملی آپ کی وجہ سے اور عامر زمان صاحب آپ کی شاعری بھی خوب رہی۔ منزہ سہام صاحبہ آپ کی باتوں سے خوشبو آتی محسوس ہوئی۔ لفظ جیسے باتیں کرتے تھے۔ آپ کے حسین جذبوں کی قدر کرتی ہوں میں، بلکہ ہر ماں، بہن بیٹی کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ کاشی صاحب، آپ کی لکھی، ”اپنی باتیں“ ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھیں ”بے شک لوگ تلوار سے نہیں زبان سے فتح ہوتے ہیں۔“ کیا خوب کہا اس ملک کو اِس وقت اِس بات پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ کہانی کی صورت میں آپ نے جس طرح بات کو سمجھایا کیا بات ہے۔ ہر لفظ بولتا محسوس ہوا آپ کے احساسات جذبات کا عکس تھا آپ کی تحریر میں، اب آتے ہیں قارئین کے خطوط کی طرف، ایسا لگتا ہے کوئی محفل جمی ہے اور سب مل بیٹھے ہیں، سچی کہانیوں کو مزید خوب صورت بنانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ ممتاز احمد صاحب بہت شکریہ کہ آپ نے خوش آمدید کہا۔ قارئین خوب صورت ہیں آپ نے تصویریں جو شائع کر ڈالیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، ہر کہانی اپنے الگ رنگ ڈھنگ میں تھی، مجھے کہانی ”محافظ“ بہت پسند آئی بشریٰ سعید احمد اچھا لکھتی ہیں آپ، چند لمحوں کے لیے مجھے یوں لگا جیسے وہ محافظ میرے ساتھ ہے اور زندگی آسان سے آسان ہو رہی ہے۔ واقعی اِس دُکھوں کے

دور میں ایسا ہی ”محافظ“ چاہیے۔ ”خلیل احمد انجم صاحب، کیوں جان کے درپے ہیں۔ مطلب سب کو مار دیا۔ ”ہائے ری محبت“ قاتل بنا ڈالا۔ ”ندا ہاشمی“ اسٹوری کو طویل نہ لکھ سکیں تشنگی رہی۔ ”نصرت سرفراز“ کی لکھی تحریر پڑھی۔ اسٹارٹ اچھا تھا مطلب یہ دوسرا جنم نہ سمجھ آیا کہ ہوا۔ تو کیا ہوا میں تو نین تارا کے دُکھ پہ آٹھ آٹھ آنسو رونا چاہتی تھی مگر اختتام پڑھ کر حیرت زدہ رہ گئی کہ یوں بھی ہوتا ہے؟ شاہد سلیم کا ”خونی بدروح“ اُف زبردست انجم فاروق کی کہانی ”قصہ ایک روح کا“ حیرت انگیز طور پر بہت ہی خوب صورت لکھا گیا تھا۔ خوشبو کہاں گئی، جی میں بھی یہی سوچ رہی ہوں خوشبو کہاں گئی۔ مطلب یہ جنات بھی محبت بدل لیتے ہیں۔ کہانی کے اسٹارٹ میں جو جن اور زینوں کے مکالمے تھے پوری کہانی میں چاند جیسے تھے بہت بہت حسین، وہ جذبات اور احساسات جو آپ نے تحریر کیے ”کیا بات ہے“ مگر سچ جانیے مجھے دکھ ہوا حسن آرا کہ آخر جن نے اس کو کیوں چاہنا شروع کر دیا۔ آپ کی تحریر تھی زبردست کیوں نہ ہوتی۔ تھینکس اسٹوری کے لیے۔ او کے جی، سچی کہانیاں کو میرا بہت سارا پیار دعائیں۔

☆ آپ نے پراسرار نمبر پر تبصرہ شاندار کیا، گویا حق ادا ہوگیا۔ ویلڈن!

✉ عارف شین روہیلہ، حیدرآباد سے لکھتے ہیں۔ محترم جناب ایڈیٹر صاحب 2013 کے ساتویں مہینے میں، میں نے ایک تحریر ارسالِ خدمت کی تھی جس کی بابت آپ کی جانب سے شائع کرنے کے لیے فون آیا تھا، بہت خوشی ہوئی تھی۔ یقیناً کوئی بھی ادیب اپنی ارسال کردہ تحریر کو بھولتا نہیں ہے بس انتظار کرتا رہتا ہے کہ اب آئے کہ کب آئے۔ ایک نئے موضوع پر تازہ تحریر ارسالِ خدمت ہے، امید ہے کہ پسند آنے پر شائع کر کے ممنون فرمائیں گے۔

☆ پیارے عارف خوش رہو۔ جلد ہی آپ کی تحریر آپ کے اپنے سچی کہانیاں میں جگمگا رہی ہوگی۔

✉ مبشر حسن۔ ہیڈ بکائنی سے رقم طراز ہیں۔ سچی کہانیاں کا میں خاموش قاری ہوں، محفل یاراں میں پہلی بار حاضری دے رہا ہوں۔ اُمید کرتا ہوں کہ خوش آمدید کہا جائے گا۔ سرورق بہت اچھا تھا۔ ٹائٹل اس بار قدرے ہٹ کر تھا۔ سب سے پہلے منزہ سہام کو پڑھا، بہت ہی پیاری بات احترام کے بارے میں تھی۔ ہمیں عورت کی عزت کرنی چاہیے۔ محترم کاشی چوہان صاحب کی کچھ اپنی باتیں بھی خوب تھیں۔ ماشاء اللہ۔ قارئین کے درمیان رابطے کا جو سلسلہ سچی کہانیاں والوں نے شروع کیا بہت ہی اچھا ہے، ایسا سلسلہ مجھے کسی رسالے میں نہیں ملا۔ بہت سے ایسے دوست تھے جن کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ فریدہ فری یوسف زئی کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ان کی شاعری میں اکثر ہر رسالے میں اور اخبار میں دیکھتا ہوں۔ بشریٰ سعید کا تبصرہ بھی خوب تھا۔ عادل حسین اور عظیم الدین، شہریار احمد اور محمد شہزاد کنول نے بھی خوب تبصرہ کیا ہوا تھا۔ سدرہ انور علی، شفقت حسین، ذیشان صاحب اور بھائی اسلم بلوچستان سے اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ مجید احمد جائی میری جان کیسے ہو؟ آپ کا تبصرہ جان دار تھا۔ ہر دل عزیز رائٹر جناب صفدر علی حیدری اوچ شریف سے ”آسیب“ لے کر آئے تھے، وہ بہت اچھا لکھنے والے ہیں۔ اللہ پاک اِن کو مزید طاقت عطا کرے (آمین) کہانیاں سب اچھی تھیں، مگر نصرت سرفراز اسلام آباد سے 14 مارچ کے حوالے سے خوب لکھا تھا ویلڈن۔ محافظ بشریٰ سعید احمد کا بھی خوب تھا جو دل پر اثر کر گیا۔ خدا سلامت رکھے ان کو۔ خلیل احمد انجم، ندا ہاشمی، ارم ناز نے بھی خوب لکھا ہوا تھا۔ شکیلہ انجم طارق کا واقعہ بھی بہت اچھا تھا۔ عصمت پروین عظمیٰ، عمران مظہر، ملک صفدر عباس اعوان اور نفیسہ فضل کی کوشش بھی اچھی لگی۔ سچی کہانیاں ایک اچھا رسالہ ہے جو کہ ایک مکمل فیملی رسالہ ہے اور ہر عمر کے لیے سب سے اچھی بات یہ کہ اس میں لکھنے والے لکھاری تمام بہت پیارے اور خوب ہیں۔ مجھے امید ہے سچی کہانیاں پر میرا مکمل تبصرہ شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆ پیارے مبشر۔ آپ کا تبصرہ ہمیں اچھا لگا اور خاص طور پر آپ کا انداز دل موہ لینے والا ہے۔ اگلے ماہ بھرپور انٹری ہونی چاہیے آپ کی۔

✉ محفل میں یہ آمد ہے ہمارے بہت پیارے لکھاری دوست صفدر علی حیدری کی اوچ شریف بہاولپور سے لکھتے ہیں۔ بھائی کاشی چوہان خیریت موجود خیریت مطلوب! اسہام فیملی، آپ، ادارے کے کارکنان، قلم کار ساتھیوں اور پیارے قارئین کی سلامتی کی امید اور دعا کے ساتھ عرض خدمت ہے کہ بندہ کافی عرصے بعد اپنے گھر لوٹا ہے۔ آمد میں یہ غیر حاضری تاخیر بے سبب ہرگز نہیں۔ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے "بھولا" کہتے ہیں۔ بھولوں کا اس ہوشیار باش دنیا میں بھلا کیا کام، لیکن گھر ہی وہ واحد جگہ ہے جہاں ہر ایک کے لیے جگہ کی گنجائش نکل ہی آتی ہے۔ خیر یہی کیا کم ہے کہ اس شمارے میں ایک تحریر آسیب کو اشاعت کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ جس نے مجھے ایک بار کچھ لکھنے اور گھر لوٹ آنے پر مجبور کیا اور میں کچے دھاگے بندھا چلا آیا کہ جذبہ عشق ابھی سلامت تھا اور بڑے تو کہہ گئے ہیں کہ اس میں جیت ہو یا ہار، میدان ہر حال میں عاشق کے ہاتھ رہتا ہے۔ ورنہ تو میرے اندر کا قلم کار (اگر کوئی ہے تو) گھٹ کر کچھ اور سمٹ سا گیا تھا۔ برادرم سلیم اختر صاحب کی شفقت ہے کہ وہ مسلسل لکھنے پر مائل کرتے رہتے ہیں۔ جب جب مایوس ہوا ان کی شفقت ڈھارس بن کر میرے کام آئی۔ کاشی بھائی، آپ کی آمد پر ان کا خیال تھا کہ اب رسالے میں جان پڑ جائے گی اور پھر چند ہی شماروں کے بعد میں ان کی اس بات کا دل سے قائل ہو گیا ہوں۔ آپ کی آمد واقعی رسالے کے لیے بادِ صبا ثابت ہوئی۔ بہار کی آمد آمد ہے اور یہی بہار مجھے اپنے محبوب رسالے میں بھی نظر آنے لگی ہے۔ "سچی کہانیاں" سے میری وابستگی، سچی بات ہے، میری نظر میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ کسی ڈائجسٹ میں میرا پہلا خط اور پہلی کہانی بھی اسی رسالے میں شائع ہوئی تھی، سو یہ رسالہ میری پہلی محبت ہے اور محبت دکھ بھی تو ضرور دیتی ہے۔ منزہ باجی کا "احترام" اور آپ کا کالم "کچھ اپنی باتیں" مارچ کے شمارے کی جان ہیں۔ ماہ مارچ کا شمارہ آج 5 مارچ کو ہاتھ آیا۔ دیر سے ہی سہی مل تو گیا۔ آپ سے ایک شکوہ ضرور کرنا ہے کہ جب ہمیں رسالہ ہی 5 کو ملے گا تو ہم اس پر تبصرہ کیسے کریں گے۔ کم از کم آپ ای میل کرنے والوں کو 10 تاریخ تک تو مہلت تو دیں کہ ہم سارا رسالہ پڑھ کر اس پر سیر حاصل تبصرہ کر سکیں۔ اپنا خط اپریل کے شمارے میں دیکھنے کے لیے میں فوراً تبصرہ لکھنے بیٹھ گیا۔ امید ہے اگلے ماہ سے ہمیں 10 تاریخ تک مہلت ضرور ملے گی تاکہ دور دراز کے قارئین بھی احوال کا حصہ بن سکیں۔ پہلے ہر ماہ کی 25 کو رسالہ مل جایا کرتا تھا، لیکن اب ایسا نہیں ہوتا۔ ہم نے سالانہ ممبر شپ اسی لیے لی تھی کہ بروقت رسالہ مل جایا کرے گا لیکن...... اے بسا آرزو کہ خاک شدہ...... ماہ مئی کے روحانی نمبر کا اعلان دل کو بڑا بھلا لگا۔ امید ہے کہ یہ بھی ایک یادگار نمبر ہو گا۔ کاشی بھائی آپ کا ایک خاص حوالے سے شکریہ بھی ادا کرنا ضرور چاہوں گا کہ میری تحریر اس قابل ہے کہ اسے "سچی کہانیاں" میں جگہ مل سکتی ہے۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ کی وجہ سے میں پھر سے اپنوں میں ہوں اور یہ اس رسالے سے محبت کا واضح ثبوت ہے کہ طبیعت کچھ لکھنے کی جانب مائل ہوئی۔ آخر میں سب سے استدعا ہے کہ میرے والد گرامی (کاظم علی حیدری) کی مغفرت کے لیے ایک بار سورۂ فاتحہ ضرور ہدیہ فرمائیں... اُمید ہے اگلا شمارہ بروقت ملے گا اور اس پر تفصیلی تبصرے کا موقع بھی ہاتھ آئے گا۔ اللہ حافظ

☆ پیارے صفدر! اللہ تعالیٰ کاظم انکل کو جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔ اب آئے ہو تو آتے رہنا۔ ہم دوری برداشت نہیں کریں گے۔ خدا آپ کو حوصلہ اور ہمت سے سرفراز کرے (آمین)

سانحۂ ارتحال

ہمارے دوست لکھاری اور دیرینہ رفیق "خواجہ پرویز رشید" 12 مارچ کو زمین کا رزق ہوئے۔ دُکھ کی اس گھڑی میں ادارہ خواجہ صاحب کے اہلِ وعیال کے ساتھ ہے اور ان کے بلند درجات کے لیے دعا گو ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ ان کے حق میں دعائے خیر کریں اور ایک مرتبہ الحمد شریف ضرور پڑھ لیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

✉ ہماری مستقل تبصرہ نگار، بہن تحسین جونیجو، بورڑی شریف خیرپور ناتھن شاہ سے لکھتی ہیں۔ اچھے بھائی کاشی نیک تمناؤں کے ساتھ، السلام علیکم۔ اس بار تو ٹائٹل نے نیند اڑانے کی بھرپور کوشش کی۔ جہاں نظر دوڑائی، بھوت ہی بھوت دکھائی دیے۔ ہم بھی نظریں چراتے رہے، کہہ بھی ڈالا معاف کردو ہمیں، اپنے کاشی بھائی آپ کی آمد ہے، پارٹی کا انعقاد کر رہے ہیں، تب جا کے جان چھوڑی...... "اداریہ" منزہ آپی کا "احترام" بے شک بلکہ ہم سب کا احترام لازم بنتا ہے۔ (کچھ باتیں اپنی) جو کہ کچھ زیادہ اپنی لگی حقیقت میں بھی "محبت ہے فاتح عالم"۔ اب احوال سناتی ہوں۔ محمد عزیز مئے بڑی نوازش بھائی۔ جی ہاں سارہ سند ھو نظامانی پیا دیس سدھار گئی ہیں۔ کچھ سال پہلے سے غائب ہیں۔ مور شاہد حسین حب چوکی سے اور مور شاہد حسین قمر شہداد کوٹ، کیا یہ ایک ہی شخصیت ہیں؟ تاکہ معلومات میں اضافہ رہے۔ ورنہ زندگی تو ہے ہی سفر...... خورشید احمد کنول خوش آمدید، بہت شکریہ پسندیدگی کا۔ ارے واہ خوب صورت تصویر کے ساتھ پیاری سدرہ انور سوچ رہی ہوں میں بھی تصویر دوں اپنی...... ہم تو الحمدللہ اچھے ہیں، اپنی سناؤ کیا مصروفیات ہیں؟ عبدالرؤف عدم اچھے بھیا حاضری لگوا کے پھر سے غائب؟ اور سلیم اختر انکل بھی نظر نہیں آ رہے، خیریت؟ مجید احمد جائی صاحب، بے حد مشکور ہوں، خوش رہیے۔ غنی شاہ نواز اور بیشتر (لسٹ جو طویل ہے) بزم احوال میں خوش آمدید۔ جی جی بھائی غصہ کیوں آ رہا ہے۔ بس کہانیوں پر بھی مختصر تبصرہ۔ نصرت سرفراز کی 14 مارچ، سکھ سنتری۔ شیخ معظم الٰہی، بشریٰ سعید احمد کی محافظ۔ ندا ہاشمی کی الہام، خوشبو کہاں گئی، کاشی بھائی کی۔ شرارتی جنات، عمران مظہر۔ کس نے کہا تھا ان سے پنگا لینے کو ہاہاہا۔ کالا انڈا صدف آصف جی، اشفاق عباسی کی وہ خوشبو، وہ پائل۔ سلیم اختر انکل کی اپسرا یا ناگن۔ الماس فاطمہ ارمان کی ناگ اور ناگن۔ یہ ایسی تحریریں ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے۔ اسرار سے پُر انوکھی، حیرت زدہ عمدہ تحریریں رقم کی گئیں۔ sms کا اضافی سلسلہ پسند آیا۔ تحن آباد میں دعا۔ ثمینہ ناز۔ غزل نوید سہیل لاکھو اور میری پریم کہانی، شہزاد کنول۔ ان تمام کی تخلیقات خوب صورت رہیں۔ روحانی کہانیاں نمبر کا انتظار ہے۔ باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ اتنی محنت سے شمارہ لایا گیا ہے تو یقین ہے سب بہترین ہوں گی۔ اجازت (اللہ حافظ)

☆ پیاری تحسین خوش رہو، پورا خط شامل کر دیا ہے، اب گلہ نہ کرنا۔

✉ ہماری بہت پیاری لکھاری اور شاعرہ زرینہ جونیجو ایک عرصے بعد خیرپور ناتھن شاہ، بورڑی شریف سے احوال میں شریک ہیں، لکھتی ہیں۔ کاشی بھیا ایڈیٹر ہونے پر ڈھیروں مبارکاں۔ پراسرار کہانیوں میں زندہ لاش، ارم ناز۔ ہم زاد خلیل احمد انجم۔ الہام، ندا ہاشمی۔ خوشبو کہاں گئی، کاشی چوہان۔ گلابو، شکیلہ انجم طارق۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

نشانی، بشیر احمد بھٹی۔ انوشکا، حافظ مون شاہ۔ اپسرا یا ناگن، محمد سلیم اختر۔ روشنی والے، احمد سجاد بابر کی بہترین کہانیاں تھیں۔ محمد عزیز مئے صاحب یاد کرنے کا ازحد شکریہ خوش رہیے۔ سدرہ انور جی، میری طبیعت اکثر خراب رہتی ہے جس کی وجہ سے لکھ نہیں پاتی، آپ کیسی ہو؟۔ رانا محمد شاہد، فریدہ فری، مور شاہد حسین، بشریٰ سعید احمد، ممتاز احمد، نزہت ناز، نصرت سرفراز، آپی رضوانہ کوثر کو سلام ودعائیں۔

☆ آڈی زرینہ، خدا آپ کو صحت یاب کرے۔ آپ کی تجاویز پر غور کریں گے۔ اب احوال میں حاضری باقاعدہ کریں۔ یہ ایک بھائی کی عرض ہے۔

✉ مومنہ بتول کراچی سے لکھتی ہیں۔ محترم کاشی صاحب، السلام علیکم۔ اُمید خدا آپ اور آپ کے اہل خانہ اور آپ کی سچی کہانیوں کے کولیگ خیر وعافیت سے ہوں گے۔ عرض حال یہ ہے کہ فروری مارچ کا شمارہ آج ہی لیا اور پڑھا۔ آپ کی محفل میں شریک قلمکار بھائی بہنوں سے ملاقات ہوئی۔ کہانیاں ابھی نہیں پڑھیں اس لیے تبصرے سے گریز کروں گی۔ باقی تمام سلسلے اچھے جا رہے ہیں۔ ایک چھوٹی سی گزارش ہے کہ وہ یہ کہ آپ سوچ بچار کر کے کچھ نئے سلسلے بھی شامل کریں۔ اُمید کرتی ہوں آپ بُرا منائے بغیر میری بات سمجھیں گے۔ میں آپ سے فون پر بھی بات کرنا چاہتی ہوں۔ براہ کرم اٹینڈ کیجیے گا۔

☆ مومنہ جی...... جلد ہی آپ کی کہانی سچی کہانیاں کی زینت بنے گی۔ احوال میں شریک رہا کریں۔ یہ ہماری تاکید ہے۔

✉ عطیہ زاہرہ، لاہور سے رقم طراز ہیں۔ محترم کاشی چوہان صاحب، پراسرار نمبر کے بارے میں اپنی رائے تو میں آپ کو فون پر ہی دے چکی ہوں کہ ماشاء اللہ سرورق سے لے کر کہانیاں تک سب کچھ بہت زبردست ہے۔ رسالے کی نئی لک بھی بہت اچھی ہے۔ اب اجازت دیں، اللہ حافظ۔

☆ پیاری عطیہ۔ بہت جلد آپ ان صفحات پر جگمگائیں گی۔ سلامت رہیے۔ سچی کہانیاں کا تبصرہ ادھار ہے آپ پر۔

✉ ایم اشفاق بٹ، لالہ موسیٰ سے رقم طراز ہیں۔ مارچ کا سچی کہانیاں بڑی ہی خوب صورت حسینہ اور بڑی ہی خوفناک بھوتنی کے ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ اتنی خوب صورت حسینہ اور اس کے ساتھ اتنی بڑے بڑے دانتوں والی بھوتنی دیکھ کر میں تو خود بے ہوش ہونے لگا تھا، اگر وہ حسینہ اس بھوتنی کو دیکھ لے تو وہ تو یقیناً ایک ہفتے تک بے ہوش رہے۔ سب سے پہلے منزہ سہام کا پیارا سا احترام پڑھا جو کہ ہم سب کے نام پیغام تھا۔ عورت کے بغیر یہ کائنات ناممکن سی بات ہے کہ مکمل ہو۔ کاشی بھائی ہم بھی آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اپنی زبان سے ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنالیں گے۔ سب کے تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ تبصروں کے بعد تبت کریم اور میڈورا پوڈر لگا کر ڈان بریڈ سے ناشتا کیا۔ کہانیوں میں نصرت سرفراز، خلیل احمد انجم، بشریٰ سعید احمد، ندا ہاشمی، ارم ناز، صفدر علی حیدری، سلیم فاروق، کاشی چوہان، شکیلہ انجم طارق، بشیر احمد بھٹی، اشفاق عباسی، انجم فاروق، محمد سلیم اختر، الماس فاطمہ ان سب نے اپنے اپنے قلم کا خوب جادو چلایا۔ سخن آباد کی اس دفعہ ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی، دستگیر شہزاد، شفق عنایت، ثانیہ بھٹی، ثمینہ ناز، تمثیلہ لطیف، عادل حسین، فریدہ فری یوسف زئی، شہزاد کنول انہوں نے خوب محفل جمائی اپنی اپنی شاعری سے۔ سچی کہانیاں اب دن بہ دن نکھرتا جا رہا ہے۔ دسمبر سے لے کر مارچ تک ہر شمارہ تبدیلی اور اپنے اندر ایک نکھار لے کر آتا ہے اور مزید نکھار آتا جائے گا۔ آپ سب کی محنت اور لگن رنگ لا رہی ہے۔

خدا آپ کو ہمیشہ بے پناہ محبتیں، چاہتیں، نعمتیں اور اللہ کی رحمتیں عطا فرمائے۔ (آمین) باقی باتیں اگلے ماہ تک کے لیے چھوڑ دیتے ہیں، اجازت دیں۔

☆ پیارے اشفاق بٹ! احوال میں آپ کی آمد نے چار چاند لگا دیے۔ اب غیر حاضری بالکل نہیں چلے گی۔

✉ ارم خان، ڈی جی خان سے احوال میں شریک ہیں، لکھتی ہیں۔ السلام علیکم۔ بھائی کاشی چوہان اور سلام تمام قارئین اور اسٹاف کو۔ احوال میں یہ میرا دوسرا خط ہے۔ پہلے خط کا جواب انکل سلیم فاروقی نے دیا تھا لیکن اب انکل کی سیٹ پر آپ بیٹھے ہیں، دیکھتے ہیں اب آپ ہمارے اس ننھے منے خط کو احوال میں تھوڑی سی جگہ دیتے ہیں یا نہیں اور ہاں اس ننھے سے خط کے ساتھ ایک منی سی تحریر اور ایک غزل بھی بھیج رہی ہوں اور ان سب کے ساتھ ایک امید۔ کاشی بھائی مجھے لکھنا تو نہیں آتا میری اس تحریر کو ایک کوشش ہی سمجھ لیں۔ میں سمجھتی ہوں انسان کوشش سے ہی کامیابی حاصل کرتا ہے، سو میں نے بھی ایک کوشش کی۔ قلم کو ہاتھ میں پکڑ لینا اور اسے چلانے میں فرق ہوتا ہے۔ مشکل تو تب ہوتی ہے جب کوئی کسی حقیقت کو خوب صورت لفظوں کے ذریعے کہانی کا روپ دیتا ہے۔ میں نے بھی یہ سب اب جانا ہے، جب لکھنے پر توجہ دی۔ اب سچی کہانیاں رسالے کے بارے میں کچھ کہوں گی۔ سچی کہانیاں واقعی بہت اچھا ہے۔ دعا ہے یہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔ اب خدا حافظ۔

☆ بہت پیاری ارم...... بہن ہم یہاں آپ ہی کے لیے موجود ہیں۔ جو لکھو، جیسا لکھو، ہمیں ارسال کردو۔ آپ کی حوصلہ افزائی ضرور کی جائے گی۔

✉ شارجہ، دبئی سے محمد شہزاد کنول لکھتے ہیں۔ پیارے کاشی بھائی۔ ماہ مارچ کا شمارہ پراسرار نمبر موصول ہوا۔ بھیا اس شمارے نے دل جیت لیے۔ جہانِ حیرت واسرار میں لپٹی پراسرار کہانیوں میں۔ نصرت سرفراز، بشریٰ سعید احمد، خلیل احمد انجم، فدا ہاشمی، ارم ناز، شمیم معظم الٰہی اور صفدر علی حیدری نے کمال کیا تو پوشیدہ دنیا سے جناتی کہانیوں میں کاشی چوہان، شکیلہ انجم طارق، بشیر احمد بھٹی، عمران مظہر پورے رسالے پر چھا گئے۔ پراسرار نمبر کی خوف ناک کہانیوں میں ملک صفدر عباس اعوان، شاہد سلیم، انجم فاروق، نفیسہ فضل اور عادل حسین کی کہانیاں پسند آئیں۔ زہر بھری دنیا سے محمد سلیم اختر اور جاوید راہی نے زبردست تحریریں دے کر لوہا منوالیا۔ پراسرار نمبر کی تینوں خاص کہانیاں احمد سجاد بابر کی روشنی والے، حمیرا خان کی ایک کہانی اور صدف آصف کی کالا انڈا شاہ کار ثابت ہوئیں۔ احوال کی محفل میں اپنوں کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ تینوں ناول زبردست جا رہے ہیں۔ سخن آباد میں، دستگیر شہزاد، شفق عنایت، تمثیلہ لطیف، عادل حسین، ایم اشفاق بٹ اور عامر زمان عامر کے کلام پسند آئے۔ منزہ باجی کا اداریہ احترام قابل غور ہے، جبکہ آپ کی کچھ اپنی باتیں پرچے کی جان ہیں۔ لیجیے تبصرہ ہوا مکمل اور اب مجھے ڈرنے دیں، سوری پڑھنے دیں۔ میں اب پرچہ دوبارہ سے پڑھوں گا، مگر خاص کہانیوں سے یعنی آخر سے شروع تک، ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے احوالیوں کو۔ اس طرح پڑھ کر دیکھیں زیادہ مزہ آئے گا۔

☆ پیارے شہزاد! سلامت رہو۔ یار تم نے تو اتنا خوب صورت اور جامع تبصرہ کر دیا ہے کہ میرے پاس الفاظ ہی ختم ہو گئے ہیں۔ خوش رہو۔

✉ عماد حسین انصاری کراچی سے عرض کرتے ہیں بہت پیارے کاشی بھائی! السلام علیکم! مارچ کے پراسرار نمبر نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ کاشی بھائی کیا شاندار شمارہ شائع ہوا ہے۔ آپ کی کہانی خوشبو کہاں گئی، احمد سجاد بابر کی روشنی والے، صدف آصف کی کالا انڈا، بشیر احمد بھٹی کی نشانی، عمران مظہر کی شرارتی جنات، نصرت سرفراز کی 14 مارچ، شیخ معظم الٰہی کی سکھ سنتری، ملک صفدر عباس اعوان کی خونی مجسمہ، شاہد سلیم کی خونی بدروح، جاوید راہی کی زہریلا انتقام، حمیرا خان کی ایک کہانی اور خلیل

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

احمد انجم کی کہانی ہم زاد اس شمارے کی ٹاپ کلاس کہانیاں ہیں۔ پرچے کا ٹائٹل شاندار اور لے آؤٹ جاندار رہا۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر سے حاضر ہوں گا، خدا حافظ

☆ ارے واہ عماد۔ کیا خوب صورت انٹری دی تم نے احوال میں۔ تمہارا مختصر مگر جامع انداز ہمیں بہت پسند آیا۔

✉ حجیل میتلو کراچی سے انتہائی مختصر حاضری کے ساتھ حاضر ہیں، لکھتی ہیں۔ محترم کاشی جی، ہمیشہ خوش رہیں آمین۔ سچی کہانیاں کے سارے اسٹاف کو سلام۔ سچی کہانیاں آج ہی ملا ہے صرف احوال ہی معلوم کیا ہے۔ سب احوالیوں کو میرا سلام۔ کاشی جی روحانی نمبر کے لیے کہانی بھیج رہی ہوں، اُمید ہے ضرور جگہ ملے گی سچی کہانیاں میں، پر اسرار نمبر پڑھوں گی تب ہی خط لکھوں گی۔ روحانی نمبر کی کہانی مل جائے تو رسید ضرور دیجیے گا، شکریہ بھیا۔ میں تصویر بھیج رہی ہوں سب کو سلام۔ نیک خواہشات کے ساتھ۔

☆ حجیل صاحبہ! لیجیے آپ کو شامل احوال کیا، مگر اگلے ماہ آپ لازمی بھرپور تبصرہ ہمارے حوالے کریں گی۔

✉ لاہور سے ہماری بہت پیاری شاعرہ اور مستقل قاری فریدہ فری یوسف زئی تحریر کرتی ہیں۔ کاشی بھائی السلام علیکم۔ سچی کہانیاں پیارے سے ٹائٹل کے ساتھ ملا اپنا خط اور غزل دیکھ کر خوشی ہوئی پر اثر کہانیاں اور جناتی کہانیاں میں شوق سے نہیں پڑھتی بس چند ایک پڑھ لیتی ہوں، مگر میگزین ضرور لیتی ہوں، یہ میرا فیورٹ میگزین ہے۔ سچی کہانیاں بے حد پسند ہیں، افسانے بس زیادہ اچھے والے اچھے لگتے ہیں۔ ان رائٹرز کے جو کہ زیادہ مشہور ہیں، ویسے نئے لکھنے والے بھی اچھا لکھ رہے ہیں۔ میں آج کل بے حد بیمار ہوں، تمام رائٹرز اور قارئین میرے لیے دعا کریں۔ شکریہ۔ شاعری سب کی اچھی لگی۔ رضوانہ کوثر، رخسانہ سہام اور منزہ سہام کو بے حد سلام اور دعا۔ اللہ حافظ۔

☆ فری جی! ہم سے بدگمان نہ ہوا کریں۔ آپ ہمیں اور ہمارے پرچے کو پسند کرتی ہیں تو ہمیں بھی تو آپ بہت پسند ہیں نا۔

قارئین سچی کہانیاں کا SMS سیل کارنر

ہمارے نئے سلسلے سچی کہانیاں SMS سیل کارنر میں ہمارے قارئین اپنی رائے کا اظہار بذریعہ SMS کر سکتے ہیں۔ پیارے قارئین آپ کو اس ماہ کا سچی کہانیاں کیسا لگا؟ اپنے نام اور شہر کے نام کے ساتھ فوراً SMS پر اپنی رائے کا اظہار کر دیجیے۔

سب سے زیادہ SMS بھیجنے والا قاری پائے گا ایک خوب صورت گفٹ۔

(نوٹ) آپ اس ماہ کے سچی کہانیاں کے بارے میں اپنے پیغامات کا اظہار ایک SMS کے ذریعے دیے گئے نمبر پر کر سکتے ہیں۔ **0333-2269932**

✉ رانا محمد شاہد بُورے والا سے عرض کرتے ہیں۔ مارچ کے شمارے کے سر ورق کا نچلا حصہ بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ پُر اسراریت کسی معقول تصویر سے بھی بنائی جا سکتی تھی۔ تصویر دیکھ کر دل خراب ہو رہا ہے۔ سچی بات پوچھیں تو میں نے اس تصویر پہ اسٹیکر چپکا دیا ہے۔ منزہ صاحبہ کو کالموں کی کتاب کی اشاعت پر مبارکباد اور ان کا اداریہ غالباً 8 مارچ کو عورتوں کے عالمی دن کے حوالے سے تھا۔ علامہ اقبال نے صحیح کہا تھا۔ ''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔'' کچھ اپنی باتیں میں کاشی چوہان نے صحیح لکھا، کیوں کہ لوگوں کو فتح کرنے کے لیے دلوں کو فتح کرنا ضروری ہے اور دل تلوار سے نہیں زبان یعنی میٹھے بول سے فتح ہوتے ہیں۔ منشی عزیز مئے! سچی کہانیاں کے لیے آپ 300 کلومیٹر کا سفر طے کرنے کو بھی تیار ہیں تو رسالے سے آپ کی محبت یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ سدرہ انور علی کا شعر اچھا تھا۔ نصرت سرفراز ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، سرِ ورق کی زینت ضرور بنیں۔ SMS کے ذریعے آپ جو پیغامات کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں، میرے خیال میں اس سے خطوط کی افادیت و اہمیت پر اس کا منفی اثر پڑے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چند ماہ بعد اکثر قارئین خطوط کی بجائے صرف SMS کے ذریعے ہی اپنا تبصرہ کر رہے ہوں۔ اس لیے اس سلسلے پر ضرور نظر ثانی کیجیے گا، باقی چند کہانیوں کے علاوہ سبھی تحریریں اپنے اندر پُر اسراریت لیے ہوئے تھیں۔

☆ رانا محمد شاہد۔ بھئی آپ کو ٹائٹل پسند نہیں آیا تو اسٹیکر چپکا دیا۔ اس بار تبصرہ کہاں ہے۔ ہمیں پسند نہیں آیا، ہم کیا کریں؟ وعدہ کرو کہ اگلے ماہ بھرپور تبصرہ بھیجو گے۔

✉ مہر نسیم، لاہور سے ایک عرصے بعد احوال میں حاضر ہیں، لکھتی ہیں۔ میں کافی عرصے بعد دوبارہ سے سچی کہانیاں میں لکھنا شروع کر رہی ہوں۔ میں کچھ مصروفیات کی وجہ سے سچی کہانیاں سے رابطہ نہ رکھ سکی، مگر جس طرح سچی کہانیاں نے مجھے ابتدا میں لکھنے کے لیے اُکسایا اور میری کافی تحریریں گاہے بگاہے اس کی زینت بنتی رہیں اس لیے میں دوبارہ سے اب ان شاء اللہ باقاعدگی سے اس میں لکھتی رہوں گی۔ کہانیوں کی میرے پاس کمی نہیں، کیوں کہ میں اپنے اردگرد میں بہت سی کہانیاں ڈھونڈ لیتی ہوں۔ کچھ صحافی ہونے کے ناتے بھی اتنا مواد مل جاتا ہے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اب تک میرا قلم رُکا نہیں۔ اُمید ہے کہ آپ بھی میری حوصلہ افزائی کریں گے، کیوں کہ سچی کہانیاں ہمارے ایک فیملی ممبر کی طرح ہے۔ ادارے کے تمام ممبران کو سلام کہیے گا۔ والسلام

☆ مہر جی! خوش آمدید۔ اب آپ کو ہم کہیں جانے نہیں دیں گے۔ آپ بھی ہماری فیملی ہی کی ممبر ہیں۔ اگلے ماہ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

✉ کوئٹہ سے عبدالباری اچکزئی پہلی بار شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں، ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کراچی ہر ماہ زیرِ مطالعہ رہتا ہے جو کہ ایک معیاری اور لاجواب رسالہ ہے، کیوں کہ ان کی کہانیاں اور قسط وار کہانیاں کے علاوہ دیگر سلسلے بھی اہم اور بہترین ہیں اور اب جبکہ آپ نے صدارت کا شعبہ سنبھالا ہے۔ اس کی خوب صورتی میں مزید تبدیلیاں لا چکے ہیں، خصوصاً آپ کا اداریہ اور خطوط کے جوابات کا سلسلہ بھی نیا اور خوب صورت انداز ہے اور آپ خطوط کے جواب بہتر اور جُدا انداز میں دیتے ہیں۔ یقیناً آپ اور آپ کا تمام اسٹاف مبارک باد کا مستحق ہے۔ ''سچی کہانیاں'' میں ہر بار تمام صوبوں سے کہانیاں وغیرہ بھی ایک اچھا اور خوب صورت سلسلہ ہے، جبکہ بیرونِ ملک سے شامل نئی نئی کہانیاں بھی رسالے کی جان

www.paksociety.com

ہے۔ اس سلسلے کو آئندہ بھی اسی طرح جاری رکھیے۔

پیارے باری! آپ نے احوال میں شرکت کر کے ہمارا مان بڑھا دیا۔ خوش رہو اور اگلے ماہ آپ کا بھرپور تبصرہ احوال کی زینت بنے۔

✉ یہ بھڑک دار انٹری ہے احوال میں عمیر عادل زادہ کی کھاریاں سے، لکھتے ہیں۔ محترم کاشی چوہان صاحب! سلامت رہیے۔ آپ کے آنے سے سچی کہانیاں میں بہت واضح تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں، مگر بھیا یہ کیا کہ اکتیس سال سے مسلسل اشاعت پذیر ہونے والے پرچے کے پڑھنے والے کچھ احوالی عقل سے ماورا لگتے ہیں۔ بھلا بتائیے سدرہ جی نے تصویر کیسی بھیجی ہے؟ ثمینہ صاحبہ نے نقاب لگا کر تصویر بھیج دی۔ تحسین جو نجو صرف گلے شکوؤں میں خط مکا دیتی ہیں۔ جی آ صاحب ہر خط میں ایوارڈ ایوارڈ پر احتجاج کرتے ہیں۔ ملک صفدر عباس اعوان...... بھلا کڑاہی کھانے کا تذکرہ احوال میں کیوں؟ کاشف عبید صاحب۔ تبصرہ کہاں کرتے ہو، میرے تبصرے کو آپ پوزیٹو لیں۔ خط جامع اور مختصر لکھا کرو بھائی۔ باقی اُمید ہے آپ سب لوگ میری آمد کو بغیر بُرا منائے قبول کریں گے۔ کہانیاں سب کلاس کی ہیں۔ اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔

☆ پیارے عمیر بھائی! ذرا آرام سے، یہاں سب اپنے ہی لوگ ہیں...... اتنا غصہ...... ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی لو۔ اُمید ہے آپ کی تجاویز سب قارئین تک پہنچ گئی ہوں گی، مگر ایک بات کا خیال رکھنا، یہاں سب میرے اپنے اور سچی کہانیاں سے پیار کرنے والے موجود ہیں اور اپنے گھر میں اپنی مرضی سے رہا جاتا ہے۔ یقیناً آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔

✉ کراچی سے کنول عمران خان ہمیشہ کی طرح تاخیر سے آئی ہیں۔ لکھتی ہیں، کاشی بھائی کیسے ہیں؟ اس بار تو شمارہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ویسے میں نے آپ کو میسج تو کر دیا تھا اور واقعی میں دل سے خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے شمارے کو اور ترقی دے (آمین)۔ ”زندہ لاش“، ”سکھ سنتری“ بہت زبردست کہانیاں تھیں۔ ”آسیب“ ایسی کہانی تھی جس میں مجھے پہلی دفعہ پتا چلا کہ جن کو ”کراڈ“ بھی کہتے ہیں۔ واقعی ایسی کئی باتیں ہیں جو ہمیں معلوم نہیں ہوتیں۔ ”نشانی“، عمران بھائی کی ”شرارتی جنات“، ”انہونے واقعات“ میں یہ پڑھ کر بہت حیرت ہوئی کہ یہ عمارات آج بھی موجود ہیں۔ اس طرح کے واقعات پڑھنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ اس کے علاوہ ”وہ پائل“، ”انوشکا“، ”تیسری منزل“، ”سوکن“ سب ہی ٹاپ کی تحریریں تھیں۔ سب نئے اور پرانے لکھاریوں کو مبارک باد اور ”ناگن“ کے تو کیا ہی کہنے ہیں۔ اب اجازت دیں۔

☆ بہت پیاری کنول جی! آپ کا خط اس بار بھی سب سے آخر میں موصول ہوا۔ آپ تو کراچی میں ہیں۔ پرچہ یکم سے پہلے مارکیٹ میں ہوتا ہے۔ اُمید ہے اب آپ اگلا تبصرہ بہت جلد روانہ کریں گی۔

SMS کے ذریعے موصول ہونے والے تبصرے

☆ سعید انور سعید، لاہور سے لکھتے ہیں السلام علیکم، مارچ کا ماہنامہ ملا، تمام کہانیاں بہت پسند آئیں اور پچھلے مہینے آپ کو میل کی تھی جو شاید آپ تک نہیں پہنچی۔ فرسٹ اپریل فول مناتے ہیں لوگ۔ میری تمام لوگوں سے گزارش ہے کہ کسی کے ساتھ ایسا مذاق نہ کریں کہ کسی کی جان چلی جائے۔

☆ فضا شہزاد نامعلوم مقام سے لکھتی ہیں شاعری سب کی سب زبردست ہے۔ اس شمارے میں ایک

ماہنامہ سچی کہانیاں کی ایک عظیم الشان اور فخریہ پیش کش

ماہِ مئی کا شمارہ

روحانی کہانی نمبر

ہوگا

اس بار سچی کہانیاں آپ کے لیے لا رہا ہے ایک ایسا شمارہ جو اپنی مثال آپ ہوگا

☆ روحانیت سے جڑے وہ واقعات جو اکثر ہمارے ساتھ پیش آتے ہیں اور جو اس رشتۂ خاص کو سمجھ جاتے ہیں وہ اوجِ ثریا تک پہنچ جاتے ہیں اور جو سمجھ نہیں پاتے وہ اپنی ہی ذات کے صحرا میں بھٹک جاتے ہیں۔

☆ دلوں کو تسخیر کر لینے والی کہانیاں۔

ماہِ مئی میں سچی کہانیاں کے روحانی کہانی نمبر میں ملاحظہ فرمائیے۔

ہمارے لکھاریوں کا تعاون، ہمیشہ ہمیں کچھ الگ کر دکھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

اپنی زندگی سے جڑے اور اپنی آنکھوں سے دیکھے یا کانوں سے سُنے، وہ واقعات جو اپنے اندر ایک اسرار رکھتے ہیں۔

اس شمارے میں ملاحظہ فرمائیے

اپنی تحریر آپ ہمیں Email کے ذریعے بھی ارسال کر سکتے ہیں

ڈاک سے بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:

110۔ آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

E:mail Pearlpublications@hotmail.com

قارئین اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہانی اور کالا انڈا زبردست کہانیاں ہیں جن میں پراسراریت بھی ہے۔ سلیم بھائی آتش جنوں میں اتنے بھی قتل نہ کروائیں ویسے بھی دہشت گرد گاجر مولی کی طرح لوگوں کا قتل کر رہے ہیں۔

☆ ہمارے بہت عزیز لکھاری دوست ممتاز احمد۔ سیٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا سے لکھتے ہیں السلام علیکم۔ سچی کہانیاں مارچ کا پراسرار نمبر اپنے موضوع کے مطابق اور اسی نسبت سے ٹائٹل کے ساتھ زبردست شمارہ تھا۔ تمام کہانیاں بہترین۔ ایک انفرادیت کے ساتھ معیار بہت بلند تھا۔ کہانیاں بہت پسند آئیں۔ احوال تمام دوستوں کے خطوط بہت شاندار تھے اور تبصرے جان دار تھے۔

☆ نعمان نیازی، بھکر سے ایس ایم ایس کر رہے ہیں کہتے ہیں مارچ کا سچی کہانیاں ملا، بہت اچھا ڈراؤنا ٹائٹل تھا۔ منزہ آپی نے بہت اچھی بات کی۔ احترام میں اور کاشی بھائی تو بہت پیاری باتیں شیئر کرتے ہیں ہم سے۔ اللہ پاک ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ سچی کہانیاں بہت اچھا پرچا ہے اور کہانیوں پر اگلے ماہ تبصرہ کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ اس بار مارچ کا پراسرار نمبر پراسرار ہی ہوگا۔ اب ان شاءاللہ Sms کے ذریعے اپنی آراء بھیجتا رہوں گا۔

☆ ہماری ایک قاری رفعت کا نامعلوم مقام سے منظوم ایس ایم ایس آیا ہے۔

سچی کہانیوں کی کیا بات ہے
ہر دفعہ وہ لاجواب ہوتا ہے
کہانیوں کا ہر شمارہ بے مثال ہے
سارے رائٹر اس کی جان ہیں
خدا کے بعد باباجی سب کے غم خوار ہیں
منزہ رخسانہ اس کی پہچان ہیں
ہر تصور اور پیغام بہت آب و تاب کے ساتھ ہے
پڑھتی ہوں ہر ماہ، جس میں
ہر بات بے حساب ہے
یارب اسے اسی طرح چمکا تا رہے
دعا سب کی یہ دن اور رات ہے

☆ ہمارے ایک اور اچھے دوست لکھاری ملک صفدر عباس اعوان نے جہانیاں سے ایس ایم ایس کیا ہے۔ کہتے ہیں آپ یقین کریں کہ سچی کہانیاں میرے لیے ڈائجسٹ نہیں ہدایت کا راستہ ہے کہ میں اپنا سب کچھ اس پر واردوں اور اس مرتبہ سچی کہانیاں تو غضب ہے۔ ایسی کوئی کہانی نہیں ہے جس کی تعریف نہ کی جائے۔

کاشی بھائی جان کیا حال ہیں؟ اُمید کرتے ہیں کہ آپ ٹھیک ہوں گے۔ مارچ کا شمارا ملا تو اپنی کہانی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے دل خوش کر دیا۔ رسالے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ٹائٹل بہت حسین تھا۔ جلدی جلدی میں رسالے پر نظر دوڑائی۔ جی تو کر رہا تھا کہ تمام کا تمام رسالہ اسی وقت پڑھ ڈالوں لیکن ابھی صرف کچھ کہانیاں ہی پڑھی ہیں۔

☆ طاہر صدیقی ملیر کراچی سے ایس ایم ایس کر رہے ہیں اقبال صاحب آپ کی محبت نے سچی کہانیوں کو اس کے اچھے مقام پر لے آئے ہیں۔

☆ غلام مصطفیٰ پنہور کا ایس ایم ایس فرٹیلائزر ایجنسی۔ جیکب آباد سے آیا ہے لکھتے ہیں سلام منزہ سہام صاحبہ، سچی کہانیاں جیسے پتھر سے ہیرا تراشنا۔ میں اعجاز احمد کا ناگن شروع سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ سب سے پہلے سچی کہانیاں ماہنامہ کا شکر گزار ہوں اور سارے دوستوں کا جنہوں نے sms کا سلسلہ شروع کیا۔

☆ کنول تاباں نے حیدرآباد سے ایس ایم ایس کیا ہے۔ سلام، میری طرف سے آپ سب کو نیا سال مبارک۔ اللہ آپ پر اور ہم سب پر اپنا رحم کرے اور یہ نیا سال ہم سب کے لیے خوشیوں کا پیغام لائے۔ یہ کسی بھی رسالے میں میرا پہلا میسج ہے۔ اس سے پہلے کوشش کی مگر ہمت نہ ہو سکی کہ نہ جانے کیا لکھ دوں، بس یہ سوچا کہ خاموش قاری رہوں۔ مجھے سچی کہانیاں ملا تو بس یہی میرا انتخاب ٹھہرتا ہے۔ سات سالوں سے دوشیزہ اور سچی کہانیاں پڑھتی آ رہی ہوں، مگر کبھی خط نہیں لکھا۔ اس کی ایک اور بھی وجہ ہے آفس کا کام۔ پڑھائی پھر گھر کو بھی منہ دینا پڑتا ہے۔ اب جب میں بازار گئی تو پراسرار نمبر دیکھ کر بہت خوش ہوئی، کیوں کہ مجھے ایسی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں اور سچی کہانیوں کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ اللہ آپ کو دن دگنی ترقی عطا فرمائے۔ ابھی تو میں صرف ناگن اور آتش جنوں پڑھ رہی ہوں، باقی تفصیل ان شاءاللہ اگلے ماہ۔ اب اجازت دیجیے دعا کے ساتھ۔ جہاں رہیں خوش رہیں۔

☆ ہمارے ایک اور قاری، لکھاری زاہد حسین زاہد، چیچوں کی ملیاں۔ شیخوپورہ سے ہمیں یاد کر رہے ہیں لکھتے ہیں سچی کہانیاں اچھا ہے۔ بوریت دور کرنے کے لیے سچی کہانیاں اچھا ساتھی ہے۔

☆ عروج۔ کراچی سے ایس ایم ایس کر رہی ہیں۔ مارچ کا خاص نمبر بہت پسند آیا۔ اس کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ ایک ایک کہانی دل سے پڑھنے کے لائق ہے۔

☆ محمد معاویہ۔ کراچی سے ایس ایم ایس کر رہے ہیں۔ السلام علیکم۔ سچی کہانیاں کی اس ماہ کی کہانیاں بھی ہمیشہ کی طرح اچھی تھیں۔ آپ سے ایک گزارش ہے کہ ہر ماہ دینی حوالے سے بھی کچھ دیا کریں۔

☆ ہمارے دوست لکھاری اور قاری فرید عالم، کراچی نے ہمیں ایس ایم ایس کے ذریعے یاد کیا ہے۔ لکھتے ہیں سچی کہانیاں کے روشن ستاروں آپ سب کو میرا عقیدت بھرا اسلام قبول ہو۔ میں کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ آپ کی محفل میں شرکت کروں لیکن مصروفیت اور روزگار میں الجھ گیا۔ اب پراسرار نمبر میں sms کا رز کے ذریعے آپ لوگوں سے مخاطب ہوں۔ اس مرتبہ پراسرار نمبر بہت دلچسپ اور سبق آموز تھا۔ ہر ایک کہانی اپنی پراسراریت میں چھائی ہوئی تھی۔ نئے ساتھیوں نے اس میں حصہ لیا اور سونے پر سہاگہ بن کر مطمئن ہوئے۔ ان سب کو اور اسٹاف کو بہت بہت مبارک ہو۔ میری طرف سے آپ سب کو نیا سال مبارک۔

☆ ندا کا ایس ایم ایس کراچی سے آیا ہے۔ اس بار کا سچی کہانیاں بہت اچھا تھا، جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ سب مبارک کے حق دار ہیں Keep it up !L!

☆ شبیر منگی نے قمبر علی خان سے ایس ایم ایس پر اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔ مارچ کا سچی کہانیاں ملا تو بہت خوشی ہوئی، مگر ٹائٹل بہت ڈراؤنا تھا۔ منورہ نوری کی طرز کا کوئی اسلامی سلسلہ اس میں شامل کریں۔

☆ رابعہ ثمرین، سرگودھا سے ایس ایم ایس کر رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ اس ماہ کا سچی کہانیاں لاجواب، بہت اچھا لگا پڑھ کر۔ اس ماہ کی خاص کہانی ''ہمزاد'' خلیل احمد، ''انجام، خونی مجسمہ'' ملک صفدر اعوان اور ''روشنی والے'' احمد سجاد بابر، ''ایک کہانی'' حمیرا خان کی بہت اچھی تھیں۔

☆ مسز عبدالرزاق نے سائٹ ایریا کراچی سے ایس ایم ایس کیا ہے۔ مارچ 2014ء کا شمارہ واقعی پُراسرار لگا۔ تصویریں بھی بہت ڈراؤنی تھیں۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆ہمارے شاعر اور لکھاری دوست کاشف عبید کاوش۔ بٹ گرام بٹہ موری سے ایس ایم ایس کررہے ہیں۔ مجھے سچی کہانیاں بائی پوسٹ مل جاتا ہے۔ بٹگرام کے بک اسٹال پر کبھی آتا ہے کبھی نہیں۔ میری خواہش ہے کہ ہر ماہ باقاعدگی سے بٹگرام آئے۔

☆عبید احمد جائی۔ ملتان سے ایس ایم ایس کر کے ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کررہے ہیں۔ ڈیئر سر! سچی کہانیاں کل ملا۔ ماشاء اللہ ترقی کی بلندیوں کو چھورہا ہے۔ احوال پڑھا، بہت خوب۔ تبصرے کا سلسلہ sms کے ذریعے زبردست ہے۔ ''آسیب'' صفدر علی حیدری کی کمال کہانی تھی۔ نیک تمنائیں تمام دوستوں اور سچی کہانیاں کے لیے۔

☆شکیل خان نے میانوالی سے اپنی رائے کا کچھ یوں اظہار کیا ہے۔ میں ایک سال سے آپ کے ماہنامہ کا قاری ہوں۔ کیا میں آپ کے ماہنامہ میں لکھ سکتا ہوں؟

☆محمد وسیم۔ ڈیفنس کراچی سے اپنی رائے کا اظہار کررہے ہیں۔ اس ماہ کا سچی کہانیاں بہت اچھا تھا۔ سب کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ لگتا ہے نئی مینجمنٹ نے پرچے کو تیار کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ آئندہ بھی بہتر سے بہتر ہو۔

ساتھیو! یہ تو تھے وہ خطوط جواب تک ہمیں موصول ہوئے، اگر خدا نے چاہا تو اگلے ماہ ان ہی صفحات پر ملاقات ہوگی، اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ ماہِ اپریل کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط

☆علی رضا عمرانی، سجاول ☆ طارق بدر، اسلام آباد ☆اشرف خان، اٹک ☆علی حسین، صادق آباد ☆نوشین ظفر، حیدرآباد ☆آفتاب نصیر، گھوٹکی ☆ذکی الدین، ٹنڈوالہ یار ☆شان شاہ، لاہور ☆اروبہ بخاری، ملتان ☆سفینہ مظہر، سکھر ☆واصف نبی خان، کراچی ☆شاہ عتیق، کراچی ☆عارش عتیق، کراچی ☆حسینہ، بی ☆محمد اکبر، حیدرآباد ☆دعا حمید، کوٹری.........................

آپ کی دُعاؤں کا طالب

کاشی چوہان

توجہ طلب

اپنی نگارشات کے حوالے سے بات کرنے کے لیے آپ 0307-2089080 پر رابطہ کر کے معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ پیارے ساتھیو! آپ اپنی نگارشات ہمیں ای میل کے ذریعے بھی روانہ کرسکتے ہیں

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

ڈاک سے بھیجنے کے لیے: 110-آدم آرکیڈ۔شہید ملت روڈ ر بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی

نوٹ: قارئین اور لکھاری دوستوں سے گزارش ہے کہ آپ اپنی تحریر کاغذ کے ایک طرف، ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور اپنا نام، پتا اور مقام واضح طور پر تحریر کیا کریں۔ (شکریہ)

ایڈیٹر

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس ماہ کی سچ بیانیاں

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصولہ وہ سچ بیانیاں
جن کو پڑھ کر اپنی مٹی کی خوشبو آس پاس محسوس ہوتی ہے

مکھی واس — شبیر احمد بھٹی — بہاول پور سے غربت کی کوکھ سے جنم لینے والی ایک سچ بیانی

سزا کی جزا — سلمیٰ غزل — عروس البلاد سے رشتوں کے ہیر پھیر سے وجود میں آنے والی ایک سچ بیانی

بھرم — ایم اشفاق بٹ — لالہ موسیٰ سے ایک یادگار، انہونی سچ بیانی

کفارہ — محمد عمیر شہزاد — ہری پور سے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرتی ایک دوشیزہ کی عبرت انگیز کہانی

ذرا سی بھول — مور شاہد حسین — حب چوکی، بلوچستان سے رشتوں کے تقدس کو پامال کرتی ایک خامہ فرسائی

کس پہ اعتبار کریں — قمر ناہید — کراچی سے دوستی کی بھیانک شکل دکھاتی ایک سچ بیانی

بے رنگ حیات — شاہد محمود مغل — کاموکے سے ایک جوڑے کی بے رنگ حیات کا ماجرا

سلگتے ارماں — منشی محمد عزیز مے — دہاڑی سے خود اپنے دام میں پھنس جانے والے ایک ملک دشمن کا احوال

آخری خواہش — نور احمد مجو — [illegible] سے زندگی کے دوراہے پر ایک خواہش کی آس میں جیتی دوشیزہ کی کہانی

اب میں مطمئن ہوں — محمد بلال فیاض — ملتان سے ایک ظالم عورت کے سفاک ظلم کی تصویر

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پہلی سچ بیانی

پکھی واس

بشیر احمد بھٹی

بہاول پور سے غربت کی کوکھ سے جنم لینے والی ایک سچ بیانی

ہمارا ملک اس وقت افراتفری کا شکار ہے۔ ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی ہے۔ سرکاری اداروں میں بدعنوانی، اقرباء پروری، سفارش کلچر عام ہے اور نااہل افراد کی اجارہ داری ہے۔ ادارے تباہ ہوچکے ہیں اور کرپشن ملک کو دیمک کی طرح چاٹ گئی ہے۔ یہی حال ہمارے ملک کی سب سے سستی اور اچھی سرکاری آمدورفت کی سہولت فراہم کرنے والے ریلوے کے محکمے کا بھی ہے۔ آج کل ریلوے افسرانِ بالا اور ملازمین پر یہ مثال فٹ بیٹھتی ہے کہ جس تھالی میں کھایا، اسی میں چھید (سوراخ) کردیا۔ وہ بھی اِک دور تھا، جب سہ پہر چار پانچ بجے کراچی ایکسپریس لاہور سے کراچی جانے کے لیے روانہ ہوتی تھی، تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پورا لاہور شہر اُمڈ آیا ہے اور تمام لاہوری اسی ٹرین میں سوار ہیں۔ ڈبوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی۔ اکیس بائیس بوگیاں جو ٹرین سے جڑی ہوتی تھیں، پائیدانوں تک مسافروں سے لبریز ہوتے تھے۔ جگہ نہ ملنے کے باعث کئی مسافر تو واش روم میں کھڑے ہوکر سفر کرتے تھے۔ جب کوئی مسافر باتھ روم میں (جائے ضرورت) کی خاطر داخل ہوتا تھا تو اندر کھڑے ہوئے مسافر بڑی بحث وتکرار کے بعد باہر آتے تھے اور وہ مجمعے میں بڑی مشکل سے چند لمحے کھڑے ہونے کی جگہ پاتے تھے۔

جب کسی اسٹیشن پر ٹرین رُکتی تو اشیائے خورد و نوش مسافر کھڑکی کے راستے ہی خریدتے تھے، کیوں کہ نیچے اُترنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

گاڑی کے رکتے ہی ڈبوں میں چیزیں فروخت کرنے والوں کا بھی رش ہوجاتا تھا اور کھڑکی کے قریب بھی اشیاء فروش آوازیں لگا کر فروخت کرتے تھے۔ اسٹیشنوں پر ایک ہنگامہ خیز سماں ہوتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ کراچی ایکسپریس کا رش دیکھ کر ریلوے کے کرپٹ، بے ایمان اور راشی افسران کے پیٹ میں مروڑ اُٹھنے لگے۔ اعلیٰ عہدے کے ملازمین، جن کی نجی ویگنیں ساہیوال، خانیوال، ملتان، بہاولپور، رحیم یار خان، صادق آباد، روہڑی تک جاتی تھیں یا لاہور سے کراچی، پنڈی اور بالائی علاقوں کے مسافروں کو ڈھوتی تھیں، انہوں نے ملی بھگت سے کراچی ایکسپریس بند کرادی، جس کی وجہ سے لاکھوں مسافر اس بہترین ٹرین سے سفر کرنے سے محروم ہوگئے، لیکن ویگن مالکان کے مزے ہوگئے۔ انہوں نے رشوت دے کر یا پھر پولیس اور ریلوے افسران نے اپنی گاڑیاں چلا کر اس ٹرین کو ختم کردیا۔

کراچی ایکسپریس کے بند ہونے سے سڑکوں کی رونق دوبالا ہوگئی۔ بسوں اور ویگنوں میں مسافروں کا رش بڑھ گیا، مالکان کی چاندی ہوگئی، جب کہ سرکاری محکمہ ڈوب گیا۔ ریلوے کو برباد کرکے غداروں نے اپنی منزل پالی۔ وہ افسران جو ریلوے سے لاکھوں روپے تنخواہ پاتے ہیں۔ انہوں نے اس دیگچے میں سوراخ کردیا، جس کا وہ دودھ پیتے تھے۔ یہ کہانی پڑھ کر آپ اندازہ کرلیں گے کہ کراچی ایکسپریس میں مسافروں کا کتنا اژدہام ہوتا تھا۔ ہزاروں مسافروں کو لے جانے والی یہ ٹرین نہ صرف عوام کے لیے سہولت اور سستا ذریعۂ سفر تھی، بلکہ ریلوے کو بھی کروڑوں روپے کا فائدہ دے رہی تھی، لیکن اپنے معمولی فائدے اور ذاتی نفع کی خاطر کرپٹ افسران نے محکمۂ ریلوے کو کروڑوں کے فائدے سے محروم کردیا۔

صد افسوس کہ بھارت کو ہم اپنا جانی و ازلی دشمن سمجھتے ہیں، کیوں کہ وہ ہمیں ہر طرح سے جانی و مالی، معاشی و سماجی اور ثقافتی نقصان پہنچاتا ہے، لیکن جو افسران ہمارے ملک میں رہ کر ملکی املاک کو نقصان پہنچا رہے ہیں، کیا وہ ہمارے دوست ہیں؟

بلاشبہ پاکستان ہمارا گھر ہے اور جو ہمارے گھر کو، ہمارے ملک کو نقصان پہنچائے، وہ اس گھر کا مکین ہونے کا حق دار نہیں بلکہ غدار کہلانے کا مستحق ہے۔ "خدا ان ملکی غداروں کو راہِ ہدایت عطا کرے، تاکہ یہ توبہ کرکے یومِ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں۔"

وہ غالباً مئی کا مہینا تھا جب سخت گرمی تھی۔ میں مع فیملی لاہور سے کراچی ایکسپریس میں سوار ہوا۔ میں نے لاہور اسٹیشن سے واٹر کولر ٹھنڈے پانی سے بھر لیا تھا۔ ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے وہ واٹر کولر کافی تھا۔ ٹرین میں اس روز ضرورت سے زیادہ رش تھا، لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے، بلکہ ایک دوسرے پر سوار تھے۔ ہماری سیٹیں بک تھیں اور یہ سیٹیں بوگی کے درمیان میں تھیں۔ دونوں طرف کے دروازے ہم سے کچھ دوری پر تھے۔ رش کی وجہ سے نیچے اُترنا تو کجا، دروازے کی جانب جانا بھی ازحد مشکل تھا، فرش تک پر مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔

گرمی کی وجہ سے ٹرین کے ڈبے کے تمام دروازے کھلے ہوئے تھے۔ دروازوں کے پاس اتنی بھیڑ تھی کہ نیچے اُترنا یا چڑھنا قریباً محال ہی تھا۔ ہمارے قریب بیٹھے ہوئے مسافروں نے پیاس کی شدت کم کرنے کے لیے ہمارا واٹر کولر، جو پانی سے بھرا ہوا تھا، پانی پی پی کر خالی کردیا تھا۔ جب ٹرین ساہیوال اسٹیشن پر آکر ٹھہری تو میں نے سوچا کہ واٹر کولر ٹھنڈے پانی سے بھروالینا چاہیے، تاکہ پیاس کی تکلیف سے بچا جائے، اس طرح اپنا بھی بھلا ہو اور اُن

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

مسافروں کا بھی، جو ہمارے قریب میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمارے قریب بیٹھے ہوئے کچھ مسافروں کے بچے بڑے بے صبرے تھے۔ وہ پانی نہ ملنے پر رونا شروع کر دیتے تھے۔ نیچے جانا اور واٹر کولر بھر کر لانا تو کافی مشکل کام تھا۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا اس قدر رش تھا کہ اسٹیشن پر بنی ٹھنڈے پانی کی ریلوے سبیل بھی نظر نہیں آ رہی تھی اور پھر یہاں ٹرین کا اسٹاپ بھی محدود تھا۔ صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں نے کھڑکی کا شیشہ اور گرل اوپر کو اٹھائی تو مجھے سامنے ایک لڑکا کھڑا ہوا نظر آیا، جس کا لباس میلا کچیلا سا تھا اور اس کے سر کے بال بھی بے ترتیب سے تھے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔ جب وہ کھڑکی کے قریب آ گیا تو میں نے اسے سو روپے کا نوٹ دیا، ساتھ ہی واٹر کولر اسے دے کر کہا۔ ''بھئی اسے ٹھنڈے پانی کی مشین سے بھر کر مجھے لا دو اور اگر مشین میں ٹھنڈا پانی نہ ہو تو بیس روپے کی اس میں برف ڈلوا لانا اور بیس روپے تم رکھ لینا اور بقیہ کے ساٹھ روپے مجھے واپس کر دینا۔'' لڑکے نے میری بات سنی اور خوشی خوشی واٹر کولر لیا اور پھر وہ رش میں کہیں غائب ہو گیا۔

لڑکے کو پیسے اور کولر دے کر میں مطمئن ہو گیا اور اطمینان سے جا کر اپنی جگہ بیٹھ گیا اور اس اخبار سے ہوا جھلنے لگا جو میں نے لاہور سے پڑھنے کے لیے خریدا تھا۔

یہاں پر ٹرین کا دو منٹ کا اسٹاپ تھا، لیکن اس روز وہ خلاف توقع پانچ منٹ تک رُکی رہی، پھر جب سگنل ڈاؤن ہوا تو انجن کا ہارن بھی بج اُٹھا اور دوسرے ہارن پر گارڈ نے وِسل بجائی اور پھر ٹرین رینگنے لگی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی سے سر نکال کر اس طرف دیکھنے لگا، جدھر کو وہ لڑکا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر دور دور تک انسانی سر ہی سر نظر آ رہے تھے اور مسافر دوڑ دوڑ کے چلتی گاڑی میں اپنی اپنی بوگیوں میں سوار ہو رہے تھے۔ سوار ہونے میں انہیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، کیوں کہ ٹرین مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ٹرین کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی اور پلیٹ فارم آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف جا رہا تھا، مگر مجھے وہ لڑکا کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹرین کی رفتار میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا اور پھر پلیٹ فارم کے قریب والی لائن سے کانٹا بدل کر اب ٹرین مین لائن پر گھوم رہی تھی۔ گھومتے ڈبوں کی وجہ سے نصف پلیٹ فارم میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے کھڑکی سے سر اندر کر لیا اور اپنی جگہ پر مایوس بددل ہو کر بیٹھ گیا، کیوں کہ اب اس لڑکے کے آنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی۔ وہ چھلاوہ تو تھا نہیں کہ اُڑ کر آتا اور ٹرین کے قریب پرواز کرتے ہوئے پانی کا کولر ہمیں دے جاتا۔ وہ انسان کا بچہ تھا، کسی جن کا نہیں، جو ٹرین کی برق رفتاری کا مقابلہ کرتا۔

میرے قریب ہی کونے پر ایک سفید پوش بڑے میاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی اُن کی جوان سال بیٹی بھی اُن کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی، جس نے کالا برقع پہنا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور اس کی صرف آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ بڑے میاں مذہبی انسان تھے، اس لیے بیٹی کو بھی پردے کا پابند بنا رکھا تھا۔

میں کولر کا غم اپنے دل میں لیے اپنی جگہ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ بڑے میاں نے سلسلۂ کلام کو جاری کرتے ہوئے کہا۔ ''کیوں میاں......؟ وہ زکوٹا جن کا بچہ کولر لے کر آیا کہ نہیں۔''

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''جناب عالی، پانی کے حصول کا معاملہ تو آپ کے سامنے پیش آیا ہے، اگر وہ آتا تو آپ بھی دیکھ لیتے، پھر آپ دیکھ تو رہے ہیں کہ وہ پانی کا کولر لے کر نہیں آیا۔''

بڑے میاں پہلو بدل کر بولے۔

''برخوردار دور بڑا خراب ہے، اس طرح آنکھیں بند کر کے کسی پر اعتماد کر لینا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ تمہیں یہ ماننا ہو گا کہ تم سے ایک بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ اگر تم اسے صرف کولر دیتے اور سو کا نوٹ نہ دیتے تو شاید وہ واپس آ جاتا اور اگر تم اسے صرف اتنا کہہ دیتے کہ ''لڑکے! اگر تم یہ کولر لے کر بھر لاؤ گے تو واپسی پر میں تمہیں بیس روپے دوں گا۔'' تو وہ اجرت کے لالچ میں فوراً واپس آ جاتا۔ اب تم نے اسے سو کا نوٹ تھما دیا روپیوں کے ساتھ نیا واٹر کولر بھی اس کے ہاتھ لگ گیا ہے، اب اس کی جانے بلا، وہ بھلا کیوں کر واپس آئے گا، کیوں کہ سو روپے جوئے، جیب خرچ کی مد میں مل چکے ہیں، اب وہ کولر تو گھر لے جائے گا اور سو روپے سے چھرے اڑائے گا۔ اللہ اللہ خیر صلا......''

بڑے میاں مسلسل بولے جا رہے تھے۔ ''آپ بھی بڑے سادہ انسان ہیں بالکل میرے منجھلے بیٹے کی طرح۔ وہ بھی آپ کی ہی طرح لااُبالی طبیعت کا مالک ہے اور یاروں دوستوں پر اندھا اعتماد کرتا ہے اور پھر بدلے میں ڈانگ کھا لیتا ہے۔ ہزار بار اسے سمجھایا ہے کہ عقل سے کام لو، دُکھ سکھ کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا، جو تمہاری جیب میں یا جو تمہارے پیٹ میں ہے، بس وہ ہی تمہارا ہے، باقی سب کا سب سنسار کا سمجھو، لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ بارہ مہینے ترل (بھوکا) رہتا ہے۔''

وہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولے۔

''یہ بچہ جس کو تم نے کولر دے کر پانی لانے کو بھیجا تھا، مجھے تو وہ کسی کوٹانے کا بچہ لگتا تھا۔ یہ فقیر، کوٹانے جو جھگیوں میں رہتے ہیں، اِن کے بچے عموماً چور ہوتے ہیں۔ وہ خود تو وہاں بیٹھ کر چھاج بناتے رہتے ہیں اور اپنے بچوں کو چوری چکاری کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ اِن اَن پڑھ اچکوں کا کیا بھروسا۔ اِن کا بھی واس قبیلوں سے ناتا ہوتا ہے، آج یہاں تو کل وہاں۔ تم نے اس کا حلیہ دیکھا تھا، میلا چیکٹ لباس، کانوں پر پڑے ہوئے بال، میلے کچیلے ہاتھ۔ اگر وہ پانی لا بھی دیتا، تو کیا تم اس کے مکروہ ہاتھ سے بھرا پانی پی لیتے؟'' بڑے میاں نے مجھ سے سوال کیا، پھر بولے۔

''یہ لوگ گندے اور غلیظ ہوتے ہیں۔ صفائی اِن کو چھو کر بھی نہیں گزرتی، اچھا ہی ہوا جو وہ پانی کا کولر نہیں لایا۔''

بڑے میاں اندرونی طور پر تپے بیٹھے تھے۔ میرے اس فعل کو انہوں نے میری بے وقوفی گردانا اور لیکچر دینا شروع کر دیا۔ میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا اور سر دھنتا رہا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہے، پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔ ''اس طرح کے کام آپ نہ کریں۔'' پھر انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں
اب اُداس بیٹھے ہو گرمیوں کی شاموں میں

اس کے بعد وہ اس غزل کے کئی مصرعے پڑھتے چلے گئے، حالاں کہ اس وقت شام نہیں تھی، بلکہ اب رات ہو چکی تھی اور ٹرین برق رفتاری کے ساتھ اپنی منزل کی جانب اُڑی چلی جا رہی تھی۔

بڑے میاں کی باتیں سننے کے بعد بھی میں دلی طور پر قطعی مطمئن تھا کہ چلو ایک غریب بچے کی اس بہانے مدد ہو گئی۔ وہ غریب بال کٹوائے گا، صابن لے کر نہائے گا، بڑے میاں کچھ دیر خاموش رہ کر دوبارہ گویا ہوئے۔

''یہ ہماری روز مرہ کی اس طرح کی غلطیوں سے چوروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں نا کہ شیر کسی بندے کو مار کے کھا لے تو اسے انسانی خون کا چسکا پڑ جاتا ہے، پھر وہ آدم خور بن جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ تاک میں رہتا ہے کہ کوئی انسان نظر آئے تو اس پر جھپٹوں۔ اب یہ لڑکا جسے تم نے کولر اور سو روپے دیے ہیں، سمجھو کہ...... چور بن گیا۔ اب یہ اپنی اس مذموم حرکت کو اپنا معمول بنا لے گا۔ روزانہ اسٹیشن پر آ کر کھڑا ہو جائے گا اور جب بھی کوئی مسافر تمہاری طرح اس کو کولر اور سو روپے دے گا تو یہ لے کر اسی طرح گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو جایا کرے گا، گویا اسے چور بنانے کی تم نے داغ بیل ڈال دی۔''

بڑے میاں اب آپ سے تُو پر اُتر آئے تھے۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' اُن کی بات پر میں سر جھکا کر شرمندگی سے بولا۔ ''افسوس کہ اب وہ بچہ چور بن جائے گا، وہ بھی میری وجہ سے۔ نہ میں اسے سو روپے اور کولر دیتا اور نہ وہ چور بنتا۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے، صرف میری وجہ سے۔'' میری انکساری پر بڑے میاں کا مزید حوصلہ بلند ہوا اور وہ اپنے لیکچر کو طول دیتے ہوئے بولے۔

''بچے کی گھٹی میں جو چیز بچپن میں پڑ جائے، وہ تا عمر نہیں جاتی، آج کا یہ چور بچہ کل کا ڈکیت بن سکتا ہے۔ چوریوں کی منازل طے کرتے ہوئے انسان ڈکیتی پر اتر آتا ہے، بالکل اس طرح، جیسے ایک بچہ پرائمری اسکول سے ہائی اسکول تک، پھر وہاں سے وہ کالج تک جا پہنچتا ہے۔ میاں اب نماز پڑھ کے توبہ کرنا اور دعا میں اللہ تعالیٰ سے اپنے کیے کی معافی مانگنا۔ اس کے دربار میں خشوع و خضوع سے فریاد کرنا کہ پروردگار مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ ایک بچے کو میں نے چوری کی عادت ڈال دی ہے۔ اے پاک پروردگار تو میرا یہ گناہ معاف کر دے۔'' اتنا کہہ کر بڑے میاں نے ایک تھیلی نکالی اور اس میں سے چند سونف کے دانے اور چند سپاری کے دانے نکال کے منہ میں ڈالے اور تھیلی کا منہ بند کر کے جیب میں ڈال لی۔ جب سپاری اور سونف ان کے منہ میں گئے تو پھر اُن کا لیکچر بند ہوا۔

اس موضوع پر اُن کی مسلسل گفتگو نے مجھے شرمندگی سے دوچار کر دیا تھا۔ اب میں اُن سے آنکھ ملاتے ہوئے کترا رہا تھا۔ جب کہ اُن کی جوان سال بیٹی

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

نقاب میں منہ چھپائے میری طرف دیکھ دیکھ کر کن انکھیوں سے مسکرا رہی تھی۔

ہا...... ہا...... میں ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ ”بزرگوار دیکھا جائے تو اس فعل میں میرا قصور کم اور ریلوے والوں کا زیادہ بنتا ہے!“

بڑے میاں منہ چلاتے اور سونف، سپاری چباتے ہوئے بولے۔ ”کیا مطلب ہے میاں تمہارا؟“

میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اجی...... دیکھیے نا...... ٹرین میں کتنا رش ہے، لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے ہیں، ایسے میں کسی بھی مسافر کے لیے نیچے اُترنا یا سوار ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر یہ ریلوے والے صرف سیٹیں اور برتھ بک کریں اور سیٹ بائی سیٹ مسافر سفر کریں، اس طرح گاڑی میں رش نہ ہو تو ایسے چھوٹے چھوٹے مسئلے باآسانی حل ہوسکتے ہیں۔ اگر رش نہ ہوتا تو نیچے اُتر کے میں اپنا کولر خود ہی بھر لاتا، لیکن یہاں تو صورت حال یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ ٹکٹ مسافروں کو جاری کردیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے مسافر بھیڑ، بکریوں کی طرح ڈبوں میں بھر جاتے ہیں، نہ کوئی مرد، خاتون یا بچہ واش روم تک جاسکتے ہیں اور نہ ہی وہ نیچے اُتر کر کوئی چیز خرید سکتے ہیں، مجبوراً کھڑکی کے راستے بندروں کی طرح مسافر اچھل کود کرکے نیچے اُترتے ہیں اور اس راستے سے مسافر خوانچہ فروشوں سے ناقص اشیاء خرید کر کھاتے پیتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ایک ٹرین تین ٹرینوں کے مسافروں کا بوجھ اُٹھا کر چلتی ہے، اس کے باوجود بھی ریلوے خسارے میں ہے اور مسافروں کو نہ تو کوئی سہولت میسر ہے اور نہ ہی ملازمین کو۔“

”یہ تو ایمان کی کمزوری ہے۔“ بڑے میاں یہ کہتے ہوئے کونے سے اُٹھ کر کھڑکی کی طرف آئے اور انہوں نے نیچے جھک کر اپنے منہ کے سائیڈ پر ہاتھ سے چھجہ سا بنایا اور کھڑکی سے باہر تھوک دیا۔ وہ تھوک ہوا کے دباؤ سے بکھر کر یقیناً ان لوگوں پر جا کر گرا ہوگا، جو دروازے میں پاؤں لٹکائے سفر کررہے تھے یا کھڑکیاں کھولے کناروں سے لٹکے بیٹھے تھے۔ کھڑکی سے تھوک بکھر کر مسافروں پر اس طرح گرتا ہے، جس طرح بارش کے ننھے ننھے قطرے گرتے ہیں۔ بڑے میاں اصول پسند آدمی تھے۔ انہوں نے ڈبّے کے فرش پر تھوکنا مناسب نہیں جانا اور باتھ روم تک وہ جانے سے قاصر تھے، اس لیے یہ سونف، سپاری کی خوشبو انہوں نے دروازے میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو منتقل کردی۔ میں نے بڑے میاں کی اس حرکت پر ان کی طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔

”آپ نے اس طرح باہر تھوک کر اچھا نہیں کیا۔ وہ مسافر جو دروازے میں بیٹھ کر سفر کررہے ہیں، یقیناً تھوک اُن پر پھوار کی صورت میں جا کر گرا ہوگا۔“ میں نے بڑے میاں سے عاجزانہ طور پر کہا، تو وہ بولے۔

”انہیں کس نے کہا ہے کہ دروازے میں بیٹھ کر سفر کرو۔“

”اجی...... مجبوری بھی کوئی چیز ہے، وہ خوشی خوشی تو دروازے میں نہیں بیٹھے ہیں۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”اتنے رش میں سب جائز ہے، یہ ٹرین روزانہ اسی طرح مسافروں سے بھری ہوتی ہے، تھوک تو چہروں پر روز ہی گرتا ہوگا۔“ وہ صاحب ہنس کر بولے۔

”خیر یہ آپ کا فعل ہے۔“ میں نے مسکرا کر ان سے کہا۔

اس کے بعد مزید ہمارے مابین ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ اچانک ٹرین کے بریک جھنجھنا اُٹھے۔ ذرا دیر بعد آؤٹر سگنل شاں کرکے قریب سے گزرا تو وہ صاحب فوراً بول اُٹھے۔ ”لگتا ہے خانیوال آگیا ہے۔“

نیچے پہیے گڑگڑا رہے تھے۔ میں نے اُٹھ کر کھڑکی سے سر نکال کر اسٹیشن کی سمت دیکھا تو واقعی خانیوال کا اسٹیشن قریب آرہا تھا۔ ٹرین مختلف جگہوں سے کانٹے بدل رہی تھی۔ یہ بڑا جادوئی نظارہ تھا۔ میں اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے کبھی اگلی سمت دیکھتا تو کبھی پچھلی۔ ٹرین کی بوگیاں بڑے مست انداز میں انجن کی فرماں برداری میں لہراتے بل کھاتے بدلے ہوئے کانٹوں پر گھوم رہی تھیں۔

جب ٹرین کسی بڑے جنکشن اسٹیشن پر پہنچتی ہے تو لوپ لائنوں کا اک جال سا بچھا ہوتا ہے۔ اُن لائنوں پر جب کئی جگہ سے گھوم کر ٹرین اسٹیشن میں داخل ہوتی ہے، تو نیچے پہیے عجیب سُر تال میں ساز بجا رہے ہوتے ہیں۔ ہزاروں مسافر کھڑکیوں سے سر نکال کر اس نظارے سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ٹرین کی مست چال دیکھ کر بدن میں سرور کی لہریں سی اُٹھتی ہیں۔ اس وقت یہ قابلِ دید منظر دیکھ کر بڑا مزہ آتا ہے اور ٹرین کا جادوائی سفر لطف کا سبب بن جاتا ہے۔

بالآخر کچھ دیر بعد ٹرین خانیوال اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوکر رک گئی۔ نان...... روٹی، چائے کا غلغلہ ہوا۔ چمٹے اور توے بجنے لگے۔ ایک ہڑبونگ سی مچ گئی، اسٹیشن پر شور ہی شور تھا، کانوں پڑی آواز میں اک تلاطم تھا۔ ہماری بوگی پلیٹ فارم کے کونے پر جا کر رکی تھی۔ یہاں ٹرین کا اٹھارہ منٹ کا اسٹاپ تھا۔ ابھی گاڑی کو رکے ہوئے چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ ہماری کھڑکی کے سامنے ایک چہرہ آکر کھڑا ہوا۔ یہ وہی لڑکا تھا، جسے میں نے کولر دیا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے کولر اپنے ہاتھوں سے بلند کیا اور بولا۔

”یہ لیجیے جناب آپ کا کولر......“ وہ مجھ سے مخاطب تھا، میں نے اُٹھ کر کھڑکی کے راستے کولر لے لیا۔ اس لڑکے نے مڑے تڑے ساٹھ روپے مجھے تھما دیے...... ”تم یہاں......“ میرے منہ سے یکدم نکلا۔

”وہ جی...... اصل میں...... بات یہ ہوئی کہ ٹھنڈے پانی کی موٹر دور تھی اور وہاں کافی رش تھا، مگر جیسے تیسے میں نے پانی بھرا۔ رش کی وجہ سے دھکم پیل تھی اس لیے وہاں پانی بھرتے بھرتے مجھے دیر ہوگئی، پھر میں نے اس میں بیس روپے کی برف ڈلوائی، اس کام میں مزید کچھ تاخیر ہوگئی۔ اس اثناء میں ٹرین چل پڑی تھی اگر میں آپ کی بوگی کی طرف آنے کی کوشش کرتا تو ٹرین میں سوار ہونے سے رہ جاتا۔ اس لیے میں کولر سمیت ٹرین کی آخری بوگی میں سوار ہوگیا، کیوں کہ اس طرف آنے کا راستہ نہیں تھا، یوں میں اس بوگی میں ہی بیٹھا رہا۔ اب ٹرین رکی ہے تو میں آپ کی امانت آپ تک پہنچانے میں کامیاب ہوا ہوں۔“

”تم نے ٹکٹ لیا۔“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ٹکٹ وکٹ ہم نہیں لیتے جی، ہمیں تو بس سیر سپاٹے کا شوق ہے، اس لیے دو چار اسٹیشنوں تک مفت میں سفر کرلیتے ہیں۔ اگر بابو پکڑ بھی لیں تو چھوڑ دیتے ہیں۔“ وہ سچ بیانی سے بولا۔

میں نے ساٹھ روپے اسے دے دیے، جو اس نے بڑی مشکل سے لیے۔

”اب تم واپس بغیر ٹکٹ جاؤ گے۔“ میں بولا۔

”یہ تو ہمارا روز کا معمول ہے جی، بغیر ٹکٹ سفر کرنا۔“ وہ سعادت مندی سے بولا۔ بڑے میاں حیرت سے اس پلھی داس کو دیکھ رہے تھے اور اس کی آمد و صاف دلی پر وہ دل ہی دل میں بڑی شرمندگی بھی محسوس کررہے تھے۔ انہوں نے تو اس غریب بچے پر بلا تمہید تبصرہ کر ڈالا تھا، لیکن وہ غریب بچہ تو نہایت ہی ایمان دار نکلا۔

بڑے میاں کا زبانی جمع خرچ کا وہ تبصرہ بے کار گیا۔ میں نے اس لڑکے سے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے!“

وہ بولا۔ ”میرا نام اصغر ہے۔“

”اصغر میاں۔“ ”تم ایک اچھے لڑکے ہو، اس لیے تم کسی اسکول میں داخلہ لے کر تعلیم حاصل کرو۔“

وہ ہنس کر بولا۔ ”میں ساتویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔“

”تمہارے ابا جی کیا کرتے ہیں!“ میں نے سوال کیا۔

”ابا جی تو فوت ہوگئے ہیں اور میری اماں کو ٹی بی ہے۔ میری ایک بہن استانی ہے اور دو بہنیں مکیش کا کام کرتی ہیں۔ میں بھی ہلکی پھلکی مزدوری کرلیتا ہوں۔ روکھی سوکھی میں گھر کا نظام چل رہا ہے۔“ اس نے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔

”بہت خوب۔“ میں نے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔

جب تک ٹرین اسٹیشن پر کھڑی رہی، اصغر بھی وہیں کھڑا رہا، پھر جب ٹرین چلنے لگی تو میں نے کھڑکی کے راستے اس سے ہاتھ ملایا اور بڑی گرم جوشی سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ جب تک ٹرین نے کانٹا نہیں بدلا۔ میں کھڑکی سے سر نکال کر اسے دیکھتا رہا اور اپنا ہاتھ ہلاتا رہا۔ اصغر بھی جواب میں الوداعی ہاتھ ہلاتا رہا۔

جب ٹرین مین لائن پر چڑھی تو وہ فراٹے بھرنے لگی اور آہستہ آہستہ خانیوال کا اسٹیشن اور اصغر میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ بڑے میاں خاموش بیٹھے تھے، انہوں نے جس لڑکے کو چور، اچکا اور نہ جانے کیا کیا کہا تھا، وہ ایمان دار نکلا۔ وہ بچہ پلھی داس نہیں تھا۔ ایک غریب گھرانے کا چشم و چراغ تھا، جس کا دل آئینے کی طرح شفاف تھا لیکن، غربت نے اس کا حلیہ پلھی داسوں جیسا کردیا تھا، آخر پلھی داس بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں۔

☆......☆

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

سلمیٰ غزل

عروس البلاد، سے رشتوں کے ہیر پھیر سے وجود میں آنے والی ایک سچ بیانی

بدقسمتی سے میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی، جو پوری بستی میں جابر اور ظالم مشہور تھا۔ میرے دادا نہ ظالم تھے، نہ ہی سخت، بلکہ بستی والے ان کے زمانے کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرا کرتے تھے کہ ان کا زمانہ امن و آشتی کا تھا۔ جاگیردار ہوتے ہوئے بھی ان میں جاگیرداروں والی خُو بُو نہیں تھی۔ بے حد ہمدرد، منکسر المزاج اور غریب پرور مگر آغا جی یعنی میرے والد ان کے بالکل اُلٹ تھے۔ جب تک دادا زندہ رہے، آغا جی کو اپنی من مانی کرنے کا موقع نہیں ملا، مگر ان کے انتقال کے ساتھ ہی گویا "بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔" بڑی اولاد ہونے کے ناتے انہوں نے پوری بستی پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے۔ میرے دونوں چھوٹے چچا بھی کچھ کم نہ تھے، لیکن چوں کہ علاقے پر حکمرانی کا حق صرف آغا جی کو ہی تھا۔ اس لیے تمام اختیارات بھی انہیں کے پاس تھے اور وہاں صرف مزارعوں کو بسنے کی اجازت تھی، مگر خادم اور غلام کی حیثیت میں، پھر پورے 5 سال کے انتظار کے بعد میرے بھائی عیان کی ولادت ہوئی، جو اس خاندان کی پہلی نرینہ اولاد تھی۔ دونوں چچاؤں کے یہاں بھی دو دو بیٹیاں تھیں۔ آغا جی اور بی جان پانچ سال سے اولاد کے لیے تڑپ رہے تھے، حالاں کہ ڈاکٹر کہہ چکے تھے کہ دونوں میڈیکلی فٹ ہیں، صرف اللہ کے حکم کی دیر ہے۔

آغا جی نے تو اپنے گرد غصے اور نفرت کا ایسا حصار باندھ رکھا تھا کہ اس میں کسی کو بھی جھانکنے کی اجازت نہیں تھی حتیٰ کہ بی جان کو بھی نہیں۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ انہیں اولاد نہ ہونے کا کوئی غم نہیں ہے، لیکن بی جان اولاد کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ کوئی منت، کوئی مراد اور کوئی دعا ایسی نہ تھی جو انہوں نے نہ مانگی ہو، کوئی در نہ چھوڑا تھا انہوں نے۔

عیان بھائی کی پیدائش کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ آغا جان کے خودساختہ خول میں دراڑیں پڑ گئیں۔ اب ان کی طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا تھا اور تلخیاں اور رنجشیں خوشیوں کے سائے تلے گم ہو گئی تھیں۔ اضطراب کی تڑپتی، مچلتی لہروں کو سکون مل گیا تھا، لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ سکون کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

عیان کی پیدائش پر پورے گاؤں میں ہفتے بھر تک جشن منایا گیا، ہر طرف شہنائیاں گونج اٹھی تھیں اور گاؤں کے سیدھے سادے لوگ طبلے کی تھاپ پر آغا سکندر علی خان اور بیگم زیب النساء کا ہر ستم بھلا کر ناچتے گاتے حویلی پہنچ گئے تھے، انہیں مبارک باد دینے کے لیے۔

عیان میرا بھائی، سب کی آنکھوں کا نور تو ماں باپ کے دل کی ٹھنڈک اور ان کے دل کا قرار تھا۔ اس کے وجود سے آغا جی کی طبیعت میں ہیجانی کیفیت کی جگہ نرمی آ گئی تھی۔ لوگ بہت خوش تھے، لیکن انسان اپنی عادت تو بدل سکتا ہے، فطرت نہیں۔ عیان ابھی تین سال کا تھا کہ ایک دن کھیلتے کھیلتے سرونٹ کوارٹر کی طرف چلا گیا اور ڈرائیور کے بچے کے ساتھ کھیلتے ہوئے گر پڑا۔ چوٹ تو زیادہ نہ لگی لیکن پوری حویلی میں قیامت سی مچ گئی۔ آغا جی یہ سب برداشت نہ کر سکے اور بُری طرح ڈرائیور کے لڑکے کو مارنے لگے، جو ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کے ساتھ ساتھ عیان کا ہی ہم عمر تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر جو بھاگا تو منڈیر سے ٹکرا کر ایسا گرا کہ پھر دوسرا سانس نہیں لے سکا۔ آغا جی کو اپنی اس زیادتی پر کوئی شرمندگی نہ تھی، کیوں کہ کسی کمی کمار سے معافی مانگنا یا معذرت کرنا ان کی شان کے خلاف تھا۔ انہوں نے اس کے باپ شیر علی سے افسوس کا اظہار کیا اور ایک بڑی رقم تاوان کے طور پر اسے دینی چاہی، لیکن اس نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ "مشیت ایزدی میں کسی کا کیا دخل ہے، آپ نے جان بوجھ کر تو میرے بیٹے کو نہیں مارا...... بس یہ ایک حادثہ تھا، جو ہو گیا۔" لیکن اس کے دل میں کیا تھا یہ کسی کو معلوم نہ ہوا اور پھر اس نے اپنے بیٹے کے خون کا بدلہ اس طرح لیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اور پھر اس نے آغا جی اور بی جان کو اضطراب کی آگ اور عمر بھر کی اذیت میں دھکیل دیا۔ اس آگ میں وہ کئی عرصے تک جھلتے رہے اور کچھ نہ کر سکے اور ان کا جگر گوشہ انتقام کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن جوں ہی رات کی تاریکی نے دن کو اپنی آغوش میں لیا، وہ خاموشی سے عیان کو اور اپنی بیوی کو لے کر فرار ہو گیا۔ اس کے بعد تو حویلی والوں پر قیامت گزر گئی۔ انہوں نے چاروں طرف اپنے گھوڑے دوڑائے۔ میرے دونوں چچاؤں نے ملک کا گوشہ گوشہ چھان مارا، مگر شیر علی کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ وہ ایسی جگہ روپوش ہو گیا تھا کہ ساری زندگی بی جان اور آغا جی ہاتھ ملتے رہ گئے۔

عیان کی گمشدگی نے انہیں اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ سرتاپا بدل گئے تھے۔ ظلم و زیادتی کے چراغ گل ہو گئے۔ بستی والوں نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا۔ گو وہ غریب اب بھی آغا جی کے دُکھ میں برابر کے شریک تھے، مگر وہ آغا جی اب پہلے والے آغا جی نہیں رہے تھے۔ انکساری، عاجزی اور غریب پروری ان کی فطرت کا حصہ بن گئی تھی اور پھر پورے ایک سال بعد میں نے پری وش

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی شکل میں اس گھر کو اچانک ایک خوشی دی تو ساری تلخیاں اور دُکھ خواب و خیال ہوگئے اور اضطراب کی تڑپتی، مچلتی لہروں کو سُکھ کا کنارہ مل گیا۔ حویلی میں ایک مرتبہ پھر جشن کا ساسماں ہوگیا۔ بی جان اور آغاجی کی اگر میں محبت کا محور ہی تو دونوں چچا بھی مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ خاص طور پر چھوٹے چچا، شاید اس لیے کہ وہ مجھے اپنے لیے خوش بختی کی علامت سمجھتے تھے، کیوں کہ میری پیدائش کے چھ سال بعد ان کے گھر میرا کزن ان کی نرینہ اولاد پیدا ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود میری اہمیت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔

آغاجی اور بی جان اپنی نگرانی میں میرا ہر کام کرواتیں اور سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہتیں، لیکن ماںتا کی ساری چاہت آنکھوں میں سمیٹے وہ مجھے اپنی آغوش میں لینے سے گریز کرتیں۔ وہ مجھے گلے سے لگاتے ہوئے بھی ڈرتی تھیں کہ کہیں کوئی پھر انہیں اپنی اولاد سے محروم نہ کردے۔ آغاجی کی شفقت تلے میری پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی، لیکن ایک تشنگی کا احساس مجھے ہمیشہ رہتا کہ ایک عام بچے کی طرح میرے ساتھ سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ نوشین، مالی کی بیٹی میری بہت اچھی دوست تھی، مگر بی جان مجھے اس کے ساتھ بھی کھیلنے نہ دیتی تھیں۔

"دیکھو پری وش، تم اس حویلی کے مالک اور بستی کے حاکم کی بیٹی ہو، تمہیں نوکروں کے ساتھ کھیلنا زیب نہیں دیتا۔"

وہ جب میری سرزنش کرتیں اور مجھے شدید غصہ آجاتا۔

"آخر کیوں زیب نہیں دیتا......؟" میں بھنا کر پوچھتی اور بی جان میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے گھور کر دیکھتیں اور غصّے کا اظہار کرتے ہوئے کمرے سے نکل جاتیں۔

میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں عام بچوں کی طرح باہر نکلوں، دوڑوں، بھاگوں اور مٹی کے گھروندے بناؤں، مگر مجھے کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی، سوائے اسکول کے۔ گھر کا سب سے خوب صورت کمرہ میرے لیے مخصوص تھا، بے شمار قیمتی اور امپورٹڈ کھلونوں سے مزین...... مگر بھلا کوئی صرف بے جان کھلونوں سے بھی بہل سکتا ہے؟ میں تو ایک ذی روح اور ساتھی کی تمنائی تھی، جس کے ساتھ میں اپنے دل کی بات کرسکتی۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ میری پیدائش پر کوئی ایسی پیچیدگی ہوگئی تھی کہ بی جان مزید اولاد پیدا کرنے سے قاصر تھیں، شاید اسی لیے ان کی پوری توجہ صرف مجھ پر ہی تھی، اکلوتی اولاد جو ٹھہری تھی میں ان کی۔

☆......☆

اس خدشے کے پیش نظر کہ کوئی مجھے اٹھا کر نہ لے جائے، اسکول میں بھی ایک نوکر میری حفاظت پر مامور تھا۔ گویا میں اپنی مرضی سے بس ایک سانس ہی تھی، جو لے سکتی تھی، پھر کالج میں قدم رکھا تو گاڑی میں کالے رنگ کے شیشے لگے ہوتے تھے، میں جس میں سے باہر تو دیکھ سکتی تھی، لیکن باہر سے کوئی اندر نہیں جھانک سکتا تھا۔

آغاجی کی ایک طرف یہ خواہش تھی کہ بیٹی اعلیٰ تعلیم حاصل کرلے تو دوسری طرف بے شمار پابندیاں۔ نہ کسی سے دوستی کی اجازت تھی اور نہ کسی فنکشن کو اٹینڈ کرنے کی آزادی، یعنی کہ "لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام۔" آغاجی کی خواہش تھی کہ میری شخصیت تعلیم کے ساتھ ساتھ خوب نکھرے اور ساتھ ساتھ زندگی کی ہر خوشی سے محروم بھی رہے، یہ ان کی کچھ عجیب سی منطق تھی۔ میں زیادہ اصرار کرتی تو جواب ملتا۔

"تم ضد نہ کیا کرو، کیوں کہ ہم تمہیں عیان کی طرح کھونا نہیں چاہتے۔" میرا دل کرتا کہ وہ چیخ چیخ کر کہے کہ "آغاجی آپ کی بے جا سختی نے میری خواہشوں کا خون کردیا ہے اور آپ کے ظلم کی سزا میرے معصوم بھائی کو ملی ہے۔"

میں نے آج تک کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی، بلکہ بچپن سے لے کر جوانی تک میں نے گاؤں کے ہر اس شخص کی دل جوئی کی تھی، جو میرے والد کی سختی کا شکار ہوئے تھے، اس لیے گاؤں کا ہر چھوٹا بڑا میری عزت بھی کرتا تھا اور مجھ سے محبت بھی۔

☆......☆

ایک روز پھر آغاجی کی میرے ڈاکٹر بننے کی خواہش پوری کرنے کے لیے میرا میڈیکل کالج میں داخلہ بھی ہوگیا۔ میں داخلے سے زیادہ اس آزادی پر خوش تھی، جو ہوسٹل میں رہ کر مجھے ملنے والی تھی۔ ہوسٹل میں میری روم میٹ 'فیبا' جو میری کلاس فیلو بھی تھی، بے حد خوش مزاج، پُراعتماد اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔ شوخی اور شرارت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنے بہن بھائیوں اور والدین کے ذکر پر اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ چیخ چیخ کر اس محبت کا اعلان کرتی جو اس کے چھوٹے بہن بھائیوں کو اس سے تھی۔ سارا دن ہنسنے مسکرانے والی لڑکی ماں باپ کے ذکر پر رو پڑتی اور پھر میں اور بھی زیادہ احساس کا شکار ہوجاتی جو اس کے سامنے بزدل اور خود اعتمادی سے محروم لڑکی تھی۔ ہاں میرا اکیڈمک ریکارڈ بہت شان دار اور قابل فخر تھا۔ وہ ایک ہی دن میں مجھ سے اتنی بے تکلف ہوگئی تھی جیسے برسوں کی جان پہچان ہو، چپ رہنا تو گویا اسے آتا ہی نہیں تھا، جبکہ میں ٹھہری کم گو، مگر اس کے سامنے میری بولتی بند نہ رہتی۔ وہ مجھ سے صرف پندرہ دن پیشتر کالج میں آئی تھی، لیکن میڈیکل کالج میں اپنی کلاس کے ہر لڑکی اور لڑکے کا نام حتیٰ کہ ان کے متعلق پوری معلومات اسے یاد تھی۔

پہلے دن جب کالج میں مجھے چھوڑ کر فیبا کسی سے ملنے چلی گئی تھی تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے، مجھے لگتا تھا کہ جیسے ہر ایک کی نظر مجھ پر ہی ہے اور میں گھبرا کر اپنا اسکارف صحیح کرنے لگتی تھی جو بار بار میرے سر سے پھسل رہا تھا۔ اناٹومی کے پروفیسر صاحب ابھی آئے نہیں تھے اور پورا ہال خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

"خاتون! آپ کیا کسی چڑیا گھر سے آئی ہیں یا ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج ہیں۔"

کوئی میرے بالکل قریب سے بولا تھا اور میں خوف زدہ ہوکر اچھل پڑی تھی۔

"اے مسٹر! یہ تم نے خاتون کس کو کہا؟" اچانک فیبا پیچھے سے آگئی اور کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بگڑ کر بولی۔

"بھئی اپنی دوست کا تعارف تو کراؤ۔" "یہ تو ایسے بیٹھی ہیں جیسے موقع ملا تو رسیاں تڑا کر بھاگ جائیں گی۔"

"دیکھو زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرو۔ میری دوست یہاں پڑھنے آئی ہے، اپنا تعارف کرانے نہیں، چلو یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

فیبا کا رعب ایسا تھا کہ وہ لڑکا بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"اور یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟" میری روتی شکل دیکھ کر وہ ڈپٹ کر بولی۔

"پری وش تمہیں اعتماد کے ساتھ سر اُٹھا کر جینا ہوگا، ورنہ سر جھکا کر چلنے والے ہمیشہ ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں۔ تم مستقبل کی ہونے والی ڈاکٹر ہو، ہمت اور حوصلے سے کام لو۔ یہ تو ابتدا ہے، میڈیکل کالج کی ٹف لائف کے پانچ سال تم کیسے گزارو گی۔"

"یہاں کوئی ہوا نہیں ہے، سب ہمارے ہی جیسے انسان ہیں۔ سب سے گھل مل کر رہو گی تو وقت اچھا گزرے گا اور تمہارے اندر خود اعتمادی بھی پیدا ہوگی۔" میری سہمی ہوئی شکل اور نم آلود پلکوں کو دیکھ کر اس نے مزید ڈانٹنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ تم کیوں معمولی معمولی باتوں پر رونے بیٹھ جاتی ہو؟ کوئی تم سے بات کرلے تو تمہاری ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں اور شکل پر بارہ بج جاتے ہیں۔ خدا کی بندی میں بے شک تمہارے ساتھ ہوں، لیکن تمہارا سایہ تو نہیں بن سکتی نا؟ حوصلہ تو تمہیں خود ہی پکڑنا ہوگا۔"

اب میں اسے کیا بتاتی کہ ماں باپ کی حد سے زیادہ توجہ، حفاظت اور بے جا پابندیوں نے مجھے بزدل بنا دیا ہے اور خود اعتمادی کی دولت مجھ سے چھین لی ہے۔ آغا جی کی سختی اور بے رحمانہ رویّے نے مجھ سے میرا بھائی چھین کر دنیا میں تنہا کردیا ہے۔ اب سوچو اس میں میرا کیا قصور کہ میں ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی کہ جس کی ایک ایک روایت سے مجھے نفرت ہے۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں حویلی کی اُن اونچی اونچی فصیلوں کو پھلانگ کر کہیں دور بھاگ جاؤں۔"

"یہ تم اچانک بیٹھے بیٹھے سو کیوں جاتی ہو؟" فیبا بگڑ کر بولی۔ "مجھے لگتا ہے خسرو کی روح تم میں حلول کرگئی ہے یا تم دونوں میں کوئی روحانی تعلق ہے۔" میری سوالیہ نگاہوں پر وہ جلدی سے بولی۔

"یہ ہمارا ایک کلاس فیلو ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح آدم بے زار، گُم صُم اور کھویا کھویا سا لڑکا ہے۔ کسی سے زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتا، مگر مجھ سے بڑی دوستی ہے اس کی۔ وہ بھی تمہاری طرح اکلوتا ہے اور مجھے اپنی بہن بنا کر اس نے میرے سارے ارمانوں پر پانی پھیر دیا ہے۔"

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

فیہما نے مصنوعی ٹھنڈی سانس بھری تو مجھے ایک دم ہنسی آ گئی۔ میں جانتی تھی کہ فیہما کس قدر صاف دل کی بلند کردار لڑکی ہے۔

☆......☆

پھر اچانک ایک دن میری خسرو سے مڈبھیڑ ہوگئی۔
''پری وش یہ خسرو ہے ہمارا کلاس فیلو۔''

میں نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور پھر اپنی جگہ پر جیسے جم کر رہ گئی۔ پتا نہیں کیوں میرے دل کی دنیا کی ڈگمگاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کی گہری شربتی آنکھیں، جن میں سارے جہاں کا درد ہلکورے سا رہا تھا اور مسکراہٹ کرب کے خول میں چھپی ہوئی تھی۔ اس کے گولڈن بال لاپروائی سے پیشانی پر پڑے تھے، مجموعی طور پر وہ خوب صورتی کا اعلیٰ شاہکار تھا۔

میں نے گھبرا کر آنکھیں جھکالیں، پھر رات ہوتے ہی میرا وجود کانچ کے ٹکڑوں کی مانند بکھرنے لگا۔ میں اپنے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کرتی تو رات احساس کی آگ میں جلتے جلتے دن ہونے کا اعلان کردیتی اور فیہما میری سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مطالعے کی عادت سمجھ کر نظر انداز کردیتی، اس کو رات دیر تک جاگ کر مطالعہ کرنے کی عادت نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ میں یونیورسٹی کے ماحول کی عادی ہونے لگی۔ خوداعتمادی نے میرے وجود کو استحکام بخشا، جس میں بڑا ہاتھ فیہما کی کوششوں کا تھا۔ اب میں سر اٹھا کر کسی کی بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکتی تھی۔

☆......☆

خسرو کی محبت دن بہ دن میرے حواسوں پر چھاتی جارہی تھی۔ آغاجی اور بی جان کی ہدایت، ان کی نصیحتیں اور خاندانی روایات کی نادیدہ زنجیروں سے جیسے میں نے خود کو آزاد کرلیا تھا پھر رفتہ رفتہ میری خاموش محبت کا اثر خسرو پر بھی ہونے لگا اور ایک دن یہ جذبہ بھرپور طریقے سے عیاں ہوگیا۔ جب بخار کی وجہ سے میں دو تین دن کلاس اٹینڈ نہ کرسکی اور وہ بے قرار ہو ہو کر فیہما سے میری خیریت پوچھتا رہا۔ فیہما ٹھہری اڑتی چڑیا کے پر گننے والی، آخر اس نے خسرو سے اُگلوا کر ہی چھوڑا کہ اس کے دل میں میرا کیا مقام ہے اور میری کوئی بات تو اس سے چھپی بھی نہ تھی، مگر وہ میرے اس وعدے کی پابند تھی کہ کبھی میری کیفیت خسرو پر ظاہر نہیں کرے گی، کیوں کہ مجھے اپنی ''انا'' خود سے بھی زیادہ عزیز تھی اور جذبوں کو عریاں کرنا مجھے منظور نہ تھا اور پھر جب میں نے ہوسٹل سے آکر کلاس اٹینڈ کرنا چاہی، تو خسرو راہ میں حائل ہوگیا۔

''پلیز پری وش آج اپنا وقت مجھے دے دو۔'' اس کی آنکھوں میں دردناک قسم کی التجا تھی اور میں خاموشی سے اس کے ساتھ آکر ایک گوشے میں بیٹھ گئی جہاں کوئی اور نہ تھا۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے بے شمار باتیں کیں اور اپنے اپنے دُکھ شیئر کیے اور خسرو نے اپنی زندگی کی کہانی مجھ پر آشکارا کی۔

''کیا بتاؤں پری وش تمہیں، تم تو خود روایتوں میں جکڑی ہوئی ایک مجبور لڑکی ہو، لیکن میرے ساتھ کوئی روایت نہیں ہے، کیوں کہ میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں، مگر نہ جانے میرے باپ کی کیا مصلحت ہے کہ اولاد کو پیار ہی نہ کیا جائے۔ شاید اس طرح ان کے رعب اور دبدبے میں کمی آجاتی ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک میں باپ کی شفقت اور محبت سے محروم رہا اور ''اُلو کا پٹھا'' ، ''کتیے کا بچہ'' ان کا تکیہ کلام رہا ہے۔ میرا بھی دل چاہتا تھا اوروں کی طرح ابا کی بانہوں میں جھول جاؤں۔ وہ میرے لاڈ اور نخرے اٹھائیں، میں ضدیں اور فرمائشیں کروں اور وہ خوشی خوشی انہیں پورا کریں، مگر پوری زندگی مجھے جھڑکیوں اور گالیوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ جب تک میری ماں زندہ تھی، ان کی چاہت اور والہانہ محبت کی وجہ سے ابا کی بے اعتنائی اور تغافل کا احساس مجھے نہیں ہوا، لیکن میری ماں، جو میرے لیے چھپر چھایا تھی، چار سال پہلے گزر گئی تو میں تپتے اور آگ برساتے کھلے آسمان کے نیچے آگیا۔ تب مجھے شدت سے احساس ہوا کہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی میں بالکل تنہا ہوں، بلکہ اگر مرتی ہوئی ماں نے میرے باپ سے مجھے اعلیٰ تعلیم دلانے کا وعدہ نہ لے لیا ہوتا، تو آج میں اس مقام پر بھی نہیں ہوتا۔ تم تو یہ جانتی ہو کہ روز شام کو میں ٹیوشن پڑھا کر اپنا خرچہ نکالتا ہوں ورنہ ابا تو سارا دن مفت کی روٹیاں توڑنے کا طعنہ دیتے رہتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں ایس علی خان کا سگا نہیں سوتیلا بیٹا ہوں، مگر میں کیا کروں کہ مجھے اپنے باپ سے شدید محبت ہے اور میں

جلد سے جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر اپنے باپ کو دنیا کی ہر آسائش دینا چاہتا ہوں۔''

جب وہ مجھے اپنی کہانی سنا رہا تھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور ضبط کرنے کی کوشش میں وہ سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا مجھے ایسا لگا کہ میرا دُکھ تو خسرو کے دکھ کا عُشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔

☆......☆

پھر ایک دن خسرو مجھ سے اپنے گھر چلنے کے لیے اصرار کرنے لگا کہ اس کے ابا اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں ڈر گئی کہ میں تو آج تک ہوسٹل سے باہر نہیں گئی تھی، پھر آغاجی کا خوف ہمہ وقت میرے ساتھ رہتا تھا، لیکن فیہما کے حوصلہ دلانے اور ساتھ چلنے پر ہمت کر بیٹھی۔

خسرو کا گھر حویلی کے مقابلے میں بہت چھوٹا...... مگر خوب صورت اور صاف ستھرا تھا۔ خسرو کے ابا بالکل مختلف اور کسی حد تک خوف ناک بھی تھے۔ خسرو پتا نہیں کس پر گیا تھا، شاید ماں پر۔ ان کا گہرا سانولا رنگ، گھنی مونچھیں، داڑھی اور ساتھ ہی چہرے پر کرختگی اور خشونت۔ انہوں نے جس طرح خسرو کے تعارف پر مجھے کینہ توز نظروں سے گھورا تو میں اندر تک لرز گئی۔

''تمہارے باپ کا نام کیا ہے لڑکی؟'' انہوں نے کرخت لہجے میں پوچھا اور مجھ سے پہلے فیہما بول پڑی۔
''آغا سکندر علی خان۔''

''لڑکی میں نے تم سے سوال نہیں کیا۔'' وہ بگڑ کر بولے، پھر ان کے لہجے میں حلاوت دَر آئی۔
''تم آغا سکندر علی خان کی بیٹی ہو؟''

''جی!'' میرے حلق سے مَری مَری سی آواز نکلی، پھر میں ہمت کر کے پوچھ بیٹھی۔ ''کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟''

''کون نہیں جانتا تمہارے باپ کو۔ ان کا ایک نام، ساکھ اور ایک مقام ہے۔ ہم تو سوچ رہے تھے کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کیسے لگا گا؟ لیکن ہمارے بیٹے کی پسند ہی اب ہماری پسند ہے۔''

''ابا! فائنل کے بعد پری وش اپنے گھر جا کر اپنے آغاجی سے بات کرے گی۔'' خسرو نے خوش ہو کر جلدی سے کہا۔

''سوچ لو بیٹا! اس ٹائپ کے لوگ روایت پسند اور سخت مزاج ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں خاندان سے باہر شادی کرنا جرم میں شمار ہوتا ہے اور تم ہمارے اکلوتے بیٹے ہو۔'' ایس علی خان کا تجزیہ غلط نہیں تھا، کیوں کہ دوسرے دن جب باضابطہ طور پر خسرو نے مجھے انگوٹھی پہنائی تھی تو میں خوف سے لرز اٹھی تھی۔

''اے خدا مجھے اس امتحان سے بچالے۔'' میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اپنے خدا سے التجا کی تھی اور میری آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔

☆......☆

فائنل کا امتحان دیتے ہی جدائی کا وقت آ گیا۔ اگر فیہما جیسی دوست اور خسرو جیسا ساتھی میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید تنہائی کا زہر مجھے نگل لیتا۔ جانے سے پہلے خسرو خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

''پری وش مجھے چھوڑ کر مت جاؤ، میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔ مجھے احساسِ محرومی کے بھنور سے صرف تمہاری چاہت نے ہی نجات دلائی ہے۔ تم نے اپنے ایثار و محبت کے سہارے مجھے خوب سیراب کیا ہے۔ اب مجھے تم زندگی کے اس لق و دق صحرا میں کس کے سہارے چھوڑ کر جارہی ہو؟ مانا کہ تم ایک بڑے جاگیردار کی بیٹی ہو، لیکن کیا تمہیں یہ سب پہلے سے نہیں معلوم تھا، پھر تم نے مجھے ایسے خواب کیوں دکھائے جن کی تعبیر تمہیں بھی نہیں معلوم تھی، لیکن اتنا جان لو کہ محبت معاشرتی پابندیوں، سماج کی دیواروں، روایتوں کی ہٹ دھرم زنجیروں اور دولت کی فصیلوں سے ماورا ہوتی ہے۔ تم نے جان بوجھ کر مجھے اس راستے کا مسافر بنایا ہے، جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی، لیکن اب تم مجھے بیچ منجدھار میں چھوڑ کر نہیں جاسکتیں۔ کوئی آس کا جگنو، کوئی اُمید کا موتی، کچھ تو اس دریدہ دامن میں ڈال کر جاؤ، تاکہ وہ میرے زندہ رہنے کا جواز تو ہوسکے۔'' خسرو کی جذباتی باتوں نے مجھے بھی جذباتی کردیا تھا۔

''خسرو آغاجی تمہیں کبھی قبول نہیں کریں گے۔ میں جانتی ہوں، مگر مجھے اقرار ہے کہ تمہارے بغیر میں بھی زندہ نہ رہ سکوں گی۔ آؤ کہیں بھاگ چلیں، دُور بہت دُور، جہاں ہمارے درمیان کوئی نہ ہو۔'' میں نڈر

www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرح رونے لگی اور خسرو کے جھنجوڑنے اور ملامت آمیز نظروں نے مجھے ہوش کی دنیا میں لا پھینکا، جن میں حیرت بھی تھی اور......

"مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی، پری وش۔ میں جانتا ہوں تم اس وقت جذباتی ہو رہی ہو، لیکن ہمیں جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہے۔ ہمیں اپنی منزل پر دل کی لگن، عزم صمیم اور آہنی ارادوں سے پہنچنا ہے۔ تمہاری رگوں میں ایک شریف باپ کا خون دوڑ رہا ہے تو میرا خون بھی اتنا گھٹیا نہیں کہ عزتوں کو روند کر اپنی آرزوؤں کی تکمیل کرلوں۔"

"میں مر تو سکتا ہوں، مگر اپنی اور تمہاری پاکیزہ محبت کو بدنام نہیں کرسکتا۔ مجھے خوشی ہوتی اگر تم یہ کہتیں کہ آؤ ہم دونوں مل کر مر جائیں، مگر وہ بھی غلط ہوتا۔ دنیا میں رسوا ہونے کے علاوہ اپنے رب کے سامنے کیا منہ لے کر جاتے کہ خودکشی حرام ہے۔ موت اور زندگی تو اس سوہنے رب نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ تو پھر ہم اپنے اسی خالق سے اپنی خوشیوں کی دعا کیوں نہ مانگیں، جو ماں سے بھی ستر گنا زیادہ اپنے بندوں کو چاہتا ہے۔" خسرو کی آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی اور میری نگاہوں میں اس کا مقام اور بھی بلند ہو رہا تھا۔

☆......☆

میں حویلی پہنچی تو خاندان کے علاوہ پورا گاؤں میرے استقبال کے لیے موجود تھا۔ آغا جی نے پہلی مرتبہ محبت کی شدت سے مجھے اپنے گلے سے لگا کر بوسہ دیا تو میری روح اندر تک شانت ہوگئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میں حیران بھی ہوئی، مگر میرا کزن علی، جو ہمیشہ میرے گاؤں آنے پر باجی باجی کہہ کر میرے آگے پیچھے پھرتا تھا، آج نہ جانے کیوں خاموش تھا۔

"کیا بات ہے آج میرے منے بھائی کو باجی کا آنا اچھا نہیں لگ رہا۔" میں نے ہنس کر ایک دھپ اس کی کمر پر رسید کی تو اس کا منہ بن گیا۔ اس کا قد اچھا خاصا نکل آیا تھا، لیکن چہرے کی معصومیت جوں کی توں تھی، البتہ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ سب حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے، کیوں کہ کسی کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ کس طرح ایک بزدل اور جھینپو لڑکی "خود اعتمادی" کی دولت سے مالا مال ہوگئی ہے۔ میں سب کچھ بھول کر اپنوں میں آکر بہت خوش تھی، مگر یہ خوشی ایک بوجھ کی طرح مجھ پر آگری، جب بی جان نے بتایا کہ چوں کہ خاندان میں کوئی اور لڑکا نہیں ہے، اس لیے میری علی سے شادی طے کردی گئی ہے۔ کہاں میں ڈاکٹر اور کہاں مجھ سے کافی چھوٹا انٹر پاس علی۔

بی جان کو نہ جانے میرے چہرے پر کیا نظر آیا کہ وہ دُکھ سے بولیں۔

"بیٹا اس فیصلے سے میں بھی خوش نہیں ہوں، مگر مجبور ہوں کہ عورتوں کی نہ تو کوئی آواز ہوتی ہے اور نہ ہی اوقات۔ ہماری روایت یہی ہے کہ خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے، تاکہ ہماری جائیداد غیروں میں نہ چلی جائے۔"

"بی جان آپ کو روایات بیٹی کی خوشیوں سے زیادہ عزیز ہیں؟ رہی جائیداد کی بات تو میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی جائیداد پر، جو انسان سے اس کے جینے کا حق بھی چھین لے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے آپ کی دولت و جائیداد سے، مجھے صرف اپنی مرضی سے جینے کا حق دے دیں۔"

کاش آغا جی آپ نے اعلیٰ تعلیم دلا کر مجھے شعور نہ بخشا ہوتا، جو میں آپ کے فیصلے کو ظلم و جبر تصور کرتی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ گھر سے بھاگ کر ان روایات کی دھجیاں بکھیر دوں، جو انسان کا خون چوس لیتی ہیں۔ اگر خاندان سے باہر شادی کرنا جرم ہے تو یہ کس قانون کی کتاب میں لکھا ہے؟ میرا دل چاہا کہ ان اونچی اونچی کھوکھلی خود ساختہ دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں، مگر خسرو کی باتیں اور اس کا دیا ہوا اعتماد اور حوصلہ میرے ساتھ تھا۔ اب مجھے اپنا کیس خود لڑنا تھا۔ بی جان بہت ہی جہاندیدہ خاتون تھیں۔ انہیں میری خاموش نگاہوں میں بغاوت نظر آئی تو بے ساختہ پوچھ بیٹھیں۔ "کیا تم کسی کو پسند کرتی ہو؟"

"جی ہاں!" میں نے بے خوفی سے انہیں جواب دیا۔

"اگر کسی کو پسند کرنا جرم ہے، تو یہ جرم میں کرچکی ہوں۔ جس کی سماجی، اخلاقی اور مذہبی طور پر مجھے اجازت ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ اس کی محبت نے مجھے جینے کا حوصلہ دیا ہے اور اس نے بغاوت کے جراثیم کچل دیے ہیں، کیوں کہ وہ مجھے عزت و وقار اور والدین کی اجازت سے لے جانا چاہتا ہے۔ وہ بے شک ہماری طرح امیر نہیں ہے، لیکن وہ بلند کردار اور اعلیٰ نسب ہے اور اس کی شرافت ثابت کرنے کے لیے ثبوت آپ کی بیٹی کی گواہی ہے۔" میں نے روتے ہوئے بی جان کو جھنجوڑ ڈالا۔

"بی جان مجھے آغا جی کی عزت اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، اس لیے علی سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں موت کو گلے لگا لوں۔" مجھے گلے لگا کر بی جان خود بھی رونے لگیں۔ وہ ایک بیوی اور رواجوں کی امین ہونے کے ساتھ ساتھ ماں بھی تو تھیں۔ ان کے جانے کے بعد علی اندر آگیا۔ اس رشتے کی نوعیت کی وجہ سے اس کے اندر ایک جھجک سی آگئی تھی، مگر میں نے حسب معمول پرانے انداز میں کہا۔

"کیا حال ہے میرے منے بھائی کا......!" تو وہ بچوں کی طرح میرے کاندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"باجی میرے لیے یہ رشتہ ناقابل قبول ہے۔ اگر میرے ساتھ زبردستی کی گئی تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گا۔" اس نے دھمکی دی تو میں ڈر گئی۔ "ورنہ میں خودکشی کرلوں گا۔"

"نہیں علی ایسا سوچنا بھی مت، تم اکیلے اس خاندان کی نرینہ اولاد ہو، اپنا بھائی تو میں پہلے ہی کھو چکی ہوں، مگر اس بھائی کو کھونے کی ہمت نہیں ہے اب مجھ میں۔ تم میرے ساتھ ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اس پاکیزہ رشتے میں دراڑ نہیں ڈال سکتی۔ ہم دونوں مل کر اس فرسودہ اور غیر شرعی روایات کے خلاف سینہ سپر ہوں گے۔"

☆......☆

رات آغا جی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا تو باوجود حوصلے اور ہمت کے میں، جی جان سے لرز اٹھی، کیوں کہ ان کا رعب و دبدبہ تو بہرحال تھا، وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔

"پری وش اتفاق سے ہم نے تمہاری اپنی ماں سے گفتگو بھی سنی اور علی کا ارادہ بھی۔ یہ سب کچھ سن کر ہمیں دُکھ تو بہت ہوا، مگر ساتھ ہی یہ خوشی بھی ہوئی کہ تمہیں خاندان کی عزت عزیز ہے اور تم نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جو ہمیں سر جھکانے پر مجبور کردے۔" ان کی باتیں سن کر میں نظریں جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

"تم خسرو کو اس کے والد کے ساتھ بلواؤ، ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"آغا جی!" میں نے لرزتے ہوئے گڑگڑا کر کہا۔

"خسرو کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، یہ غلطی میری ہے تو سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہیے۔"

"پری وش تم کیا سمجھ رہی ہو۔ کیا ہم خسرو کو سزا دینے کے لیے ملنا چاہ رہے ہیں؟" وہ دُکھ سے بولے۔

"ہم بے شک تمہاری نظروں میں سخت گیر صحیح، لیکن باپ تو ہیں نا۔ بیٹا تو ہم نے بچپن میں کھو دیا تھا، اس لیے اب تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔" ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیا پتھر بھی رویا کرتے ہیں۔ میں بے اختیار ان سے لپٹ گئی اور ان کے آنسوؤں سے میری پیشانی بھیگ گئی۔

خسرو کو تو جیسے میری کال کا انتظار تھا۔ وہ دوسرے ہی دن اپنے باپ کے ساتھ موجود تھا۔ آج وہ شاید خصوصی طور پر تیار ہوا تھا۔ اس لیے نظر لگنے کی حد تک وجیہہ اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔ ہم ماں بیٹی چھپ کر یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ اماں کی نظروں میں ستائش تھی، پتا نہیں کیوں وہ ٹکٹکی باندھ کر خسرو کو دیکھ رہی تھی اور ان کی محویت پر میں حیران بھی تھی۔

خسرو کے والد نے سر پر پگڑی باندھ کر خود کو اور بھی خوفناک بنالیا تھا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" آغا جی کا انداز تیکھا سا تھا اور عجیب بات یہ تھی کہ ان کی نگاہیں بھی خسرو پر ٹکی ہوئی تھیں اور میں اندر ہی اندر سوکھے پتے کی طرح کانپ رہی تھی کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔

"دنیا میں بے شمار لوگ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔" الیس علی خان نے لاپروائی سے کہتے ہوئے آنے کا مدعا بیان کیا، جس پر آغا جی نے سوچنے کی مہلت مانگی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ جس مرحلے کو میں مشکل سمجھ رہی تھی وہ اس آسانی سے طے ہو جائے گا۔ آغا جی دوسرے ہی دن شہر جا کر ساری معلومات کر آئے اور بغیر کسی رکاوٹ کے یہ

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

مرحلہ خوش اسلوبی سے حل ہوگیا اور پھر شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ علی اور میں دونوں ہی بے حد خوش تھے اور خوش تو بی جان اور آغا جی بھی کچھ کم نہ تھے، لیکن مجھ پر تو جیسے شادیٔ مرگ طاری تھی۔ کس طرح میں نے ایجاب قبول کیا اور نکاح نامے پر دستخط کیے، مجھے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ ہوش تو جب آیا جب مردانے حصّے میں کھلبلی مچ گئی، جوں ہی خسرو نے سائن کیے اور نکاح مکمل ہوا، اس کے ابا نے قہقہے لگانے شروع کردیے تھے۔

''آغا سکندر علی خان! یہ میرا انتقام ہے، تمہارے اس غرور و تکبر کا، جس نے میرے معصوم بچے کی جان لے لی تھی۔ تم نے نام پر غور ہی نہیں کیا۔ میں نے تمہارے بیٹے کی ولدیت نہیں بدلی تھی۔ بھلا سید اور پٹھان ایک ساتھ کیسے ہوسکتے ہیں۔ اس لیے میں نے ہمیشہ تمہارے بیٹے کے نام کے ساتھ ''ایس علی خان'' لکھا ہے۔ دیکھو غور سے، یہ تمہارا ہی بیٹا عیان ہے، جسے میں نے انتقاماً اغوا کیا تھا۔ مارنے کے لیے، مگر بیوی کی التجائیں اس کے آڑے آگئی تھیں، کیوں کہ وہ اسے اولاد کی طرح چاہتی تھی۔ جس نفرت سے تم نے میرے بیٹے کو مارا تھا، آج تمہارا بیٹا اور بیٹی خود شرم اور غیرت سے مرجائیں گے کہ دونوں سگے بہن بھائی ہیں۔'' سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو اور خسرو گھبرا کر کھڑا ہوگیا تھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں ابا؟'' اس نے اپنے باپ کو بُری طرح جھنجوڑ ڈالا۔

''مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ پوچھ اپنے باپ سے، جس نے دولت اور طاقت کے نشے میں میرے معصوم بیٹے کی جان لی تھی...... تو اسی باپ کا بیٹا ہے، جو اپنی سگی بہن سے محبت کا کھیل کھیلتا رہا اور اب اس سے نکاح بھی کرلیا۔ ڈوب مر شرم سے، اگر غیرت ہو تو......!'' شیر علی کے لہجے میں نفرت وحقارت اور سانپ کی سی پھنکار تھی اور اس سے پہلے کے خسرو کوئی غلط قدم اٹھاتا۔ آغا جی نے اسے بڑھ کر گلے لگالیا۔

''بیٹا اس شخص کی باتوں پر کان مت دھرو۔ اس نے غیر شرعی کام کر کے اللہ کے قہر کو آواز دی ہے، مگر شکر ہے میرے رب کا کہ کچھ بھی غلط نہیں ہوا۔ میں نے پہلے ہی دن تم دونوں کو پہچان لیا تھا، کیوں کہ تم ہو بہو اپنے دادا کی شکل کے ہو اور تمہارا نکاح بالکل جائز ہوا ہے، کیوں کہ پری وش ہماری بیٹی نہیں ہے، بلکہ وہ میری بھتیجی ہے یعنی تمہارے چچا کی اولاد، جنہوں نے تمہاری ماں کی حالت دیکھ کر پیدا ہوتے ہی اسے اپنی بھاوج کی گود میں ڈال دیا تھا، لیکن اس کی خبر خود پری وش کو بھی نہیں تھی۔'' اس دوران آغا جی کے کارندے شیر علی کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ خسرو بے ساختہ اپنے ابا سے لپٹ کر رونے لگا۔

''آغا جی آپ کو، آپ کا بیٹا مل گیا ہے۔ خدا کے لیے میرے بابا کو معاف کردیں۔ ان کو مجھ سے نفرت صحیح، مگر مجھے آج بھی ان سے محبت ہے۔''

شیر علی کی نظریں شرم سے جھکی ہوئی تھیں۔ جس سے وہ ساری زندگی نفرت کرتا رہا تھا، وہ آج بھی اس کی محبت کا دَم بھرتا ہے۔

''آغا جی!'' وہ دُکھ سے بولا۔ ''میرا جرم ناقابلِ معافی ہے، جو گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ میرا رب تو شاید مجھے کبھی معاف نہ کرے، مگر آپ اپنے بیٹے کے صدقے مجھے معاف کردیں۔'' شیر علی نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تو آغا جی نے اسے بڑھ کر گلے لگالیا۔

''ہمیں تم سے کوئی گلہ نہیں ہے، بلکہ ہم تو تمہارے احسان مند ہیں کہ تم نے نہ صرف ہمارے بیٹے کی تربیت اچھی کی، بلکہ اسے پڑھا لکھا کر ایک اچھا انسان بھی بنایا اور رب کی رحمت سے مایوس نہ ہو، معاف نہ کرنے کی خاصیت ہم انسانوں میں تو ہوتی ہے، لیکن پاک پروردگار میں نہیں۔ وہ تو ہم عاصیوں کو ہمیشہ ہی بخشتا اور معاف کرتا ہے، صرف اس سے ہی معافی مانگو۔'' اور میں جو اندر یہ سن کر کہ خسرو میرا سگا بھائی ہے، غیرت اور شرم سے بے ہوش ہونے لگی تھی کہ علی کی بھرپور چیخ سن کر ہوش میں آگئی۔

''باجی خوش ہوجائیں، آپ خسرو بھائی کی سگی بہن نہیں ہیں، ان کی کزن ہیں۔ چھوٹے چچا کی بیٹی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے گھسیٹ کر کھڑا کرلیا۔

''آئیں باجی اس خوشی میں ہم دونوں مل کر بھنگڑا ڈالیں۔'' مجھ پر تو گویا سکتہ طاری تھا جو خسرو کو ماں سے لپٹا دیکھ کر ہوا تھا، البتہ فیبہا برابر علی کا ساتھ دے رہی تھی اور قہقہے بھی لگا رہی تھی۔

☆......☆

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایم اشفاق بٹ

لالہ موسیٰ سے ایک یادگار، انہونی سچ بیانی

انسان سے جب کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگتا ہے۔ میں بھی ایک ایسا ہی گناہ گار ہوں، جس نے دو زندگیوں کی جان لے لی۔ یہ حقیقت ہے کہ زہریا ہتھیار سے انسان فوراً مر جاتا ہے، لیکن زبان ایک ایسا ہتھیار ہے، جو انسان کو تڑپا تڑپا کر اور پاگل بنا کر مارتا ہے۔

میں اب بھی سوچتا ہوں کہ میں نے اس طرح دو زندگیوں کی جان لی تھی کہ مجھے آج تک کوئی قانون پکڑ نہیں سکا۔ میں اب تک گرفتار نہیں ہوا، مجھے کسی جج نے کوئی سزا نہیں دی، اس کے باوجود، مگر اب تک میں ایسی سزا بھگت رہا ہوں جو شاید مر کر بھی ختم نہ ہوگی۔ آپ لوگوں کو اپنی آپ بیتی سنانے کا مقصد یہ ہے کہ مجھ جیسے بھائی پڑھیں اور پھر اس سے عبرت حاصل کریں، اپنے جرم کا سرِعام اعتراف کر دینے سے شاید میرے ضمیر سے وہ کانٹا نکل جائے جو مجھے راتوں کو سکون سے سونے بھی نہیں دیتا اور ایک خلش بن کر میرے جگر کے پار ہے۔ میری آپ بیتی ایک عبرت ناک حقیقت بھی ہے اور دردناک کہانی بھی۔

میرے خاندان کے اکثر افراد پولیس میں ملازم ہیں۔ پولیس کی ملازمت ہمیں تقسیم ہند سے قبل انگریزوں کی طرف سے تحفے میں، بلکہ ورثے میں ملی تھی۔ میرے دادا جان انگریزوں کے مخلص دوست اور وفادار ساتھی تھے۔ انگریزوں نے ان کی اس وفاداری کا بڑا لحاظ کیا اور اس کے صلے میں پولیس میں نوکری کے ساتھ ساتھ انہوں نے دادا جان کو پنجاب کے علاقے میں کئی ایکڑ زمین بھی بخش دی تھی۔ اسی وجہ سے دادا جان کا اپنے علاقے میں بہت ہی رعب و دبدبہ تھا۔

ایک تو ان کی پولیس کی ملازمت اور اوپر سے کئی ایکڑ جائیداد نے ان میں غرور اور غصہ پیدا کر دیا تھا۔ پاکستان بنا تو دادا جان اپنی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے تعلقات کے بل بوتے پر نہ صرف اپنے دو بھائیوں، بلکہ میرے ابا جان کو بھی پولیس میں بھرتی کروا دیا تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ابا جان کو تھانے دار کی وردی میں ہی دیکھا تھا۔

ان کا لہجہ و اطوار بھی دادا جان والے ہی تھے۔ اپنے رعب کی وجہ سے دادا جان اپنے علاقے کی پہچان بن گئے تھے۔ ہمارے گاؤں کا نام تو کچھ اور تھا، مگر وہ مشہور میرے دادا جان کی وجہ سے ہی ہے۔ لوگ ہمارے گاؤں کا نام لینے کی بجائے اسے رسالدار گکھڑ کا گاؤں کہتے ہیں۔ ہمارے ارد گرد پانچ گاؤں تھے۔ ان دیہاتوں میں بھی ہماری سب سے زیادہ جائیداد تھی۔

اپنے گاؤں کے علاوہ ان پانچ دیہاتوں پر گویا ہماری حکومت تھی، جن کے سربراہ ہمارے دادا جان تھے۔

گاؤں میں کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا تھا۔ ان دیہاتوں کے لوگوں کے جھگڑے دادا جان ہی نمٹاتے تھے۔ یہاں کے لوگوں کو تھانے کچہری جانے کی نوبت کم ہی آتی تھی۔

علاقے کا کوئی بھی شخص ہمارا ہم پلہ نہ تھا، اوپر سے پولیس اور تھانے داری کا دبدبہ الگ تھا۔ علاقے کا کوئی بھی شخص ہماری حکم عدولی کی تاب نہ رکھتا تھا۔ ہمارے خاندان کے ہر فرد کا احترام ان لوگوں پر لازم تھا۔ ان دیہاتوں میں جب بھی کوئی شادی طے پاتی تھی، تو تاریخ ہمارے دادا جان کی مرضی سے رکھی جاتی تھی۔

ہمارے خاندان کے ہر فرد کا نام مشہور و معروف لوگوں کے نام پر رکھا جاتا تھا، جیسے ابا جان کا نام رستم خان اور میرا اسکندر خان ہے۔ ہمارے خاندان کی اس سلسلے میں یہ انفرادیت تھی کہ اس علاقے میں کسی بھی فرد کا یہ نام نہ تھا، یہ میرے دادا جان کا حکم تھا کہ علاقے کا کوئی بھی شخص ہمارے خاندان کے کسی مرد والا نام نہیں رکھ سکتا۔

جب بھی کوئی بچہ ہمارے خاندان میں جنم لیتا تو اُس کا نام رکھنے کے بعد ڈھول بجا کر پورے گاؤں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ رسالدار گکھڑ کے خاندان میں جس بچے نے جنم لیا ہے اور اس کا یہ نام رکھا گیا ہے...... اس کے بعد علاقے کا کوئی بھی شخص وہ نام نہ رکھتا تھا۔ میری پیدائش پر بھی ایسا ہی اعلان کیا گیا تھا اور میری پرورش بھی روایتی انداز میں ہوئی تھی۔

میری ہر ضرورت اور ہر خواہش کا ہر طرح سے خیال

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

رکھا گیا تھا۔ ہائی اسکول میں پڑھنے کے بعد جب میں شہر کالج میں داخل ہوا، تب بھی میرے انداز و اطوار میں کوئی فرق نہ آیا، بلکہ اس وقت سے ہی میرا لہجہ اور انداز حکم دینے والا تھا، اسی لیے میری گہری دوستی کسی سے نہ ہوسکی تھی۔ مجھے یہ مان تھا کہ میں تھانے دار کا بیٹا ہوں۔ تھانے دار جو ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔

میں کالج میں ہی تھا کہ دادا جان کا انتقال ہوگیا۔ علاقے کے لوگوں نے شاید سکھ کا سانس لیا ہوگا، مگر اس کے باوجود ان کے جنازے میں کافی افراد نے شرکت کی تھی۔ اب ابا جان ہی اس علاقے کی رعب دار شخصیت تھے۔ انہوں نے زمینوں اور دیگر امور کو چلانے کی خاطر ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور نظام اُسی طرح چلنے لگا تھا، جیسے پہلے چلتا تھا...... میں کالج سے بی اے کرکے فارغ ہوا تو ابا جان کی تھوڑی سی کوشش سے میں پولیس میں ملازم ہوگیا۔ میں جب پہلی بار تھانے کا انچارج بن کر تھانے پہنچا تو پتا چلا کہ تھانے داری کیا ہوتی ہے۔

تھانے دار علاقے کا گویا بادشاہ ہوتا ہے، میں نے یہاں بھی اپنا خاندانی وقار بحال رکھا ہوا تھا۔ جلد ہی میرا شمار سخت ترین تھانے داروں میں ہونے لگا۔ میرے لب و لہجے میں وہی سختی آ گئی تھی، جو میرے ابا جان اور دادا جان کے اندر تھی، بلکہ میرے اندر کا غصہ تو ان کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی تھا۔ میں اپنے اسٹاف کے کسی بھی فرد کے ساتھ ذرہ بھر بھی رعایت نہیں کرتا تھا، میں چھٹی کے معاملے میں بھی کچھ زیادہ ہی سخت واقع ہوا تھا۔

سالانہ چھٹی کے علاوہ تھانے کا کوئی بھی ملازم ایک دن کی بھی چھٹی مانگتا تو میں فوراً انکار کردیتا، یہی نہیں بلکہ میں چھٹی مانگنے والے پر طنز بھی کرتا اور اسے بے عزت کرکے آفس سے باہر نکال دیتا۔ میرے تمام ماتحت مجھ سے نالاں رہتے تھے، لیکن مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں تھی۔

اس عرصے میں میری شادی بھی ہوگئی۔ میری بیوی ایک بڑے بزنس مین کی بیٹی تھی۔ میری شادی ایک یادگار شادی تھی۔ ابا جان نے اس کے لیے تجوریوں کے منہ کھول دیے تھے۔ بڑی دھوم سے بارات شہر آئی تھی۔ سیٹھ نواب نے بھی اپنی بیٹی کو نہایت ہی قیمتی جہیز دیا تھا۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی میری تبدیلی ایک دوسرے تھانے میں کردی گئی، جو ایک قصبے میں واقع تھا۔ میں خوشی سے اس تھانے میں چلا گیا، کیوں کہ وہ ہیڈ کوارٹر سے دور تھا اور وہاں آزادی بھی شہر کی نسبت بہت زیادہ تھی، مگر تھانے پہنچنے کے بعد اسٹاف سے تعارف کے دوران میری ساری خوشی اس وقت کافور ہوگئی، جب تھانے میں ایک سکندر نامی شخص سے میرا تعارف کرایا گیا۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور بھرپور جوان تھا، مگر مجھے وہ ایک آنکھ نہ بھایا، کیوں کہ وہ میرا ہم نام تھا اور میں یہ کسی صورت برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ اس تھانے میں کوئی اور بھی سکندر ہو، پھر خوامخواہ میرے دل میں اس کے لیے نفرت کی چنگاری بھڑک اُٹھی...... مجھے اس کا اچھا کام بھی بُرا لگنے لگا۔ وہ خوش تھا کہ وہ میرا ہم نام ہے، مگر میرے اندر اس کے لیے نفرت کا لاوا اُبل رہا تھا......

گو کہ یہ بات بڑی معمولی سی تھی...... اس ملک میں کئی سکندر خان ہوں گے تھے، لیکن اس وقت میرے لیے یہ بڑی بات بن گئی تھی، میں بات بات پر اُسے ڈانٹنے لگا تھا۔ میں اس کی شکل دیکھتا تو میرے مسکراتے چہرے پر غصے کی لکیریں نمایاں ہوجاتیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ نہایت ہی محنتی اور فرض شناس سپاہی ہے، مگر میں ان باتوں کو نظر انداز کرکے اکثر اُسے کام چور کہہ کر ڈانٹتا رہتا۔ وہ خود بھی میرے اس رویے پر سخت حیران تھا کہ مجھے اس سے اس قدر شدید نفرت کیوں ہے؟

وہ ڈر کے مارے مجھ سے بات بھی نہیں کرتا تھا، کیوں کہ وہ جان گیا تھا کہ مجھے اس سے شدید نفرت ہے، اسی وجہ سے اس نے میرے سامنے بھی آنا کم کردیا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ میرا اور اس کا آمنا سامنا نہ ہی ہو تو بہتر ہے......

ایک رات گشت کے دوران سکندر نے ایک چور کو اکیلے ہی قابو کرلیا اور اسے تھانے لے آیا۔ اس چور نے کئی وارداتوں کا اعتراف بھی کرلیا تھا اور سامان کی برآمدگی بھی ہوگئی تھی۔ یہ سارا کریڈٹ سکندر کو ہی جاتا تھا، مگر میں نے پھر بھی اس کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ جب میں نے اُسے بلایا تو وہ بھاگا چلا آیا، یہ جان کر کہ میں اس کی کارکردگی کی تعریف کروں گا۔ وہ سلام کرکے میرے سامنے باادب کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس سے کہا کہ ”تم نے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے، اس کے عوض میں

تمہیں پندرہ دن کی چھٹی دیتا ہوں۔“

”سر آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ وہ خوش ہوکر بولا۔ ”اس چھٹیوں میں تم نے ایک کام کرنا ہے۔“ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

”جی جناب...... حکم کریں......“ وہ ممنون بھرے انداز میں بولا۔

”ان پندرہ دنوں میں تم نے اپنا نام تبدیل کرکے آنا ہے۔“ میں نے دو ٹوک لہجے میں اس سے کہا......

”میں سمجھا نہیں جناب......“ وہ میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ”میں نام کیوں تبدیل کروں؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”تم جانتے ہو کہ ہم دونوں ہم نام ہیں، میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ یہاں دو سکندر ہوں۔ یہ میرے خاندان کی روایات کی توہین ہے، اس لیے تمہیں اپنا نام بدلنا ہوگا۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”مگر جناب......“ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”اگر مگر کچھ نہیں، ابھی گھر جاؤ اور جب تم پندرہ دنوں بعد واپس آؤ تو تمہارا نام سکندر نہیں کچھ اور ہونا چاہیے......“

میں غصے سے دھاڑا تو وہ سلوٹ مار کر باہر نکل گیا۔

پندرہ دن میں نے ایک عذاب میں گزارے۔ میں چاہتا تو اُس کی تبدیلی بھی کرواسکتا تھا، مگر مجھے پھر بھی چین نہیں آنا تھا، کیوں کہ اصل مسئلہ تو نام کا تھا۔ سولہویں دن وہ میرے کمرے میں مہذب انداز میں کھڑا تھا۔

”جس کام کے لیے تمہیں چھٹی دی تھی، وہ ہوگیا؟“ میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”جناب! اتنی جلدی اور آسانی سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔“ اس نے دونوں ہاتھ میرے آگے جوڑ دیے اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔

”یہ تحصیل اور کچہری کا معاملہ ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ یہاں کتنا وقت لگ جاتا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اب بھی سکندر ہی ہو......“ اس کی بات سن کر میرے لہجے میں سختی آ گئی۔

”جی جناب...... میں پوری کوشش کروں گا۔“

”حرام زادے...... جاؤ دفع ہوجاؤ۔“ غصے سے میری رگیں تن گئیں۔

”نکل جاؤ میرے کمرے سے۔“ میں غصے سے گرجا...... تو وہ خوف زدہ ہوکر باہر نکل گیا۔ غصے سے میرا بُرا حال ہوگیا۔ مجھے اس سے خوامخواہ کا بیر ہوگیا تھا۔

”میں اس سے نمٹ لوں گا، یہ سوچ کر میں خاموش ہوگیا۔

اس واقعے کے بعد مجھے کسی پل بھی چین نہ تھا۔ وہ آسیب کی مانند میرے دل و دماغ پر سوار ہوگیا تھا، حالاں کہ تھانے کا ہر فرد اس کی تعریفیں کرتا تھا کہ وہ نہایت ہی محنتی، ایماندار، نمازی اور پرہیزگار شخص تھا۔ میں نے اس کے بارے میں تفصیل معلوم کی تو انکشاف ہوا...... کہ وہ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے ایک شہید کا بیٹا ہے۔ اس کا باپ چونڈہ کے محاذ پر ٹینکوں والے معرکے میں شہید ہوا تھا اور حکومت کی طرف سے اسے کوئی تمغا بھی ملا تھا، اسی لیے بیٹا بھی باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔

اس کا تعلق ایک دور دراز گاؤں سے تھا جہاں اس کی ماں اکیلی رہتی تھی۔ میں نے اب اسے ہر معاملے میں تنگ کرنا شروع کردیا۔ وہ خاموش ہوجاتا، مگر بعض اوقات وہ میری منتیں کرنے لگتا تو میں اس کی اس بے بسی سے بہت ہی لطف اندوز ہوتا۔ اس نے اپنا نام اس لیے نہیں کیا تھا، کیوں کہ اس کی ماں نہیں مانی تھی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس کا نام، اس کے شہید باپ نے رکھا تھا، جسے اس کی ماں کسی صورت میں بھی نہیں بدل سکتی تھی......

سالانہ رخصت چوں کہ ہیڈ کوارٹر سے ملتی تھی، اس لیے سکندر کو بھی سالانہ رخصت دے دی گئی۔ اسی چھٹی میں سکندر کی شادی ہوگئی۔ جب وہ چھٹی گزار کر واپس آیا تو میں نے اُسے مبارکباد دینے کی بجائے جھاڑ پلادی، حالاں کہ وہ میرے لیے مٹھائی کا ڈبا لے کر میرے کمرے میں آیا تھا۔ اس نے تمام اسٹاف کو اس خوشی میں شامل کرنے کے لیے مٹھائی کھلائی تھی۔

میں نے اسے دیکھا تو غصے سے کہا ”تم میرے کمرے میں بغیر اجازت کیوں آئے ہو۔“ میں نے اس سے مٹھائی بھی نہ لی اور اسے بے عزت کرکے اپنے کمرے سے باہر نکال دیا۔

سکندر کی ہتک کرکے میری جھوٹی انا کو ایک تسکین

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہی ملتی تھی، چند ماہ اسی طرح گزر گئے، ایک روز سکندر دس دن کی چھٹی کی درخواست لے کر میرے پاس آیا۔ اس نے درخواست میں یہ لکھا تھا کہ اس کی بیوی ماں بننے والی ہے اور اس کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے، اس لیے اُسے دس دن کی چھٹی دے دی جائے۔

''بچہ تمہاری بیوی کو ہونے والا ہے۔'' میں نے درخواست پڑھنے کے بعد طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم وہاں جا کر کیا کرو گے......''

''ممکن ہے کہ بیوی کو زیادہ تکلیف ہو جائے، کیوں کہ یہ پہلا بچہ ہے۔'' اُس نے وضاحت کرنی چاہی تو۔

''تم ڈاکٹر ہو؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''جی نہیں......'' وہ بولا۔

''تو پھر تمہارا وہاں کیا کام ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔

''یہ عورتوں کا معاملہ ہے ہے...... تکلیف زیادہ ہونے کی صورت میں ممکن ہے بیوی کو کسی نزدیکی اسپتال لے جانا پڑ جائے۔'' وہ التجائیہ لہجے میں بولا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ حالات خراب ہیں۔'' میں نے سنگدلی سے کہا۔

''کسی بھی وقت ایمرجنسی لگ سکتی ہے، اس لیے تمہیں چھٹی نہیں مل سکتی۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی درخواست ردّی کی ٹوکری میں پھینک دی۔

وہ مزید ایک لفظ بھی نہ بولا اور منہ لٹکائے کمرے سے باہر نکل گیا۔

پندرہ دن بعد وہ پھر چھٹی کی درخواست لے کر میرے سامنے کھڑا تھا، جس میں اُس نے لکھا تھا کہ اُسے گاؤں سے ماں کا خط آیا ہے کہ اس کی بیوی نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔ وہ اس خوشی کے موقع پر گاؤں جانا چاہتا ہے، لہٰذا اسے صرف دو دن کی رخصت دی جائے۔

میں نے اسے اس کے بیٹے کی مبارکباد بھی نہ دی، بلکہ اُلٹا اسے یہ کہہ کر شرمندہ کر دیا کہ تمہارے گاؤں گئے بغیر ہی اوپر والے نے تمہیں بیٹا دے دیا ہے، اس بار بھی تمہارے نہ جانے سے کوئی تقریب رُکے گی نہیں، تمہارے بیٹے کے ختنے بھی ہو جائیں گے اور بال بھی اُتر جائیں گے، فی الحال تمہیں چھٹی نہیں مل سکتی۔''

''اگلے ماہ میں تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی دوں گا۔''

میں نے اُسے ٹال دیا، مگر وہ میری منتیں کرنے لگا کہ اسے بیٹے کو دیکھنے کی بہت تمنا ہے، مگر میں نے پھر بھی اُسے چھٹی نہ دی، ایسا کر کے مجھے ایک تسکین کا احساس ہوتا تھا۔ مجھ پر اس کی کوئی آہ و فریاد اثر ہی نہ کرتی تھی، لہٰذا اس بار بھی وہ خاموشی سے کچھ کہے بغیر چلا گیا، پھر ایک روز وہ بیٹے کی بیماری کا ٹیلی گرام لے کر آیا کہ میں اُسے گاؤں جانے دوں...... مگر میں نے پھر بھی اُسے چھٹی نہ دی۔

دو دن بعد جمعہ تھا۔ ہم سب نے نزدیکی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ نماز پڑھ کر میں جلدی میں گھر لوٹ آیا کہ کھانا کھانے کے بعد تھانے جاؤں گا۔ نماز جمعہ کے بعد کسی نے سکندر کو ایک تار دیا، جس میں اس کے بیٹے کی وفات کی خبر تھی۔ بیٹے کی موت کی خبر سن کر سکندر کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ اس وقت بلک بلک کر رو دیا۔ اس نے مسجد میں داخل ہو کر آسمان کی جانب اپنے دونوں ہاتھ اور چہرہ اٹھایا اور بولا......

''تھانے دار سکندر خان، تم میرے بیٹے اور میری خوشیوں کے قاتل ہو، اللہ کرے کہ تم بھی کبھی اپنی اولاد کا چہرہ اور اس کی خوشیاں نہ دیکھو اور نہ تم کو یہ خوشیاں کبھی نصیب ہوں......'' اس کے بعد اس نے بغیر چھٹی لیے گاؤں کے لیے رخت سفر باندھا اور اپنے گاؤں روانہ ہو گیا۔ یہ بات بعد میں لوگوں نے مجھے بتائی تھی کہ اس نے مجھے ہاتھ اُٹھا کر بد دعا دی ہے۔ میں نے اس کے خلاف اس وقت تو کوئی کارروائی نہ کی اور سب کچھ اس کی واپسی تک کے لیے چھوڑ دیا۔ میں نے اُسے بغیر اجازت گاؤں جانے پر کڑی سزا دینے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ میں اب اُس کی واپسی کا منتظر تھا، مگر دن گزرتے گئے اور وہ واپس لوٹ کر نہ آیا......

دو ماہ گزرے تو میں نے اس کے علاقے کے تھانے دار کو ٹیلی گرام بھیجا کہ ''سپاہی سکندر بھگوڑا ہو گیا ہے، لہٰذا اسے گرفتار کر کے یہاں بھیجا جائے۔''

وہاں سے جواب آیا کہ ''سکندر گاؤں آیا تھا اور وہ اپنے بیٹے کی قبر سے لپٹ کر بلک بلک کر رویا تھا۔ اس کے رونے کی آواز دور دور تک سنی گئی تھی، اسے بیٹے کی موت کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہ قبر سے لپٹ کر روتا رہا اور وہاں ہی اس کی روح پرواز کر گئی۔ اب بیٹے کی قبر کے ساتھ ہی اس کی قبر بھی بنی ہوئی ہے۔''

سچ کہتے ہیں کہ جب کوئی جان سے بھی عزیز اس دنیا سے جاتا ہے تو پھر جینا مشکل ہو جاتا ہے اور کچھ تو جانے والے کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے اور خود بھی خاک میں مل کے خاک ہو جاتے ہیں......

یہ تار پڑھ کر میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا، مگر پھر بھی مجھے کوئی پچھتاوا نہ ہوا۔ تھانے کے اسٹاف کے سبھی لوگ افسوس کرنے اس کے گاؤں تک گئے۔ انہوں نے اس کی بیوی کی مالی امداد بھی کی، مگر میں پتھر کا بت ہی بنا رہا۔ میرے اندر وہ حس ہی ختم ہو گئی تھی جس کا تعلق ضمیر سے ہوتا ہے، نہ جانے کیوں اس کی بیوی کی طرف سے پنشن کی درخواست بھی نہ آئی پھر میں بھی جلد ہی اسے بھول گیا۔

ان ہی دنوں میری بیوی امید سے تھی۔ میں ہی نہیں بلکہ میرے گھر کے سب لوگ ہی حویلی میں رونق دیکھنا چاہتے تھے۔ ابا جان کہتے تھے کہ بیٹا ہی ہوگا اور میں اس کا نام محمد علی رکھوں گا۔ ابا جان آئے تھے اور میری بیوی کو ساتھ لے کر حویلی چلے گئے تھے، کیوں کہ وہ بچے کی ولادت حویلی میں ہی چاہتے تھے۔ ان ہی دنوں میری تبدیلی پنجاب کے دور دراز شہر میں ہو گئی، مگر میں بیوی کی طرف سے فکر مند نہ تھا۔ میں تو بس گاؤں سے خوش خبری سننے کا منتظر رہنے لگا تھا......

پھر ایک روز فون پر جب ابا جان نے مجھے ایک بیٹے کا باپ بننے کی خوش خبری سنائی تو میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں بدھ کو گاؤں آ جاؤں گا۔ میں نے بدھ والے دن ہی شہر جا کر ڈھیروں کھلونے اور قیمتی کپڑے خریدے اور خوشی خوشی سرکاری جیپ میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب میں گاؤں پہنچا تو شام ڈھل چکی تھی، پھر میں نے اپنی حویلی کے باہر گاؤں کے لوگ جمع دیکھے اور حویلی میں سے رونے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں وہ بھی سنیں تو میں لوگوں سے ملے اور کچھ پوچھے بغیر حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔ ماں نے مجھے دیکھا تو میرے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ میرا بیٹا جو صرف سات دن کا تھا، فوت ہو گیا تھا۔ اس کی بیماری اور موت کی وجہ کسی کی سمجھ میں ہی نہ آئی تھی۔ رو دھو کر ہم سب نے صبر کر لیا۔ میں نے بیوی کو ساتھ لیا اور واپس ڈیوٹی پر آ گیا۔

اس بات کو اب کئی برس بیت گئے ہیں۔ میں نے قبل از وقت ہی ریٹائرمنٹ لے لی ہے۔ ہماری حویلی ابھی تک وارث سے محروم ہے۔ اب ہمارے گاؤں میں نام نہ رکھنے والی پابندی بھی ختم ہو گئی ہے۔ یہ پہلا پتھر میں نے ہی پھینکا تھا۔ میں ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ مجھ میں اور میری بیوی میں کوئی نقص بھی نہیں ہے، مگر کوئی بھی بچہ ہمارے یہاں ایک ہفتے سے زیادہ زندہ نہیں رہتا۔ میری بیوی امید سے ہوتی ہے، وہ بچے کو جنم بھی دیتی ہے، مگر کوئی بھی بچہ ایک ہفتے سے زیادہ زندہ نہیں رہتا، حالاں کہ ہماری اولاد صحت مند اور خوب صورت ہوتی ہے۔ اس میں کسی قسم کا پیدائشی نقص بھی نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر بھی ان کے ہر طرح صحت مند ہونے کی تصدیق کرتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ ایک ہفتے سے زائد زندہ نہیں رہتے، بس اچانک ہی انہیں بخار یا کوئی اور تکلیف ہوتی ہے اور وہ زندگی سے ناتا توڑ جاتے ہیں، ایسا سات بار ہو چکا ہے، اس لیے اب تو اولاد پیدا کرنے سے بھی ہمیں خوف آنے لگا ہے۔ میں نے پہلے تو اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ تقدیر میرے ساتھ ایسا مذاق کیوں کر رہی ہے، پھر ایک رات میں نے خواب میں سکندر کو دیکھا تو مجھے اس کی بد دعا یاد آ گئی۔ پچھتاووں نے مجھے گھیر لیا کہ میں تو ایک مظلوم کی بد دعا کا شکار ہوں اور مظلوم کی آہ تو عرش تک جاتی ہے اور بارگاہِ الٰہی میں شرف قبولیت حاصل کرتی ہے۔ میں سکندر کا مجرم تھا۔ ہاں میں ایک مجرم ہوں اور مجرم ہی رہوں گا اور اسی جرم کی سزا ابھی تک بھگت رہا ہوں اور نہ جانے کب تک بھگتتا رہوں گا۔

یقین کریں کہ میں اور میری بیوی سکندر کی دی ہوئی بد دعا سے ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہیں اور لگتا ہے کہ میں اس دنیا سے نامراد ہی ہو جاؤں گا۔ میرے گناہوں کی سزا میری بیوی کو بھی مل رہی ہے۔ میں اپنی بیوی کا بھی مجرم ہوں اور سکندر کا بھی......

میں اپنی بیوی کے ہمراہ سکندر کے گاؤں گیا تھا۔ ہم سکندر کی قبر پر بھی گئے تھے اور اس سے رو رو کر اپنے کیے کی معافی بھی مانگی ہے، مگر ہمیں معافی نہیں ملی، کیوں کہ معافی دینے والی ذات تو اوپر بیٹھی ہے اور میں شاید اس قابل نہیں ہوں کہ مجھے معاف کیا جائے۔

☆......☆

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کفارہ

محمد عمیر شہزاد

ہری پور سے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرتی ایک دوشیزہ کی عبرت انگیز کہانی

نصف شب کا وقت تھا۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل تھے۔ آندھی اپنے زوروں پر تھی۔ ہر چیز پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ صرف سڑک پر آتی جاتی کسی گاڑی کی روشنی اردگرد دیواروں سے ٹکراتی یا آسمانی بجلی کی کڑک چمک پیدا ہوتی تو میرے دل میں خوف و ہراس کی ایک لہر پھیل جاتی۔ کبھی یوں پاس سے کسی کی آہٹ محسوس ہوتی تو میں ڈری سہمی اپنے قدم روک لیتی۔ اس وقت میں سڑک کے کنارے یوں چل رہی تھی جیسے مجرم پولیس سے بھاگ کر کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو۔ میرا ہر قدم بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دور چل کر مجھے اپنی منزل نزدیک آتی محسوس ہوئی، لیکن میں خوش پھر بھی نہیں تھی۔ لوگ منزل پر پہنچتے ہیں تو سب کچھ پا لیتے ہیں، لیکن میری منزل پر میرا خسارہ تھا۔ مجھے سب کچھ کھو دینا تھا۔ میری متاعِ جان، میری لختِ جگر، میری اپنی بیٹی، جسے میں نے نو ماہ تک اپنے پیٹ میں پالا تھا۔ مجھے اپنی منزل پر اسے خود سے جدا کر دینا تھا۔ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دینا تھا۔ جوں جوں میں آگے بڑھ رہی تھی۔ میرے دل میں مزید رنج و ملال کی کیفیت زور پکڑ رہی تھی۔ اب سامنے ایک کیچڑ کا ڈھیر تھا جہاں اردگرد بارش کے پانی کی وجہ سے کافی دلدل بنی ہوئی تھی اور اس سے تھوڑی دور دائیں جانب مسافروں کی آرام گاہ بنی ہوئی تھی، جہاں رات کے اس پہر کسی آدم ذات کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ میں نے اپنی لختِ جگر کو خود سے علیحدہ کیا اور اسے وہاں پڑے ایک بینچ پر لٹا دیا۔ ایک چھوٹا سا کمبل اس کے جسم کے اردگرد لپیٹا اور سر پر ایک موٹی اون کی ٹوپی پہنائی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مسلسل مجھے گھورے جا رہی تھیں، جیسے کہ اسے پتا ہو کہ اس کے ساتھ کیا، کیا جا رہا ہے، لیکن وہ ننھی، گلاب کی نرم و نازک کلی مسکرا رہی تھی اور میری آنکھیں غم کے مارے نم ہو چکی تھیں۔ مجھے اس وقت ایک ظالم عورت کا کردار نبھانا تھا، کیوں کہ مظلوم ہونے کے ساتھ ساتھ عورت کو بے رحم و سفاک کا لقب بھی دیا جاتا ہے۔ یہ ایسی عورتوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی خوشی کے لیے اپنی اولاد کا گلا اپنے ہی ہاتھوں سے گھونٹ دیتی ہیں۔ میں بھی ایک ایسی ہی عورت بنتے جا رہی تھی۔ مجھے بے رحم سفاک بنایا گیا تھا۔ میں بھی اس لمحے خود غرض ہو گئی تھی، لیکن مجھے خود غرضی کس نے سکھائی تھی؟ ہاں...... اسی معاشرے نے جہاں کسی بھی عورت کی بے بسی کو مفاد پرستی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ سب مجھے اسی معاشرے نے سکھایا تھا جہاں عورت ذات پر کیچڑ اچھالنا بہت آسان اور سود مند ہے، جہاں پر عورت کے کسی بھی گناہ کو راز رکھنے کے بجائے سرعام لانا اولین فرائض میں شامل ہے۔

ایک غلطی...... یا ایک گناہ...... جہاں ایک گناہ مجھ سے بھی ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ دن جب میں اپنے کالج سے نکلی تھی اور بس اسٹاپ پر ہماری گاڑی پہلے سے ہی جا چکی تھی۔ بس کے جانے کے بعد پہلی بار مجھے بہت ڈر محسوس ہوا تھا۔ اس وقت میرے ساتھ میری ایک دوست بھی تھی، لیکن اس کے گھر سے کوئی اسے لینے آ گیا تھا اور وہ ان کے ساتھ چلی گئی تھی، پھر میں وہاں اکیلی رہ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک کار میرے قریب آ کر رکی تھی اور اگلے دروازے سے باہر نکل کر کسی نے مجھے پکارا تھا۔

''کہاں جانا ہے آپ نے...... چلو میں ڈراپ کر دیتا ہوں، یہاں اس ٹائم گاڑی ملنا مشکل ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا تو تھوڑی دیر بعد پھر اس نے مجھے پکارا تھا۔

''چلو بیٹھ جاؤ ورنہ مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور پھر اس کے کہنے پر میں چپ چاپ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ گاڑی چلا رہا تھا، لیکن اس کی نظریں مختلف زاویوں سے گھوم کر میرے بدن سے ٹکرائیں، جیسے کوئی ڈاکٹر معائنہ کرنے کے دوران مختلف زاویے بدلتا ہے۔ مجھے وحشت سی ہونے لگی تھی، اس لیے میں نے اپنا دوپٹا گلے سے نکال کر سر پر اوڑھ لیا تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے پیچھے نظریں گھما کر پوچھا۔

''جی میرا نام عائشہ ہے۔ عائشہ گل۔''

''اتنا ڈرتے ہوئے کیوں بول رہی ہو، کھا نہیں جاؤں گا میں تمہیں۔''

''ڈری ہوئی نہیں ہوں میں! بس ذرا جھجک محسوس ہو رہی ہے۔ دراصل میں پہلی بار کسی اجنبی کے ساتھ سفر کر رہی ہوں اس لیے۔'' میں نے وضاحت کی تھی۔

''او کے! تو پھر اس اجنبی کا نام وقار علی ہے اور یہ ناظم آباد میں رہتا ہے۔'' اس نے اپنی گاڑی کا شیشہ ٹھیک کرتے ہوئے بتایا۔

''ناظم آباد میں تو میں بھی رہتی ہوں، پر کبھی آپ کو دیکھا نہیں۔'' تب وہ بے ساختہ ہنس دیا۔

''ارے اتنا بڑا ناظم آباد کا ایریا ہے۔ آپ کیسے دیکھ سکتی تھیں، ویسے میں تو بس ایک ہفتہ پہلے یہاں آیا ہوں۔ پاپا کا بزنس تھا تو انہوں نے بلا لیا، سنبھالنے کے لیے۔'' وہ شگفتگی سے بول رہا تھا۔

''خیر تم بتاؤ کیا پڑھتی ہو!''

''میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔'' وہ گاڑی چلا رہا تھا، لیکن اس کا دھیان باتوں میں تھا۔

''بس آپ مجھے یہاں اتار دیجیے، میں یہاں سے پیدل چلی جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے احتیاط سے جایئے گا۔''

''آپ کا بہت شکریہ! آپ نے مشکل وقت میں میری مدد کی۔'' میں نے گاڑی سے اُترتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور گھر کی طرف چل پڑی۔

آج میں بہت دیر سے گھر پہنچی تھی، لیکن مجھے وقت کا احساس قطعی نہ ہوا تھا۔ وقار مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ اس کے لمبے بال جو سلیقے سے پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے، درمیانہ قد اور سفید رنگت تھی اس کی۔

دوسرے دن جب میں کالج کے لیے نکلی تھی تو میں وقار کے ساتھ ہی کالج تک گئی تھی، کیوں کہ جب میں گھر سے نکلی تو میری متلاشی نگاہوں نے اسے ڈھونڈ ہی لیا تھا۔ سڑک کے کنارے وہ اپنی کار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور دائیں ہاتھ کی انگلی سے گاڑی کی چابی گھما رہا تھا۔

''آپ یہاں کیسے آ گئے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بس ایسے ہی ایک کام پڑ گیا تھا۔ آؤ تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔'' میں خوشی سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں اسے چاہنے لگی تھی۔ وہ جب بھی مجھ سے دور ہوتا تو میں غمگین ہو جاتی، وہ اگر ناراضگی ظاہر کرتا تو میں رونے لگ جاتی تھی اور اگر پیار بھری نظروں سے دیکھتا تو میں خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی۔

اس روز شام کے وقت مجھے وقار کی کال آئی تھی۔

''کدھر ہو عائشہ اور کیا کر رہی ہو؟'' میں نے کال ریسیو کی تو اُس نے پوچھا تھا۔

''گھر پر ہی ہوں اور آپ کو یاد کر رہی تھی۔''

''اچھا تو میں یاد آ رہا تھا آپ کو، تو پھر ایسا کرو کہ آ جاؤ اِدھر میرے ہی فلیٹ میں، تمہارے لیے زبردست سی کافی بنائی ہے میں نے اور اسی لیے تمہیں کال بھی کی ہے۔'' اس نے مجھے اپنے گھر آنے کو کہا تو مجھے عجیب سا محسوس ہوا، لیکن میرا دل بھی کر رہا تھا اس سے ملنے کو، اس لیے میں نے اس سے کہا۔

''ہوں! اس وقت تو نہیں آ سکتی میں، کیوں کہ پاپا بھی گھر پر ہیں۔'' میں نے معذرت کرنا چاہی، لیکن اگلے ہی پل اُس کی طرف سے ایک بہانا سننے کو ملا تھا۔

''عائشہ ایسا کرو کسی دوست کے بہانے آ جاؤ نا، دیکھو! مجھے بھی تم کتنا یاد آ رہی ہو۔''

''اچھا میں دیکھتی ہوں۔ اگر موقع ملا تو آؤں گی ورنہ پھر کبھی۔'' میں نے اس سے کہا۔

''او کے! میں پھر انتظار کرتا ہوں اور ہاں سنو! تم وہ بلیو کلر والا ٹراؤزر پہن کے آنا، کتنی خوب صورت لگتی ہو تم اس کلر میں۔''

''او کے، ابھی انتظار کرو، میں کسی طرح کوئی بہانا تو بنا لوں۔''

وقار کا فلیٹ ہمارے گھر سے تھوڑا ہی دور تھا۔ وہ یہاں کام کے لیے آیا ہوا تھا۔ اپنے پاپا کا بزنس یہاں رہ کر آسانی سے سنبھال رہا تھا، لیکن کبھی مجھے اس بارے میں اس نے نہیں بتایا تھا کہ اس کے پاپا اور وہ کیا بزنس کرتے ہیں؟ میں نے بہت پوچھا لیکن ہر بار وہ ٹال مٹول کر دیتا۔

آدھے گھنٹے بعد میں اس کے فلیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے جب دروازے کی گھنٹی بجائی تو اندر سے اس کی آواز آئی تھی۔

''آ جاؤ عاشی دروازہ کھلا ہے۔'' میں فوراً اندر چلی گئی اور حیرت سے پوچھا۔

''تمہیں کس نے بتایا کہ میں ہی ہوں دروازے پر۔''

''یہاں تمہارے سوا اور کون آ سکتا ہے۔ میرے دل نے بتا دیا تھا کہ تم ہی آئی ہو۔''

''اچھا بتاؤ کافی پیو گی یا ساتھ کچھ اور بھی ہونا چاہیے؟'' اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا اور مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ''فی الحال تو میں کچھ نہیں پیوں گی اور تم سے بہت سی پیار بھری باتیں کروں گی۔''

''آؤ پھر، یہاں بیٹھو۔'' میں اس کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

''بہت خوب صورت لگ رہی ہو آج اور اس بلیو ٹراؤزر میں تو انتہائی خوب صورت لگتی ہو۔''

''ہوں! اب ایسے جھوٹی تعریف کرو گے تو میں مغرور ہو جاؤں گی، پھر تم میرے ناز نخرے نہیں اٹھا سکو گے۔''

''جھوٹی تعریف نہیں کر رہا میں، یقین کرو تم بہت پیاری لگ رہی ہو اس وقت! دیکھو تو تمہاری آنکھوں میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔ میں تمہارے ان گھنے بالوں میں ایسے چھپ جانا چاہتا ہوں جیسے سیاہ بادل سورج، چاند کو چھپا لیتے ہیں اور پھر کوئی انہیں دیکھ نہیں سکتا۔'' ایک عجیب سا نشہ طاری تھا مجھ پر اور جو بے خود کر رہا تھا مجھے۔ کیف و سرور کی مستی میں، میں نے اپنے دونوں بازو اس کے کاندھے تک پھیلا دیے تھے۔ کمرے میں خاموشی تھی، پُرسکون ماحول تھا۔ اس نے اپنی بانہیں پھیلائیں تو میں ان میں گٹھڑی کی طرح سمٹ سی گئی تھی۔

عجیب لمس تھا اس کے حصار میں۔ میری سانسیں تیز تیز چلنے لگی تھیں اور میری آنکھیں نشے سے بند ہو رہی تھیں۔ اس وقت پورے ماحول پر سناٹا چھا چکا تھا۔

جب رات کے دس بج گئے تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں کہاں ہوں؟

''مجھے اب جانا ہوگا وقار! بہت دیر ہو گئی ہے۔'' میں نے اتنا کہا اور واپس پلٹ آئی تھی۔

وہ اب میری سوچوں میں بسنے لگا تھا۔ کہتے ہیں جو سوچ میں ہوتے ہیں وہ انسان اگر حقیقی روپ دھار لیں تو انسان آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ مجھ پر بھی اب اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ وہ جب بھی اپنی بانہیں پھیلاتا تو میں ان میں گم سی ہو جاتی۔ وہ نظریں ملاتا تو میں ان میں ڈوب جاتی۔ میری ہر سوچ اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہونے لگی تھی۔ اب وہی میری کل کائنات تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ محبت کی یہ گرہیں مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ دن گزرنے لگے، پھر ہفتے اور اب مہینے گزر رہے تھے، پھر ایک دن مجھ پر عجیب انکشاف ہوا تھا۔ شام کا وقت تھا، ہم پارک میں گھوم رہے تھے کہ اچانک میرا سر چکرا گیا اور میں گر گئی۔ چاروں طرف لوگ چہل قدمی کر رہے تھے۔

''کیا ہوا عائشہ تم ٹھیک تو ہو!'' اس نے مجھے اٹھایا اور پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے اپنی سانسیں بحال کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن مجھے فوراً ہی قے ہونے لگی تھی اور میں کچھ ہی دیر میں بے ہوش پڑی تھی۔

جب میری آنکھیں کھلیں تو میں بیڈ پر لیٹی تھی اور وقار میرے سرہانے کی طرف بیٹھا میرے بالوں کی لٹیں سلجھا رہا تھا۔ یہ ایک اسپتال کا کمرہ تھا۔

''اب طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں بس! مجھے کیا ہوا تھا...... اچانک میں بے ہوش کیسے ہوئی؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا تھا۔

''کچھ نہیں ہوا بس گر گئی تھی تم، پھر قے ہوئی تمہیں اور تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔'' تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی اور پھر وقار نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

"عائشہ!"

"جی وقار!" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

"ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ تم ماں بننے والی ہو۔" اس نے اتنا کہا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ زمین جیسے پاؤں تلے سے نکل چکی تھی اور آسمان کا سایہ سر پر سے اٹھ چکا تھا، لیکن میں پھر بھی خاموش تھی۔ میں نے ایک فیصلہ کیا تھا، بچے کو جنم دینے کا فیصلہ۔ "اب کیا ہوگا وقار؟" میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم اسے ضائع کرواسکتی ہو، گھبراتی کیوں ہو؟" وقار نے مجھے تسلی دیتے ہوئے میرا ہاتھ ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں، یہ ہمارے پیار کی نشانی ہے، میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔ تم بس مجھ سے شادی کرلو۔"

"اچھا، اچھا۔ تم جیسا کہتی ہو ویسا ہی ہوگا۔" وقار میری تیز آواز سے گھبراتے ہوئے بولا۔

وقار نے تو مجھ سے کہا تھا کہ ہم دونوں شادی کرلیں گے اور ایک سال تک ہم اپنے بچے کو کسی کی ذمے داری میں دے کر پرورش کروائیں گے اور پھر خود ہی ایڈاپٹ کرلیں گے، لیکن وقت آنے پر کیا کیا بدل جاتا ہے، یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ میری زندگی کا رُخ ایک دفعہ پھر بدل گیا تھا۔

وہ دن میری زندگی کا سیاہ ترین دن تھا۔ میں وقار کی محبت میں سب کچھ بھول چکی تھی، حتیٰ کہ ان ماں باپ کی عزت کا بھرم بھی نہیں رکھا تھا جنھوں نے میری پرورش میں محبتوں کے بے دریغ خزانے لٹائے تھے، میں وہ جنت فراموش کرکے وقار کے پاس آگئی۔ یہ سوچے بغیر کہ میرے گھر چھوڑ جانے سے میرے ماں باپ پر کیا گزرے گی۔

میں اسپتال کے کمرے میں پڑی تھی۔ میرے دائیں بازو پر ڈرپ لگی ہوئی تھی اور بائیں بازو پر میری لختِ جگر لیٹی تھی۔ میری پری جیسی بیٹی اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور سامنے دروازے کی اوٹ میں کھڑی دو نرسیں کبھی مجھے اور کبھی بچی کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

"مبارک ہو بہت پیاری بیٹی ہے۔" ایک نے خوشی سے مبارک باد دی تھی۔

"تھینک یو!" میں نے بچی کا ماتھا چومتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"اللہ اس کے مقدر بھی اچھے کرے۔" دوسری نے دعائیہ کلمات کہے۔

تب وقار میرے نزدیک آیا، مجھے بیٹی کی مبارکباد دیتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ پاپا کے پاس جارہا ہے انہیں منانے کے لیے تاکہ ہم نکاح کرسکیں۔

عصر کا وقت ہورہا تھا۔ میں انتظار کرنے لگی تھی اور پھر یہ انتظار بڑھتا گیا۔ ایک رات بیت گئی، پھر دن، دو دن اور پھر دس دن بھی گزر گئے، لیکن وہ نہ آیا۔ شاید اس کو اب آنا ہی نہیں تھا۔ یہ تو مجھے ایک نرس نے بتایا کہ اس نے دیکھا تھا کہ جب وقار جارہا تھا تو وہ ایک ٹیکسی میں تھا۔ جس پر دو بڑے بریف کیس بھی لدے ہوئے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ پہلے ہی یہ بات مجھے بتادیتی، لیکن میری خراب حالت دیکھ کر وہ چپ رہی تھی۔ میرے ذمے واجب الادا بل بھی اس نے مجھ پر ترس کھا کر ادا کردیے تھے۔ وقار کہاں چلا گیا تھا، یہ تو میں نہیں جانتی تھی، لیکن آج گیارہ دن بعد میں وہاں سے نکل آئی۔ رات کے اندھیرے میں، بادلوں کی گرج چمک اور تیز طوفانی موسم میں، میں وہاں سے انجان راہوں کی مسافر بن کر نکل پڑی تھی...... اکثر اوقات بہت مجبوری میں لوگ بے حسی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ بے حس اس وقت ہوتے ہیں جب راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے گناہ پر گناہ کرتے جاتے ہیں۔ اور اب میں نے بھی اپنے گناہ سے بچنے کے لیے ایسی ہی راہِ فرار اختیار کی تھی۔ آج اس واقعے کو پندرہ برس گزر چکے ہیں۔ میں اپنے دل کا قرار تو اسی بینچ پر چھوڑ آئی تھی۔ اپنی معصوم گڑیا کے پاس۔ دل کے بے قراری کا قرار جب کہیں سے نہ مل سکا تو میں نے ایک یتیم خانے میں پناہ حاصل کرلی۔ پندرہ برس سے میں اس یتیم خانے میں بلامعاوضہ اپنی خدمات انجام دے رہی ہوں۔ جب کوئی چھوٹا معصوم گناہ اس جگہ خالی جھولے میں آتا ہے تو اُس کو سینے سے لگا کر میری ممتا کو بہت سکون ملتا ہے۔

دعا کیجیے کہ میری ممتا قرار پا جائے۔ گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس اس سے بہتر راستہ کوئی نہ تھا۔

☆......☆......☆

پانچویں سچ بیانی

ذرا سی بھول

مور شاہد حسین

جب چوکی، بلوچستان سے رشتوں کے تقدس کو پامال کرتی ایک خامہ فرسائی

وہ سخت گرمیوں کے دن تھے کہ ایک روز صبح دس بجے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ عاطف آفس اور بچے اسکول گئے ہوئے تھے اور چوکیدار کو میں نے کسی کام سے باہر بھیجا ہوا تھا، جب کہ ماسی گھر کے کام

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کاج میں مصروف تھی۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو میرے سامنے کوئی 25-24 برس کی ایک نوجوان لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔

''جی فرمایئے۔''میں نے اس سے پوچھا۔

''مجھے ڈاکٹر طیبہ سے ملنا ہے، کیا وہ اس وقت گھر میں موجود ہیں۔''وہ بولی۔

''جی! میں ہی ڈاکٹر طیبہ ہوں، لیکن تم کون ہو؟'' میرے سوال پر نجانے کیوں وہ چونک سی گئی۔

''جی......وہ......دراصل مجھے رابعہ باجی نے بھیجا ہے۔''اس نے کہا تو پھر میں نے اس کو اندر آنے کی دعوت دی، کیوں کہ میں رابعہ کو اچھی طرح جانتی تھی، وہ کوئی اور نہیں، بلکہ میری کزن اور بچپن کی سہیلی تھی۔

''تم کیوں تشریف لائی ہو۔'' سلام دعا کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحبہ مجھے آپ سے اپنا علاج کروانا ہے۔''اس نے کہا۔

''اوہو......تو پھر تم کو میرے کلینک میں آنا چاہیے تھا نا؟''میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

یہ سن کر وہ ایک دم رو پڑی۔''ارے تم کیوں رو رہی ہو، کچھ تو بتاؤ۔''میں نے اسے حوصلہ دیا۔

''ڈاکٹر صاحبہ! دراصل بات یہ ہے کہ مجھے اپنا بچہ ضائع کروانا ہے۔''وہ سسکیوں کے درمیان میں بولی۔

''کیا؟'' میں ایک دم چیخی۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ عورتیں تو ماں بننے کی دعائیں کرتی ہیں، لیکن یہ کیسی خود غرض عورت ہے جو خود اپنی ہی کوکھ اجاڑنا چاہتی ہے۔

''پلیز ڈاکٹر صاحب، آپ میری مدد کریں۔'' اس کے لہجے میں بڑی التجا تھی۔

''دیکھو! تم پاگل مت بنو، آخر ایسی کون سی مجبوری ہے، جو تم اپنا بچہ ضائع کروانا چاہتی ہو۔''میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ میرے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگی۔

''دیکھو، تم نہ ہی میرے آگے اپنے ہاتھ جوڑو اور نہ میرے پاؤں پکڑو، میں یہ گناہ کا کام کسی بھی صورت نہیں کرسکتی۔''میں نے اسے صاف انکار کردیا۔

''ڈاکٹر صاحبہ! میں مانتی ہوں کہ کوئی ماں اپنے بچے کی دشمن ہرگز نہیں ہوسکتی، مگر میں کیا کروں؟ میں نہیں چاہتی کہ میرا بچہ کل کو میرے نقش قدم پر چلے۔'' یہ کہہ کر وہ زاروقطار رونے لگی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا۔''میں اس کی بات سن کر بُری طرح چونکی۔ وہ مسلسل روئے جارہی تھی۔

''دیکھو! تم پہلے یہ اپنا رونا دھونا بند کرو اور مجھے واضح طور پر بتاؤ کہ تم اپنا بچہ کیوں ضائع کروانا چاہتی ہو۔''میں نے بڑی محبت اور اپنائیت سے اس سے کہا۔

میری باتوں سے اس نے حوصلہ پکڑا اور پھر اس نے اپنی آپ بیتی مجھے یوں سنائی۔

''ڈیڑھ سال پہلے میں دلہن کے روپ میں ندیم کے گھر آئی تھی۔ ہماری شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت پُرسکون تھا۔ سسرال میں میرے علاوہ ندیم کی امی، ابو اور اس کا اکلوتا بھائی وسیم تھا۔ سسر اور ساس تو مجھے اپنی بیٹی سمجھتے تھے اور میں نے بھی انہیں کبھی بیٹی نہ ہونے کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ وسیم تو بھابی بھابی کہتے تھکتا نہیں تھا۔ میں اس کا بھی بے حد خیال رکھتی تھی۔ وہ مجھے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز تھا اور ندیم تو مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔ وہ بے پناہ محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا، اس نے تو جیسے مجھے اپنی پلکوں پر بٹھائے رکھا تھا۔ ندیم بیرون ملک کسی فیکٹری میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ شادی کے چند دن بعد پھر اسے وہاں سے فون آگیا کہ اسے حاضر ہونا ہے۔ وہ مجھے اس طرح تنہا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے بھی ان سے بہت اصرار کیا کہ تم واپس چلے جاؤ، کیوں کہ تمہاری نوکری کا مسئلہ ہے۔

ندیم نے باہر ملک جانے سے صاف انکار کردیا۔ اس نے پاکستان میں ہی جاب کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس نے اس مقصد کے لیے مختلف اداروں کے چکر بھی لگائے، مگر کہیں وہ کسی کے معیار پر پورے نہیں اترے، تو کہیں اس کے لیے ملازمت معیاری نہیں تھی، چند دن اسی پریشانی میں گزر گئے۔

سسر اور ساس نے ندیم کے ساتھ مجھے بھی باہر ملک بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن ندیم نے احتجاج کیا کہ پھر آپ دونوں کا خیال کون رکھے گا۔ وہ کہنے لگا۔

''ارے بیٹا ہماری فکر چھوڑو، اسی بہانے بہو بھی ایک نیا ملک دیکھ لے گی اور تم دونوں کو ساتھ میں سیر و تفریح کا بھی اچھا موقع مل جائے گا۔''ان کا اصرار دن بہ دن بڑھتا جارہا تھا۔

سسر اور ساس سے میں بھی الگ رہنا نہیں چاہتی تھی، مگر ان کی ضد نے مجھے اور ندیم کو باہر ملک جانے پر مجبور کردیا۔ یوں ہم باہر چلے گئے۔ وہاں بمشکل 15 دن ہی گزرے ہوں گے کہ میری طبیعت خراب رہنے لگی۔ میں نے وہاں کے مختلف ڈاکٹروں سے دوالی، مگر دن بہ دن میری کمزوری میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، اس لیے میں پاکستان آنے پر مجبور ہوگئی۔ میں نے یہاں آکر اپنا علاج کرایا اور دوائیں لیں تو چند ہی دنوں میں میری طبیعت پہلے سے کافی بہتر ہوگئی۔

وہ سردیوں کے دن تھے۔ ہمارے گھر میں تین کمرے تھے۔ اس میں ایک کمرہ وسیم کا تھا اور دوسرے میں، میں امی اور ابو رہتے تھے، باقی تیسرے کمرے میں ضروری سامان رکھا ہوا تھا۔ پہلے چند دن تو میں نے خوشی سے گزارے، مگر پھر ندیم کی کمی مجھے شدت سے محسوس ہونے لگی۔ دن تو جیسے تیسے گزر جاتا تھا، لیکن رات کی تنہائی سانپ بن کر مجھے ڈستی تھی۔ مجھے رات کی اس تنہائی میں شوہر کی شدت سے کمی محسوس ہونے لگی۔ مجھے دن تڑپاتے تھے اور راتیں کھانے کو آتی تھیں۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ مجھے رات کی تنہائی مارے ڈالتی تھی۔

ایک رات مجھ پر شیطان آگیا اور میرا خود پر قابو نہیں رہا۔ میں نے امی، ابو کی طرف دیکھا تو وہ گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے، پھر میں اس کمرے سے دبے پاؤں باہر نکلی اور سیدھی وسیم کے کمرے کی طرف گئی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس وقت وہ کسی سے موبائل فون پر باتیں کررہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی رابطہ منقطع کردیا۔

''بھابی آپ خیر تو ہے۔''وسیم نے چونکتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے وسیم۔'' میں نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''آپ بیٹھیں میں ابھی امی کو جگا کر آتا ہوں۔'' اس نے بڑے بھولپن سے کہا۔

''نہیں......نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ تم امی کی نیند خراب مت کرو، ان کی پہلے ہی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''میں نے بات بنائی۔

''چلو ٹھیک ہے بھابی میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔''وسیم نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اسی وقت اس کو بازوؤں سے پکڑا اور زور سے اپنی طرف کھینچا۔ وہ بے دھڑک میرے سینے پر گرا اور پھر میرے بدن میں جیسے بجلی سی دوڑ گئی۔

''بھابی یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' اس نے قریباً چلاتے ہوئے کہا۔

''میں پانی کی نہیں تمہاری پیاسی ہوں وسیم۔'' میں نے اس کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے زور دیتے ہوئے اس سے کہا اور پھر اسے اپنی گرفت میں مضبوطی سے جکڑ لیا۔

''بھابی میں اپنے بھائی کو کیسے منہ دکھاؤں گا۔''اس نے سخت احتجاج کیا تو میں نے اس سے کہا۔''وسیم تم ایک مزدور ہو اس لیے مزدوری کرو، باقی کا مالک تو تمہارا بھائی ہے۔''میں نے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے پیار سے کہا، کیوں کہ وہ ابھی تک میرے بازوؤں کی زنجیر میں قید تھا۔

''نہیں......نہیں بھابی، آپ کو شرم آنی چاہیے، میں آپ کے بھائی جیسا دیور ہوں۔'' اس نے اب باقاعدہ احتجاج کرنا شروع کردیا تھا۔

''ارے احمق، میں خود تمہارے پاس چل کر آئی ہوں۔ اگر میں واپس چلی گئی تو تم پچھتاوے کی آگ میں جلتے رہو گے۔'' میں اب اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی تھی اور اس کے جسم کے نازک حصوں کو آہستہ آہستہ سہلانے بھی لگی تھی۔ آخر وہ شیطان کے آگے ہار ہی گیا اور پھر ہم نے حیا و شرم کی تمام حدیں پار کردی تھیں۔ اس نے بھی اپنی مردانگی کا بھرپور مظاہرہ کرکے کبیرہ گناہ کو گلے لگالیا تھا اور پھر اس روز کے بعد تو یہ ہمارا روز کا معمول بن گیا تھا۔ آدھی رات کے بعد میں باقی رات وسیم کے بیڈ پر گزارتی تھی۔ ہم ساری رات گناہ کی لت میں پڑے رہتے تھے اور صبح ہونے سے پہلے میں اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ اس پر ہمیں ذرا سی بھی شرمندگی نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ ہماری راتیں بڑی پرجوش و پُرلذت گزر رہی تھیں۔ اب ہمارا ایک دوسرے کے بغیر رہنا دشوار ہوتا جارہا تھا۔ ایک روز وسیم نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ اب میرے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا، کیوں کہ اسے میرے ساتھ سونے کی

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

عادت پڑ چکی تھی۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تم سے شادی کرلوں۔'' میں نے تڑپ کر پوچھا۔

''آپ بھائی جان سے طلاق لے لیں، پھر ہم یہ گھر چھوڑ کر ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں ہمارا کوئی اپنا نہ ہوگا'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

یہ سچ ہے کہ میں بھی اس کو اب بہت چاہنے لگی تھی۔ وہ بھی میرے دل کے پاتال میں اتر گیا تھا، مگر میں تو اسے صرف اسی لیے ٹوٹ کر چاہتی تھی کہ وہ میری جسمانی خواہش پوری کرتا تھا۔ وہ راتوں کو میرے لیے بے چین رہتا۔ جب میں اس کے پاس جاتی تھی، تب جا کر اسے سکون ملتا تھا۔ وہ مجھ سے مل کر ہمہ وقت سرشار رہتا تھا اور میں بھی اس شیطان سے مل کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ ہماری اس شیطانی کارستانی میں اب بڑی شدت آ گئی تھی اور میری جانب اس کا دن بہ دن لگاؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ہم ہر شب کبیرہ گناہ سے اپنی راتیں کالی کرتے تھے۔ اس پر ہمیں ذرا سی بھی شرم نہیں آتی تھی۔ ہم دن کو دیور بھابی بنے رہتے تاکہ کوئی ہمارے مکرہ چہرے کے تاثرات نہ پڑھ لے اور رات کو...... حسب معمول وقت اسی طرح گزرتا رہا، پھر مجھ پر ایک روز یہ انکشاف ہوا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ عورت کا سب سے بڑا خوشی کا دن وہ ہوتا ہے جب وہ ماں بنتی ہے یا اسے ماں بننے کا احساس ہوتا ہے، مگر جب مجھے یہ احساس ہوا کہ میں بھی...... تو اس روز میں بہت روئی۔ پھر میں نے اپنا مکمل چیک اپ کروایا تو ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق مجھے بتایا گیا کہ میری بیٹی ہوگی، تب سے مجھے عجیب سا ڈر لگنے لگا ہوا ہے کہ کہیں میری بچی بھی بڑی ہو کر اسی راہ کی مسافر نہ بن جائے۔ میں اکثر راتوں کو اٹھ کر خدا کے آگے گڑگڑاتی ہوں اور اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگتی ہوں۔ میں نے اب وسیم سے بھی ملنا چھوڑ دیا ہے۔ پلیز ڈاکٹر صاحبہ! آپ میری مدد کریں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی اور بدلے میں ڈھیر ساری دعائیں بھی دوں گی۔ وہ مجھے اپنی آپ بیتی سنا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ برابر مجھ سے التجائیں کرتی رہی۔

''تم رابعہ کو کیسے جانتی ہو؟''۔ میں نے اس سے پوچھا۔

نوجوان شاعر کاشی چوہان کا خوبصورت شاعری سے سجا مجموعہ کلام......

شائع ہو چکا ہے

تم نے سونا بنا کے مٹی سے
مجھ کو مٹی کے بھاؤ بیچ دیا

دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے خصوصی ڈسکاؤنٹ۔ کتاب کی قیمت میں کتاب آپ کے ہاتھ میں۔ نہ کوئی ڈاک خرچ اور نہ کوئی دوسرا خرچ۔ پاکستان بھر سے صرف ایک S.M.S یا فون کال کیجیے، کتاب آپ کی دہلیز تک پہنچا دی جائے گی۔

کتاب ملنے کے:

الفرید پبلشرز اردو بازار۔ کراچی

البلال اردو بازار۔ کراچی

سٹی بک پوائنٹ اردو بازار۔ کراچی

رابطے کے لیے 0307-2089080

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"رابعہ باجی میری پڑوسن ہے اور ہمارے درمیان گہری دوستی بھی ہے۔ ہم دل کی ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کر لیتی ہیں۔ جب میں نے اپنا بچہ ضائع کروانے کی بات کی تو اس نے اس اُمید کے ساتھ آپ کی طرف مجھے بھیجا ہے کہ آپ میری مدد ضرور کریں گی۔" یہ کہہ کر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری ہوگئی۔ میں خاموش ہوگئی اور سوچوں کے سمندر میں ڈوب گئی کہ کہیں اس کی مدد کر کے میں ایک معصوم روح کی قاتل نہ بن جاؤں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ میری خاموشی طویل ہوتی جارہی تھی۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ کر میری خاموشی توڑی اور روتے ہوئے ایک بار پھر بولی۔ "ڈاکٹر صاحبہ! پلیز میری مدد کریں۔"

"چلو ٹھیک ہے تم کل آنا تو میں کچھ تمہارے لیے سوچتی ہوں۔" میں نے اسے دلاسا دیا اور یوں وقتی طور پر اسے ٹال دیا۔

اس کے جانے کے بعد میں کافی دیر بے قرار رہی، اتنے میں ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا۔ میں نے نماز ادا کی اور دو نفل ادا کر کے استغفار کی دعا پڑھی، پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر خالق کائنات سے دعا مانگی۔ "اے میرے مالک تو بڑا غفور الرحیم ہے، تیرے دَر پر آنے والا کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تو مجھے اس امتحان میں کامیاب کر دے، کیوں کہ تو سب سے عظیم ہے۔ میرے مولا! مجھ سے وہ کام کروا جس میں بہتری ہو اور جو تجھے اور تیرے حبیب ﷺ کو پسند آئے۔ میرے مولا میری مدد فرما۔" دعا مانگ کر میں اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔

جب بچے اسکول سے آئے تو ان کے چہرے اترے ہوئے تھے اور وہ حیران و پریشان سے لگ رہے تھے۔

"کیا بات ہے بیٹا تمہارے چہرے کیوں اترے ہوئے ہیں۔" میں نے بڑے پیار سے ان سے پوچھا۔

"ممی اسٹاپ پر کسی آنٹی کو ٹیکسی نے ٹکر ماردی اور وہ بہت نازک حالت میں زخمی ہوئی ہیں۔ اس کے سر پر گہری چوٹ لگی ہے اور اس کے سر سے بہت خون بہہ رہا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔" مجھے بچوں نے بتایا۔

"کون تھی وہ، کیا...... اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟" میں نے چونکتے ہوئے بچوں سے پوچھا۔

"نہیں، ممی وہ بالکل اکیلی تھی، کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کون تھی؟" بچوں نے مجھے بتایا۔

"چلو جلدی کرو، تم لوگ یونی فارم بدل لو، میں کھانا لگاتی ہوں۔" میں نے بچوں سے کہا اور وہ یونی فارم بدلنے چلے گئے، پھر کھانا کھایا۔

عاطف جب آفس سے آئے تو ان کی شرٹ پر تازہ خون لگا ہوا تھا۔ ان کی شرٹ پر خون دیکھتے ہی میں چیخی۔ "کیا ہوا؟"

"ارے بھئی کچھ نہیں، ہم بالکل ٹھیک ہیں، کوئی جوان لڑکی تھی، اس کو ٹیکسی نے ٹکر ماردی تھی۔ وہ اسپتال میں فوت ہو چکی ہے، بس اس کو اٹھاتے ہوئے ذرا سا خون لگ گیا ہے۔" عاطف نے تفصیل سے مجھے بتایا۔

"کون تھی وہ۔" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"میرا کوئی دوست تھا، اس کے محلے کی تھی۔ اب اس کی لاش گھر منتقل ہو چکی ہے۔" عاطف نے شرٹ اتارتے ہوئے کہا۔

حسب معمول جب عاطف فریش ہوئے تو پھر ہم نے ساتھ کھانا کھایا اور ٹی وی آن کیا۔ ایک نیوز چینل کے نمائندے نے بتایا کہ "ثریا زوجہ ندیم کو بازار سے گھر کی طرف واپسی پر ایک کار نے ٹکر ماردی۔ لوگوں نے اسے اسپتال پہنچایا، مگر وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے زندگی سے منہ موڑ گئی۔ اس کی پہچان ہوگئی ہے اور اس کی لاش وارثوں کے حوالے کر دی گئی ہے۔"

"یا اللہ تیرے لاکھ لاکھ شکر۔" میں نے دل ہی دل میں سجدہ کیا کہ مجھے اس امتحان سے چھٹکارا مل گیا تھا، پھر میں نے ثریا کے لیے دعا کی۔ "میرے مولا! تو ثریا کے تمام گناہوں کو معاف فرما، بے شک تو سب سے بڑا، عظیم اور غفور الرحیم ہے۔"

☆......☆

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کس پہ اعتبار کریں

قمر تابندہ

کراچی سے دوستی کی بھیانک شکل دکھاتی ایک سچ بیانی

نعمان کی ناگہانی موت سے اس کے اہل خانہ سمیت پورا محلہ حیران و پریشان تھا۔ تین دن کی تاخیر سے آج ایدھی سرد خانے، سہراب گوٹھ سے جیسے ہی اس کی میت اس کے گھر پہنچی تو علاقے میں جیسے کہرام مچ گیا۔ اہل خانہ کے ہمراہ آس پڑوس اور محلے میں سیکڑوں لوگ اس کی لاش کو دیکھ دیکھ کر پچھاڑیں کھا رہے تھے اور دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔

میں تو خود اس نوجوان کی اس قدر بے درد موت پر اس کی بہنوں اور والدہ کی شدتِ غم سے غیر ہوتی حالت دیکھ کر شدید افسردہ حالت میں کھڑی اس کی ضعیف و نحیف دادی کو دلاسا دے رہی تھی جو اپنے پوتے کی اس اچانک موت پر لرزتے ہاتھوں پائنتی پکڑے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

☆......☆

مقتول نعمان اپنے پانچ بہن بھائیوں، جن میں دو بھائی چھوٹے اور تین چھوٹی بہنیں شامل ہیں، میں سب سے بڑا تھا اور گھر کے قریب ہی واقع ایک پرائیویٹ اسکول، جو پڑھائی کے لحاظ سے علاقے کا سب سے منفرد اسکول تھا، کا میٹرک کا طالب علم تھا۔ وہ اپنے دادا سمیت پورے گھرانے کا لاڈلا اور چہیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اسکول کا ہونہار طالب علم ہونے کی وجہ سے تمام استاد بھی اس سے بڑے خوش تھے اور اس کے ہم جماعت بھی اس کی بہت عزت کرتے تھے اور آج اس کی میت کو دیکھ کر یہ سب ہی بڑے سوگوار اور اشک بار تھے۔

نعمان کے دادا اور اس کی دادی بڑھاپے کے باعث زیادہ تر بیمار ہی رہتے تھے اور ان دونوں کی تیمارداری، ان کی دیکھ بھال کی تمام ذمے داری نعمان خود اٹھاتا تھا۔ وہ ان کی ہر طرح سے خدمت کرتا تھا اور انہیں کبھی شکایت کا کوئی موقع نہیں دیتا تھا۔ اگر کبھی وہ کسی کام سے باہر بھی چلا جاتا تھا تو اس کی دادی اس کو آواز دیتی رہتی تھی، جب تک کہ انہیں یہ نہ بتایا جاتا کہ نعمان گھر میں نہیں ہے، وہ کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ اس پریشانی سے بچنے کے لیے ہی نعمان کو موبائل فون دلوایا گیا تھا کہ اگر دادا، دادی کو کوئی کام ہو اور نعمان گھر سے باہر ہو تو اسے فون کر کے بتا دیا جاتا اور وہ جہاں بھی ہوتا، فوری طور پر وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر گھر پہنچ جاتا اور دادا، دادی کے کام نمٹاتا۔ وہ ان سے محبت کرتا تھا اور وہ بھی اسے بہت چاہتے تھے۔

اہل محلہ میں سے بھی اگر کسی کو کوئی ضرورت ہوتی تھی وہ بے دھڑک نعمان کو کہہ دیا کرتے تھے اور نعمان ان کے بہت چھوٹے چھوٹے کام بھی خوشی خوشی کر دیا کرتا تھا۔ اس کے گھر کے سامنے رہائش پذیر جمیل صاحب کی بیگم اگر اس کی نانی امی تھیں تو بائیں طرف رہنے والی خاتون اس کی پھوپھی اماں، محلے بھر کی خواتین قریباً اس کی رشتے دار ہی تھیں۔ وہ کسی خاتون کو آنٹی کہہ کر مخاطب نہ کرتا تھا، کیوں کہ اس کی نظر میں، بقول اس کے آنٹی کہنے میں ایک عجیب سا اجنبیت کا احساس ہوتا ہے اور اس لفظ میں رشتوں سے محبت جھلکتی نظر نہیں آتی۔ اس کے یہی محبت بھرے الفاظ اور دل نشین انداز، جو رشتوں کی اہمیت کو اجاگر کرتے تھے، آج محلے بھر کی خواتین کو رونے پر مجبور کر رہے تھے۔

سب کا یہی کہنا تھا کہ اس معصوم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا، جو ظالموں نے اس کا یہ حال کیا ہے۔ وہ تو بلا تخصیص ہر کسی کے کام آتا تھا۔ وہ ہر کسی کی تکلیف کو اپنی تکلیف محسوس کرتا تھا اور اسے دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ آخر کس ظالم نے اس معصوم کو اس بے دردی سے قتل کیا ہے اور کیوں کیا ہے؟

☆......☆

نعمان کے والد رئیس اختر نے، جو کہ ایک سرکاری افسر تھے اور اپنے شعبے میں ایک فرض شناس اور دیانت دار ملازم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، ان کی شرافت کی مثال دی جاتی تھی۔ انہوں نے نامعلوم ملزمان کے خلاف مقدمہ درج کرا دیا تھا اور پولیس نے اس واقعے کی تفتیش شروع کر دی تھی۔

وقوعہ کے اگلے روز تفتیشی افسر نعمان کے گھر اس واقعے کی مزید تفصیلات حاصل کرنے کے لیے پہنچا تو تمام حالات سننے اور واقعات کا جائزہ لینے کے بعد اس نے نعمان کے والد سے اس کا موبائل فون طلب کیا، پریشانی کے عالم میں کسی نے بھی اسے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی، بلکہ اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

☆......☆

نعمان کا موبائل فون لے کر پولیس افسر جیسے ہی میسج کے آپشن پر پہنچا تو اس میں موجود ایک میسج کو پڑھ کر اس کی آنکھیں کسی خیال سے چمکنے لگیں اور اس کے چہرے پر ایک پُرسکون سی مسکراہٹ کِھل گئی۔

”یہ بشریٰ کون ہے؟“ اس نے اچانک نعمان کے والد سے سوال کیا، جو اس کے سامنے ہی صوفے پر بیٹھے نہ جانے کن خیالوں میں گم تھے۔

”بشریٰ“ نعمان کے والد یہ نام سن کر ایک دم چونکے اور ان کے چہرے پر حیرت و استعجاب کے سائے لہرانے لگے۔

”ہم تو کسی بشریٰ کو نہیں جانتے، بلکہ ہمارے خاندان میں اس نام کی کوئی لڑکی ہی نہیں ہے اور نہ رشتے
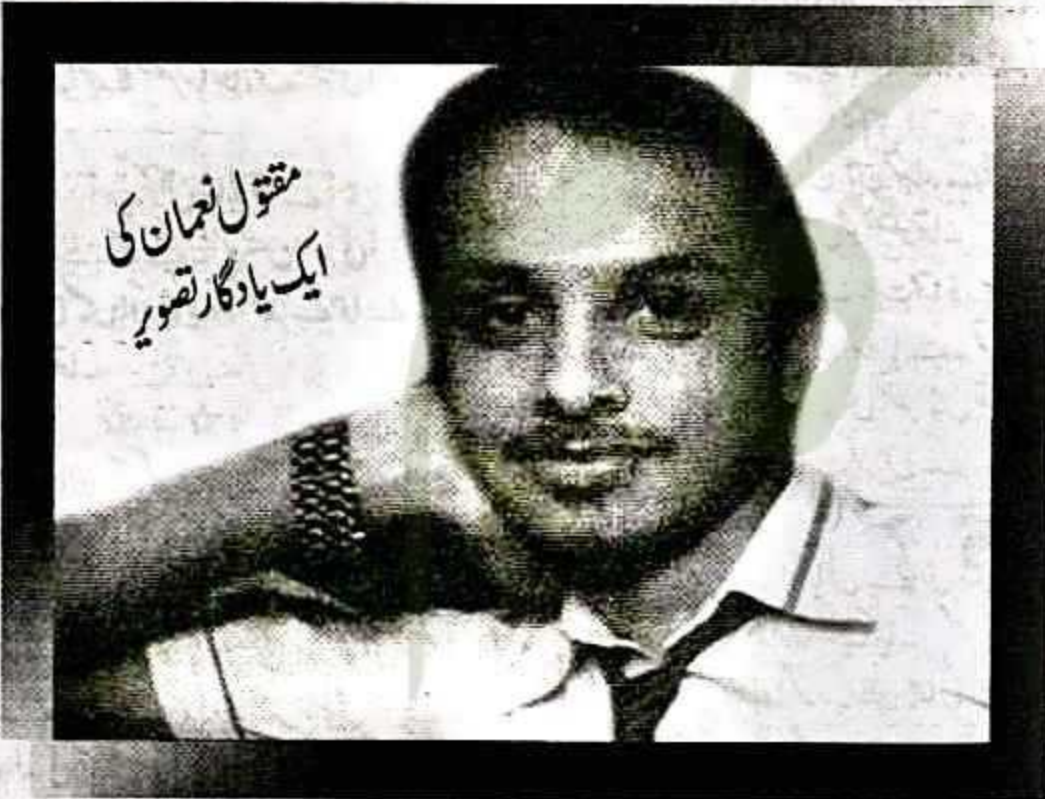
مقتول نعمان کی ایک یادگار تصویر

www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

داروں اور جاننے والوں میں ایسی کوئی لڑکی ہے، جس کا نام بشریٰ ہو۔“

☆......☆

ابھی سوال و جواب کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ڈور بیل بجنے لگی۔

”جی انکل...... میرے لائق اگر کوئی کام ہو تو بتایئے؟“ دروازہ کھولنے پر کسی نے بڑی چاہ اور اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

”نہیں بیٹا، بہت بہت شکریہ تمہارا، چوں کہ ابھی انسپکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں، اس لیے ذرا......“

”اوہ...... اچھا۔“ امجد کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر چلا گیا۔

”بہت بہتر انکل...... میں بعد میں آؤں گا، مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔“

”ہاں ہاں......ضرور۔ تم شام کو آ جانا، میں گھر پر ہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے جبار صاحب، میں پھر آپ کو تکلیف دوں گا۔“ تفتیشی افسر نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے یہ کون صاحب تھے؟“

”یہ امجد تھا، نعمان کا یارانا، بلکہ بچپن کا دوست اور اس کا کلاس فیلو۔ یہ دونوں اکثر ساتھ ہی رہتے تھے۔“ نعمان کے والد نے امجد کا مختصر سا تعارف تفتیشی افسر کے سامنے پیش کر دیا۔

”اچھا اچھا...... آپ کو کل شاید تھانے آنا پڑے گا، کچھ ضروری معلومات کے لیے۔“ پولیس افسر کی آنکھیں گویا کچھ کھوج رہی تھیں اور شاید وہ امجد کے حوالے سے بھی کچھ محتاط ہو گیا تھا۔

☆......☆

شام کو امجد نعمان کے گھر پر اس کے والد کے سامنے موجود تھا۔ اس کو دیکھ کر اس کے گھر والوں کے زخم پھر سے تازہ ہو گئے اور گھر میں ایک بار پھر آہوں اور سسکیوں کا طوفان امڈ آیا تھا۔ اس کی والدہ اور بہنیں دوپٹے میں منہ چھپا چھپا کر رو رہی تھیں، جبکہ اس کے بھائیوں اور والد کی آنکھیں بھی آنسو بہانے رہی تھیں اور امجد ان کی حالت دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا، لیکن انہیں اس حال میں چھوڑ کر وہ واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔

”امجد بھائی! کون تھے وہ لوگ، کیا آپ انہیں جانتے ہیں، جنہیں ہمارے اتنے پیارے بھائی پر گولی چلاتے ہوئے ذرا سا بھی ترس نہ آیا۔“ یہ رخسار تھی، نعمان کی چھوٹی بہن جو امجد سے سیلابی آنکھیں لیے سوال کر رہی تھی۔ ”اب ہمیں اسکول چھوڑنے کون جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر تڑپ کر رونا شروع ہو گئی۔

”صبر کرو بہنا...... میں نعمان کی کمی تو پوری نہیں کر سکتا، لیکن اس کی کچھ ذمے داریاں اپنے سر ضرور لے سکتا ہوں۔“ امجد نے رخسار کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

زندگی ایک بار پھر رواں دواں ہو گئی تھی۔ رخسار کو اسکول چھوڑنے کی ذمے داری امجد بخوبی نبھا رہا تھا اور اب پہلے کی نسبت نعمان کے گھر میں امجد کی آمد و رفت میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا اور وہ اپنا بیش تر وقت یہیں گزارتا تھا۔

”رخسار نعمان کا موبائل کہاں ہے؟“ امجد نے ایک روز اچانک سوال کیا۔

”پتا نہیں امجد بھائی...... ابو کے پاس ہی ہوگا، کیوں خیریت؟“ رخسار نے اس اچانک سوال کا حیرت زدہ ہو کر جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں کچھ نہیں......بس، ایک دوست کا نمبر چاہیے تھا۔ نعمان کے پاس Save تھا۔ ایک ضروری کام تھا مجھے اس سے......اچھا تم اپنا موبائل لاؤ اور یہ سم اس میں لگا کر مجھے دے دو۔“ امجد نے ایک سم جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

☆......☆

”ہاں بھئی...... کیا حال ہیں تمہارے؟“ امجد کسی سے نہایت سرگوشی کے عالم میں محو گفتگو تھا۔

”ارے یار...... مجھے اب بہت محتاط رہنا ہوگا۔ لگتا ہے اس نے اپنی دھمکی پر عمل کر دیا ہے۔ تم بھی تو اتنی پیاری ہو کہ دیکھنے والا ایک ہی نظر میں تمہارا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اچھا چلو پھر بات کریں گے...... ابھی میں ذرا......اوکے، بائے۔“

”امجد بھائی آپ موبائل لے ہی لیں۔“ رخسار نے شرارتی لہجے میں امجد کو مخاطب کیا۔

”کیا کروں گڑیا، اگر ریحان بھائی ابو سے میری شکایت نہ کرتے تو وہ کبھی مجھ سے میرا موبائل نہ لیتے اور نہ مجھ پر اس طرح کی کوئی پابندی عاید ہوتی۔“ مجید نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”اچھا مجھے تو بتایئے، آخر وہ کون ہے؟“ رخسار نے لپک کر پوچھا۔

”پھر بتاؤں گا، ابھی تو میں جا رہا ہوں، اور ہاں...... سنو، اس بات کا تذکرہ بھی کسی سے نہ کرنا......ٹھیک ہے نا۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آپ بے فکر رہیں امجد بھائی۔ آپ میرے لیے بالکل نعمان بھائی کی طرح ہیں۔ آپ کو دیکھ کر ہم لوگ کچھ دیر کے لیے نعمان بھائی کو بھول جاتے ہیں۔“ رخسار نے افسردہ لہجے میں نم آنکھوں سے کہا۔

☆......☆

”پتا نہیں یہ بشریٰ کون ہے اور نعمان سے اس کا کیا تعلق تھا؟“ تھانے سے واپس آ کر نعمان کے والد نے اس کی ماں سے کہا۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں پتا کہ کون ہے؟ میں بھی اس کا نام پہلی مرتبہ سن رہی ہوں۔ ایک منٹ رکیں، میں رخسار سے پوچھتی ہوں، شاید وہ اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو۔“

رخسار نے جب بشریٰ کا نام سنا تو وہ چونک سی گئی اور پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد سا آ گیا ہو۔ وہ اپنی ماں سے بولی۔

”اماں...... یہ تو وہی لڑکی ہے جس سے امجد بھائی بات کرتے ہیں۔“ اس نے جب یہ انکشاف کیا تو اسی وقت معاملہ کھل کر سامنے آ گیا اور پولیس نے نعمان کے قتل کے الزام میں بشریٰ کے بھائی کو گرفتار کر لیا، جس نے دورانِ تفتیش بتایا کہ اس نے بشریٰ کو کسی لڑکے سے موبائل پر بات کرتے ہوئے سن لیا تھا، پھر اس نے بشریٰ

مقتول نعمان کے والد

مقتول نعمان کے دادا

کے موبائل سے نمبر لے کر نعمان سے رابطہ کیا۔ معصوم اور بھولے بھالے نعمان نے جس کا اس معاملے سے کوئی لینا دینا نہیں تھا، اپنے بارے میں اس نے بشریٰ کے بھائی کو تمام معلومات فراہم کر دیں۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے موبائل نمبر کا کسی نے غلط استعمال کیا ہے اور اس کو دھوکے میں رکھ کر مسلسل اسے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

دراصل بشریٰ سے اس کے دوست امجد کی دوستی تھی۔ وقوعہ والے روز نعمان شام کو اپنی موٹر سائیکل پر اپنے گھر واقع شاہ فیصل کالونی پانچ نمبر سے کسی کام سے نکلا اور جیسے ہی اس نے روڈ کراس کیا اور گلی کے کونے پر پہنچا تو بشریٰ کے بھائی اور دوستوں نے جو ریکی کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے یہاں تک پہنچے تھے، ایک دم اس کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی اس کے بھیجے کو چیرتی ہوئی باہر نکل گئی اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔ آج لوگ نعمان کو یاد کرتے ہیں، کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ اس سارے معاملہ میں نعمان کا کوئی قصور نہ تھا۔

پولیس نے تفتیش کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے امجد کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا تھا، پھر سائبر کرائم ایکٹ کے تحت اس کے خلاف مقدمہ درج کر لیا گیا اور عدالت نے اسے مجرم گردانتے ہوئے دس سال قید با مشقت اور ایک لاکھ روپے جرمانے کی سزا سنائی۔ آج امجد اپنے دوست کو کھو کر، اس کے گھر والوں کی نظروں سے گر کر جیل کی زندگی گزار رہا ہے اور اس کے قبیح جرم کو دیکھتے ہوئے اس کے اپنے گھر والوں نے بھی اس سے منہ موڑ لیا ہے۔

☆......☆

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساتویں سچ بیانی

بے رنگ حیات

شاہد محمود مغل

کاموں کے سے ایک جوڑے کی بے رنگ حیات کا ماجرا

رنگ برنگے پھولوں سے سجی سیج پر میرون ملبوس میں دلہن بنی اقراء اپنے کچی عمر کے حسین خوابوں کے ٹوٹنے پر نوحہ کناں تھی۔ اسلم جیسا ان پڑھ شخص اُس کی زندگی میں شامل کر دیا گیا تھا۔ وجہ ٹھہری تھی اِقراء کی ڈھلتی عمر...... اُس میں قصور تو کسی کا بھی نہیں تھا۔

یہ تو حالات کا بھنور تھا یا قانونِ قدرت۔ کہتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ کئی برس پہلے جب اقراء نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا تو آگے پڑھنے کے جنون میں اُس نے باپ سے ضد کر کے اس کی اجازت تو لے لی تھی، مگر اس کی ماں نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ اقراء گھر کے خرچے پہلے ہی بہت زیادہ ہیں، اوپر سے تمہارے باپ کی قلیل آمدنی، میرا خون جلاتی رہتی ہے۔ اس آمدنی میں تو پاؤں ڈھکو تو سر ننگا ہوتا ہے اور سر ڈھکو تو پاؤں اور تمہارے کالج کا خرچ بھی ہمارے لیے تو نا قابلِ برداشت ہے، بس تم اب یہیں تک رہنے دو...... بیٹی کو بس گھر بسانا آنا چاہیے۔"

اقراء نے آزردہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا، اس کے دل میں ماں کی باتوں سے دُکھ کا دھواں سا بھر گیا تھا۔

"میں نے تو امی کبھی آپ سے عید پر بھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ آپ کے کہے بغیر ہی میں سمجھ جاتی تھی کہ خرچے بہت ہیں اور آپ چند ہزار روپے ہاتھ میں لے کر بہت سی ضرورتوں سے لڑ رہی ہیں، پھر دوسرے شہر میں بیاہی اکلوتی پھوپھی کو بھی شاندار عیدی بھجوانی ضروری ہوتی تھی، تا کہ اُس کے سسرال میں اُس کی ٹور بنی رہے، ادھر آپ کو دادی کی ناراضگی کا بھی ڈر ہوتا تھا۔"

"بیٹا جب اِن سب مسائل کو سمجھتی ہو تو پھر......" اماں نے بڑے پیار سے کہا۔

"کچھ فیصلے مشکل لگتے ہیں...... مگر آسانی سے ہو جاتے ہیں۔" دروازے کی دہلیز پر کھڑی دُکھ کے سناٹوں میں گھری اِقراء نے ایک فیصلہ کر لیا اور ماں سے کہا۔

"امی...... میں بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اپنا خرچہ نکال لوں گی۔ میں اپنی ضروریاتِ زندگی اور بھی سمیٹ لوں گی۔ اب میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

ماں نے بیٹی کے چہرے پر اعتماد کی چمک دیکھ کر اُس کا کندھا تھپتھپا دیا۔

پھر تو گھر میں رونق جو شروع ہوئی تو ایک کے بعد ایک ٹیوشن پڑھنے والے بچوں سے صحن بھر گیا اور وہ کفایت شعاری کے زیرِ نظر اپنی تعلیم کے سفر پہ خراماں خراماں رواں دواں ہو گئی، بہت سے خوابوں اور امیدوں کے ساتھ۔

اُن ہی دنوں اقراء کے لیے دو رشتے آ گئے، لڑکے دونوں قابل تھے۔ ایک نے انٹر کیا ہوا تھا اور اس کا اپنا جنرل

اسٹور تھا اور دوسرا کسی آفس میں ملازمت کرتا تھا...... ماں نے بیٹی سے اس معاملے میں رائے طلب کی تو اُس نے کہا۔

"نہیں امی ابھی مجھے بہت آگے تک پڑھنا ہے۔ میں ان چکروں میں نہیں پڑ سکتی۔"

"بیٹا ایک عمر ہوتی ہے شادی کی، جب اچھے رشتے آتے ہیں۔ اگر اُن کو ٹھکرا دیں، تو پھر بعد میں بہت مشکل ہو جاتی ہے اور پھر دیر نہیں بلکہ بہت دیر ہو جاتی ہے۔"

اقراء نے ماں کے ذہن میں آنے والے وقت کے اندیشوں کو جھٹک دیا۔

"چھوڑیں اماں۔" مجھے بس پڑھنے دیں، اللہ بہتر کرے گا۔" یوں یہ موضوع اپنے طور پر ختم ہو گیا۔

رشتہ لانے والوں کو منع کر دیا گیا کہ اقراء نے مزید پڑھنا ہے تو ابھی فی الحال شادی نہیں کر سکتے۔

گھر کے حالات جیسے تیسے چل رہے تھے، خوش حالی کی امید میں مشکل دن ہی گزر رہے تھے کہ گھر پر ایک دن اچانک قیامت ٹوٹ پڑی، اقراء کے والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔

عید کے دن دو فریقوں کی آپس میں لڑائی ہوئی۔ اقراء کے ابو، جو عید کی نماز پڑھ کر عید گاہ سے باہر نکلے ہی

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے کہ سڑک پار سے چلی گولی اُن کے سینے کے آر پار ہوگئی اور وہ وہیں پر جاں بحق ہوگئے۔ گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی، ایک کہرام برپا ہوگیا۔ ایک طرف باپ کے دنیا سے کوچ کر جانے کا دُکھ سب کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا تو دوسری طرف فکر تھی کہ اب گھر کیسے چلے گا؟ کون کمائے گا؟ گھر کا چولہا کیسے جلے گا؟

اقراء کا باپ ہی گھر کا واحد کفیل تھا۔ بھائی ابھی چھوٹے تھے وہ کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔

باپ کیا گیا کہ اِن کی تو دنیا ہی اُجڑ گئی۔ ایک طرف باپ کی وفات کا غم اسے نڈھال کر رہا تھا تو دوسری طرف اسے یہ فکر تھی کہ اب گھر کیسے چلے گا اور گھریلو اخراجات کیسے پورے ہوں گے!! اِس فکر کو دور کرنے کے لیے اقراء کو ایک نجی اسکول میں ملازمت کرنا پڑی۔ اچھی تعلیم کی وجہ سے اسے اچھی تنخواہ ملنے لگی تھی، ساتھ ہی ٹیوشن سے بھی اسے کچھ آمدنی ہونے لگی تو گھر کی گاڑی چل پڑی تھی۔

بھائی ابھی پڑھ رہے تھے۔ موسم ایک دوسرے کے تعاقب میں سرگرداں تھے۔ چھوٹے بھائی نے تعلیم مکمل کر کے جاب بھی حاصل کر لی تھی جو کہ اس ملک میں جوئے شیر سے کم نہیں ہے، پھر دن بدن گھر کے حالات بدلنے لگے۔ جب گھر میں ایک دم سے خوش حالی آنے لگی تو اماں نے شکر ادا کیا اُس رب کی ذات کا، جس نے ان سب کو مشکل دور سے نکالا تھا۔

بیٹی کے بالوں میں اُترتی چاندی دیکھ کر ماں نے ''ہوکا'' بھرا اور بیٹے سے، بہن کی شادی کے بارے میں مشورہ کیا۔ چوں کہ اب کوئی رشتہ ان کے قریب بھی نہ پھٹکتا تھا۔ اگر آتا بھی تھا تو کوئی رنڈوا یا بچوں کی امید کے لیے دوسری شادی کا خواہاں......

اقراء کی شادی کی مسلسل کوشش میں ناکامی کے بعد امی بددل ہوگئیں تو عمران نے امی کو تجویز پیش کی کہ ''چچا لطیف کا بیٹا اسلم کیسا ہے، آپی اقراء کے لیے؟'' تو اماں نے جھٹ سے کہا......

''بیٹا وہ اَن پڑھ ہے، اقراء کے ساتھ اُس کا کیسے گزارہ ہوگا۔''

اماں کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے عمران نے دلیل دی۔

''دنیا کی تاریخ دیکھیں تو ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ کہیں لڑکے پڑھے لکھے تو اَن پڑھ لڑکی اور کہیں لڑکی پڑھی لکھی تو میاں پٹا اَن پڑھ۔ سب ہنس کھیل کے گزارا کرتے ہی ہیں نا۔'' پھر آہستہ آہستہ اماں عمران کی بات مان ہی گئیں۔ اقراء کو اس کی سب خبر تھی، اُس نے بھی ماں کی مجبوری دیکھ کر رشتہ قبول کر لیا۔

اسلم کو تو جیسے دو جہاں کی خوشیاں مل گئی تھیں۔ وہ تو بچپن سے ہی اقراء کو چاہتا تھا۔ اسلم جب پیدا ہوا تو ٹھیک پندرہ دن بعد اس کی ماں داغِ مفارقت دے گئی۔

ننھی سی جان کو اقراء کی امی کی گود میں ڈال دیا گیا تھا۔ ابھی اُس کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہ اُتری تھی اور نئی نویلی دلہن کو اسلم کو سنبھالنا پڑ گیا تھا۔ اقراء کے ابو کو اپنے بھائی کی اُداس زندگی کا بہت دُکھ تھا۔ انہوں نے اُس کی دوسری شادی کر دی۔ بچہ اِن کے گھر ہی پرورش پاتا رہا، کیوں کہ دادی بھی یہاں ہی تھی۔

اسلم کا باپ اپنی نئی بیوی کو لے کر دوسرے شہر چلا گیا۔ اسلم کا ذہن پڑھائی کی طرف تھا ہی نہیں، اُس نے خراد کا کام سیکھ لیا تھا اور وہ لوہے کے کام سے منسلک ہوگیا تھا۔ شادی کے پندرہ سال گزر جانے پر بھی اسلم کے باپ کو خدا نے اولاد سے نہ نوازا تو اُس نے بیوی کے کہنے پر اسلم کو واپس لے لیا تھا۔

اقراء کے ابو کو اسلم کے جانے کا بہت دکھ تھا، وہ بہت سلجھا ہوا اور باادب بچہ تھا۔ خیر فیصلہ ہوتے ہی جھٹ پٹ اقراء اور اسلم کی شادی طے ہوگئی۔

اسلم کی سوتیلی ماں بہت خوش تھی اور ساری بری کے جوڑے اقراء کی پسند سے بنائے گئے تھے اور آج وہ سیج پر بیٹھی اپنا احتساب کر رہی تھی۔

اتنی دیر میں آہٹ ہوئی اور اسلم نے اندر کمرے میں قدم رکھا۔ اس کی سیدھی سادی باتوں میں بھی اُس کی محبت ٹپک رہی تھی۔ اُس کی بھرپور محبت نے اقراء کے سب دکھ فضا میں تحلیل کر دیے تھے اور وہ شانت ہوگئی تھی۔ دن گزرتے گئے اور اسلم میں جو اَن پڑھ رہ جانے والی خامی تھی، وہ کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ اقراء محبت کی رو میں بہتی رہتی، بس اپنے ساجن کو دیکھا کرتی۔ چند مہینے گزرے تو اللہ نے اس پر اپنی خاص رحمت فرمائی اور وہ حاملہ ہوگئی، یہ بات سنتے ہی گھر میں سب کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

اقراء کی امی بھی یہ خبر سن کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

اقراء کی طبیعت اب خراب رہنے لگی تھی، جس کی

وجہ سے گھر کے کام پورے نہ ہو پاتے تھے۔ کام کا اس طرح ادھورا رہنا جو ساس کو بہت بُرا لگنے لگا تھا۔ چچا سمجھاتے کہ وہ کچھ عرصے بعد ٹھیک ہو جائے گی، پھر تم اپنا پوتا پوتی سنبھالنا۔ وہ پہلے ہی کی طرح سارا کا کیا کرے گی مگر وہ کہاں سنتی تھی شوہر کی۔

ایک دن دوسرے گاؤں ساس کے رشتے دار کے گھر فوتگی ہوگئی تو وہ لوگ وہاں چلے گئے۔ اسلم کام پر تھا۔ دو گلی چھوڑ کر اقراء کی امی کا مکان تھا، کیوں کہ جب بھائی کی بڑے شہر میں نوکری لگی تھی تو یہ لوگ یہاں شفٹ ہوگئے تھے۔ تین ماہ سے اقراء کی ساس نے اسے روک رکھا تھا میکے جانے سے، وہ چچا کو تو بولنے ہی نہیں دیتی تھی۔ اسلم کو بھی جانے کیا کیا پٹیاں پڑھاتی رہتی کہ وہ بھی اب اس سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا تھا۔

اُس نے گھر کو تالا لگایا اور سوچا کہ اُن کے واپس آنے سے پہلے وہ واپس آ جائے گی اس طرح انہیں پتا بھی نہ چلے گا کہ میں اپنی ماں کے گھر گئی تھی، مگر قسمت کی خرابی کہ وہ ماں کے گھر گئی تو بہن بھائیوں میں بیٹھے بیٹھے اسے وقت کا پتا ہی نہ چلا اور پھر وہ میکے اتنے عرصے بعد گئی تھی۔ جب مغرب کی اذان ہوئی اور شام گہری ہوتی گئی تو وہ اُٹھ کر بھاگی۔ سب اسے روکنے لگے، لیکن وہ ان کے پوچھنے اور کہنے کے باوجود وہاں نہ رُکی۔

جب دھڑکتے دل سے وہ گھر پہنچی تو اس کی ساس گھر آ چکی تھی، چچا اور اسلم بھی خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''دیکھ لیا اسلم تو نے، یہ اپنے اُسی یار سے مل کر آئی ہے جس کے بارے میں، میں کتنے دن سے کھوج میں تھی۔ یہ اُس سے فون پر چپکے چپکے باتیں کرتی رہتی تھی اور جب میں اندر آ جاتی تو یہ چُپ ہو جاتی تھی۔''

یہ سن کر اقراء ہکا بکا رہ گئی، اس کے بعد پھر کوئی معافی تلافی اس کے کام نہ آئی، اسلم نے اس کی جی بھر کر پٹائی کی...... اقراء کی حالت بھی ایسی تھی، مگر چچا نے بھی نفرت انگیز نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اقراء کی پاکبازی پر کسی نے یقین نہ کیا اور مار پیٹ کر اُسے گھر سے باہر نکال دیا۔ جب روتی دھوتی ماں کے گھر پہنچی تو وہاں بھی ماں کا بی پی اس کی حالت دیکھ کر ہائی ہوگیا۔ پھر کوئی بھی کوشش کامیاب نہ ہو سکی، حتیٰ کہ اقراء کی بچی نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو اُس ننھی پری کو اس کا باپ تک دیکھنے نہ آیا۔ ہر دن اِک آس لے کر آتا اور ہر رات اپنی تاریکی میں اقراء کی مایوسی کو چھپا لیتی اور پھر کچھ دنوں بعد اسے طلاق کا پروانہ مل گیا، جسے دیکھ کر اقراء پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ایک تعلق...... اِک امید...... اِک آس جو تھی، آج وہ بھی ٹوٹ گئی تھی۔

ماں نے اقراء کو حوصلہ دیا اور اُس نے اپنے زیورات بیچ کر ایک اسکول کھول لیا۔ اب اُسے جینا تھا، اپنی ننھی پری کے لیے۔

اماں کی بہوؤں نے انہیں الگ تنگ کر رکھا تھا، اوپر سے طلاق شدہ نند اُن کو زہر لگ رہی تھی۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر اماں کا بی پی شوٹ کر گیا اور ایک روز انہیں فالج کا اٹیک ہوگیا۔

ماں کی دیکھ بھال کرنا بھی اُن کے لیے مشکل تھا۔ اس لیے ماں کو بھی اقراء ہی سنبھالتی تھی۔ بیٹے بھی اپنی بیویوں کو ہی صحیح سمجھتے تھے۔ اماں نے اقراء کو آخری بار سمجھایا کہ تم اپنا گھر بسا لو۔ زندگی گزارنے کے لیے مضبوط سہارا ہونا چاہیے اور یہ شوہر کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوتا، مگر وہ ڈرتی تھی کہ پہلے کی طرح پھر سے کچھ نہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ تو جیتے جی ہی مر جائے گی۔ اُس نے شادی کا خیال ہی دل سے نکال دیا تھا۔

ایک دن وہ بازار میں تھی تو وہاں اُس نے اسلم کو بڑے بُرے حال میں دیکھا۔

گندے ملبوس، گرد میں اَٹے بالوں اور غبار آلود چہرہ لیے وہ بس میں سوار ہوا تھا۔ اسلم کو دیکھ کر اُس کے دل میں پھر اُتھل پتھل سی ہونے لگی تھی۔ اُس نے اسلم کے بارے میں پتا چلایا تو اُسے علم ہوا کہ محلے کی کسی لڑکی کے ساتھ اُس کے ناجائز مراسم ہیں اور اُس لڑکی کے گھر والوں نے اُسے گھر سے باہر نکال دیا ہے کہ وہ بن بیاہی ماں بننے والی ہے۔ محلے والوں نے اسلم کو اِس کے کرتوتوں کی وجہ سے محلے سے نکال دیا تھا۔

اقراء کو اسلم کا یہ حال دیکھ کر دُکھ تو ہوا تھا کہ وہ بہر حال اس کی بچی کا باپ تھا اور وہ بھلا مرد بھی جس سے اقراء نے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ اس کے قدم اپنے گھر کی جانب اب ایک نئے عزم کے ساتھ اُٹھ رہے تھے، جہاں اس کی جنت موجود تھی۔ جس کی دعاؤں کے طفیل ہی وہ آج اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ اب اُسے اپنی بچی کی پرورش کرنا تھی۔ اُسے اقرء بننے سے بچانا تھا۔

☆......☆

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

آٹھویں سچ بیانی

سلگتے ارماں

منشی محمد عزیز مئے

وہاڑی سے خود اپنے دام میں پھنس جانے والے ایک ملک دشمن کا احوال

جس دن نعیم اور اس کے گھر والے اپنا سارا سامان اٹھا کر لاہور کے لیے روانہ ہو رہے تھے، اس دن ہمارے گاؤں کی فضا بڑی مکدر اور بے رونق سی لگ رہی تھی، خصوصاً میں اور میرے گھر والے تو کچھ زیادہ ہی افسردہ تھے، کیوں کہ وہ ہمارے رشتے دار ہونے کے ساتھ ساتھ ہمسائے بھی تھے۔ ہمارے اور ان کے گھروں کی درمیانی دیوار ایک ہی تھی، جس میں ہم لوگوں نے اتنا سا سوراخ کر رکھا تھا کہ ایک آدمی باآسانی اس میں سے گزر سکے۔

نعیم میرا بچپن ہی سے کلاس فیلو تھا۔ ہم نے ایک ساتھ اسکول میں داخلہ لیا تھا اور اکٹھے ہی میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ میرا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ مجھ سے بڑے تین بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ جن میں سب سے بڑے نیاز بھائی اس وقت چار بچوں کے باپ تھے۔ ان سے چھوٹے ریاض بھائی کی ایک ہی بیٹی تھی۔ چھوٹے فیاض بھائی ابھی کنوارے تھے۔ دونوں بہنوں کی بھی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ اپنے اپنے گھر میں آباد تھیں۔ ہم لوگ "جوائنٹ فیملی سسٹم" کے تحت اکٹھے ہی ایک بڑے سے حویلی نما مکان میں رہتے تھے، جس میں ایک طرف نیاز بھائی اور فیاض بھائی کے مکانات تھے اور دوسری طرف ریاض بھائی اور میرے مکانات تھے۔ یہ حویلی ہمارے والد مرحوم نے اپنے ذہن میں ترتیب دیے گئے پلان کے مطابق تیار کروائی تھی، لیکن خود وہ زیادہ عرصہ اس حویلی میں نہ گزار سکے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

نعیم کے والد انکل رفیق اور میرے والد دور کے رشتے دار تھے، لیکن دونوں گھرانوں کے درمیان مثالی محبت تھی۔ جو چیز ہمارے گھر میں پکائی جاتی، وہ پہلے رفیق انکل کے گھر دی جاتی تھی اور ایسا ہی ان لوگوں کی طرف سے بھی ہوتا تھا۔ رفیق انکل سرکاری ملازم تھے۔ جب ہم لوگوں نے میٹرک کیا، تب رفیق انکل کا تبادلہ لاہور کر دیا گیا اور وہ لوگ نہ چاہنے کے باوجود بھی لاہور چلے گئے۔

اس وقت آج کے دور کی طرح رابطے کے اتنے آسان ذرائع نہ تھے اور گاؤں دیہات میں تو ویسے ہی کم ہوتے ہیں۔ ہم لوگ بھی خط و کتابت کے ذریعے ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ لیا کرتے تھے۔ بعد میں انکل رفیق نے اپنے گھر میں فون لگوا لیا اور یوں ذرا آسانی پیدا ہو گئی کہ ہم لوگ پی سی او سے ان کو فون کر لیتے تھے۔

میٹرک کے بعد میں نے قریبی شہر میں ایک کالج میں داخلہ لے لیا اور پڑھنے لگا۔ یہاں نیا ماحول، نئے دوست...... کچھ مزہ نہیں آیا اور نعیم کی یاد اور بھی شدت سے آتی۔ اس نے بھی لاہور میں ایک کالج میں داخلہ لے لیا تھا، لیکن اسے بھی میری یاد بڑا ستاتی تھی۔ وہ مجھے بات اکثر کہتا تھا کہ میں لاہور آ جاؤں تا کہ اکٹھے تعلیم حاصل کریں، لیکن یہ بات میرے گھر والے نہیں مان رہے تھے۔

"دیکھو بیٹا! مانا کہ وہ لوگ بہت اچھے ہیں، لیکن ہیں تو وہ اپنے شریک رشتے دار۔" میری ماں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "کل کو کیوں یہ بات کہیں کہ ہمارے ٹکڑوں پر پلے بڑھے ہو۔"

"امی ٹھیک کہہ رہی آپ۔" فیاض بھائی نے بھی ان کی تائید کی۔

"ان کے جانے کا ہمیں بھی افسوس ہوا ہے، لیکن ان کی اپنی زندگی ہے، ہماری اپنی۔ اور یہ بات ہمیں گوارا نہیں کہ ہمیں کسی کی بھی کوئی ایسی ویسی بات سننا پڑے۔"

"لیکن بھائی جان!" میں نے نعیم کے گھر والوں کا دفاع کرنا چاہا۔ "وہ لوگ ایسے نہیں ہیں کہ ایسے گھٹیا قسم کے طعنے دینے لگ جائیں۔"

نیاز بھائی بول اٹھے۔ "دیکھو میاں! تمہاری اور نعیم کی دوستی سے ہم ناواقف تو نہیں ہیں، لیکن رفیق انکل ذرا اور طبیعت کے آدمی ہیں اور ہوسکتا ہے کہ کبھی کوئی طعنہ نما

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
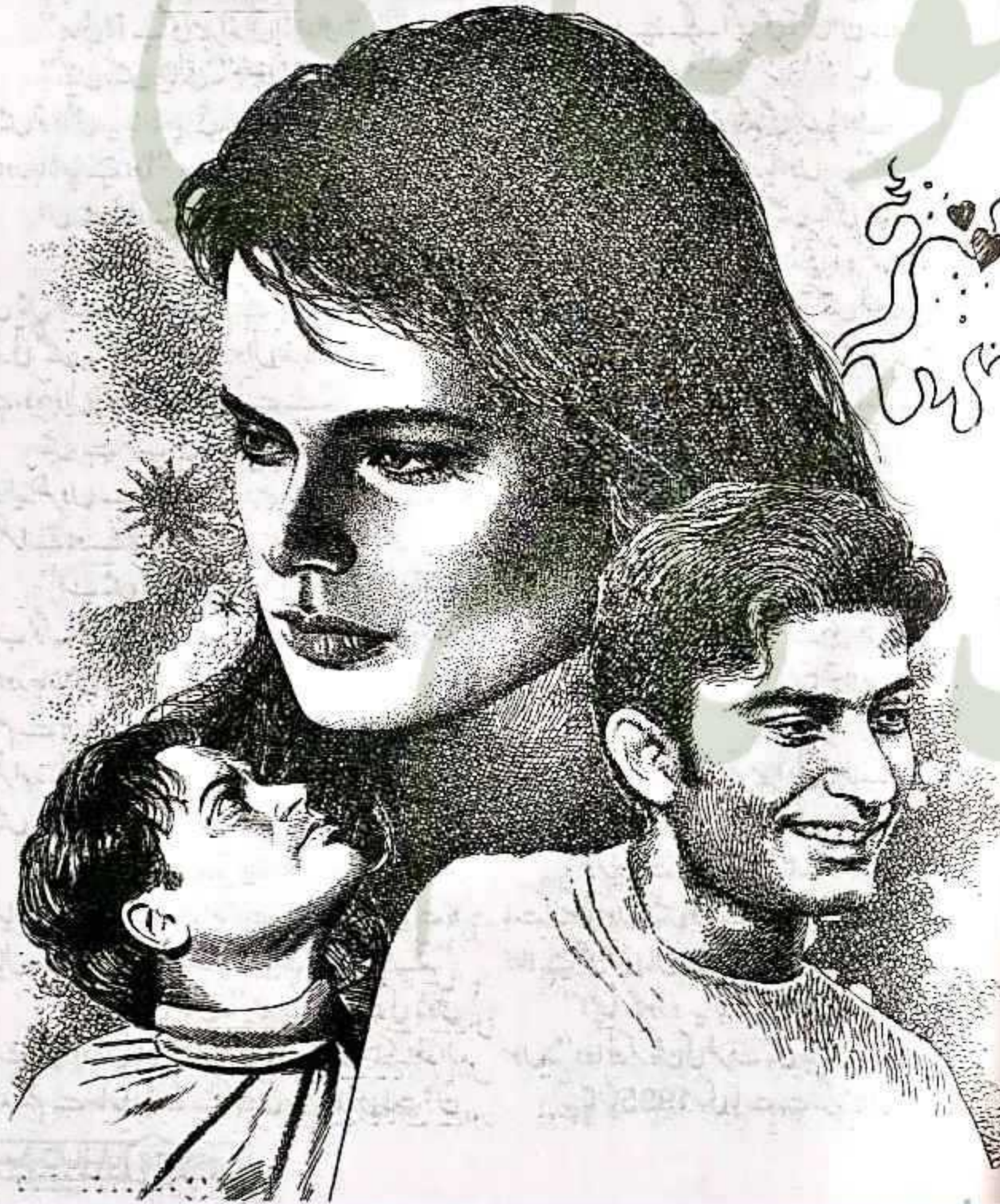
بات نکل جائے، تو اس بات کی ہمیں تو بہت تکلیف ہوگی، تم شاید نعیم کی دوستی کی خاطر یہ برداشت کرلو۔"

"نہیں بھائی جان۔" میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میں ایسا کم ظرف نہیں ہوں کہ اپنی کسی بات کے لیے آپ لوگوں سے منہ پھیرلوں یا آپ کی تردید کروں، لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر میں لاہور گیا تب بھی کسی طور طریقے سے جاؤں گا، ایسے تو منہ اٹھا کر نہیں جاؤں گا نا۔"

"ذرا ہمیں بھی تو پتا چلے دیور جی کہ تم کس طریقے سے لاہور جانا چاہتے ہو؟" عذرا بھابی نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو میں نے کہا۔

"بھابی! آپ بھی میرا مذاق اڑا رہی ہیں؟"

"نہیں، نہیں بیٹا جی۔" انہوں نے فوراً ہاتھ ہلایا۔ "میں تو واقعی یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم کس طریقے سے لاہور جانا چاہتے ہو؟"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، چھوٹی بھابی سونیا نے کہا۔

"بادشاہو! عذرا کی طرف سے کسی بدگمانی کو اپنے دل میں جگہ نہ دو۔" وہ ہمیشہ مجھے بادشاہو کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ "یوں سمجھو کہ جو سوال عذرا نے تم سے پوچھا ہے، وہ سوال ہم سب کی طرف سے ہے۔"

میں نے سب ہی طرف دیکھا۔ سب ہی لوگ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب میں کوئی مقرر تو ہوں نہیں، جو یوں آپ سب لوگ میری طرف ہمہ تن گوش ہیں، بہرحال میں لاہور جانا اس طریقے سے چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے نعیم سے ہر بات طے کرکے جاؤں گا کہ ہماری دوستی بھی برقرار رہے گی اور مجھے یا آپ کو کسی قسم کا کوئی طعنہ سننے کو نہیں ملے گا۔"

"چلو پھر ٹھیک ہے۔" نیاز بھائی کا ہاتھ اوپر اٹھ گیا۔ "ہماری طرف سے اجازت ہے، بس اس بات کا خیال رہے کہ ہمیں کوئی طعنہ یا غلط بات نہ سننی پڑ جائے۔"

"او کے بھائی جان۔" میرے چہرے کی رونق لوٹ آئی اور میں باہر پی سی او کی جانب دوڑا، تاکہ جلد از جلد نعیم سے ساری بات طے کرلوں، پھر ساری بات ڈن ہوگئی اور میں لاہور نعیم کے پاس چلا گیا۔ وہاں ہم نے اکٹھے ہی کالج میں ایڈمیشن لیا اور تعلیم حاصل کرنے لگے۔

ہمارا ایک معمول یہ بھی تھا کہ کم و بیش دو تین ماہ کے بعد کسی بھی ویک اینڈ پر گاؤں چلے جاتے اور چھٹی کا دن گاؤں میں گزارنے کے بعد واپس لاہور آ جاتے۔

نعیم کے گھر میں مجھے کسی بھی قسم کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ کھانا پینا، نہانا دھونا وغیرہ سب کچھ چوں کہ پہلے سے ہی طے ہو چکا تھا، اس لیے مجھے کسی قسم کا سر درد لینے کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ دن بڑے مزے سے گزر رہے تھے......

لیکن آہستہ آہستہ رفیق انکل کا رویہ میرے ساتھ، بلکہ سب گھر والوں کے ساتھ پُراسرار سا ہوتا گیا۔ وہ گھر میں بہت کم وقت دینے لگے۔ اگر کبھی آنٹی ان سے کوئی شکوہ کرتیں تو وہ کہتے۔

"دیکھو بیگم! میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے ہی کر رہا ہوں......" اور یہ جواب سن کر نعیمہ خالہ چپ سی ہو جاتی تھیں۔ کبھی کبھار وہ گاؤں والی زندگی یاد کرتیں، تو ان کی ٹھنڈی آہ نکل جاتی۔ وہ مجھے بھی اپنے بیٹے نعیم کی طرح سمجھتی تھیں اور میرے گھر والوں نے میری وہاں رہائش و طعام وغیرہ کے بدلے میں جو رقم ان کو ہر ماہ دیتے تھے، وہ اس بات کو بھی اچھا نہیں سمجھتی تھیں، لیکن اس بات پر بھی رفیق انکل نے انہیں قائل یا مجبور کیا تھا۔ نعیمہ خالہ کہتیں۔

"شہباز بیٹا! کتنی سادہ سی مگر پُرسکون زندگی تھی وہاں۔ یہاں شہر میں میرا تو دم گھٹتا ہے......"

"ارے خالہ! یہاں تو مزے ہی مزے ہیں۔" میں ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتا تو ان کے لبوں پر پھیکی سی ہنسی بکھر جاتی۔

"میں جانتی ہوں، تم میرا دل بہلانے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں کوئی بچی تھوڑی ہوں۔"

"لو کر لو بات" میں تردید کرتا۔ "بھلا خالہ! میں ایسی بات کرسکتا ہوں، میں تو آپ کے بیٹے کے برابر ہوں اور بھلا بیٹے بھی اپنی ماں سے ایسی بات کرسکتے ہیں۔"

"اچھا چھوڑو یہ باتیں، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" وہ اٹھ کر کچن کی طرف چلی جاتیں۔

یہ غالباً 1995ء کی بات ہے۔ گرمیوں کی چھٹیاں

تھیں۔ ہم نے گاؤں جانے کا پروگرام بنایا اور ایک سوٹ کیس میں اپنے دو چار جوڑے ڈالے اور گاؤں کی طرف چل دیے۔ بس جب لاہور سے نکل رہی تھی تو نعیم نے مجھ سے کہا۔

"شہباز یار! پتا نہیں کیا بات ہے، آج دل بہت اُداس ہو رہا ہے، حالاں کہ جب بھی ہم گاؤں کا چکر لگاتے ہیں تو میرا دل بہت خوش ہوتا ہے۔"

"کہیں عاصمہ کی یاد تو نہیں ستا رہی ہے؟" میں نے اسے چھیڑا۔ ہمارے کالج کی حسین ترین لڑکی ہے، عاصمہ کے بارے میں نعیم کا یہ کہنا تھا اور وہ وقتاً فوقتاً اسی کا ذکر چھیڑ دیتا تھا، جب بھی کوئی پیریڈ خالی ہوتا۔

☆......☆

ایک دفعہ میں نے کہا۔ "نعیم اگر کہو تو خالہ اور رفیق انکل کو عاصمہ کے بارے میں بتا دوں؟"

"ارے نہیں یار! یہ غضب نہ کرنا۔" اس نے گھبرا کر کہا۔ "تم تو جانتے ہی ہو کہ میری بچپن سے زُلیخا سے منگنی طے ہو چکی ہے اور اگر اب میں اس رشتے سے انکار کرتا ہوں تو اس کا مطلب تو تم جانتے ہی ہو؟"

"ہاں۔" میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پوری برادری اور سارے گاؤں والے تم لوگوں سے قطع تعلق کرلیں گے اور پھر تمہاری بہن ثمینہ کی زندگی کا بھی تو سوال ہے، کیوں کہ تمہاری شادی وٹہ سٹہ کی بنیاد پر طے ہے، یعنی اگر تم زُلیخا کے ساتھ شادی سے انکار کروگے تو زلیخا کا بھائی ظہیر بھی یقیناً تمہاری بہن کے ساتھ شادی سے انکار کر دے گا۔"

"بس تو پیارے بھائی۔" نعیم نے میرے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "یہ بات یہیں تک رہنے دو اور گھر میں ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے جس سے معاملہ بگڑ جائے۔"

"ٹھیک ہے یار" میں ہنس دیتا۔ "میری طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔" لیکن نعیم، عاصمہ کی محبت میں اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ میں نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھو پیارے! یہ جو عشق کا مرض ہے نا، اس کا سارا ہی حساب کتاب اُلٹا ہوتا ہے۔ اگر تم اسے نیچے کی طرف دباؤ گے، تو یہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر پہلے سے بھی زیادہ اوپر آ جائے گا۔ اگر اسے اپنی مٹھی میں قید کرنے کی کوشش کروگے، تو یہ ریت کی طرح ہتھیلی سے پھسل کر باہر آ جائے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس کو اپنے اندر سے نکالو۔ عاصمہ کے ساتھ اسے "شیئر" کرو تاکہ اس کا "دباؤ" تم پر سے ہٹ کر کچھ "دباؤ" دوسری طرف، میرا مطلب ہے عاصمہ والے پلڑے میں چلا جائے اور یوں کچھ "توازن" برقرار رہے۔"

"دیکھو شہباز۔" نعیم اس وقت بالکل بے بس نظر آ رہا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح پنجرے میں بند کوئی پنچھی پَر پھڑپھڑا کر رہ جائے۔ "عاصمہ سے اظہار محبت نہ کرنے کی کئی وجوہ ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ میں خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہا ہوں کہ اس کے سامنے یہ بات کہہ سکوں، دوسری بات یہ کہ اگر بالفرض میں اسے یہ بات کہہ بھی دوں، تو اس بات کا کوئی فائدہ، کوئی نتیجہ نہیں نکلنے والا، کیوں کہ شادی تو مجھے یقیناً زلیخا کے ساتھ ہی کرنی پڑے گی، لہٰذا اس آگ میں، میں اکیلا ہی جلوں، تو یہی بہتر ہے۔ اس سے پہلے کہ میرے ساتھ ساتھ عاصمہ کو بھی جلنا پڑے......"

"جزاک اللہ" میں نے بات کو مذاق میں بولنا چاہا۔ "اللہ سب ہی لڑکے لڑکیوں کو آپ جیسی سوچ اور ہمت دے۔"

"دیکھو شہباز۔" اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔ "تم میرا مذاق اڑا رہے ہو، یہ بات جانتے ہوئے بھی کہ میری محبت عمومی نہیں ہے۔"

"اچھا مجنوں صاحب! اب چھوڑو یہ ٹاپک۔" میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "کوئی اور قصہ چھیڑو۔"

"اچھا تو سناؤ! تمہاری شادی کب ہوگی؟" اس نے میری شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"کیوں میری شادی سے آپ کو کیا لینا دینا ہے؟" میں نے اسے چھیڑا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"ابے گدھے! تمہاری شادی پر تو مجھے خوب ڈانس کرنا ہے۔"

"وہ کیوں بھئی؟" میں نے حقیقتاً حیرت سے پوچھا۔

"کیوں کہ میں نے کسی سے وعدہ کر رکھا ہے۔"

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے چہکتے ہوئے کہا۔
"یہ 'کسی' کون ہے؟" میری اُلجھن برقرار تھی۔
"میری ہونے والی بھابی۔" اس کے چہرے پر رونق اور بہار نظر آ رہی تھی مجھے۔
"یار کیوں پہیلیاں بجھوا رہے ہو، سچ بتا دو۔" میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تو اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولا۔
"یہ وعدہ میں نے تمہاری منگیتر شائستہ کے ساتھ کیا تھا، جب گزشتہ بار ہم گاؤں سے واپس لاہور آ رہے تھے۔"
"اچھا! تو یہ بات ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "لیکن یار! مجھے اس وعدے کا پہلے پتا کیوں نہیں چلا؟ کیوں کہ گاؤں میں تو ہم اکٹھے ہی ہر جگہ آتے جاتے ہیں۔"
"ہم دونوں کے درمیان یہ باتیں تب ہوئی تھیں، جب تم اپنی...... ہونے والی ساس صاحبہ کے پاس ان ہی کی چارپائی پر بیٹھے ان سے گپیں ہانک رہے تھے۔"
"اچھا!" میرے ذہن میں وہ منظر گھوم گیا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
اس کے بعد یوں ہوا کہ نعیم کا ذہن مذہب کی طرف کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ مجھ سے بھی وہ یہی کہتا
"یار! میرے حق میں دعا کیا کرو کہ اللہ مجھے استقامت دے۔" اور اس کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے میں نے صدق دل سے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی تھی۔ "الٰہی! میرے دوست کو استقامت دے اور اس کو اتنی ہمت دے کہ وہ عاصمہ کو بھول جائے، کیوں کہ یہی اس کے حق میں بہتر ہے۔" اور پھر ہم نے دیکھا کہ نعیم بالکل بدل گیا تھا۔ گم صم اور بجھے بجھے سے نعیم کی جگہ ایک نئے نعیم نے جنم لیا تھا۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کو پتا ہے کہ اس نے کسی کی دعا میں اتنی تاثیر دی تھی کہ وہ نعیم جو پہلے زلیخا کو اپنی صرف منگیتر سمجھتا تھا، اب اسے اپنا محبوب سمجھنے لگا تو اور جب بھی ہم گاؤں جاتے، تو وہ بہانے بہانے سے زلیخا کے گھر کے چکر کاٹتا۔
ایک دن میں نے زلیخا سے کہا۔ "زلیخا! ایک بات تو بتاؤ! تم نے کیا کچھ پڑھ کر نعیم کو کھلایا ہے؟ کہ اب وہ صرف تمہارے ہی نام کی مالا جپتا رہتا ہے۔"
وہ پہلے تو شرما سی گئی، پھر بولی۔ "سچ بتاؤں بھائی! میری سہیلیاں مجھے طعنے دیتی تھیں اور کہتی تھیں کہ تمہارا نعیم اب تمہارا نہیں رہا۔ اب وہ 'شہری بابو' بن گیا ہے اور یہ کہ اب میں اس کے 'معیار' کی نہیں رہی ہوں، تو ایسی باتیں سن کر میرا دل بہت دُکھی ہو جاتا تھا اور میں سب سے چھپ کر اللہ سے یہ دعا مانگا کرتی تھی کہ 'یا اللہ! یا تو مجھے اس طعنوں بھری زندگی سے آزاد کر یا پھر میرے نعیم کو صرف میرا بنا دے۔'"
"شاباش! اچھی بہن۔" میں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "مبارک ہو کہ اللہ نے تمہاری دعا کو فوراً شرف قبولیت بخشا۔ اب وہ صرف تمہارا ہے تمہارا۔"
"جی بھائی جی۔" وہ شرما کر اپنے آپ میں سمٹ گئی۔
میں اسے اللہ نگہبان کہہ کر آگے جانے لگا تو اس نے پیچھے سے مجھے پکارا۔ "بھائی جی؟" میں نے پیچھے مڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔
"وہ...... شائستہ بھابی آپ کو سلام کہہ رہی تھیں۔"
"اوہ...... اچھا! میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "انہیں وعلیکم السلام کہہ دینا، بلکہ دست بستہ سلام کہنا۔" میں نے شوخی سے کہا تو وہ شرما کر آگے چلی گئی۔

☆......☆

ہماری تعلیم جاری تھی کہ ایک دن نعیمہ خالہ نے مجھ سے کہا۔ "شہباز بیٹا، نعیم کے سسرال والے آئے تھے اور وہ لوگ چاہتے ہیں کہ عیدالفطر کے بعد ان کی شادی کر دی جائے۔"
"خالہ! یہ تو بہت بڑی خوش خبری ہے۔ نیک کام میں کیسی دیر۔"
"بس بیٹا! تو پھر ٹھیک ہے۔" نعیمہ خالہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "آج کل میں، تمہارے انکل آتے ہیں، تو میں انہیں لے کر گاؤں جاؤں گی اور شادی کی تاریخ پکی کر آؤں گی۔" اور پھر تیسرے دن وہ لوگ گاؤں سے واپس لوٹے تو شادی کی تاریخ طے کر کے ہی آئے۔

☆......☆

"یار شہباز!" پتا نہیں کیوں آج دل اُداس ہو رہا ہے۔" بس میں نعیم نے کہا تو میں نے اسے چھیڑا۔
"عاصمہ کی یاد تو نہیں آ رہی ہے؟"

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔" اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔
"سوری بھئی!" میں نے کان پکڑ لیے۔ "اگر بُرا لگا تو معاف کر دو۔"
"بس تم اس کا ذکر مت کیا کرو۔ زخموں کو کریدنا اچھی بات تو نہیں ہے نا۔" اس نے کہا۔
"اب تو زلیخا ہی اپنی سب کچھ ہے۔"
"کیا مطلب؟" مجھے پھر شوخی نے آن لیا۔
"سب کچھ، مطلب؟ ماں باپ، بہن بھائی، دوست یار...... سب کچھ۔"
"ابے نہیں گدھے۔" اس نے میری لاعلمی پر اظہار تاسف کیا۔
بس فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ ہم لوگ یوں ہی خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ چوں کہ دن کا وقت تھا اور شدید گرمیوں کے دن تھے، اسی لیے چلتی ہوئی بس تو بڑی اچھی لگ رہی تھی، لیکن وہی بس جب کسی اسٹاپ پر رُکتی تو گرمی سے دم گھٹتا محسوس ہوتا۔ ہم نے بس کے شیشے کھول رکھے تھے کیوں کہ یہ نان اے سی بس تھی اور اندر مسافر حضرات سگریٹ پی رہے تھے۔ چلتے چلتے پانی کی پیاس محسوس ہوئی۔ میں نے دیکھا بس کی رفتار دھیمی پڑ رہی تھی، غالباً کوئی اسٹاپ آ گیا تھا۔
"بھائی پھیرو...... بھائی پھیرو۔" کنڈیکٹر کی آواز سے پتا چلا کہ بھائی پھیرو عرف پھول نگر کا اسٹاپ آ چکا تھا۔ بس رُکی تو اترنے والوں سے زیادہ جلدی سوار ہونے والوں کو تھی۔ کنڈیکٹر چلا رہا تھا۔
"پہلے سواریوں کو اترنے تو دو......" میں نے سوچا، گیٹ تک پہنچنا تو بہت مشکل ہے اور پیاس بھی شدید لگ رہی تھی، شیشے چوں کہ پہلے سے ہی کھلے ہوئے تھے اس لیے میں "منچلے نوجوانوں" کی طرح سیٹ سے ہی دُہرا ہو کر باہر نکل گیا۔
"کہاں چلے؟" نعیم نے پکارا تو میں نے اشارے سے اسے پانی لانے کا کہا۔ ہمارے ساتھ والی سیٹوں پر ایک بہت بڑی فیملی سوار تھی۔ وہ لوگ کسی شادی پر جا رہے تھے۔ ان صاحب نے پکارا۔
"بھائی! ایک بوتل پانی والی ہمارے لیے بھی لیتے آنا، بچوں کو پیاس لگی ہے۔ آ کر پیسے لے لینا۔"
لیکن افسوس...... سب کچھ ہی ختم ہو گیا۔ میں نے کولڈ ڈرنکس والے سے منرل واٹر کی دو بوتلیں مانگی ہی تھیں کہ ایک زوردار دھماکا ہوا اور اس بس کے پرخچے اڑ گئے جس میں سے میں اُترا تھا، میرا جگری دوست نعیم تھا اور بہت سے لوگ تھے جو اپنے اپنے دوستوں، رشتے داروں سے ملنے جا رہے تھے۔ وہ معصوم بچے بھی تھے، لیکن سب کچھ ہی ختم ہو گیا۔
لیکن اس سانحے سے اتنا پتا چلا کہ رفیق انکل نجانے کب سے ان انسان نما درندوں کے ساتھ تھے اور دہشت گردی کے اس مذموم کاروبار میں ملوث تھے۔ یہ بھی پتا چلا کہ انڈین خفیہ ایجنسی "را" والے یہ کام کروا رہے تھے، لیکن جو بھی تھا۔ نعیم ہم سے بہت دُور جا چکا تھا۔ اتنا دور کہ سے اپنا دوست تو کیا ہر وقت جان نچھاور کرنے والی ماں، لاڈ کرنے والی بہن اور اس کی راہوں میں ہر وقت پلکیں بچھانے والی اس کی منگیتر، کوئی بھی اس کو واپس نہ لا سکے۔
باپ تو اس کا قاتل تھا ہی اور اس نے بھی چیخ چیخ کر اپنے اس گھناؤنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا۔ نعیمہ خالہ کا دماغ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا اور وہ پاگل ہو گئیں۔
میں بڑی مشکل سے ان کو واپس گاؤں لے آیا۔ خالہ نعیمہ تو ہر غم فکر سے آزاد ہو گئیں۔ ثمینہ کی شادی بالکل سادگی سے ہم نے ظہیر کے ساتھ کر دی تھی۔ سب سے بدتر حالت زلیخا کی تھی، وہ میرے گلے لگ کر روتی تھی اور کہتی تھی۔ "بھیا! اگر میری دعاؤں کا اثر اس طرح سے ہونا تھا تو کاش ان کی جگہ میں مر جاتی۔" اور میں زلیخا کو دلاسا بھی نہیں دے سکتا ہوں کہ خود میرا جگر پھٹنے لگتا ہے اس کی حالت کو دیکھ کر...... کاش کہ ہم یہ سفر نہ کر رہے ہوتے۔ آج بھی جب کبھی مجھے ان لوگوں کی یاد آتی ہے تو پورا واقعہ میرے دماغ میں گھوم جاتا ہے اور خاص کر مجھے اپنے جگری دوست نعیم کی یاد آتی ہے تو میری زبان پر بے ساختہ یہ شعر آ جاتا ہے۔

یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

☆......☆

www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

نویں سچ بیانی

آخری خواہش

نور محمد بھٹو

ننھی سے زندگی کے دوراہے پر، ایک خواہش کی آس میں جیتی، دوشیزہ کی کہانی

درد کی شدت سے میں رات بھر کراہتی رہی تھی اور نیند تھی کہ میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی، کیوں کہ اکرم پچھلے تین دنوں سے گھر نہیں آیا تھا اور میں اس کی طرف سے سخت پریشان تھی کہ بچے کی ولادت کا وقت بہت قریب ہے اور میں گھر میں اکیلی ہوں، ایسے میں کہیں میری جان نکل نہ جائے۔ یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹا جارہا تھا کہ اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ سن کر میری جان میں جان آگئی کہ اکرم بس آگیا ہوگا، لیکن جب میں نے دروازے کی کنڈی کھولی تو سامنے ماسی کوثر کھڑی تھی، جس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔ وہ دروازہ کھلتے ہی اندر آگئی اور بولی۔

"میرے بیٹے کی منگنی ہوگئی ہے، میں اسی خوشی میں مٹھائی لائی ہوں تمہارے پاس۔" اُس نے میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "ارے یہ تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں، لگتا ہے تمہیں کوئی درد وغیرہ ہے۔"

یہ سن کر میں بس اپنے پیٹ پر ہاتھ ہی رکھ سکی تھی اور میرا سر چکرا گیا، کافی دیر کے بعد مجھے ہوش آیا تو میرے پہلو میں ایک ننھی منی سی پری سفید تولیے میں ملبوس لیٹی ہوئی تھی اور میرے پائنتی ایک دائی اماں کے ساتھ ماسی کوثر بھی کھڑی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ انہوں نے مجھے کس بڑی مصیبت سے بچایا ہے اور انہوں نے اس سلسلے میں میری بھرپور مدد کی ہے۔ ان دونوں کا میں نے بہت شکریہ ادا کیا اور ان سے کہا کہ "اکرم جیسے ہی آجائے گا، میں آپ کی محنت کے پیسے آپ کو دے دوں گی۔" یہ سن کر وہ دونوں میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

"پیسوں کی کوئی بات نہیں ہے، بس شکر ہے اس رب کا کہ آپ کا مسئلہ حل ہوگیا۔" پھر کچھ دیر تک وہ بیٹھی رہیں، مگر میں اٹھنے کے قابل کہاں کہ جو اُن کی کچھ خدمت کرتی، اس لیے وہ شام کو ملنے کا کہہ کر چلی گئیں۔

☆......☆

شام کو جب وہ دونوں آئیں تو گھر میں ویسی ہی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے بستر پر لیٹے دیکھ کر وہ میرے سرہانے بیٹھ گئیں، جنہیں دیکھ کر مجھے اپنی بڑی بہن اور اماں جی یاد آنے لگیں، کیوں کہ جب بھی مجھے کوئی تکلیف ہوتی تھی تو وہ یونہی میرے سرہانے بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتی تھیں اور میری تکلیف کے دُور ہونے تک وہ چین کی نیند نہ سوتی تھیں، مگر ہائے ری قسمت، میں بھی کہاں آگئی کہ نہ ماں باپ کا سایہ تھا اور نہ بہن بھائیوں کی

محبت......! کچھ دیر تک وہ میرے ساتھ بیٹھی حال احوال کرتی رہیں، مگر وہ آخر کب تک میرے ساتھ بیٹھی رہتیں۔

رات کے تقریباً 11 بجے تھے کہ اکرم گھر میں داخل ہوا۔ میرے پہلو میں بچی کو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اُتر گیا اور اس کا گلا جیسے خشک ہوگیا ہو۔ وہ قریب ہی رکھے گھڑے سے پانی پیتے ہوا بولا......! "تمہیں بیٹی ہوئی ہے؟"

میں اس کی طرف غصّے سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"پھر تم کیا دیکھ رہے ہو......؟" وہ اس کی طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اسے میری نظروں سے دُور کردو، آئندہ میں اس کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گا۔" یہ سن کر میں اس کی سنگدلی پر افسوس کرتے ہوئے بولی۔

"آخر تمہیں اس معصوم سے کیوں نفرت ہے......؟"

وہ اپنی خون اُگلتی آنکھوں سے اس کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "جیسی تم کمینی اور گری ہوئی ہو، مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی ایسی ہی ہوگی اور ایک دن تمہاری طرح یہ بھی کسی اَیرے غیرے کے ساتھ رات کی تاریکی میں بھاگ جائے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ تم آج ہی اس کا گلا گھونٹ دو، تاکہ تمہیں وہ منحوس دن دیکھنا ہی نہ پڑے۔"

یہ سن کر میرا سر شرم سے جھک گیا اور میں نے بات کو ختم کرتے ہوئے بڑی نرمی سے کہا۔

"پچھلے تین دنوں سے تم کہاں غائب تھے؟ میں یہاں اکیلی پڑی رہتی ہوں، تمہیں اس کا ذرہ بھر بھی احساس نہیں ہے اور یہ تو اچھا ہی ہوا کہ ولادت کے وقت ماسی کوثر اور دائی اماں آگئی تھیں، ورنہ تو شاید آج میری لاش تمہارے سامنے پڑی ہوتی۔"

وہ میری بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بولا۔ "تم بھی کتنی بے وقوفوں والی بات کرتی ہو۔ مرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ یہ بات ضرور ہے کہ ولادت کے وقت تکلیف ہوتی ہے اور پھر میرے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میں انہیں اپنے آنچل سے پونچھتے ہوئے بولی۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اکرم تم اتنے بے درد اور سنگدل ہو گئے ہو۔ یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا کہ تم میرے مرنے پر بھی خوشی محسوس کر سکتے ہو، جبکہ میں تو تمہیں اپنا سب کچھ مان چکی ہوں۔ اب تم ہی میری محبت اور میری زندگی ہو، مگر تمہاری یہ نفرت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔" میری بات سن کر وہ ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"میں اور تمہاری محبت، تمہاری زندگی......؟ واہ واہ آخر وہ تمہاری پہلی محبت اور زندگی کہاں گئی، جس کی خاطر تم اپنا سب کچھ لٹا کر گھر سے نکلی تھیں اور وہ تمہاری عزت سے چند دن کھیل کر تمہیں بھرے بازار میں بیچ گیا، جس کی خاطر تم نے اپنے گھر والوں سے بغاوت کی اور رات کی تاریکی میں اس کے ساتھ بھاگ گئیں۔ تمہاری محبت تمہاری زندگی تو وہ ہے، جس کے ساتھ تم شادی کرنا چاہتی تھیں، جو تمہیں بازار میں کوڑے کے کٹڑے بیچ گیا اور اس کی محبت کا دیا ہوا تحفہ تمہارے پہلو میں اب بھی پڑا ہوا ہے اور تم کہتی ہو کہ میں اس بچی کو اپنا نام دے دوں...... نہیں...... نہیں یہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا، اب میں تمہاری اس محبت کے اس تحفے سے اور تم سے بے زار ہوں......" یہ سن کر میں اکرم کے پیروں میں گر گئی۔

"اگر تم نے اسے اپنا نام نہیں دیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی......" میں نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔

جس پر اکرم چڑ کر بولا "اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو اور میرے ساتھ میری بیوی بن کر رہنا چاہتی ہو تو تمہیں اس محبت کی نشانی کو چھوڑنا پڑے گا۔" یہ سن کر میں ایک بار پھر اس کے پیروں میں گر گئی اور رو رو کر گڑگڑاتے ہوئے اُس سے بولی۔

"اکرم ایسا ظلم مت کرو۔ اس معصوم کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر تمہیں سزا دینی ہی ہے تو مجھے دو۔ میری نادانی کی سزا اس معصوم بچی کو مت دو۔" میری بے بسی اور بہتی آنکھوں کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا۔

اس بحث و تکرار کے بعد مجھے میری حیثیت معلوم ہو گئی تھی، میں رات بھر روتی رہی، تڑپتی رہی، سسکتی رہی اور سوچتی رہی کہ واقعی مجھ جیسا بدنصیب کوئی نہیں ہے کہ جس کا ایک اچھا خاصا گھر تھا، جس میں میری ماں، باپ، بہن، بھائی سب ہی لوگ تھے۔ جہاں خوشیاں تھیں، محبتیں تھیں، اگر میرے پیر میں کانٹا بھی لگ جاتا تو اس پر اُن کی جان نکل جاتی تھی۔ انھوں نے مجھے بیٹوں کی طرح پالا پوسا اور بڑا کیا تھا، اس کے ساتھ ہی ساتھ مجھے اچھی تعلیم بھی دی تھی اور ایک اچھے گھرانے میں میرا رشتہ بھی طے کر دیا تھا اور میری شادی بھی قریب ہی تھی کہ دورانِ تعلیم عمران سے مجھے پیار ہو گیا، میں اس کے پیار اور محبت میں اتنی اندھی ہو چکی تھی کہ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کا دل توڑ کر اور اپنے رشتے کو بھی بھلا کر عمران کے ساتھ کورٹ میرج کا فیصلہ کر لیا اور رات کی تاریکی میں اس کے ساتھ گھر سے باہر نکل آئی، پھر وہ ظالم، بے وفا، دھوکے باز مجھے اپنے ایک دوست کے گھر لے آیا، جہاں زبردستی وہ چند ہفتوں تک میری عزت و آبرو سے کھیلتا رہا۔ اس کی محبت کا ایسا انجام دیکھ کر میں نے زہر پی کر مرنے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک دن وہ بے وفا، وہ ظالم و سنگ دل مجھے جوئے کے اڈے پر لایا اور اس نے یہاں میری بولی لگا دی۔ جہاں اکرم نے مجھے 40 ہزار روپے میں خرید لیا۔ اکرم اکیلا ہی گھر میں رہتا تھا۔ وہ جواری ضرور تھا، مگر دل کا بہت صاف آدمی تھا۔ اُسے اب تک میری اس نادانی پر سخت غصہ ہے اور اتنے عرصے ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود وہ میرے قریب بھی نہیں آیا ہے۔ اس کی نیک دلی اور شرافت کو دیکھ کر میں نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اُسے اپنے دل کی بات بھی بتا دی، مگر وہ میرے پیٹ میں پلنے والی بچی کی خاطر خاموش ہو گیا تھا۔ اب وہ میری گود میں بچی کو دیکھ کر جل سا جاتا ہے۔ وہ اس بات پر غصہ ضرور کرتا ہے کہ یہ اس کی بیٹی نہیں ہے، مگر ساتھ ہی وہ میرا بہت خیال بھی رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک دن اس بچی کے ساتھ ساتھ مجھ بدنصیب کو بھی بہت جلد اپنا لے گا، کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ میرا رب اس معصوم بچی کی محبت سے کسی وقت بھی اس کا دل لبریز کر دے گا اور کایا پلٹتے دیر نہیں لگتی، بس اسی آس اور اسی امید پر میں جی رہی ہوں اور اب یہی میری زندگی کی "آخری خواہش" ہے......!!

☆......☆

دسویں سچ بیانی

اب میں مطمئن ہوں

محمد بلال فیاض

ملتان سے ایک ظالم عورت کے سفاک ظلم کی تصویر

اُس نے آج پھر وہی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا اور مارے خوف کے پسینے سے شرابور وہ چلا کر اُٹھ بیٹھی تھی۔ "چھوڑ دو...... چھوڑ دو مجھے...... دور ہٹو۔" وہ بُری طرح چلا رہی تھی۔

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

جلیل اُس کی چیخ پکار سن کر اپنی چارپائی سے اُٹھ کر اس کی چارپائی کے قریب آ گیا تھا جو دو قدم کے فاصلے پر تھی۔

"کیا ہوا خالدہ؟" جلیل نے بہت پریشانی سے استفسار کیا تھا۔

"وہ مجھے مار دے گا جلیل...... خدا کے واسطے مجھے بچالو۔" وہ جلیل سے لپٹ کر زاروقطار رو رہی تھی۔

"کون؟ کون مار دے گا تمہیں؟"

"وہی...... وہی بچہ...... وہ کسی طور میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

"تم نے پھر وہی خواب دیکھا ہے؟" جلیل نے عرق آلود پیشانی کو اپنی انگلیوں سے مسلتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں...... مگر وہ خواب...... خواب نہیں حقیقت...... میں ابھی بھی اپنی گردن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت محسوس کر رہی ہوں جلیل۔"

"اچھا...... تم گھبراؤ مت...... اطمینان سے بیٹھو، میں پانی لاتا ہوں تمہارے لیے۔"

جلیل نے اسے تکیے کا سہارا دیا تو وہ نیم دراز ہوگئی۔ اس کا جسم ابھی تک کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں خوف کے سائے موجود تھے۔

جلیل نے گھڑے سے پانی کا گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ لو، پانی پیو۔"

پیاس کی شدت سے وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گئی اور پھر تکیے کا سہارا لے کر وہ آنکھیں بند کر کے نیم دراز سی ہوگئی۔

لیٹتے لیٹتے وہ جلیل کا بازو پکڑ کر التجائیہ انداز میں بولی تھی "تم ادھر میرے پاس ہی بیٹھے رہو۔"

"ہاں، میں یہیں تمہارے پاس ہی ہوں...... تم اطمینان سے سو جاؤ۔" جلیل کے کہنے پر اُس نے آنکھیں مکمل طور پر موند لی تھیں مگر دل و دماغ کو کسی صورت چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ مسلسل اضطراب کی کیفیت سے گزر رہی تھی۔

☆......☆

وہ صحن میں کھیلتے ہوئے بچوں کو کافی دیر سے پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی...... اور پھر یکایک اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔ اس کے چہرے کی رنگت تبدیل ہونے لگی تھی، اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے اور کنپٹی سے بہہ کر رخساروں پر آ گئے۔ جلیل جو اُس کی بدلتی کیفیات کا بغور جائزہ لے رہا تھا، فوراً ہی اُٹھ کر اس کے قریب آ گیا تھا۔

"یہ وہی ہے...... میرا دشمن...... اس سے کہو کہ یہاں سے چلا جائے۔" وہ احمر کی طرف اشارہ کر کے بے اختیار چلاّنے لگی تھی...... کھیلتے ہوئے بچے یک دم رُک کر حیرت سے اُسے دیکھنے لگے تھے۔

"جلیل...... یہی ہے میرا جانی دشمن، تم ایسا کرو اس کو مار دو...... ورنہ یہ مجھے مار دے گا۔" وہ جلیل کو جھنجھوڑ کر ہذیانی انداز میں چلاّنے لگی تھی۔

"خالدہ ہوش کرو...... یہ ہمارا بھتیجا ہے احمر!" جلیل نے اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا، اتنی دیر میں بچے وہاں سے رفو چکر ہو گئے تھے اور خالدہ بھی کچھ ہوش میں آ گئی تھی۔

"مجھے ہر جگہ وہی نظر آتا ہے...... وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں کیا کروں جلیل؟" خالدہ بے بسی سے کہہ رہی تھی۔

"تم ہرگز پریشان نہ ہو...... میں کل تمہیں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا...... ایسے تو تم بالکل نفسیاتی مریضہ بنتی جا رہی ہو۔" جلیل نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، مگر خالدہ کا خوف، دیوانگی، ہذیان اور پریشانی کسی طور ختم ہوتی دکھائی نہ دے رہی تھی۔

"مجھے یقین ہو چلا ہے کہ وہ مجھے مار دے گا۔" خالدہ نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

"ایسی فضول باتیں کیوں کر رہی ہو؟ تم نے ایک خواب کو اتنا کیوں سوار کر رکھا ہے اپنے ذہن پر؟" جلیل سخت لہجے میں گویا ہوا تھا۔

"یہ خواب؟ نہیں حقیقت ہے۔" وہ دیوانوں کی طرح بڑبڑا رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے جب میں سوتی ہوں تو وہ آ جاتا ہے...... چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ میری طرف بڑھتا

ہے۔ میرے سینے پر بیٹھ کر میری گردن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے...... میری سانس رُک جاتی ہے...... میں چیختی ہوں، چلاّتی ہوں، مگر وہ مجھے نہیں چھوڑتا، وہ مجھے جان سے مارنا چاہتا ہے...... وہ مجھے مار دے گا۔" خالدہ نے یہ کہہ کر کرسی کی پشت پر سر گرا دیا تھا۔

"کیا تم اُس لڑکے کو جانتی ہو......؟ میرا مطلب ہے تم نے کبھی زندگی میں اس بچے کو دیکھا ہے؟" جلیل نے خالدہ کا پژمردہ چہرہ بغور دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

خالدہ چند ثانیوں تک خاموش رہی، پھر جیسے اُس نے ہار مان لی تھی۔

"ہاں" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی تھی۔

"کون ہے وہ۔" جلیل نے بے چینی سے پوچھا تھا۔

"حمزہ!" خالدہ نے گویا دھماکہ کیا تھا...... جلیل اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"میں بہت اذیت سے گزر رہی ہوں...... میری زندگی میں اِک پل کا سکون نہیں...... سوتے، جاگتے مجھے کسی پل قرار نہیں آتا۔" خالدہ مجرمانہ انداز میں ہولے ہولے کہہ رہی تھی...... جلیل دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا رُواں رُواں کان بن گیا تھا...... وہ آنکھیں پھاڑے اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

☆......☆

بات گو ذرا سی تھی...... مگر لڑائی جو شروع ہوئی تو پھر بڑھتی چلی گئی...... کرکٹ کھیلنے کے دوران شہزاد خود کو آؤٹ ماننے کو تیار نہیں تھا، جبکہ حمزہ بضد تھا کہ وہ آؤٹ ہو چکا ہے اور اب اُس کی باری ہے...... حمزہ نے اسے گریبان سے پکڑ لیا تھا...... شہزاد نے لکڑی کا چھوٹا بیٹ ایک طرف پھینک کر حمزہ کے منہ پر زور سے تھپڑ رسید کیا تھا، جواباً حمزہ نے اسے پوری قوت سے دھکا دیا تھا، تو وہ لڑکھڑاتا ہوا منہ کے بل زمین پر گرا تھا اور گلی میں اینٹوں سے بنے اونچے نیچے فرش پر پڑا کانچ کا نوکیلا ٹکڑا شہزاد کے گال میں اندر تک کھب گیا تھا۔ وہ حلق پھاڑ کر چیخنے اور رونے لگا تھا...... اس کا چہرہ بری طرح لہولہان ہو گیا تھا...... حمزہ نے بڑی خوف زدہ نظروں سے شہزاد کا لہو سرخ چہرہ دیکھا تھا...... بہرحال جو بھی ہوا، لاشعوری طور پر ہوا تھا......

وہ اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے بھاگتا اپنے گھر میں داخل ہو گیا تھا۔

☆......☆

خالدہ اپنے بیٹے کے پھول سے چہرے کا حشر دیکھ کر تڑپ اٹھی تھی...... حمزہ کے گھر جا کر اُن لوگوں نے خوب ہنگامہ کیا تھا...... خوب لڑائی ہوئی تھی اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی تھی...... لیکن محلے کے لوگوں نے معاملے کو ٹھنڈا کیا تھا...... معافی تلافی کے بعد صلح صفائی تو ہو گئی تھی، مگر خالدہ کی ممتا کو قرار نہ آیا تھا۔

خالدہ کے بیٹے، شہزاد کے چہرے کا زخم تو ٹھیک ہو چکا تھا...... مگر وہ چہرے پر اپنا بدنما داغ چھوڑ گیا تھا، جیسے چاند کو گرہن لگ گیا ہو...... وہ جب جب شہزاد کے چہرے کا بدنما داغ دیکھتی تڑپ تڑپ جاتی...... اس کی ممتا بے قرار ہو جاتی تھی۔

"میرے پھول سے بچے کے چہرے کا ناس مار دیا...... ساری عمر یہ داغ میرے دل پر کانچ کی کرچیوں کی مانند چبھتا رہے گا" وہ اکثر پیار سے شہزاد کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہتی...... اس کے دل و دماغ میں غصے کا آتش فشاں جنم لے چکا تھا، جس میں انتقام کا لاوا اُبل رہا تھا۔

جون کی ایک گرم دوپہر تھی، خالدہ نے دروازے کا بوسیدہ پردہ ہٹا کر اس نے باہر جھانکا تھا۔ اُسے حمزہ کا چہرہ نظر آیا تھا۔ خالدہ کے دماغ میں شیطانی خیال کوندے کی طرح لپکا تھا...... اور چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ آ گئی تھی...... انتقام کے لاوے کو باہر نکلنے کا راستہ جو مل گیا تھا۔

"حمزہ بیٹے! کہاں جا رہے ہو؟" اس نے لہجے میں زمانے بھر کی مٹھاس سموئے ہوئے پوچھا تھا۔

"برف لینے جا رہا ہوں۔" حمزہ نے آستین سے پسینا صاف کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اِدھر آؤ...... ذرا میری بات سنو!" خالدہ نے اُسے بہت پیار سے بلایا تھا۔

"جی آنٹی۔" وہ قریب آ گیا تھا۔

"میں نے حلیم بنائی ہے...... لیتے جاؤ، اپنی امی کو دے دینا، شہزاد سو رہا ہے ورنہ اس کے ہاتھ بھیج دیتی، آؤ اندر آ جاؤ۔"

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

حمزہ اس کی تقلید میں اندر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ برآمدے کے آخری سرے پر بنے کچن میں نیم تاریکی تھی۔

وہ اپنے پیچھے حمزہ کے قدموں کی چاپ محسوس کر رہی تھی...... کچن میں داخل ہوتے ہی آگے بڑھ کر اس نے کیبنٹ سے تیز دھار والا چاقو نکالا تھا، پھر اس نے پھرتی سے پلٹ کر حمزہ کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ کر تیز دھار والا نوکیلا چاقو اس کی گردن میں اتار دیا تھا اور پلک جھپکنے میں خالدہ کے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

☆......☆

لاش کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ بھی اس نے بخوبی حل کر لیا...... اس مقصد کے لیے اس کے جہیز کا بڑا والا صندوق بہت کام آیا۔

لاش کو صندوق میں اتارنے کے بعد پرانی بوسیدہ رضائی سے اسے ڈھک دیا اور صندوق پر بڑا سا تالا ڈال دیا اور اسے چارپائی کے نیچے گھسیٹ دیا۔

خون صاف کرنے اور قتل کے سارے نشانات مٹانے کے بعد وہ خود بھی نہا دھو کر مطمئن ہو گئی۔

''کچھ سنا تم نے......'' شام کو جلیل نے گھر آتے ہی اسے پکارا۔

''کیا......؟'' سرسری انداز میں اس نے کہا۔

''حمزہ کو کسی نے اغوا کر لیا ہے شاید۔ وہ دوپہر کو برف لینے گھر سے نکلا تھا، پھر اس کے بعد اس کا کچھ پتا ہی نہیں چلا...... پورا محلّہ سوگوار ہے...... اور حمزہ کی ماں تو غم سے بے حال ہے اور کئی بار وہ بے ہوش ہو چکی ہے۔''

''خدا غارت کرے...... کسی غریب کے بچے کو اغوا کر کے کس کو کیا مل جائے گا۔'' خالدہ نے لہجے کو افسردہ بناتے ہوئے کہا۔

''ہوں...... مگر اغوا کا مطلب صرف تاوان ہی نہیں ہوتا اور بھی بہت سے مقاصد ہوتے ہیں...... ہر شہر میں بچوں کو اغوا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی گروہ سرگرم رہتا ہے، اخبارات بھرے ہوتے ہیں ایسی خبروں سے، اللہ سب کے بچوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔'' جلیل کچھ زیادہ ہی آزردہ دکھائی دے رہا تھا۔

''آپ کھانا کھا لیں...... پھر میں جاتی ہوں حمزہ کے گھر...... بہت مشکل وقت آن پڑا ہے، کیا حال ہوگا بیچاری ماں کا۔'' لہجے کو غم زدہ بنانے کی اس نے کامیاب کوشش کی تھی۔

کچھ دیر بعد خالدہ، حمزہ کے گھر بچھی ماتمی صف کا حصہ بنی بیٹھی تھی...... آنکھوں میں آنسو، مگر دل شاد تھا۔

☆......☆

کروٹیں بدل بدل کر وہ تھک گئی تھی...... ایک بے چینی تھی جو کسی صورت چین نہیں لینے دے رہی تھی...... آج نیند بھی اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا...... اس نے چور نظروں سے دو قدم کے فاصلے پر پڑی چارپائی کو دیکھا جہاں جلیل اطمینان سے سو رہا تھا۔

''آخر مجھے آج نیند کیوں نہیں آ رہی...... کیسی بے چینی ہے، کیسا اضطراب ہے یہ۔'' وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی، جھانک کر چارپائی کے نیچے پڑے صندوق کو دیکھا، جس میں حمزہ کی خون آلود لاش رکھی ہوئی تھی...... دل عجیب واہموں میں گھر گیا تھا۔

دائیں طرف شہزاد اپنی چھوٹی چارپائی پر بے خبر سو رہا تھا، وہ اُٹھ کر اس کے قریب آ گئی...... زیرو واٹ کے بلب کی زرد روشنی میں اس کے چہرے کا داغ واضح نظر آ رہا تھا...... وہ مزے سے محوِ خواب تھا۔

تھکے تھکے قدموں کے ساتھ وہ واپس چارپائی پر آ کر لیٹ گئی...... اس کا دھیان بار بار چارپائی کے نیچے رکھے صندوق کی طرف چلا جاتا...... اتنا خوف تو اسے معصوم کی نازک گردن میں چاقو پیوست کرتے ہوئے بھی محسوس نہیں ہوا تھا، جتنا اب ہو رہا تھا۔

''اگر کسی کو پتا چل گیا تو......؟'' اس کے دل میں وہم نے ڈیرہ جما لیا۔

''نہیں...... کسی کو پتا نہیں چلے گا، کوئی صندوق کھولے گا تو پتا چلے گا۔'' اس نے اپنے پراندے سے بندھی چابی کو مضبوطی سے پکڑ کر خود کو دلاسا دیا۔

صبح صادق تک بے چینی سے کروٹیں بدل بدل کر اس کا جسم شل ہو چکا تھا۔

☆......☆

دور دور تک مساجد میں اعلان کروائے گئے، اخبارات میں اشتہارات دیے گئے...... اسپتالوں، یتیم خانوں، حتیٰ کہ شہر کے گلی کوچے چھان مارے گئے، مگر حمزہ کو نہ ملنا تھا اور نہ ہی وہ ملا...... اس کی ماں بچے کے غم میں نیم پاگل سی ہو گئی تھی...... رات کی تاریکی میں جب وہ چیخ چلاتی تو اس کی دلدوز چیخوں سے محلے والوں کے دل کانپ اُٹھتے...... اس کی بے چین ممتا کو کسی پل قرار نہ آتا...... گرمیوں کی گرم دوپہروں میں وہ ننگے پاؤں، گرمی کی تپش سے بے نیاز گلی کوچوں میں پاگلوں کی طرح پھرتی...... ہر راہ گیر کو روک روک کر اس سے اپنے لاڈلے جگر گوشے کے بارے میں پوچھتی۔

''تم نے میرا حمزہ دیکھا ہے؟''

لوگوں کے گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتی۔

''میرا حمزہ یہاں تو نہیں آیا؟''

''حمزہ......! کہاں چلا گیا میرا بچہ...... کوئی میرے بچے کو ڈھونڈ کر لادے۔''

ماں کی ممتا کرلاتی، دہائیاں دیتی...... دیکھنے والے دکھ سے اپنے آنسو پونچھتے رہ جاتے۔

''سنو! وہ اکثر محلے کے لوگوں سے کہتی لوگوں! اگر میرا حمزہ ملے تو اسے کہنا کہ جلدی گھر آ جائے، اس کی ماں اس کے غم میں مر رہی ہے...... ذرا جلدی گھر آ جائے تو...... میری بے قرار ممتا کو قرار آ جائے گا۔''

☆......☆

حمزہ کے مرنے کے بعد اس کی نیند بھی مر گئی تھی...... زندگی میں اب سکون نام کی کوئی چیز نہیں رہی تھی...... وہ خوف زدہ نظروں سے صندوق کو تکتی رہتی، جس میں اس نے اپنا گناہ چھپا کر رکھا ہوا تھا...... اب اس کے ضمیر پر ہمہ وقت ایک بوجھ سا دھرا رہتا تھا۔ ایک دن جلیل نے بھی اس کی بدلتی ہوئی حالت کو نوٹ کیا تو بولا۔

''کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں...... ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک۔'' وہ گڑبڑائی۔

''لگتی تو نہیں......'' دیکھو تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے۔

''آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے ہوئے ہیں...... آنکھیں باہر کو اُبلی پڑی ہیں...... چہرہ زرد ہے۔''

''بس گرمی کی وجہ سے بلڈ پریشر لو ہو جاتا ہے آپ کو پتا تو ہے۔''

خالدہ نے سرسری طور پر یہ کہہ کر گویا اپنی جان چھڑائی۔

''اپنا خیال رکھا کرو۔'' جلیل نے نرم لہجے میں کہا۔ جواب میں وہ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

''یہ بدبو کیسی ہے کمرے میں؟'' جلیل نے ناگواری سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''کک...... کک...... کیسی بد...... بو؟'' خالدہ کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔

''کیا تمہیں محسوس نہیں ہو رہی؟ جیسے گلے سڑے گوشت کی بو ہو؟''

''نن...... نہیں تو...... ہاں شاید کوئی چوہا مرا پڑا ہوگا کسی پلنگ کے نیچے۔''

خالدہ نے فوراً بات بنائی۔

''میں صفائی کر لیتی ہوں......'' وہ جلدی سے بولی۔

''ہاں۔''

''اچھا میں بازار جا رہا ہوں...... تمہیں کچھ منگوانا ہو تو بتا دو۔''

''نہیں......''

فی الحال تو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔'' خالدہ نے جلدی سے کہا۔ وہ تو خود چاہتی تھی کہ جلیل جلد از جلد یہاں سے چلا جائے۔

جلیل کے جانے کے بعد اس نے صندوق کے قریب آ کر لمبا سانس لیا اور پھر ناک پر اپنا دوپٹا رکھ لیا...... لاش میں گلنے سڑنے کا عمل شروع ہو چکا تھا، جس کی بدبو آہستہ آہستہ کمرے میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔

''یہ اب نئی مصیبت ہے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی اور دوسرے کمرے سے جا کر پرفیوم کی بڑی بوتل اٹھا لائی پھر اس نے صندوق پر خوب اچھی طرح اسپرے کیا...... بدبو، پرفیوم کی دلفریب خوشبو میں دب گئی تھی، ایک بار پھر وہ مطمئن سی ہو گئی تھی۔

☆......☆

''پھر یہ اس کا روز کا معمول بن گیا...... وہ روز صندوق پر پرفیوم کا اسپرے کرتی...... بدبو دن بہ دن

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بڑھتی جا رہی تھی...... وہ بازار سے مزید چار شیشیاں بڑی بڑی پرفیوم کی خرید لائی تھی...... اب یہ کمرہ ہمہ وقت مختلف اقسام کی خوشبو سے مہکتا رہتا تھا۔

ایک دن جلیل نے شوخی سے کہا۔

"بھئی کیا بات ہے آج کل کمرہ خوب صاف اور مہکاتی رہتی ہو...... ہر دن کوئی نہ کوئی نئی خوشبو کمرے میں مہکتی ہے۔"

جلیل کی بات پر پہلے تو وہ سٹپٹا کر رہ گئی، پھر سنبھل کر بولی۔

"سیانے کہتے ہیں۔ خوشبو انسان کے ذہن اور شخصیت پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔"

یوں بات آئی گئی ہوگئی، مگر خالدہ کی پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا، آخر کب تک وہ خوشبو کا سہارا لے کر اپنے سفاک گناہ کو چھپاتی۔

"کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔" جلیل کے کمرے سے باہر جانے کے بعد اس نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔

"اس مصیبت کو جلد از جلد اس گھر سے دفعان کردوں تو بہتر ہے۔" وہ صندوق کو دیکھ کر بڑبڑائی۔

رات سونے سے پہلے اس نے چپکے سے اپنے بٹوے سے نیند کی گولیوں کا پتا نکالا اور دو گولیاں پانی کے ساتھ نگل کر تکیے پر سر رکھ دیا۔ اب بے سکونی سے گھبرا کر وہ مصنوعی نیند کا سہارا لینے لگی تھی...... جس سے کچھ دیر کو آنکھ تو لگ جاتی تھی، مگر دو، تین گھنٹوں بعد ہی وہ کسی ڈراؤنے خواب سے گھبرا کر مارے خوف کے اُٹھ جاتی اور باقی رات حسب معمول آنکھوں میں ہی کٹتی تھی۔

☆......☆

جلیل کو کسی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑ گیا تو...... خالدہ نے سکون کا سانس لیا...... کم از کم اب وہ اطمینان سے لاش کو کسی ٹھکانے لگا سکتی تھی، جو کسی ننگی تلوار کی طرح ہمہ وقت اس کے سر پر لٹکتی رہتی تھی۔

جب اسے یقین ہوگیا کہ شہزاد سو چکا ہے تو اس نے چارپائی کے نیچے سے صندوق کھینچا اور کانپتے ہاتھوں سے تالا کھولا۔ ناک پر کپڑا ہونے کے باوجود بدبو کی ایک تیز لہر اس کے ناک میں گھستی چلی گئی۔

لاش کی حالت ناقابل بیان تھی...... وہ خوف سے کانپ کر رہ گئی، وہ بوسیدہ رضائی، جو اس نے لاش کے اوپر ڈال رکھی تھی، میں گلے سڑے وجود، جس میں اب کیڑے پیدا ہوگئے تھے، کو ایک مضبوط بوری میں منتقل کیا اور بوری کے منہ کو مضبوط رسّی سے باندھ دیا۔

برصغیر کی عظیم ڈرامہ نویس

فاطمہ ثریا بجیا کی زندگی کی کہانی

سیدہ عفت حسن رضوی کی زبانی

ایک معرکتہ الآراء کتاب

شائع ہوگئی ہے

اور اس سارے کام کے بعد وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔

گھر کو باہر سے تالا لگایا...... تیز تیز قدم اٹھاتی وہ گندے نالے تک پہنچی، صد شکر کہ گندا نالہ گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔

بوری نالے میں پھینکنے کے بعد وہ بے حد ہلکی پھلکی ہوگئی تھی...... جیسے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہو......

کچھ دیر بعد ہی بوری بند لاش نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

☆......☆

اور اُسی رات حمزہ اس کے خوب میں آیا۔

وہ غصے سے جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا اور اس کے سینے پر بیٹھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ ایک دم خوف سے چیخ مار کر اُٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا امی؟" شہزاد اس کی چیخ سن کر اُٹھ گیا تھا اور اب سہمے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا، خالدہ کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔

"کک...... کک...... کچھ نہیں...... تم سو جاؤ بیٹا!" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا تھا۔

جس مصیبت کو وہ گندے نالے کے سپرد کرنے کے بعد وقتی طور پر مطمئن ہوئی تھی، اب وہ سارا اطمینان بھاپ بن کر اُڑ گیا تھا۔ اب اس کے ضمیر پر اک بوجھ سا سوار ہوگیا تھا...... بے سکونی کے اذیت ناک سلسلے بڑھتے چلے گئے۔ خوابوں اور خیالوں میں اب حمزہ اسے کسی پل چین نہ لینے دیتا تھا...... وہ تقریباً نفسیاتی مریضہ بن گئی تھی...... نیم پاگل سی ہوگئی تھی حمزہ کی ماں کی طرح۔

☆......☆

جلیل شاکڈ رہ گیا تھا۔ وہ بے یقینی سے اس کے پژمردہ چہرے کو دیکھ رہا تھا...... وہ اسے اس وقت اپنی بیوی نہیں بلکہ قاتلہ نظر آ رہی تھی...... جس کے ہاتھ معصوم بچے کے لہو سے رنگے ہوئے تھے۔

"تم اتنی سفاک ہو سکتی ہو......؟ نہیں، مجھے یقین ہی نہیں آتا۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

خالدہ کی آنکھوں میں پچھتاوے کے آنسو آ گئے۔

"ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے ایسا کیا، اپنے بچے کا بدنما داغ دار چہرہ مجھے چین نہیں لینے دیتا تھا اور پھر میری اندر کی انسانیت جیسے مر گئی تھی...... اور...... اور میں نے اپنے ان ہاتھوں سے......"

وہ اپنے ہاتھ جلیل کے سامنے پھیلا کر رونے لگی۔

"میں بہت اذیت سے گزر رہی ہوں جلیل......" منہ پر دوپٹا رکھتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان وہ بہ مشکل بولی۔

"تمہیں کیسے سکون ملے گا خالدہ بیگم! ایک بے گناہ معصوم کو، جسے تم نے معمولی سی لڑائی پر موت کے گھاٹ اتار دیا...... اس کی ماں کا حال دیکھا ہے تم نے؟ پاگلوں کی طرح ماری ماری پھرتی ہے...... پھر بھلا تمہیں کیسے سکون ملے گا؟"

"میری آنکھوں پر انتقام کی پٹی بندھی ہوئی تھی...... میں اندھی ہوگئی تھی۔"

"انتقام......؟ معمولی سے جھگڑے کا اس قدر بھیانک انتقام...... غصے سے تمہاری عقل بھی مفلوج ہوگئی تھی؟ یہ تم نے کیا کر دیا، بہت برا کیا تم نے۔" جلیل نے بڑے دُکھ بھرے لہجے سے کہا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا...... خالدہ اب ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

☆......☆

میں خالدہ جلیل ہوں......

اپنے شوہر سے حال دل کہنے کے بعد بھی مجھے سکون نہیں ملا، مجھے میرا ضمیر کچوکے لگاتا تھا...... خواب و خیال میں حمزہ کا بھوت میرے دماغ پر چیکار رہتا۔ میں بالکل پاگل ہو چکی تھی...... اکثر میرا بیٹا شہزاد بھی مجھ سے خوف زدہ رہتا...... میری زندگی بر دوزخ بن گئی تھی۔

میں جانتی تھی وہ معصوم حمزہ مجھے معاف نہیں کرے گا، زندگی کا سکون تو غارت ہو ہی گیا تھا، مگر روز قیامت بھی مجھے جواب دہ ہونا پڑے گا، تب اس کا ہاتھ ہوگا اور میرا گریبان۔

اس لیے میں نے ایک فیصلہ کر لیا...... آج میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے سزا کاٹ رہی ہوں۔ آج میرے ضمیر پر بوجھ نہیں ہے، اب حمزہ بھی میرے خواب میں نہیں آتا...... کیوں کہ اپنے کیے کی سزا پا کر میں مطمئن ہوں۔

☆......☆

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

آتشِ جنوں

چٹان سا حوصلہ رکھنے والے نوجوان کی رُوداد، 25 ویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و انا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے.....ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے، جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان، راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران میں اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلۂ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں اس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ پولیس کی آمد ہوتی ہے اور وہ ان مجرموں کے ساتھ عمران اور ارسلان کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے۔ ان کے درمیان تلخ کلامی ہوتی ہے اور راشد کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے رابطے کے باعث پولیس انہیں تھانے میں بیان ریکارڈ کرانے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دن راشد کا مرڈر ہو جاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔

تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے اور آزاد کرا کے کسی نامعلوم مقام پر لے جاتا ہے۔ یہاں عمران کو ارسلان بتاتا ہے کہ ان کی بہن شائستہ کو مشہدی نے کراچی سے باہر کہیں منتقل کر دیا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اُس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران میں پولیس، عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اُس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی ماں کی اس صورتِ حال میں طبیعت بگڑتی ہے اور اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ستم یہ ہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا، اُس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو گئے تھے۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی

پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ ارسلان، بیرسٹر بخاری کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں اُن کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون آتا ہے اور پھر انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے.....عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں......

عمران اپنی بہن کی تلاش میں اس کی دوست وردہ کے گھر پہنچتا ہے جہاں وردہ کے والد بتاتے ہیں کہ رات میں کسی لڑکی کا فون آیا تھا، فون نمبر کی انکوائری پر معلوم ہوتا ہے، وہ نمبر اسٹیشن کے قریب کسی پی سی او کا ہے۔ عمران اور نادیہ کینٹ اسٹیشن پہنچتے ہیں جہاں نادیہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عمران ان اغوا کاروں کو پکڑ کر پوچھ گچھ کرتا ہے۔

عمران اور تیمور، شائستہ کو تلاش کرتے کرتے حاکم خان کے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں مگر شائستہ، حاکم خان کے غنڈوں کو زخمی کر کے پہلے ہی فرار ہو جاتی ہے۔ تیمور، حاکم خان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ وہ دونوں حاکم خان کے سیف سے ضروری کاغذات لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ مشہدی فون کر کے ان کاغذات میں سے ایک ریڈ فائل کا تقاضہ کرتا ہے مگر عمران اسے فائل دینے سے انکار کر دیتا ہے۔

ٹیلی فون پر مشہدی اور عمران کی تلخ کلامی ہوتی ہے۔ مشہدی اسے دھمکیاں دیتا ہے اور ملٹری انٹیلی جنس کو اس کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ وہ اس کے آفس میں کچھ ممنوعہ فائلیں اور دوسرا میٹر رکھوا دیتا ہے لیکن ہاشم اور تیمور کی بروقت مداخلت سے عمران بچ جاتا ہے اور ملٹری انٹیلی جنس والے ناکام لوٹ جاتے ہیں۔ ہاشم شبے میں آفس کے جی ایم سمیت کئی افراد کو اٹھا لیتا ہے۔ وہ آفس کے ایک چپڑاسی کو پکڑ لیتے ہیں۔ وہ سب کچھ اگل دیتا ہے۔ ہاشم اسے ویرانے میں لے جا کر ہلاک کر دیتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کا

www.paksociety.com

www.paksociety.com
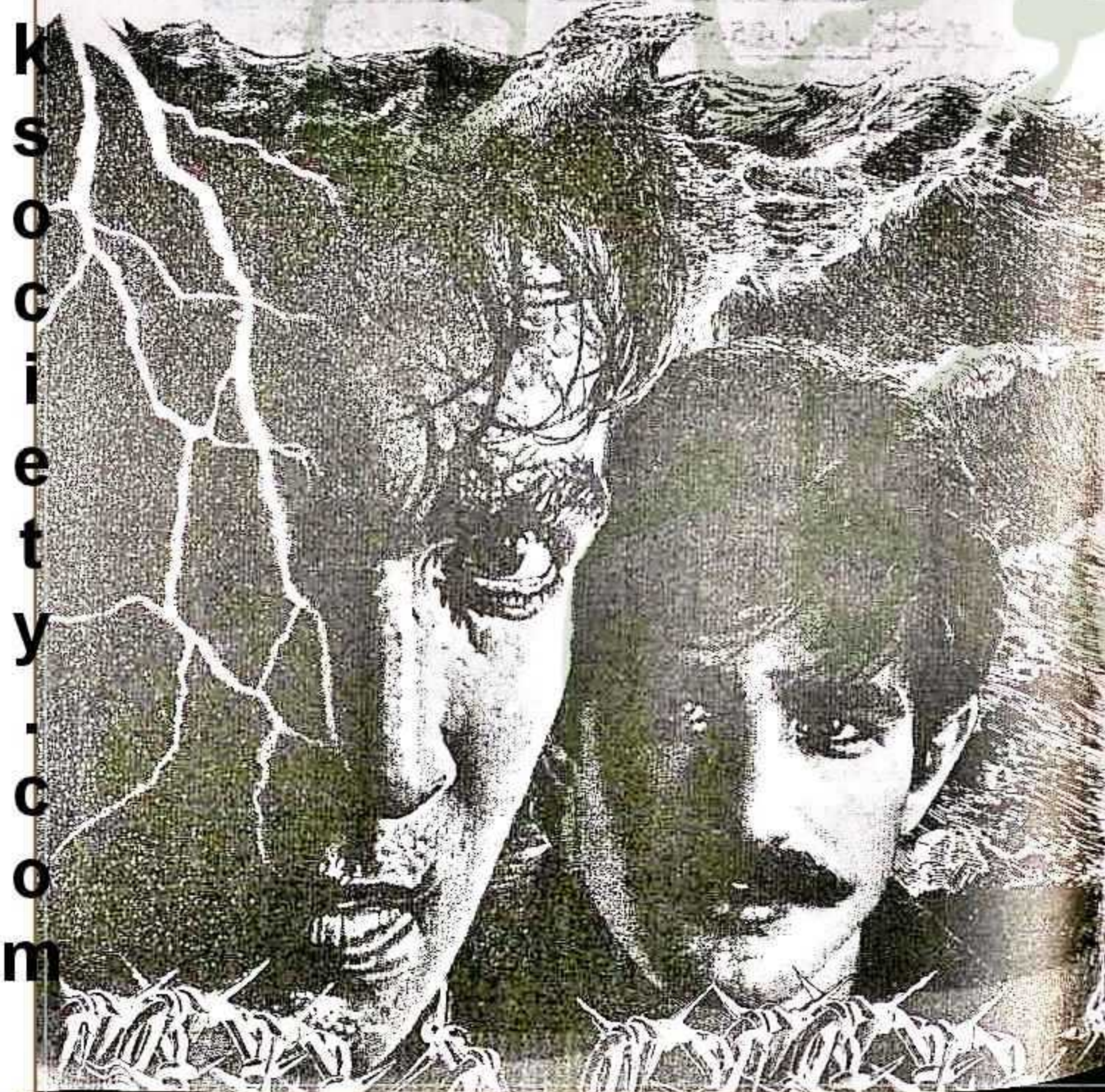
ایک دشمن غنی بلوچ، عمران سے آملتا ہے۔ بلوچ، عمران کو بتاتا ہے کہ اس نے مشہدی کا جہاز غرق کرنے کی تیاری کرلی ہے۔ وہ لوگ جہاز میں ریموٹ بم لگا کر آتے ہیں تو جہاز کے کسی آدمی کی نظر بلوچ پر پڑ جاتی ہے۔ وہ تیزی سے اس تنگ کھاڑی میں گھس جاتا ہے جہاں ان کی لانچ لنگر انداز تھی۔ اچانک کھاڑی کے سامنے تیز روشنی ہوجاتی ہے اور کوئی چیخ کر کہتا ہے کہ اندر جو کوئی بھی ہے باہر آجائے ورنہ یہ کھاڑی اس کی قبر بن جائے گی......

کوسٹ گارڈز کی لانچ انہیں ڈھونڈنے میں ناکام ہوکر واپس چلی جاتی ہے۔ ہاشم بوٹ کو لے کر جیٹی پہنچتا ہے جہاں پہنچ کر ہاشم ریموٹ کنٹرول کے ذریعے مشہدی کے جہاز ایم وی مونارک کو تباہ کردیتا ہے اور ریموٹ کنٹرول سمندر میں پھینک دیتا ہے جہاں سے یہ لوگ علیحدہ علیحدہ گھروں کے لیے روانہ ہوجاتے ہیں۔ راستے میں عمران کو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی گاڑی اس کے تعاقب میں ہے۔ وہ کمال ہوشیاری سے اس شخص کو قابو کرتا ہے اور اسے گھر لے آتا ہے جہاں تیمور بھی آجاتا ہے۔ اس شخص سے پوچھ گچھ کرنے پر پتا چلتا ہے کہ وہ مشہدی کا آدمی ہے اور ساتھ ہی یہ انکشاف بھی کرتا ہے کہ عمران کا بھائی ارسلان زندہ ہے۔ جس کے بارے میں تفصیلات کا علم شبو کو ہے تب ہی بلوچ آکر انہیں بتاتا ہے کہ مشہدی نے امریکا کی کسی بدنام ایجنسی سے ان لوگوں کو قتل کرنے کے لیے خاص آدمیوں کو بلایا ہے۔

جان محمد جو کہ مشہدی کا آدمی ہے لیکن اصل میں وہ عمران کے لیے کام کررہا ہے۔ معلومات فراہم کرتا ہے کہ ان کے خاتمے کے لیے مشہدی نے جن کرائے کے قاتلوں کو امریکا سے بلایا ہے ان کی تعداد پانچ ہے جن میں سے دو کا تعلق امریکا سے ہے، ایک ہندو ہے اور دو یہودی۔

بلوچ، شبو کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ کسی زمانے میں چھوٹا موٹا بدمعاش تھا جسے بعد میں مشہدی نے اپنے گینگ میں شامل کرلیا تھا۔ اس کا اصل نام شہاب ہے اور اس کی ڈیوٹی پورٹ پر ہوتی ہے۔ مشہدی کے خاص آدمیوں میں سے ہے اور پورٹ سے بہت کم باہر نکلتا ہے۔ اسے صرف اسٹیمر سے باہر لانا ہوگا جہاں سے اسے کھلے سمندر میں لے جائیں گے اور اس آپریشن میں اس کے ساتھ ہاشم اور عمران بھی شریک ہوں گے۔

دوسری جانب جان محمد فون پر بتاتا ہے کہ مشہدی کے امپورٹڈ دہشت گردوں میں سے ایک پی سی کے ریسٹورنٹ میں موجود ہے جس کا نام آرنلڈ ہے۔

عمران، نعیم کو ساتھ لے کر ہوٹل کی جانب روانہ ہوجاتا ہے جہاں سے وہ امریکن اپنے گارڈز کے ہمراہ ہوٹل سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ لوگ محتاط ہوکر ان کا تعاقب کرتے ہیں۔ گاڑی ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے رکتی ہے۔ وہ امریکن اسٹور میں چلا جاتا ہے۔ عمران اور نعیم باہر ہی اس کا انتظار کرتے ہیں۔ جیسے ہی آرنلڈ باہر آتا ہے، نعیم اس سے بغل گیر ہوجاتا ہے اور عمران بھی یوں ظاہر کرتا ہے جیسے صدیوں کی شناسائی ہو اور ساتھ ہی آہستگی سے اس سے کہتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں ریوالور ہے لہٰذا وہ بغیر چوں و چرا کیے ان کے ساتھ چلے۔ آرنلڈ خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑتا ہے۔

گھر لاکر پوچھ گچھ میں آرنلڈ اقرار کرتا ہے کہ وہ کرائے کا قاتل ہے اور مشہدی نے اسے بلایا ہے۔ عمران، تیمور سے کہتا ہے، اسے گولی ماردو اور اس کے سینے پر ایک ٹیگ لگا دینا ہے۔ ”مشہدی کے لیے اس کے ایک پرانے دوست کا تحفہ“

تیمور، نعیم کی مدد سے آرنلڈ کے مردہ جسم کو لے کر باہر نکل جاتا ہے۔ ابھی تیمور کو نکلے مشکل سے دس منٹ ہوئے تھے کہ عمران کے گھر کے نزدیک پولیس موبائل کے سائرن کی کرخت آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

پھر موبائل عین دروازے کے سامنے آکر رکتی ہے۔

آنے والا پولیس آفیسر عمران کو بتاتا ہے کہ وہ لوگ ایک خطرناک دہشت گرد کا پیچھا کررہے تھے۔ انہیں شک ہے کہ وہ اردگرد کے کسی بنگلے میں نہ گھس گیا ہو۔ عمران اسے بتاتا ہے کہ ان کے بنگلے پر موجود سیکورٹی کی موجودگی میں ایسا کچھ نہیں ہوسکتا۔

تیمور آکر بتاتا ہے کہ انہوں نے آرنلڈ کی لاش کے سینے پر ”تحفے“ والا ٹیگ لگا دیا ہے۔ لاش کچھ دیر میں پولیس کو مل جائے گی۔ بلوچ کہتا ہے کہ اس نے شبو کے ٹھکانے کا سراغ لگا لیا ہے۔ اسٹیمر پر اس کے ساتھ پانچ چھ آدمی ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ آپ ان لوگوں کے بارے میں انفارمیشن جمع کرو، میں آپریشن کی تیاری کرتا ہوں۔

ٹی وی چینلز آرنلڈ کے بارے میں خبر نشر کرتے ہیں کہ مشہدی مقتول کو نہیں جانتے اور ان کا نام لے کر ان کے کسی دشمن نے ان کے خلاف کارروائی کی ہے۔ آپریشن پر روانگی سے قبل ہاشم نادیہ کو کہتا ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی، وہ خود اس وقت کے پی ٹی کے سیکورٹی افسر کے یونیفارم میں تھا۔ کے پی ٹی کے مین گیٹ پر سیکورٹی اہل کار نے جب ہاشم کو آفیسر کی یونیفارم میں دیکھا تو فوراً

بیریئر ہٹا دیے۔ جیٹی پر آگے بڑھتے ہوئے وہ اس علاقے میں پہنچتے ہیں جہاں اسٹیمر، لانچ اور بوٹس کھڑی تھیں۔ ہاشم بتاتا ہے کہ سامنے جو بڑا اسٹیمر ہے، وہ مشہدی کا ہے، جبکہ دوسرا اسٹیمر سیٹھ عبدالستار کا ہے۔ عمران کہتا ہے کہ پہلے سیٹھ عبدالستار کے اسٹیمر پر جایا جائے وہاں سے مشہدی کے اسٹیمر میں جانے میں آسانی ہوگی۔

اسٹیمر پر پہنچ کر بلوچ ایک کیبن کا دروازہ کھولتا ہے تو اندر ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی موجود ہوتے ہیں۔ وہ لڑکا بتاتا ہے کہ وہ سیٹھ عبدالستار کا بیٹا ہے اور اسٹیمر پر اس کے علاوہ دو مزید آدمی موجود ہیں، جنہیں بلوچ پہلے ہی بے ہوش کرچکا تھا۔ ہاشم ان دونوں کو بھی ریوالور کا دستہ مار کر بے ہوش کردیتا ہے اور بلوچ سے کہتا ہے کہ میں اسٹیمر کو مشہدی کے اسٹیمر کے ساتھ لگا دوں گا، پھر وہاں سے ہم مشہدی کے اسٹیمر میں چلے جائیں گے۔ مشہدی کے اسٹیمر کے نزدیک پہنچ کر وہ ڈیک پر موجود مسلح افراد سے کہتے ہیں کہ ان کا فرسٹ ایڈ باکس خالی ہے اور ان کا ایک آدمی زخمی ہے۔ یہ کہہ کر عمران ان کے اسٹیمر پر کود جاتا ہے اس کے پیچھے ہاشم بھی تھا، جو کہ کے پی ٹی کے سیکورٹی افسر کے یونیفارم میں تھا، جسے دیکھ کر ان لوگوں نے اسلحہ نہیں نکالا تھا۔ عمران اور ہاشم مل کر ان لوگوں کو قابو کرلیتے ہیں۔

وہاں سے وہ شہاب عرف شبو کے کیبن میں پہنچتے ہیں جہاں شہاب اپنی بیوی کے ساتھ موجود تھا۔ عمران ریوالور کی مدد سے انہیں قابو کرتا ہے، بلوچ ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتا ہے۔ بلوچ اور ہاشم ان دونوں کو بوٹ میں چھوڑ آتے ہیں۔ بلوچ کہتا ہے کہ تیمور اور نادیہ ان کا انتظار کررہے ہوں گے، ہاشم کو واپس بھیج دیا جائے، شبو سے ہم نمٹ لیں گے۔ ہاشم وہاں سے رخصت ہوجاتا ہے۔ عمران بلوچ کو کہتا ہے کہ بوٹ کھلے سمندر میں لے چلو۔ بلوچ شبو سے پوچھ گچھ شروع کردیتا ہے۔

شبو بتاتا ہے کہ ارسلان مشہدی کی قید سے فرار ہوگیا تھا جاتے جاتے مشہدی کی خفیہ فائل لے گیا ہے۔ انڈیا میں وہ ”را“ والوں کے ہتھے چڑھ گیا اور اب تہاڑ جیل دہلی میں ہے۔ اچانک سامنے سے کوسٹ گارڈ والوں کی تیز رفتار بوٹ آتی ہے جسے دیکھ کر بلوچ اپنی بوٹ کی اسپیڈ بھی بڑھا دیتا ہے۔ کوسٹ گارڈز کی بوٹ کی طرف سے فائرنگ شروع ہوجاتی ہے، حملے میں شہاب مارا جاتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

تعاقب میں آنے والے کوسٹ گارڈ اہلکاران کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس چلے جاتے ہیں۔ عمران تاج بخت کو اپنے ہمراہ گھر لے آتا ہے۔ جان محمد (مخبر) عمران کو فون پر اطلاع دیتا ہے کہ مشہدی نے جن کرائے کے قاتلوں کو امریکا سے بلایا ہے، ان میں سے جیک نامی شخص ہوٹل ایئرپورٹ ان میں مقیم ہے۔ عمران ہاشم تیمور اور نادیہ گیٹ اپ بدل کر ہوٹل پہنچ جاتے ہیں۔ دوران مقابلہ وہ شخص عمران کے خنجر کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ چاروں واپس گھر آ جاتے ہیں۔ جان محمد عمران کو فون پر بتاتا ہے کہ مشہدی کے ایک اور ساتھی کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں مشہدی بے حد پریشان ہے۔

اخبار میں خبر چھپتی ہے کہ معروف سماجی کارکن اور تاجر عبدالحمید راجپوت کو ہوٹل میں پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا ہے۔ عمران اس حقیقت سے واقف ہے کہ قتل ہونے والا دراصل ''را'' کا ایک سفاک اور خونی ایجنٹ ونود تھا، جو گزشتہ بائیس برس سے پاکستان میں مقیم تھا۔ وہ یہ معلومات اخبار کو مہیا کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے ذہن میں معروف انگلش روزنامے کے چیف ایڈیٹر اور کالم نگار وقار الحسن کا نام آتا ہے۔ عمران انہیں فون کر کے ملاقات کے لیے کہتا ہے اور اپنے ہمراہ ہاشم کو بھی لے جاتا ہے۔

وقار الحسن کے دفتر سے واپسی پر انہیں جیک کی مرسڈیز نظر آتی ہے۔ وہ لوگ جیک کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں جو کہ ایک ہوٹل میں جا کے رُکتی ہے جیک گاڑی سے اُتر کر ہوٹل میں داخل ہوتا ہے اور ریسپشن سے چابی لے کر اپنے روم میں چلا جاتا ہے، عمران اس کا تعاقب کرتا ہوا اس کے روم تک پہنچ جاتا ہے۔ ابھی وہ یہ بات ہاشم کو بتا رہا ہوتا ہے کہ پیچھے سے جیک اس پر ریوالور تان لیتا ہے۔ وہ عمران کو اپنے کمرے میں لے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تم میرا پیچھا کیوں کر رہے تھے۔ عمران کہتا ہے کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے، مجھے تو اپنے دوست ہاشم کی تلاش ہے۔ دوران گفتگو جیک عمران سے غافل ہوتا ہے تو عمران اس پر حملہ کر دیتا ہے اور اسے بے ہوش کر دیتا ہے۔ دونوں اس بات پر پریشان ہوتے ہیں کہ وہ بے ہوش جیک کو ہوٹل سے باہر کیسے لے کر جایا جائے۔ تھوڑی ہی دیر بعد جیک کو ہوش آ جاتا ہے جیک کی تلاشی کے دوران اس کی پنڈلی کے ساتھ بندھا دو دھاری خنجر اور ریوالور برآمد ہوتا ہے۔ اچانک دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ عمران دروازہ کھولتا ہے دو آدمی ہاشم کو دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔

ہوٹل کے کمرے میں ان لوگوں کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے اور ان میں سے ایک شخص ہلاک ہو جاتا ہے، جب کہ جیک فرار ہو جاتا ہے۔

عمران اور ہاشم بڑے محفوظ طریقے سے ہوٹل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اگلے روز وقار الحسن سے ملنے ان کے آفس پہنچتے ہیں اور جیک کے بارے میں بتاتے ہیں تو وہ فکر مند ہو جاتے ہیں۔ عمران وقار الحسن کو اپنی فیملی ٹریجڈی کے بارے میں بتاتا ہے کہ کیسے ان لوگوں کی دشمنی مشہدی سے ہوئی اور وہ لوگ ارسلان کو مردہ سمجھتے رہے، جب کہ وہ دہلی کی تہاڑ جیل میں ہے۔ تب وقار الحسن انہیں اپنے انڈیا جانے اور ''را'' کی قید میں رہنے کے واقعات کی تفصیل بتاتے ہیں۔

یونیورسٹی سے فارغ ہو کر میں نے اخبار میں جاب کر لی۔ میں پاکستان کے کثیر الاشاعت روزنامے کا چیف کرائم رپورٹر اور پولیٹیکل انویسٹی گیٹر تھا۔ ان ہی دنوں میں نے بھارت جانے کا پروگرام بنایا۔ میرے دور و نزدیک کے بہت سے رشتے دار یوپی کے مختلف شہروں میں ہیں۔ میں جرنلسٹ کے ویزے پر سفر کر رہا تھا، اس لیے مجھے آٹھ شہروں کا ویزا مل گیا تھا۔ میں نے اور میرے کزن ناصر نے آگرہ جانے کا پروگرام بنایا۔ جہاں تاج محل دیکھنے کے بعد جو کوچ ہمیں آگرہ لے کر آئی تھی، اسی میں ہمیں واپس جانا تھا۔ واپسی پر بس متھرا کے مقام پر رُکی جہاں ہم لوگوں نے کھانا کھایا، وہیں ہماری ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی جس نے اپنا نام صائمہ بتاتے ہوئے کہا کہ آپ جس بس میں سفر کر رہے ہیں، اس میں آپ کے لیے خطرہ ہے۔ تب ہی دو آدمی ہماری طرف آئے اور ہم سے کہا کہ تم لوگ زیر حراست ہو۔ وہ ہماری آنکھوں پر بلائنڈ فولڈ باندھ کر ہمیں اپنے ہمراہ ایک مقام پر لے آئے جہاں مزید چھ سات لوگ موجود تھے۔ ان میں ایک نے مجھے میجر وقار کے نام سے پکارتے ہوئے پوچھا کہ تم کس مشن پر انڈیا آئے تھے۔ میں نے جواب میں بتایا کہ میں بے۔ میجر نہیں بلکہ وقار الحسن ہوں۔ کالمسٹ اور جرنلسٹ لیکن ان لوگوں نے میری بات پر اعتبار کرنے کے بجائے ونود اور شنکر کے حوالے کر دیا جو مجھ پر شدید تشدد کے ذریعے سچ اگلوانے کی کوشش کرنے لگے۔ ابھی ان کا تشدد جاری تھا کہ ان کا باس کمرے میں آیا، اس نے میری مرہم پٹی اور کھانے کی ہدایت کی۔ ان لوگوں نے بتایا کہ تمہارے لوگوں نے بھارتی پریس کو اطلاع دی ہے کہ ہم نے کسی پاکستانی جرنلسٹ کو گرفتار کیا ہے اور پریس نے اودھم مچایا ہوا ہے کہ اگر کوئی جرنلسٹ گرفتار کیا گیا ہے تو اسے کورٹ میں پیش کیوں نہیں کیا گیا اور اسے میڈیا سے کیوں چھپایا گیا۔ تمہارا معلوم ہونے کے بعد دہلی کے چیف منسٹر نے بھی پولیس سے جواب طلب کر لیا ہے، لہٰذا تمہیں میڈیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ مجھے بلائنڈ فولڈ پہنا کر لے جایا جا رہا تھا کہ راستے میں ہماری گاڑی روک لی گئی، پھر مجھ سمیت تمام لوگوں کو گاڑی سے اتار لیا گیا۔

(اب آگے ملاحظہ کیجیے)

لمحے بھر کو میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں، میں نے آنکھیں بند کر لیں، دوبارہ آنکھیں کھولیں تو مجھے تین آدمی نظر آئے۔ وہ دیکھنے میں چرواہے نظر آ رہے تھے لیکن ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں اور چہروں سے وہ کسی طور ان پڑھ چرواہے نہیں لگ رہے تھے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ ان میں سے دو نے گنجے اور ایک آدمی کو کور کر رکھا تھا۔ دوسرا آدمی غالباً وہی تھا جو میری دائیں جانب بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ اس نے اپنا چہرہ گھمایا تو میں اسے پہچان گیا تھا۔ وہ ان لوگوں کا باس تھا۔ وہی باس جس نے کمرے میں مجھ سے تفتیش کی تھی اور مجھ پر آئی ایس آئی کے میجر ہونے کا الزام لگایا تھا۔

''آپ خیریت سے تو ہیں سر!'' ان چرواہوں میں سے ایک بولا۔

''میں خیریت سے ہوں لیکن تم لوگ کون ہو؟''

''ہم آپ کے دوست ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ پریشان مت ہوں۔''

اس وقت وہاں ایک گاڑی آ کر رُکی۔ ان لوگوں نے گنجے اور باس کو کھینچ کر گاڑی میں بٹھا لیا۔ باس پسنجر سیٹ پر تھا اور گنجا عقبی سیٹ پر، مجھے بھی انہوں نے گنجے کے پاس بٹھا دیا۔ ان میں سے ایک آدمی وہیں رہ گیا۔

آخری لمحوں میں میری نظر اس گاڑی کے ڈرائیور پر پڑی جو ہمیں یہاں تک لایا تھا۔ وہ سر جھکائے اسٹیئرنگ پر بے سدھ پڑا تھا اور اس کی کنپٹی سے خون بہ کر اس کے چہرے اور تھوڑی سے بہتا ہوا اس کے سینے پر گر رہا تھا۔ گویا ان لوگوں نے ڈرائیور کو ہلاک کر دیا تھا۔

پھر فوراً ہی وہ گاڑی روانہ ہو گئی۔ اب مجھے گنجے اور باس کے چہروں پر بلائنڈ فولڈ نظر آ رہے تھے۔

گنجے نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ہمارا اندازہ درست تھا۔ تمہارا تعلق آئی ایس آئی سے ہے وقار الحسن!''

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے گھوم کر گنجے کے سر پر زوردار ہاتھ مارا اور بولا۔ ''اب تو نے بکواس کی تو میں تیری زبان کاٹ دوں گا۔''

گنجا خاموش ہو گیا۔ باس بھی بالکل خاموش تھا، شاید وہ جانتا تھا کہ بولنے کا نتیجہ تھپڑ یا گھونسے کی شکل میں نکلے گا۔

''تم لوگ بچ نہیں سکو گے۔'' گنجے نے کہا۔ ''ہمارے آدمی تمہاری گاڑی کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ تمہیں......''

اس کے ساتھ ہی اس کی کھوپڑی پر زوردار تھپڑ پڑا اور میرے ساتھ بیٹھا ہوا آدمی چیخ کر بولا۔ ''رشید! گاڑی روکو! میں اس گنجے کو یہیں اُتار کے اس کا جھٹکا کر دوں۔''

رشید نے اچانک گاڑی روک دی۔

میری دائیں جانب بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ ''سر! اسے ایک موقع اور دے دیں، اب یہ بولا تو اسے گولی مار کے یہیں پھینک دیں گے۔''

''یہ بنیے کی اولاد، اُلّو کا پٹھا پھر بولے گا۔'' میری بائیں جانب بیٹھا ہوا آدمی غرایا۔

''تو پھر ہماری گن سے گولی بھی ضرور نکلے گی۔''

مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ میں نے ان لوگوں سے مزید کوئی استفسار نہیں کیا اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

گاڑی مضافات میں سفر کر رہی تھی، ایک گھنٹے بعد مجھے کسی شہر کے آثار دکھائی دیے، پھر کچھ دیر بعد گاڑی ایک پرانے سے بنگلے کے آگے ٹھہر گئی، ڈرائیور کے ہارن بجانے پر لکڑی کا دروازہ کھلا اور گاڑی اندر داخل ہو گئی۔ ان لوگوں نے گنجے اور باس کو اسی انداز میں باہر نکالا جیسے انہوں نے مجھے نکالا تھا، پھر وہ انہیں بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے اندر کی طرف لے چلے۔

بنگلے میں کئی کمرے تھے، وہ گنجے اور باس کو نہ جانے کہاں لے گئے، مجھے وہ لوگ صاف ستھرے ایک بیڈ روم میں لے آئے اور بولے۔ ''آپ فی الحال آرام کریں، ہم جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے رات بھر آپ پر شدید قسم کا تشدد کیا ہوگا؟''

''لیکن تم لوگ ہو کون اور تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں ان لوگوں کی قید میں ہوں۔''

www.paksociety.com

www.paksociety.com

"میں نے بتایا تھا کہ ہم آپ کے ہمدرد ہیں۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں ایک سیدھا سادہ امن پسند شہری ہوں۔" میں نے کہا۔ "بھارتی پریس نے میرے بارے میں اخبارات میں خبریں لگادی تھیں، اب یہ لوگ مجھے میڈیا کے سامنے لے کر جا رہے تھے۔ وہاں میرے کئی دوست بھی ہوتے اور ان لوگوں کو مجھے رہا کرنا ہی پڑتا۔"

"یہ سب ان کی چال تھی وقار صاحب!" اس نے کہا۔ "کیسا پریس اور کہاں کا پریس؟" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "میں ابھی آپ کو یہاں چھپنے والے تمام اخبارات لا دوں گا، ان میں آپ کے بارے میں کسی بھی صفحے پر سنگل کالم کی خبر بھی نہیں ہے، یہ لوگ بکواس کرتے ہیں۔" پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "آپ جانتے ہیں کہ یہ لوگ کون ہیں؟"

"میں انہیں نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔

"ان لوگوں کا تعلق "را" سے ہے۔" اس نے انکشاف کیا۔

"را" کو مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"دشمنی؟" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

"را" کو ہر مسلمان سے اور خاص طور پر پاکستانیوں سے دشمنی ہے۔"

"وہاں میرا ایک دوست اور بھی تھا۔" میں نے کہا۔

"آپ پریشان مت ہوں، ہم اس کی رہائی کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کرلیں گے۔"

"اب یہ بھی بتادو کہ تم لوگ کون ہو اور......"

"فی الحال آپ آرام کریں، شام تک آپ کو ہر بات کا جواب مل جائے گا۔" وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔ "ہاں اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو دروازے پر دستک دے کر مانگ لیجیے گا۔ ہمارا آدمی برابر والے کمرے میں موجود ہے۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔

"ایک منٹ" میں نے کہا۔ "آپ مجھے اپنا نام تو بتادیں۔"

"میرا نام تیمور ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا تیمور صاحب! مجھے آج کے تمام اخبارات چاہئیں۔ اگر پاکستانی اخبارات بھی مل جائیں تو بہت اچھا ہوگا۔"

"میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو پاکستان کے سب نہ سہی وہاں کے دو تین کثیر الاشاعت روزنامے مل جائیں، البتہ یہاں کے تمام اخبارات تھوڑی دیر میں آپ تک پہنچ جائیں گے۔"

اس کے جانے کے بعد میں بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور تشدد سہتا رہا تھا، اس لیے لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو نہ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو دھوپ ڈھل رہی تھی۔ کمرے میں البتہ اخبارات کا ایک بنڈل پڑا ہوا تھا۔ مجھے اس وقت چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے دروازے پر دستک دی تو فوراً ہی ایک شخص وہاں آ گیا۔ اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔

"لیس سر!" اس نے کہا۔

"مجھے ایک کپ کافی، کوئی پین کلر ٹیبلٹ لا دو۔"

وہ سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ میں باتھ روم میں چلا گیا پھر میں گرم پانی سے دیر تک نہاتا رہا۔ اس سے میری ساری تھکن اور کسل مندی دور ہو گئی۔

نہا کر میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر سوجن اور ورم خاصا کم تھا لیکن دونوں گالوں پر ابھی تک انگلیوں کے نشانات تھے اور نیل پڑے ہوئے تھے۔

میں نہا کر باہر نکلا تو کافی کے کپ نے میرا استقبال کیا۔ کافی کے ساتھ ہی ٹرے میں دو ابلے ہوئے انڈے کچھ

بسکٹ اور پانی کا گلاس بھی تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اسٹرپ پین کلر ٹیبلٹس کا تھا۔

میں نے یک وقت دو ٹیبلٹس پانی کے ساتھ نگل لیں اور انڈے کھانے لگا، پھر کافی پی کر تو مجھے ایسا لگا جیسے مجھے دوبارہ نئی زندگی مل گئی ہو۔

پیٹ پوجا سے فارغ ہو کر میں نے اخبارات کا بنڈل اٹھا لیا۔ اس بنڈل میں اکثریت ہندی زبان کے اخباروں کی تھی۔ دو اخبارات انگریزی کے اور ایک اردو کا بھی تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ اردو کی پرنٹنگ اور کاغذ انتہائی گھٹیا تھا۔

میں نے انگریزی کا اخبار "ہندوستان ٹائمز" اٹھا لیا۔ اس میں روزمرہ کی عام سی خبریں اور سیاست دانوں کے بیانات تھے۔ ایک خبر پڑھ کر میں بری طرح چونک اٹھا۔ وہ خبر میرے ہی بارے میں تھی۔ "پاکستانی صحافی کی پراسرار گمشدگی۔" میں نے جلدی جلدی پوری خبر پڑھ ڈالی۔ خبر کے مطابق پاکستانی صحافی وقار الحسن اپنے کزن کے ساتھ آگرہ گئے تھے، وہاں جا کر وہ پراسرار طور پر غائب ہو گئے۔ ان کے ساتھ ان کا کزن بھی لاپتا ہے، دہلی میں مقیم ان کے چچا نے پولیس میں ان کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی ہے۔ پولیس انہیں تلاش کر رہی ہے لیکن تاحال ان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ دوسرے اخبار میں بھی الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ یہ خبر موجود تھی۔ اس کے برعکس اردو اخبار میں یہ خبر نہیں تھی۔

میں اخبار پڑھ ہی رہا تھا کہ تیمور اندر داخل ہوا، اس کے جسم پر اس وقت بہت سلیقے کا لباس تھا۔

"ہیلو مسٹر وقار۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔ "کیسے ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔

"آپ نے نیوز پیپرز دیکھ لیے؟" اس نے کہا۔

"ہاں، میں نے دیکھ لیے، ان میں میری گمشدگی کی خبر تو ہے لیکن......"

"میں آپ کو یہ ہی بتانے کی کوشش کر رہا تھا، میں نے آپ کے لیے پاکستانی اخبارات بھی منگوائے ہیں، وہ بھی ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"آپ پلیز مجھے یہ تو بتادیں کہ آپ لوگ ہیں کون؟"

"میں نے بتایا تھا کہ ہم آپ کے خیر خواہ ہیں، ہاں، ہمارا تعلق آئی ایس آئی سے نہیں ہے۔"

"پھر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ ان لوگوں کا تعلق آئی ایس آئی سے ہوگا۔

"آپ کو کیسے علم ہوا کہ مجھے "را" والوں نے گرفتار کرلیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا جواب بھی ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو مل جائے گا۔" پھر وہ یوں چونکا جیسے کوئی بات اسے یاد آ گئی ہو۔ اس نے جیب سے ایک ٹیوب نکالی اور بولا۔ "آپ یہ کریم اپنے چہرے پر دن میں کئی مرتبہ لگائیں۔ آپ کے چہرے کی سوجن اور نیل ختم ہو جائیں گے، ابھی تھوڑی دیر میں ایک ڈاکٹر بھی آ کر آپ کا چیک اپ کرے گا اور آپ کی انگلیوں پہ دوا لگائے گا۔ آپ کی کلائی بھی چیک کرے گا کہ اس میں فریکچر تو نہیں ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس میں فریکچر نہیں ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ورنہ مجھ سے ہاتھ ملانا بھی محال ہوتا اور ہاتھ پر سوجن بھی ہو جاتی۔"

"ہماری طرف سے آپ دل میں کوئی بدگمانی نہ لائیں۔ میں آپ سے بار بار یہ ہی کہہ رہا ہوں کہ ہم آپ کے دوست ہیں۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں حاضر ہوتا ہوں۔" اس نے کہا کیوں کہ اس کے سیل فون کی بیل بج رہی تھی۔

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں ایک مرتبہ پھر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ میرا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

میں اپنے ہی خیالات میں گم تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور خوب صورت سی ایک لڑکی اندر داخل ہوئی، اس کے آتے ہی کمرہ پرفیوم کی مہک سے بھر گیا۔

"ہیلو مسٹر وقار!" اس نے کہا۔ "کیسے ہیں آپ؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کی آواز سن کر میں چونک اٹھا، وہ صائمہ تھی، وہی صائمہ جو ہمیں متھرا میں ملی تھی اور خود کو کسی ایڈووکیٹ کی بیٹی کہا تھا......

اس وقت وہ انتہائی قیمتی ٹی شرٹ اور اسکن ٹائٹ جینز میں تھی، بال بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے، چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا، اس کا چہرہ اس وقت انتہائی دل کش اور پُرکشش لگ رہا تھا، اس کا متناسب جسم دیکھ کر مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی سہمی اور وحشت زدہ لڑکی ہے جو مجھے متھرا میں ملی تھی۔

''سر وقار!'' اس نے مترنم آواز میں کہا۔ ''آپ اتنے حیران کیوں ہیں؟''

''آپ نے تو بتایا تھا کہ آپ کا تعلق الہٰ آباد سے ہے اور آپ کے والد وہاں ایڈووکیٹ ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے والد ایڈووکیٹ تھے اور میرا تعلق الہٰ آباد سے ہے، آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا تھا؟''

''لیکن......آپ......''

''میرا تعلق اصل میں کشمیر لبریشن فرنٹ کے فارورڈ بلاک سے ہے۔ میں متھرا میں گائیڈ کے روپ میں رہتی ہوں۔ اس لیے ''را'' والوں نے مجھے نظر انداز کر دیا، ورنہ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہاں سے نکل گئی تھی۔ وہ لوگ اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔''

''آپ متھرا میں کیا کرتی ہیں؟'' میں نے پوچھا، پھر مجھے خود ہی اپنے احمقانہ سوال کا احساس ہوا۔ وہ بتا تو چکی تھی کہ وہ متھرا میں گائیڈ کے روپ میں رہتی ہے۔

''میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ میں متھرا میں گائیڈ ہوں۔ اصل میں ''را'' والے آگرہ اور متھرا میں بہت سرگرم ہوتے ہیں۔ یہ وہاں سے کسی بھی بے قصور پاکستانی کو پکڑ لیتے ہیں، پھر اسے بھارتی جاسوس بنا کر یا تو تشدد کر کے مار دیتے ہیں یا پھر وہ برسوں ان کی قید میں سڑتے رہتے ہیں۔ اب بھی سیکڑوں بے گناہ پاکستانی بھارت کی جیلوں میں سڑ رہے ہیں، کوئی ان کا پُرسان حال نہیں ہے۔ نہ بھارت کی نام نہاد انسانی حقوق کی تنظیمیں، نہ آپ کے ملک کی کوئی این جی او، ہاں وہ آپ کے ملک کی این جی اوز یہاں کے وزٹ کرتی ہیں۔ ان کے اہل کار یہاں کے سیاست دانوں سے ملاقاتیں کرتے ہیں، دوطرفہ امن کی باتیں ہوتی ہیں اور امن کی فاختہ کے حوالے دیے جاتے ہیں لیکن ہوتا کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔ بھارت کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کی جیلوں میں بھی بے شمار بھارتی قیدی بے قصور ہیں اور وہ صرف اپنے بھارتی ہونے کی سزا پا رہے ہیں۔''

''ارے ارے، آپ نے تو تقریر شروع کر دی۔'' میں نے کہا۔

''میرا دل روتا ہے وقار صاحب! میں نے ان بے قصور پاکستانیوں کو بھی دیکھا ہے جو یہاں کی جیلوں میں ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ان میں سے بیش تر کی تو ذہنی حالت خراب ہو چکی ہے۔ وہ زندوں میں ہیں نہ مردوں میں۔ جو زندہ ہیں وہ بھی صرف سانس لے رہے ہیں۔ ان کی زندگی میں بھی صرف رات کی تاریکی ہے۔''

''آپ کو کیسے علم ہوا تھا بس میں کہ یہ لوگ ہمیں گرفتار کرنے والے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ میں آپ کی بس میں سفر کر رہی تھی، میں اس وقت شاہی قلعے میں موجود تھی جب آپ گائیڈ سے بحث کر رہے تھے۔ میری نظر اسی وقت ان دونوں پر پڑی تھی۔ میں انہیں شکلوں سے پہچانتی تھی، خاص طور پر وہ گنجا تو اپنی شفاف کھوپڑی کے باعث لاکھوں میں پہچانا جاتا ہے، میں نے ان کی گفتگو سن لی، وہ لوگ آپ کو آئی ایس آئی کا میجر سمجھ رہے تھے۔''

''لیکن کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا میری شکل پر آرمی کی چھاپ ہے یا پیشانی پر آئی ایس آئی لکھا ہے؟'' میں جھنجلا کر بولا۔

میرے اس انداز پر صائمہ کھلکھلا کر ہنس دی اور بولی۔ ''اصل میں ان کے ذرائع سے انہیں اطلاع ملی ہے کہ آئی ایس آئی کا ایک میجر اس وقت متھرا میں موجود ہے، اس کا قد دراز، رنگت سرخ و سپید اور جسم ورزشی ہے۔ اتفاق سے یہ سب کچھ آپ کے حلیے میں موجود ہے۔''

''لیکن ان لوگوں نے فرض کر لیا کہ اس میجر کا نام وقار ہے۔''

''ہاں، یہ لوگ عموماً مفروضوں پر کام کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے آپ کو گرفتار کر لیا، پھر پاکستان کی آئی ایس آئی کے کسی بھی آدمی سے رابطہ کرتے اور آپ کے بدلے اپنے کسی آدمی کی رہائی کا مطالبہ کرتے لیکن ان کا اندازہ غلط ہو گیا۔''

''تو کیا واقعی آئی ایس آئی کا کوئی میجر متھرا میں موجود ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ان ہی لوگوں کا مفروضہ ہے، ممکن ہے ایسا کوئی شخص متھرا میں ہو لیکن ان کا یہ مفروضہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔''

''آپ ایسا کریں، مجھے ٹیلی فون دے دیں۔'' میں نے کہا۔

''سیل فون تو میں آپ کو دے دوں گی لیکن اس کا آپ کریں گے کیا؟''

''میں یہاں سے اپنے جرنلسٹ دوست سنیل کمار یادو کو کال کروں گا اور اسے بتاؤں گا کہ میں کسی مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔''

''ایسا بھول کر بھی مت کیجیے گا۔'' اس نے کہا۔

''آپ ایک مرتبہ ان کی تحویل سے فرار ہو چکے ہیں، اس بات سے ان کا شک اب یقین میں بدل چکا ہوگا کہ آپ ہی وہ آئی ایس آئی کے میجر ہیں، وہ لوگ آپ کو اس دفعہ باضابطہ گرفتار کریں گے، پھر نہ بھارتی پریس آپ کے کام آئے گا، نہ آپ کا ہائی کمیشن۔''

''یہ سب کچھ آپ لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''کیا ضرورت تھی مجھے ان کی قید سے رہائی دلوانے کی؟''

''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ آپ کو چھوڑ دیتے؟'' صائمہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ آپ کو مزید تفتیش کے لیے اپنے ہیڈ کوارٹر لے جا رہے تھے، کسی پریس کے سامنے پیش نہیں کر رہے تھے، پھر آپ پر وہ ایسا تشدد کرتے کہ آپ اپنا نام بھی بھول جاتے۔''

''تو اب آپ ہی بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے الجھ کر کہا۔

''آپ خاموشی سے یہاں رہیں۔ ہم آج آپ کے ساتھی کو بھی رہا کرانے کی کوشش کریں گے، وہ بھارتی شہری ہے، پھر ''را'' والوں کے پاس اس کا ایڈریس بھی نہیں ہے، وہ خاموشی سے اپنے گھر چلا جائے گا اور وہاں سب لوگوں کو یہی بتائے گا کہ آپ پاکستان جا چکے ہیں۔''

''لیکن ان کے ریکارڈ سے تو ظاہر ہو جائے گا کہ میں ابھی تک بھارت میں موجود ہوں۔ میرا Exit تو کہیں نہیں ہوگا، پھر وہ لوگ میرے چچا اور کزن کو پریشان کریں گے، ان کی تو زندگی ہی اجیرن ہو جائے گی۔''

''یہ ساری باتیں بعد از وقت ہیں۔'' صائمہ نے کہا۔ ''پہلے ہم ناصر صاحب کو ان کی قید سے رہا کرائیں گے۔''

''لیکن کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ شاید بھول گئے کہ ان کے دو افسر ہمارے قبضے میں ہیں، وہی ناصر صاحب کی رہائی کا ذریعہ بنیں گے۔'' صائمہ نے کہا۔

مجھے بھی یاد آ گیا کہ گنجا اور باس دونوں ان لوگوں کے قبضے میں ہیں۔

''ہم آج ہی کارروائی کر کے آپ کے کزن کو وہاں سے رہائی دلوائیں گے۔'' صائمہ نے کہا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' میں نے کہا۔

''آپ کو ریوالور چلانا آتا ہے؟'' صائمہ نے اچانک پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کوئی اور ہتھیار؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا سب سے بڑا ہتھیار میرا قلم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں آج تک اس سے لڑتا رہا ہوں۔''

www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"لیکن قلم کا ہتھیار اس قسم کے آپریشنز میں کام نہیں آتا۔" صائمہ نے کہا، پھر وہ چونک کر بولی۔ "آپ کی ڈرائیونگ کیسی ہے؟"

"ہاں، طالب علمی کے زمانے میں مجھے ڈرائیونگ بلکہ تیز رفتار ڈرائیونگ کا جنون تھا۔" میں نے کہا۔ "میں ہر قسم کی گاڑی کو انتہائی برق رفتاری سے دوڑا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" صائمہ نے کہا۔ "تو پھر آپ بہ طور ڈرائیور ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں، ہمیں ایک اچھے ڈرائیور کی ضرورت بھی پڑے گی۔ آپ گاڑی کے علاوہ بڑی وین اور ہیوی وہیکل چلا سکتے ہیں؟"

"میں نے شوقیہ طور پر ٹرک بھی چلایا ہے، مجھے فلائنگ کا تجربہ بھی ہے اور کمرشل پائلٹ کا لائسنس بھی ہے، میں جہاز بھی اُڑا سکتا ہوں لیکن مجھے صحافت کا شوق تھا اس لیے میں اس فیلڈ میں آ گیا ورنہ میں ایک کامیاب پائلٹ ہوتا۔"

"وری گڈ!" صائمہ نے کہا۔ "پھر تو ہم ہیلی کاپٹر بھی استعمال کر سکتے ہیں؟"

"ہیلی کاپٹر!" میں نے حیرت سے کہا۔ "لیکن میں نے آج تک کبھی ہیلی کاپٹر نہیں اُڑایا۔"

"جو شخص فلائنگ کر سکتا ہے، وہ ہیلی کاپٹر بھی اُڑا سکتا ہے، ممکن ہے ہمیں ہیلی کاپٹر کی ضرورت نہ پڑے۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک شخص میرے لیے ایک مرتبہ پھر کافی لے کر آ گیا، میں نے کافی ختم ہی کی تھی کہ تیمور میرے کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ "مسٹر وقار! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔ "آیئے میرے ساتھ آیئے۔" اس نے کہا۔

میں اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو ایک دروازے کے سامنے مجھے ایک مسلح شخص نظر آیا، اس نے تیمور کو دیکھ کر مؤدب انداز میں اسے سلام کیا۔

"دروازہ کھولو۔" تیمور نے اسے حکم دیا۔

اس گارڈ نے فوراً اپنی جیب سے چابی نکال کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ کمرا تقریباً اسی قسم کا تھا جیسے کمرے میں مجھے قید رکھا گیا تھا۔ کمرے میں سامان بھی تقریباً ویسا ہی تھا۔ اچانک میری نظر اوپر کی طرف اُٹھ گئی، میں حیران رہ گیا۔ زمین سے چند فٹ کی بلندی پر گنجا اور باس الٹے لٹکے ہوئے تھے۔

"میں یہاں آپ کو صرف اس لیے لایا ہوں کہ آپ ان کا حشر دیکھ سکیں، اس کے بعد تو پھر ان کی لاشیں کوڑے کے کسی ڈھیر پر پڑی ہوں گی۔"

"ان سے پوچھو کہ میرا دوست کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"میں تم سے پہلے بھی پوچھ چکا ہوں اور اب پھر پوچھ رہا ہوں کہ وقار صاحب کا دوست ناصر کہاں ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں کہ وہ ہماری عمارت میں ہے جہاں پر وقار تھا۔"

"اس عمارت میں کہاں؟" تیمور نے پوچھا۔

"وہ عمارت تو بہت بڑی ہے۔" اب میں یہاں سے بیٹھ کر کیسے بتا سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"تم مجھے نقشہ تو بنا کر دے سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

"الٹے لٹکے تو نقشہ بھی نہیں بن سکتا۔"

اس کے جواب پر تیمور نے اس کے چہرے پر ایک زبردست تھپڑ رسید کر دیا۔

وہ گھڑی کے پینڈولم کی طرح جھولتا ہوا میری طرف آیا، میں نے غیر شعوری طور پر اس کے چہرے پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ پھر تیمور کی طرف چلا گیا۔ زندگی میں پہلی دفعہ میں نے کسی کو اتنا بھرپور تھپڑ مارا تھا ورنہ میری تو کبھی اسکول کے زمانے میں بھی کسی سے ایسی لڑائی نہیں ہوئی کہ مار پیٹ کی نوبت آتی۔ میں کتابی کیڑا کہلاتا تھا اس لیے اسکول، کالج اور یونیورسٹی تک میں میرے ساتھی اور تمام ٹیچرز مجھے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

"تو کیا ہمیں اتنا ہی بے وقوف سمجھتا ہے کہ ہم وہاں جائیں اور اس قید خانے میں پھنس جائیں۔" تیمور نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ وہاں ہر وقت تمہارے مسلح آدمی پہرے پر موجود ہوتے ہیں اور جہاں پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا۔"

"جب تم یہ سب باتیں جانتے ہو تو پھر مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو۔" گنجے نے جھنجلا کر کہا۔

"مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اس عمارت میں داخلے کا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟"

"دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔" گنجے نے کہا۔

"ٹھیک ہے، پھر تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔" تیمور نے کہا۔

"تمہارے ساتھیوں یا گارڈز کی طرف سے فائرنگ ہوئی تو سب سے پہلے میں خود تمہیں گولی مار دوں گا، بعد میں چاہے وہ لوگ ہم سب کو ختم کر دیں۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" گنجے نے کہا۔ وہ کوئی گاڑی دیکھتے ہی فائرنگ شروع نہیں کر دیتے بلکہ پہلے گاڑی روک کر وہ پوچھ گچھ کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، اس وقت تک تم یہاں الٹے لٹکے رہو۔" یہ کہہ کر تیمور باس کی طرف مڑا جو پلکیں جھپکائے بغیر ہمیں گھور رہا تھا۔ تیمور نے کچھ کہے بغیر باس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا اور کہنے لگا۔ "تجھے تو میں تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ تو نے میرے کئی ساتھیوں کو اس طرح شہید کیا ہے نا؟"

مجھے تو اس کی قوت برداشت پر حیرت ہو رہی تھی، تھپڑ کھانے کے باوجود بھی اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اس طرح پُرسکون انداز میں تیمور کو گھورتا رہا۔

ایک لمحے کو تو مجھے شبہ ہوا کہ کہیں یہ مر تو نہیں گیا لیکن فوراً ہی اس نے طویل سانس کھینچی تو مجھے اس کے زندہ ہونے کا احساس ہوا۔

تیمور مجھے وہاں سے لے کر باہر نکلا ہی تھا کہ اس کا ایک ساتھی پُرجوش انداز میں اس کی طرف بڑھا اور بولا۔ "مسٹر مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا ہے، ذرا میرے ساتھ آئیں۔"

"بولو۔" اس نے کہا اور میرے ساتھ میرے کمرے میں آ گیا۔

"سر......وہ......" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ان کی فکر مت کرو۔" تیمور نے کہا۔ "یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔"

"سر، میں نے معلوم کیا ہے کہ اس بھوت بنگلے میں کوئی گارڈ نہیں ہوتا، صرف ایک چوکیدار باہر ہوتا ہے، باقی دو گارڈ اندر ہوتے ہیں یا پھر ان لوگوں کا کوئی افسر اندر ہوتا ہے تو وہ مسلح ہوتا ہے۔ وہ عمارت سرکار نے کسی زمانے میں لائبریری کے لیے بنائی تھی لیکن وہاں لائبریری نہ بن سکی تو "را" والوں نے اسے اپنے استعمال میں لے لیا۔"

"یہ خبر اچھی ہے۔" تیمور نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ ہم وہاں اپنے طور پر کارروائی کر کے ناصر کو آزاد کرا سکتے ہیں۔"

میرے ہاتھ میں اب بھی شدید تکلیف تھی، تیمور نے ڈاکٹر کو بلا لیا۔ اس نے اچھی طرح میرا معائنہ کیا اور بتایا کہ فریکچر نہیں ہے، تکلیف تو ناخن نکالے جانے کی وجہ سے ہے۔ اس کے لیے میں آپ کو اینٹی بایوٹک انجکشن دے دیتا ہوں، آپ کو وہ انجکشن سات دن تک لگانا ہوگا۔

اس نے فوری طور پر مجھے ایک انجکشن لگا دیا اور میرے کہنے پر درد دور کرنے کا ایک انجکشن بھی میری رگ میں اُتار دیا۔

ہم لوگ وہاں سے نکلنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ تیمور کا ایک آدمی وہاں پہنچ گیا۔ (اس دور میں بھارت اور پاکستان میں سیل فون اتنے عام نہیں تھے) اس نے بتایا کہ اس عمارت میں موجود بہت سے آدمیوں کو ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا ہے۔ "کہاں؟" تیمور نے پوچھا۔

"امرتسر کے نزدیک ایک گاڑی میں۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "وہاں کے بارے میں مکمل معلومات چاہئیں۔" تیمور نے کہا۔ وہ شخص اسی وقت واپس چلا گیا۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆......☆......☆

رات انتہائی سرد اور تاریک تھی، تیمور مجھے اس آپریشن میں ساتھ نہیں لے جانا چاہ رہا تھا لیکن میں ضد کر کے ان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا، البتہ اس نے مجھے ڈرائیونگ کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس آپریشن میں تیمور کے علاوہ اس کے پانچ مزید ساتھی بھی تھے، ہم سب ایک وین میں سوار تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وین رُک گئی اور ہم لوگ ایک ایک کر کے باہر آ گئے۔ تیمور کے ساتھی نے بتایا کہ اس قصبے میں جو ویران مندر ہے، وہیں سب قیدیوں کو رکھا گیا ہے۔ مندر کے باہر اور اندر پجاریوں کے روپ میں "را" کے ایجنٹ موجود ہیں۔ وہ مندر ویران ہے، اس لیے کوئی بھولے بھٹکے ہی اس طرف آتا ہے۔

ہم لوگ جھکے جھکے اب اس مندر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

مندر کے باہر دو آدمی بیٹھے حقہ پی رہے تھے، تیمور اور اس کے ساتھی بھی دیہاتیوں کے روپ میں تھے۔ میں خود بھی ایک دھوتی، کرتے میں تھا۔ میرے پیروں میں بھدے سے جوتے تھے، جیسے بھارت اور پاکستان کے عام گاڑی والے استعمال کرتے ہیں۔

تیمور کھیتوں میں رک کر ان دونوں کی باتیں سننے لگا۔ ممکن ہے وہ عام گاؤں والے ہوتے۔

"یار، یہ ان لوگوں نے ہمیں کہاں لا پھنسایا؟" ان میں سے ایک آدمی بولا۔ "اگر آئی ایس آئی کو معلوم ہو جائے تو وہ ایک ہی ہلے میں ہمارا "رام نام ست" کر دے گی۔"

"آئی ایس آئی والے جادوگر نہیں ہیں۔" دوسرا بولا۔ "انہیں کیا معلوم کہ ہم یہاں ہیں۔" پھر بڑے صاحب نے کہا تھا کہ ایک ہی رات کی تو بات ہے، کل تک دوسری جگہ کا بندوبست ہو جائے گا۔"

ان کی باتیں سننے کے بعد تیمور نے اپنے دو ساتھیوں کو دائیں بائیں سے حملہ کرنے کا اشارہ کیا اور خود سامنے سے ان کی طرف بڑھا۔ وہ تینوں اچانک ہی ان کے سر پر پہنچ گئے۔ انہیں اپنے ہتھیار تک نکالنے کی مہلت نہیں ملی۔ وہ انہیں کھینچتے ہوئے دوبارہ کھیتوں میں لے آئے۔

"کون ہو تم لوگ۔" ان میں سے ایک بولا۔

"آئی ایس آئی۔" تیمور نے رعب دار لہجے میں کہا۔

آئی ایس آئی کا نام سن کر اس کی گھگھی بند ہو گئی۔

اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ ان لوگوں پر آئی ایس آئی کی کتنی دہشت طاری ہے۔ "اس مندر میں کتنے آدمی ہیں؟" تیمور نے پوچھا۔

"قیدی...... تو گیارہ ہیں...... اور ہمارے تین آدمی ہیں۔" وہ شخص کچھ زیادہ ہی خوف زدہ تھا۔

"تمہارے تینوں آدمی کہاں ہیں؟" تیمور نے پوچھا۔

"وہ مندر کے بڑے دروازے کے پاس موجود ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اور قیدی کہاں ہیں؟"

"وہ مندر کے تہ خانے میں ہیں۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اگر اس نے ایک لمحے کی تاخیر بھی کی تو تیمور اس کی گردن مروڑ دے گا۔

"تہ خانے کا راستہ کہاں ہے؟" تیمور نے پوچھا۔

"مندر میں بھگوان کی بڑی مورتی کے پاس ایک چھوٹی مورتی بھی ہے، اس مورتی کا سر سیدھی طرف کرنے سے تہ خانے کا دروازہ کھل جائے گا۔ وہ دروازہ بڑی مورتی کے بالکل نزدیک ہے۔" اس نے جواب دیا۔

تیمور کے ایک ساتھی نے انہیں باری باری ناک آؤٹ کر دیا، پھر وہ لوگ بہت آہستگی اور مہارت سے مندر کی طرف بڑھے۔ مجھے انہوں نے وہیں کھیتوں میں چھپے رہنے کا اشارہ کیا۔ میں خود بھی اس قسم کی صورتحال سے بچنا چاہ رہا

تھا۔ میں ناصر کی وجہ سے ان کے ساتھ آ تو گیا تھا لیکن اب پچھتا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد تیمور اور اس کے ساتھیوں نے اندر والے گارڈز پر بھی قابو پا لیا، پھر انہوں نے مخصوص آواز نکال کر مجھے بھی وہاں بلا لیا۔ وہ خاصا بڑا اور پرانا مندر تھا، اس کے در و دیوار سے وحشت ٹپک رہی تھی، شاید اس لیے وہ ویران بھی تھا۔ لوگ شاید وہاں دن میں آنا بھی پسند نہ کرتے ہوں۔

مندر کی سیڑھیاں چڑھ کر میں اوپر پہنچا تو مجھے ہال کے سرے پر بڑی مورتی دکھائی دی۔ تیمور کے ساتھیوں نے وہاں اتنی روشنی کا بندوبست کر دیا تھا کہ سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ تیمور نے بڑی مورتی کے ساتھ لگی ہوئی ایک چھوٹی مورتی دیکھی، اس نے آگے بڑھ کر اس مورتی کی گردن دائیں جانب گھمائی تو ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی اور پتھر کی ایک سِل اپنی جگہ سے ہٹ گئی، اس کے ساتھ ہی اس مورتی کی گردن ٹوٹ کر تیمور کے ہاتھ میں آ گئی۔

تیمور نے حیرت سے اس مورتی کی گردن کی طرف دیکھا، پھر اسے وہیں پھینک کر اپنے ساتھیوں کو سیڑھیاں اترنے کا اشارہ کیا۔ نیچے واقعی تہ خانہ تھا، وہاں قیدی بھی موجود تھے۔ ان میں ناصر کو دیکھ کر میں خوشی سے پاگل ہو گیا لیکن میری یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی، ابھی میں ناصر سے مل ہی رہا تھا کہ اوپر بھاری قدموں کی آوازیں آئیں، پھر کوئی گرج کر بولا۔ "کوئی فرار ہونے کی کوشش نہ کرے ورنہ بے موت مارا جائے گا۔ تم سب اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ۔" ہم سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔

"تم لوگ اگر پانچ منٹ کے اندر اندر باہر نہ آئے تو ہم اس تہ خانے میں آگ لگا دیں گے۔"

تیمور نے بے بسی سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا، پھر اس نے اپنا ریوالور پھینک دیا، اس کے ساتھیوں نے بھی اسلحہ پھینک دیا اور وہ سب ایک ایک کر کے باہر جانے لگے۔ اس لمحے میں نے تیمور کو بڑے سے ایک ستون کے پیچھے چھپتے دیکھا۔ اس کے ساتھی بھی مختلف ستونوں کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ تمام قیدی ایک ایک کر کے باہر نکل گئے، اوپر سے اچانک کوئی ہنس کر بولا۔ "یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ہم سے بچ کر نکل جائیں گے اور ان قیدیوں کو بھی نکال لیں گے۔" وہ آواز سن کر تیمور نے خوشی سے نعرہ بلند کیا اور چیخ کر بولا۔

"احمد علی کیا تم ہو؟"

"ارے تیمور! تم یہاں؟" احمد علی نے کہا، پھر تیمور اور اس کے دوسرے ساتھی بھی باہر نکل گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے اپنا اسلحہ بھی اٹھا لیا تھا۔ ناصر نے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے روک دیا۔ میں اب ان لوگوں کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا۔

میں باہر نکلنے کے بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ تہ خانے کی سیڑھیوں پر پھر قدموں کی آہٹ گونجی، اترنے والے کئی تھے، ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ٹارچ تھی، ٹارچ کی روشنی میں مجھے تیمور نظر آیا، وہ شاید ہم ہی لوگوں کو تلاش کر رہا تھا، پھر اس نے ہمیں دیکھ لیا اور بولا۔ "ارے باہر نکلیں، ہم سب آپ کے انتظار میں ہیں اور آپ کو باہر کھیتوں میں ڈھونڈ رہے ہیں۔" ہم دونوں باہر نکل آئے۔ میں ناصر کے ساتھ اوپر آیا تو ٹارچ کی روشنی میں مجھے تین آدمی نظر آئے جو شاید زندگی سے ناتا توڑ چکے تھے۔ ان کے نزدیک ہی وہ مورتی پڑی تھی جو سر گھماتے ہوئے تیمور کے ہاتھوں سے ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے ایک بات نوٹ کی کہ وہ مورتی ہندوؤں کے روایتی دیوی دیوتاؤں سے بہت مختلف تھی، وہاں بعد میں آنے والے بھی تیمور ہی کے ساتھی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ "را" والے یہاں سے بھی کہیں اور منتقل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ واپسی میں ناصر اور میں ایک ہی گاڑی میں سوار تھے، ہمارے ساتھ ایک قیدی اور تھا، تیمور کا ایک ساتھی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور دوسرا پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ہم لوگ امرتسر پہنچے تو ناصر نے کہا کہ میں دو دن سے بھوکا ہوں، ان لوگوں نے مجھے ایک روٹی اور پتلی دال کے سوا کچھ بھی نہیں دیا۔ میرے کہنے پر ان لوگوں نے گاڑی ایک ہوٹل کے سامنے روک لی، میں اور ناصر ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ میں نے کھانے کا آرڈر دیا، ہمارے ساتھی گاڑی میں ہی بیٹھے رہے، صرف وہ قیدی ہمارے ساتھ آ گیا جو ناصر ہی کی طرح بھوکا تھا۔

ناصر ابھی کھانا کھا کر فارغ ہوا تھا کہ وہاں دو پولیس والے آ گئے، انہوں نے وہاں موجود لوگوں کا سرسری انداز میں جائزہ لیا، پھر وہ سیدھے ہماری طرف آئے اور ان میں سے ایک بھاری آواز میں بولا۔ "کدروں آرئے ہو سی؟"

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

”ہم لوگ ہریانہ سے آ رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”دہلی۔“ میرے جواب پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولا۔ ”آپ پاکستانی ہو؟“ میں بھی چونک اُٹھا کہ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں پاکستانی ہوں۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ بھارتی شہری دہلی کو دلّی کہتے ہیں۔ ”ہاں سردار جی! میں پاکستانی ہوں۔“ میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا۔ ”میں آگرہ گھومنے گیا تھا، وہاں سے واپسی پر کچھ لٹیروں نے ہمیں لوٹ لیا، ہم بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچے ہیں۔“

”کہانی تو اچھی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”پاسپورٹ آپ لوگ دکھا نہیں سکتے کیوں کہ وہ تو ڈاکو لے گئے ہوں گے، ہیں نا؟“

”صرف میں پاکستانی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرا دوست انڈین ہے اور دہلی میں رہتا ہے۔“

”ہاں ہم لوگ انڈین ہیں۔“ ناصر کی بجائے اس قیدی نے جواب دیا جو ہمارے ساتھ تھا۔ ”ایڈریس کیا ہے آپ لوگوں کا۔“ ناصر نے اسے اپنا ایڈریس لکھوایا اور بتایا کہ میرا دوست وقار پاکستان سے آیا ہے اور ارشد یہیں رہتا ہے۔“ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس قیدی کا نام ارشد تھا جو ہمارے ساتھ تھا۔ میں اگر دہلی کو دلّی نہ کہتا تو شاید اس دن وہ مجھے بھی چھوڑ دیتے۔

☆......☆......☆

پھر انہوں نے ضروری تفتیش کرنے کے بعد ناصر اور ارشد کو چھوڑ دیا اور مجھے بغیر ویزہ کے امرتسر آنے پر جیل بھیج دیا۔ جیل کی اپنی ہی دنیا تھی، وہاں بہت سے پاکستانی ہی قید تھے۔ وہ لوگ ہفتوں اور مہینوں سے نہیں بلکہ برسوں سے وہاں قید تھے۔ ان سب کا جرم یہ تھا کہ وہ پاکستانی تھے۔

میرے لیے چچا جان نے کوشش کی، بڑے سے بڑا وکیل کیا لیکن تاریخ پہ تاریخ پڑتی رہی، مجھے بھارت کی پھر مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔ سب سے آخری جیل تہاڑ تھی۔ یہاں مجھے مئی 1997 میں منتقل کیا گیا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ بھارت کی ایسی جیل ہے جہاں سے فرار ہونا ناممکن ہے۔ لیکن اسے بھی سوبھراج نامی ایک مجرم نے تسخیر کر لیا تھا۔ تہاڑ جیل میں میری ملاقات ایک مسلمان بوڑھے سے ہوئی، اس کی عمر اس وقت ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی لیکن وہ دیکھنے میں ساٹھ کی بجائے ستر پچھتر سال کا لگتا تھا۔ اس کا جرم سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ اسے پولیس نے ایسی دفعہ کے تحت گرفتار کیا تھا۔ جس کی زیادہ سے زیادہ سزا ایک رات کی قید اور جرمانہ ہے۔ آوارہ گردی کے تحت گرفتار ہونے والے عموماً اسی دفعہ کے تحت گرفتار ہوتے ہیں۔

اس بوڑھے کا نام عاصم خان تھا۔ اس نے میرے پوچھنے پر یوں خلا میں تکنا شروع کیا جیسے اسے وہاں کوئی منظر دکھائی دے رہا ہو یا وہ اپنے اردگرد بکھرے ہوئے خیالات کو مجتمع کر رہا ہو، پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ ”میں بدایوں کے ایک قصبے الہ پور کا رہنے والا ہوں۔ اب تو یاد بھی نہیں کہ جو بات میں تمہیں سنانے جا رہا ہوں، اسے کتنا عرصہ بیت گیا ہے۔ میں اس وقت میٹرک پاس کر کے نیا نیا ریلوے میں ملازم ہوا تھا۔ گھر میں بہت زیادہ خوش حالی نہیں تو ایسی مفلسی بھی نہیں تھی۔ ابا جی کی تھوڑی بہت آمدنی تھی۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا تھا، اس لیے گزارہ بہت آسانی سے ہو جاتا تھا۔ ان ہی دنوں ماں کو میری شادی کا شوق پیدا ہوا بلکہ یوں کہیں کہ اس شوق میں اضافہ ہو گیا۔ شوق تو انہیں اس وقت سے تھا جب میں آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ میری شادی میری پسند سے خاندان میں ہی طے ہو گئی۔ شادی سے ایک دن پہلے میں اپنے دوستوں اور رشتے داروں کے ساتھ گھومنے کے لیے نکلا۔ ہم لوگ سواری کے ذریعے الہٰ پور سے بدایوں آ گئے۔ واپسی میں میرے دوستوں کو مذاق سوجھا۔ انہوں نے بہانے سے میرے سارے پیسے لے لیے اور مجھے پریشان کرنے کو بدایوں میں چھوڑ کر الہٰ پور فرار ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ بدایوں میں بھی ہمارے رشتے دار ہوتے ہیں، میں ان سے پیسے لے کر آ جاؤں گا یا پھر کسی پرائیویٹ ٹیکسی کے ذریعے الہ پور آ جاؤں گا۔ پہنچنا تو مجھے ہر حال میں تھا، کیوں کہ اگلے دن میری شادی تھی۔

میں ابھی اسٹاپ پر کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ پولیس کے دو سنتری گھومتے گھماتے وہاں آ گئے۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا۔ ”کہاں جا رہے ہو جوان؟“ میں نے مختصر جواب دیا۔ ”الہٰ پور!“

”پھر ایک بیڑی تے پلا دے۔“ دوسرے نے کہا۔ ”میں بیڑی نہیں پیتا۔“ میں نے کہا۔ ”میرے پاس اک پائی بھی نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”سالے، ہم سے جھوٹ بول رہا ہے، ہم تو یہ بھی معلوم کر لیتے ہیں کہ بندے نے صبح کھایا کیا تھا۔ لا تلاشی دے۔“

”کیوں؟“ میں نے بھی درشت لہجے میں پوچھا۔ ”اے ہم سے زبان چلا رہا ہے۔“ دوسرے والے نے ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ پہلا پولیس والا میری جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ جب انہیں میری جیبوں سے کچھ نہیں ملا تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”تو الہٰ پور جا رہا تھا۔ لاری والا کیا تیری ماں کا خصم لگتا ہے جو تجھے بغیر پیسوں کے لے جائے گا؟“

”میرے پیسے کسی نے نکال لیے ہیں، میں یا تو لاری والے سے بات کروں گا کہ وہ الہٰ پور میں پیسے لے لے، ورنہ میں پرائیویٹ ٹیکسی میں چلا جاؤں گا۔“

”واہ بھئی واہ۔ تیرے کنے تو بہت مال ہے، چل پھر پرائیویٹ گاڑی والے سے ہمیں بھی ایک روپیہ دلوا دے، وہ بھی تو الہٰ پور جا کر دے دیتا۔“ (اس وقت پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا، اس لیے ایک روپیہ بھی بہت اہمیت رکھتا تھا)

”نہیں۔“ میں نے انکار کر دیا۔

”بند کرو سالے کو!“ دوسرے پولیس والے نے کہا اور میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔ پھر کسی گھر والے کو میری خبر نہ ہو سکی، مجھے کبھی کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش نہیں کیا گیا، کبھی میرا کیس عدالت کو نہیں گیا، اب تو لگتا ہے کہ یہ جیل ہی میرا گھر ہے۔

اس بوڑھے کی داستانِ الم سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ قیام پاکستان سے قبل جیل میں آیا تھا، اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ملک تقسیم ہو چکا ہے، یہ بھی اسے جیل ہی میں آ کر معلوم ہوا ہوگا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس نے اپنی زندگی کے چالیس پینتالیس سال سلاخوں کے پیچھے گنوا دیے۔

وہاں ایسے بھانت بھانت کے کردار تھے کہ انہیں دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔ ایک شخص کو محض اس جرم میں پکڑا گیا تھا کہ اس نے غلطی سے بارڈر عبور کر لیا تھا۔ وہ چرواہا تھا اور اپنی بکری کے پیچھے بھاگتا ہوا بھارتی علاقے میں چلا گیا تھا۔ اس کی عمر ان دنوں صرف دس یا بارہ سال رہی ہوگی، اب وہ پچاس کے سن میں تھا۔ ایسے بے شمار پاکستانی تھے جن کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ پاکستانی ہیں۔

ان ہی میں سے ایک میں بھی تھا۔ میرا جرم بھی تو یہ ہی تھا کہ میں پاکستانی تھا۔ مجھے بھی تو ناکردہ جرم کی سزا بھگتتے ہوئے بیس سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ میں کبھی کبھی اپنی منگیتر افشاں کے بارے میں سوچتا تھا، وہ بھی اب میری طرح بوڑھی ہو چکی ہوگی، میں جب پاکستان سے آیا تھا تو اس وقت بتیس سال کا تھا، اس حساب سے میری عمر اس وقت باون سال تھی۔ باون سال میں تو انسان بوڑھا ہو جاتا ہے اور جیل کے باون سال تو انتہائی کٹھن ہوتے ہیں۔ وہاں تو باون برس کا آدمی بھی بہتر برس کا لگتا ہے، پھر افشاں کون سے میرے انتظار میں بیٹھی ہوگی۔ اس کی بھی شادی ہو گئی ہوگی اور اب تو اس کے جوان بچے ہوں گے۔

جب تک میں امرتسر میں رہا، اس وقت تک تو چچا جان اور ناصر دونوں مجھ سے ملنے آتے رہے، پھر مجھے وہاں سے اٹھا کر کرنال بھیج دیا گیا، شاید چچا جان اور ناصر کو میرے بارے میں بتایا نہیں گیا تھا اس لیے وہ لوگ پھر نہیں آئے۔ انہیں آخری دفعہ میں نے 1982ء میں دیکھا تھا۔ اب تو میں بھی مایوس ہو چلا تھا اور یہ ہی سوچتا تھا کہ اب میری زندگی کا مقصد کیا رہ گیا ہے، نہ جانے پاپا اور ممانا زندہ بھی ہوں گے یا نہیں۔ اب میں رہا ہو کر کروں گا بھی کیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں اپنے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیتا تھا کہ ان لوگوں نے مجھے بے گناہ قید کیا تھا اور مجھے ہر قیمت پر وہاں سے نکلنا تھا، کیسے نکلنا تھا؟ اس سوال کا جواب سوچتے سوچتے بیس برس بیت چکے تھے۔

☆......☆......☆

اس دن میں مشقت کے بعد بیرک میں واپس آیا تو مجھے وہاں ایک نیا قیدی نظر آیا، اس وقت رگھو بھی آ گیا۔ رگھو اس بیرک کا بدمعاش تھا۔ وہ کسی سیاست دان کا چمچہ تھا اور پوری بیرک پر اس کی غنڈہ گردی تھی، سنتری بھی اس کے نزدیک

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں جاتے تھے۔ اب سیل فون عام ہو چکے تھے، وہ کھلے عام سیل فون استعمال کرتا تھا، اس کے لیے باہر سے خاص طور پر کھانا منگایا جاتا تھا۔ وہ کسی بھی قیدی سے اپنی خدمت بھی کرا لیتا تھا۔

اس دن اس کی نظر اس نئے قیدی پر پڑی تو وہ سیدھا اس کی طرف آیا اور اس کی کمر پر زوردار لات جما کر بولا۔ ''کیا تو نے دیکھا نہیں کہ میرے آتے ہی سارے قیدی میرے احترام میں کھڑے ہو گئے یا پھر تو اندھا ہے؟''

''دیکھو بھائی! خوانخواہ میرے گلے مت پڑ، نئے قیدی نے درشت لہجے میں کہا۔

''میں تیرا غلام ہوں کہ میں تجھے دیکھ کر کھڑا ہو جاؤں اور تجھے سلام کروں؟''

''سالے! شاید تو مجھے جانتا نہیں ہے۔'' رگھو نے کہا۔ ''چل اُٹھ کر میرے پیر دبا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے میٹرس پر لیٹ گیا، نئے قیدی نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی۔ رگھو چراغ پا ہو گیا۔ وہ غصے میں کھولتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھا اور نئے قیدی کے پاس پہنچ کر پھر اس کی کمر میں لات مارنا چاہی لیکن نئے قیدی نے پھرتی سے گھوم کر اس کی پنڈلی پکڑ لی اور ایک ہی جھٹکے میں اسے نیچے گرا کر اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اس کی گردن پر گھٹنا رکھ کر بولا۔ ''میں پہلی غلطی ہمیشہ معاف کرنے کا عادی ہوں لیکن دوسری غلطی معاف نہیں کرتا۔ اب اگر تو نے تیسری غلطی کرنے کی کوشش کی تو تجھے پچھتانے کا موقع بھی نہیں دوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا گھٹنا اُٹھایا اور رگھو کو بالوں سے پکڑ کر زمین سے اٹھایا اور لات مار کے اس کے بستر کی طرف دھکیل دیا، پھر وہ خود اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ سب قیدی سناٹے میں یہ منظر دیکھ رہے تھے، نیا قیدی میرے بالکل برابر میں لیٹا تھا اور اس کا رُخ دوسری طرف تھا۔

رگھو کچھ دیر بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا، پھر اس نے اپنے میٹرس کے نیچے سے لوہے کی ایک راڈ نکالی اور نئے قیدی کی طرف بڑھا۔ وہ بلی کی طرح دبے پاؤں نئے قیدی کے پیچھے پہنچا اور اس کے سر پر پوری قوت سے راڈ مارنے کی کوشش کی لیکن میں بھی ذہنی طور پر بالکل تیار تھا۔ میں نے جھپٹ کر اس کی راڈ پکڑ لی اور اس کے پیٹ میں زوردار لات رسید کر دی، اب میں صرف جرنلسٹ وقار الحسن نہیں تھا بلکہ قیدی نمبر سات سو آٹھ بھی تھا، جو بیس سال جیل میں گزارنے کے بعد لڑائی بھڑائی کا ماہر ہو چکا تھا۔ میں نے شروع میں چار پانچ سال بہت مار بھی کھائی تھی لیکن پھر ایک مسلمان قیدی نے باقاعدہ مجھے تربیت دی اور لڑائی بھڑائی کے گُر سکھائے تھے۔ اب میں جیل میں رہ کر اتنا ماہر ہو چکا تھا کہ کوئی بھی تالا بہت آسانی سے توڑ سکتا تھا، کسی بھی آدمی کی جیب کاٹ سکتا تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں تھا کہ کوئی زیادتی کرے تو اسے روکو، اس لیے میں نے رگھو کا ہاتھ نہ صرف روکا تھا بلکہ اس کے پیٹ میں لات مار کے اس کے ہاتھ سے راڈ بھی چھین لی تھی، پھر میں وہی راڈ لے کر آگے بڑھا اور رگھو کی گردن پر پاؤں رکھ کر راڈ اس کے سر پر مارنا چاہی، تو پیچھے سے کسی نے وہ راڈ پکڑ لی۔ نیا قیدی میرے پیچھے کھڑا تھا، اس نے مجھ سے کہا۔ ''یہ تو اپنی جان سے جائے گا لیکن تم پر تین سو دو کا کیس بن جائے گا۔ چلو اپنے بستر پر بیٹھو، اس کے لیے تو میں ہی کافی ہوں۔''

رگھو نے پھر ہماری طرف آنے کی ہمت نہیں کی۔

دوسرے دن وہ کسی اور بیرک میں منتقل ہو گیا، بہت سے قیدیوں کے سامنے اس کی بے عزتی جو ہو گئی تھی۔ وہ بھی ایک نئے قیدی کے ہاتھوں......

اب ان سب نے مجھے اور نئے قیدی کو اس بیرک کا ''بدمعاش'' تسلیم کر لیا تھا اور وہ ہماری خدمت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

☆......☆......☆

ایک دن میں بیرک میں واپس آیا تو بہت اداس تھا نہ جانے کیوں اس دن مجھے مما اور پاپا بہت یاد آ رہے تھے۔ میں خاموشی سے اپنے میٹرس پر لیٹ گیا، اسی وقت وہ نیا قیدی بھی آ گیا، اس کا نام وکی تھا شاید اکرم ہو گا۔ اس نے مجھے اُداس دیکھا تو سیدھا میرے پاس ہی آ گیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا، پھر بولا۔ ''یار وقار! اب تمہارے کیس کی تاریخ کب ہے؟''

''کیسی تاریخ؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''گزشتہ دس سال سے جیل کے حکام مجھے کورٹ لے کر نہیں گئے۔'' اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''تم دس سال سے بغیر کسی مقدمے کے یہاں پڑے ہو اور......''

''میں تو صرف دس سال سے بغیر مقدمے کے یہاں پڑا ہوں، یہاں تو ایسے ایسے لوگ بھی ہیں جو بہت معمولی جرائم میں جیل آئے اور اپنی پوری پوری عمریں یہاں کاٹ دیں۔''

''تم نے کیا جرم کیا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا جرم صرف یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں، دوسرا جرم یہ ہے کہ میں پاکستانی ہوں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''تم...... تم...... پاکستانی ہو؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''ان لوگوں نے تمہیں کیوں گرفتار کیا تھا؟''

جیل میں اور قیدیوں نے مجھ سے میرے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اتنی تفصیل سے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا جتنی تفصیل سے اسے بتایا۔

میری داستان سن کر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ''تم نے...... تم نے اپنی جوانی کے بیس قیمتی سال محض اس جرم میں گزار دیے کہ تمہارا نام اتفاق سے وقار تھا اور آئی ایس آئی کا کوئی میجر وقار ان کا ٹارگٹ تھا، اس نے رومال سے اپنی آنکھیں خشک کیں، پھر بولا۔ ''فکر مت کرو، اب تم زیادہ دن قید نہیں رہو گے۔'' میں اس کی بات پر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ جب کوئی قیدی مجھ سے ہمدردی جتاتا تھا تو یہ ضرور کہتا تھا۔

اس دن ہم مشقت سے واپس آئے تو اس نے اپنے میٹرس پر نیم دراز ہو کر مجھ سے پوچھا۔

''وقار! تم یہاں سے باہر نکلنا چاہو گے؟''

میں نے اس کی طرف ہنس کر دیکھا، جیسے وہ مذاق کر رہا ہو یا میرا مذاق اُڑا رہا ہو۔

''ہنسو مت!'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''میں اس وقت مذاق نہیں کر رہا ہوں، سنجیدہ ہوں۔ میری بات کا جواب دو، کیا تم یہاں سے باہر نکلنا چاہو گے۔''

''لیکن کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''قانون تو تمہارے لیے واقعی اندھا، گونگا اور بہرہ بن گیا ہے اس لیے تم قانونی طریقے سے تو باہر نہیں نکل سکتے۔ تمہیں غیر قانونی طریقے سے باہر نکلنا ہو گا۔'' میں سوچ میں پڑ گیا۔ ''دیکھو وقار! یہاں رہ کر بھی تم ظلم سہ رہے ہو اور دس سال بعد نہیں تو پندرہ یا بیس سال بعد اس جیل میں تمہارا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس سے بہتر یہ نہیں ہے کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی جائے، زیادہ سے زیادہ یہ ہی ہو گا نا کہ ہم کسی سنتری کی گولی کا نشانہ بن جائیں گے تو بن جائیں، کم سے کم اس زندگی سے تو نجات مل جائے گی۔''

اس کی باتوں سے میں قائل ہو گیا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے، آج سے ٹھیک ایک ہفتے بعد ہم لوگ ان شاء اللہ جیل سے باہر ہوں گے۔'' اس نے کہا۔

''ان شاء اللہ!'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کیا تم مسلمان ہو یا پھر ہندوؤں کی طرح محض محاورے کے طور پر ان شاء اللہ کہہ رہے ہو۔ اب تو اکثر ہندو بھی ماشاء اللہ اور ان شاء اللہ جیسے الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں۔''

وہ مسکرایا اور بولا۔ ''الحمد للہ! میں مسلمان ہوں، بس تم اب یہاں سے نکلنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ۔''

پورے ہفتے وہ عجیب و غریب سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ اس رات جیل کی دائیں جانب زوردار دھماکا ہوا۔ سارے سنتری اس طرف دوڑے، وکی مجھے لے کر مخالف سمت میں دوڑا اور ایک جگہ پہنچ کر اس نے دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی رسّی پکڑی اور اسے پکڑ کر تیزی سے دیوار پر چڑھ گیا، پھر اس نے مجھے بھی اوپر آنے کو کہا اور جب میں کچھ اوپر پہنچا تو اس نے وہ رسّی ہی پکڑ کر کھینچ لی۔ اس کے ساتھ میں بھی اوپر پہنچ گیا۔ اس رسّی کے ذریعے وہ دوسری طرف کودا، میں بھی اس کے سہارے جھکتا ہوا دوسری طرف بڑھ گیا لیکن ابھی ہم جیل ہی کے اندر تھے، ابھی ہمیں اور رکاوٹیں مزید عبور کرنا تھیں۔ اس وقت مجھے دوسرے زوردار دھماکے کی آواز بھی سنائی دی، وہ دھماکا بھی اسی سمت میں ہوا تھا جس سمت میں پہلا دھماکا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

یہ پُرتجسس، سنسنی خیز اور لہو رنگ آپ بیتی ابھی جاری ہے۔
بقیہ واقعات آئندہ ماہ کے ''سچی کہانیاں'' میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com
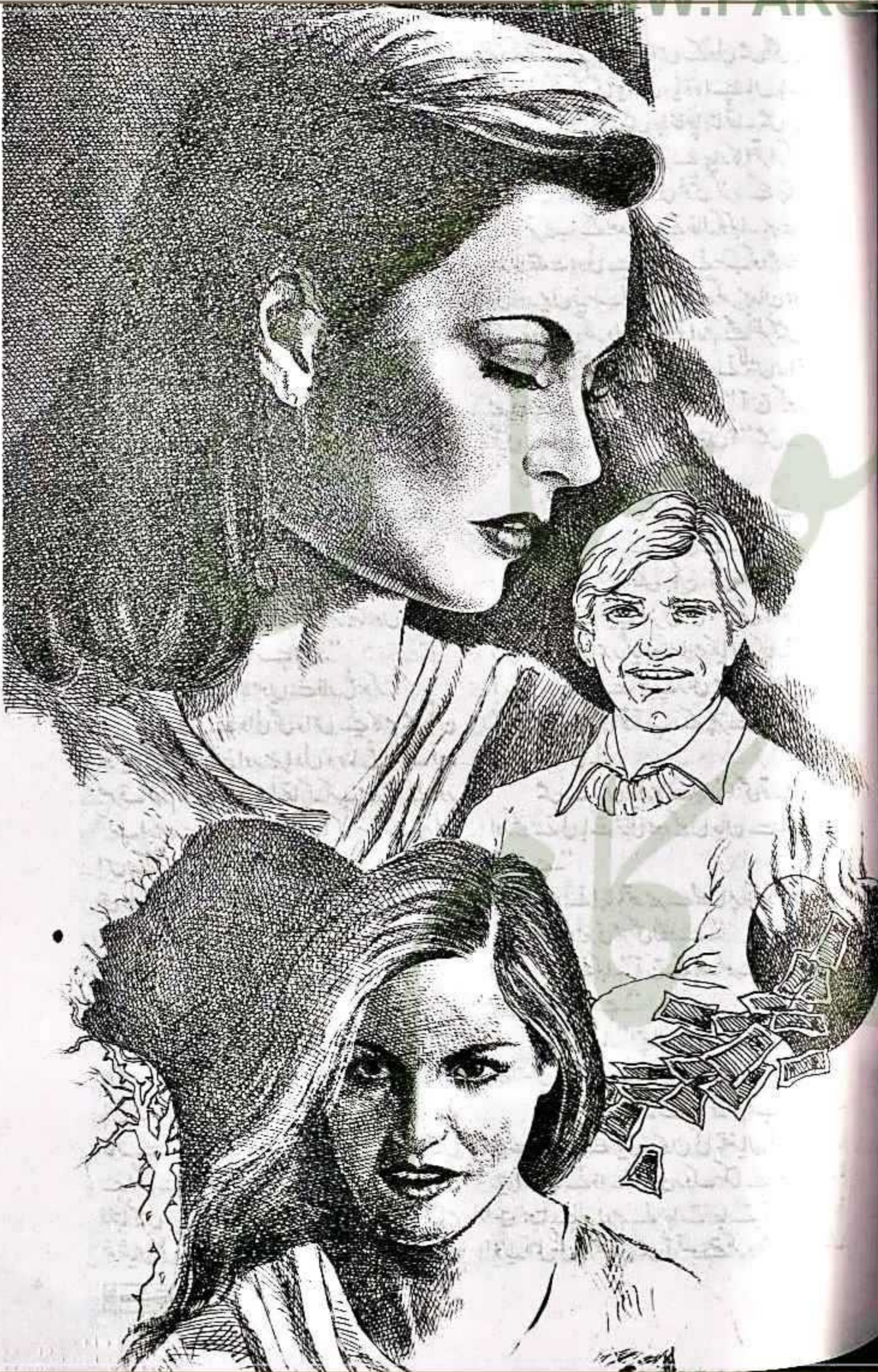
پردیس سے پہلی کہانی

دل، اِک شہرِ خوشاں

محمد شہزاد کنول

زخمِ محبت لیے پردیس سے ایک پریم کتھا

محبت اِک انجانا سا احساس ہے۔ یہ دل کا دل سے بندھ جانے والا، بندھن ہے۔ محبت ہو جانا، وفا کرنا اور ملن ہو جانا۔ اپنی محبت کو پالینا، یہ ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا ہے۔ محبت ہنساتی ہے، رُلاتی ہے، تڑپاتی ہے، سنوارتی ہے، بگاڑتی ہے، مگر جب جدا ہوتی ہے تو ایسا احساس چھوڑ جاتی ہے کہ جو نہ مرنے دے نہ جینے دے۔ یہ بھی ایک ایسی محبت کی داستان ہے جو کچھ ایسے شامل ہوئی زندگی میں کہ سب کچھ بدل گیا۔ رہی تو بس محبت اور یادیں، سوائے آنسوؤں کے اور کچھ نہیں ملا۔

میرا نام محمد شہزاد ہے۔ میں پاکستان کے شہر چکوال کا رہنے والا ہوں۔ ہم دو بھائی اور پانچ بہنیں تھیں۔ میرے گھر میں ضرورت کی ہر اشیاء موجود تھی۔ بچپن سے مجھے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ پانچ سال کا ہوا تو مجھے اسکول میں داخل کروا دیا گیا جو ہمارے گھر کے نزدیک تھا۔ اسکول میں بچپن میں تو دن بہت اچھے گزرتے رہے۔ کبھی اسکول جانا، کبھی ضد کر کے نہ جانا، کبھی کسی سے لڑائی کر کے روتے روتے گھر واپس آجانا اور پھر ماں مجھے بہت پیار سے گلے لگاتی۔ کبھی کاغذ کی کشتیاں بنا کر پانی میں بہانا۔ وقت اسی طرح گزرتا گیا اور میں پرائمری اسکول سے ہائی اسکول میں داخل ہو گیا۔ اب ہر طرح کی باتیں میں سمجھ سکتا تھا۔ گھر میں کسی کی بات ہو رہی ہے، کون کون آتا ہے ہمارے گھر اور کون کون نہیں آتا۔ امی اکثر ایک خالہ کا ذکر کیا کرتی تھیں، چند وجوہ کی بناء پر ان سے ہماری بول چال بند تھی۔ وہ دن بہت خوب صورت تھے۔ نہ کوئی دُکھ نہ پریشانی۔ صبح قرآن مجید پڑھنے جاتے، پھر ناشتا کر کے اسکول، پھر واپس آتے ہی گلیوں میں شور و غل کرتے۔ کبھی کھیتوں میں تتلی پکڑنے جاتے اور کبھی ریت کو پاؤں پر ڈال کر گھر بناتے۔ دن گزرتے گئے اور معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب جوان ہو گئے اور ہائی اسکول سے بھی اچھے نمبروں میں پاس ہو گئے، پھر میں پڑھائی میں کم اور شعر و شاعری میں زیادہ توجہ دینے لگا۔ جوانی سر چڑھ کر بول رہی تھی۔ زندگی بہت خوب صورت گزر رہی تھی، مگر زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا کہ جس نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔

میری خالہ کی شادی تھی اور ان دنوں میں میرے چاچو کے سالے کی بھی شادی تھی گوجرانوالہ میں اور اس وقت میں گوجرانوالہ گیا ہوا تھا۔ جس رات میری خالہ کی مہندی تھی تو میں گوجرانوالہ سے واپس آیا لیکن مہندی میں شریک نہ ہو سکا، کیوں کہ

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بہت رات ہو چکی تھی اور میرے ساتھ چاچو کے گھر والے بھی تھے۔ اگلے دن صبح سب سے ملاقات ہوئی جن میری بڑی خالہ بھی تھیں۔ امی نے ان سے تعارف کروایا، کیوں کہ ایک عرصے بعد ہم مل رہے تھے۔ جب امی نے کہا کہ اس سے ملو، یہ بھی آپ کی کزن ہے، اس کا نام ارم ہے اور جب میں نے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ معصوم سا چہرہ، آنکھوں میں حیا، بولے تو جیسے منہ سے موتی گر رہے ہوں۔ وہ پل میری زندگی کا بہت حسین لمحہ تھا۔ اس کے بعد میری زندگی اک پیاس بن کر رہ گئی۔

''ہیلو جناب! کہاں کھو گئے۔ سلام بھی نہیں کرو گے۔'' اور میں ایک دم خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آیا تو فوراً میرے منہ سے یہ شعر نکلا

آپ آئے ہمارے گھر میں خدا کی قدرت ہے
ہم کبھی خود کو کبھی گھر کو دیکھتے ہیں

''تو جناب شاعری بھی کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''بس ٹوٹی پھوٹی کر لیتا ہوں۔''

''تو ہمیں کب سُنا رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کاموں سے فارغ ہو کر۔''

بارات آنے والی تھی، اس لیے کام میں مگن ہو گیا، مگر میرا ذہن اور میرا دل و دماغ صرف اور صرف ارم کو ہی سوچ رہا تھا کہ کب موقع ملے اور کب ارم سے بات ہو۔ دل کرتا کہ ہر وقت، ہر لمحہ اس کے قریب رہوں۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں دل ہی دل میں ارم کو اپنا مان چکا تھا، مگر ارم سے کچھ کہنے کی ہمت نہ رہی۔ آخر میں نے مامی سے بات کی جن سے میری بہت دوستی تھی، ان سے کہا کہ ارم سے پوچھوں کہ میں اسے پسند کرنے لگا ہوں۔ اگر میں خالہ سے بات کروں تو اسے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔ خیر مامی نے ارم سے پوچھا اور ارم نے بھی ہاں کر دی اور میں نے امی سے بات کی۔ امی نے خالہ سے کہا تو انہوں نے کہا ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اگر بچے راضی ہیں۔'' یہ سن کر میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی اور ایسا لگنے لگا کہ مجھے زندگی کی وہ تمام خوشیاں مل گئیں جو مجھے چاہیے تھیں اور میں تو ارم کو خود پسند کرنے لگا تھا، مگر اس کے دل میں بھی میرے لیے پیار کی جگہ تھی یا نہیں، یا وہ اپنے ماں باپ کے فیصلے پر راضی تھی، یہ میں جاننا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا ارم ایک بار خود بول کر میرے پیار کا اقرار کرے۔ خیر شادی کے دن کیسے ہنسی خوشی گزر گئے پتا بھی نہ چلا۔ تقریب کے بعد امی نے خالہ کو کہا۔ بہت عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے اور امی نے سب کو دعوت دے دی اور یوں یہ سب لوگ ہمارے گھر مہمان ہو گئے۔ ایک روز میں گھر واپس آیا تو ارم مجھے نظر نہیں آئی۔ میری متلاشی نظریں اسے ڈھونڈنے لگیں۔ امی نے میری چوری پکڑ لی اور کہنے لگیں۔ ''آج کیوں بے چینی ہے اور کسے ڈھونڈ رہے ہوں؟'' میں نے کہا۔ ''کسی کو نہیں۔''

امی نے کہا ''میں تیری ماں ہوں اور جسے تم ڈھونڈ رہے ہو وہ کچن میں چائے بنا رہی ہے۔''

یہ سنتے ہی میں کچن میں چلا گیا۔ ارم دروازے کے پیچھے کھڑی تھی، جیسے وہ خود کو چھپا رہی ہو۔ میں اندر گیا اور سلام کیا اور کہا۔ ''اچھا تو آپ یہاں ہم سے چھپ رہی ہیں۔'' ارم کہنے لگی ''اگر یوں نہ چھپتی تو آپ کے چہرے پر یہ کھونے کا ڈر کیسے دیکھتی۔''

میں نے یہ سن کر ارم سے کہا۔ ''ابھی تو ملے بھی نہیں اور کھونے کی بات کرتی ہو، کیوں جان سے مار ڈالنے کا ارادہ ہے۔''

ارم نے اپنا ہاتھ میرے لبوں پر رکھ دیا اور بولی۔ ''خدا آپ کو میری عمر بھی لگا دے۔''

میں نے کہا۔ ''آج کے بعد کھونے کی بات نہ کرنا مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔''

ارم نے کہا۔ ''اچھا اب موڈ ٹھیک کرو اور چائے پی لو، اسپیشل آپ کے لیے بنائی ہے۔''

کچھ دن بعد خالہ نے کہا کہ ہم اب چلتے ہیں۔ بہت دن ہو گئے ہیں، بچوں کی چھٹیاں بھی ختم ہو گئی ہیں اور جانے والے کو کون روک سکتا ہے؟ اسے تو جانا ہی ہوتا ہے۔ ارم نے جاتے جاتے مجھ ایک کارڈ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر وہ کھل کر رو نہیں سکتی تھے۔ ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے کہہ رہی ہو، میں نے نہیں جانا یا میں نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر۔ جاتے جاتے میں نے ارم کو ایک خط دیا اور اس میں اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ میں نے اسے لکھا تھا

''ارم آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میری زندگی کی ہر خوشی آپ سے اور ہر صبح، ہر رات بھی۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زیادہ کچھ نہیں کہوں گا، اتنا کہوں گا کہ میں آپ کے بغیر نہیں جی سکتا مجھے آپ کا ساتھ چاہیے عمر بھر کے لیے۔ میں چاہتا ہوں آپ بھی صرف میرے بارے میں سوچو۔ آپ بھی وفا کرو اور صرف اور صرف میری ہو کے رہو، مجھے تو آپ کے بارے میں سوچتے رہنا بہت اچھا لگتا ہے، اپنا خیال رکھنا اور خوش رہنا۔''

بہت سی یادیں دے کر ارم اپنے گھر چلی گئی، اب میرا کہیں دل نہیں لگ رہا تھا۔ گھر کھانے کو دوڑتا تھا، پھر مجھے وہ کارڈ یاد آیا، میں نے کارڈ کھولا اور پڑھنے لگا۔

''السلام علیکم مائی ڈیئر:

میں نے بہت انتظار کیا کہ آپ مجھ سے دل کی بات خود اپنے منہ سے کہیں مگر آپ نے اس قابل شاید ہمیں نہیں سمجھا۔ میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنے پیار کا یقین دلا رہی ہوں، اُمید ہے مایوس نہیں کرو گے۔

ارم صرف تمہاری ہے، صرف آپ کی۔ اگر آپ کی نہیں تو کسی کی نہیں۔''

ارم کے اس خط سے ہر طرف خوشی ہی خوشی نظر آنے لگی تھی۔ مجھے لگا جیسے میں دنیا کا خوش نصیب انسان ہوں، مگر یہ خوشی بہت دن تک راس نہ آئی۔

میرا باپ بہت سخت اور گرم مزاج کا آدمی تھا۔ غصہ تو ان کی ناک پر سوار رہتا تھا۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا تب سے دیکھ رہے تھے کہ بات بات پر ماں کو مارنا، ہر وقت طعنے مارتے، جو بات میری دادی دادا، ابو کے کان میں ڈالتے، ابو اس پر عمل کرتے۔ جب چھوٹے تھے جب دیکھتے کہ ابو امی کو مار رہے ہیں تو ڈر سے ایک کونے میں چھپ جاتے۔ جب تک ابو گھر سے باہر رہتے سکون رہتا، ورنہ ہر وقت ایک خوف اور ڈر رہتا کہ کب نہ جانے کس کی باری آ جائے۔ اتنا ظلم کرتے کہ ہر وقت دُعا کرتے کہ ابو کی کب چھٹی ختم ہو اور کب وہ واپس جائیں۔ ایک روز وہ مجھ پر برس پڑے اور مجھے سخت سست کہا اور میری شعر و شاعری پر بھی اعتراض کیا۔ میں نے بھی آگے سے ابو کو جواب دے دیا۔ تب ابو نے غصے میں آ کر مجھے گھر سے نکال دیا اور میں سیدھا خالہ کے گھر سرگودھا چلا گیا۔ ایک دو دن تو ان کو معلوم نہیں ہوا، مگر جب گھر والوں نے سرگودھا فون کر کے پوچھا کہ شہزاد تو نہیں آیا اور کہا کہ ابو کا غصہ تو کچھ دیر کا تھا، اب وہ خود بھی بہت پریشان ہیں۔ تب خالہ نے ان سے کہا کہ شہزاد ہمارے گھر ہے اور میں اسے راضی کر کے واپس بھیج دیتی ہوں، پھر خالہ نے مجھ سے کہا۔ ''اگر تم راضی ہو کر آتے تو چاہے جتنا مرضی یہاں رہ لیتے، مگر اس طرح گھر والوں سے ناراض ہو کر آئے ہو تو میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے، تم واپس چلے جاؤ۔'' مجھے بہت دُکھ ہوا کہ خالہ بھی ایسی بات کر سکتی تھیں۔ شام کا وقت تھا میں نے خالہ سے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں، میں آپ پر مزید بوجھ نہیں بنوں گا، میں کل واپس چلا جاؤں گا۔'' رات کو ارم نے رہتی کسر پوری کر دی، کہنے لگی ''جو خط میں نے دیا تھا وہ پھاڑ دینا اور میں تم سے پیار نہیں کرتی، جو فیصلہ میرے گھر والے کریں گے، وہ مجھے منظور ہوگا۔'' اب میرا ایک لمحہ بھی یہاں رکنے کو دل نہیں کر رہا تھا کہ یہ میرے اپنے ہیں۔ چھوٹی سی بات پر بھی ساتھ نہیں دے سکتے۔ کاش ان کے اس رویے کو میں نہ بھول پاتا اور ان سے نفرت ہی کرتا تو آج یوں میری دنیا نہ اجڑتی۔ خالہ نے تو کیا سو کیا، مگر ارم سے میرا کچھ الگ ہی رشتہ تھا۔ پیار کا محبت کا، اس سے تو کچھ بھی نہیں مانگا تھا، پھر میں نے ارم سے کہا۔ ''تم پریشان نہ ہو میری جان، میں ابھی لاوارث نہیں ہوں۔ میرا گھر ہے، میری ماں ہے، بہنیں ہیں، دوست ہیں۔ آپ سے تو مدد نہیں مانگی اور اب میں ایک لمحہ بھی آپ کے گھر نہیں رُکوں گا۔'' میں خالہ کے گھر سے اپنے استاد کے گھر آ گیا۔ اسکول چھوڑنے کے بعد میں نے رنگ کا کام سیکھنا شروع

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

کر دیا تھا اور جو میرا استاد تھا وہ بھی روزی روٹی کمانے کی غرض سے ان دنوں چکوال آیا ہوا تھا۔ اس سے ملاقات ہوگئی اور پھر جان پہچان ہوگئی تھی۔ خیر میں رات کو اپنے استاد کے گھر چلا گیا اور صبح وہاں سے اپنے گھر واپس چلا گیا۔ اس واقعے کے بعد ابو نے میرے لیے سعودی عرب میں جاب کا انتظار کر دیا اور میں سعودی عرب چلا گیا، لیکن وہاں جا کر بھی میں نہ تو ارم کے پھول جیسے چہرے کو بھلا سکا اور نہ اس کے اس رونے کو کہ وہ تو سب کچھ بھول چکی ہے۔ میری سعودی عرب میں جاب کے بعد خاندان میں میری وقعت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اب وہ رشتے دار بھی کسی نہ کسی بہانے مجھے فون کرنے لگے تھے جو عید تہوار پر بھی نہیں پوچھتے تھے۔ سعودی عرب میں مجھے عمرے کی سعادت نصیب ہوئی۔ رب کے گھر میں، میں نے دعا کی کہ یا رب یا تو، تو ارم کو میرا کر دے یا اس کی محبت میرے دل سے ہمیشہ کے لیے نکال دے۔ یوں وقت گزرتا گیا۔ ایک دن خالو ہمارے گھر گئے اور کہنے لگے کہ میں اپنی بیٹی کا رشتہ دینے آیا ہوں۔ میرے ابو اور چاچو میرا رشتہ پھوپھی کی بیٹی سے کرنا چاہ رہے تھے۔ ابو میرے دل کے حال سے واقف تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ میری خوشی کا احساس نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے خالو کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ ابو کی ضد نے مجھے غلط کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ابو سے کہا۔ اگر میرا رشتہ آپ نہیں کریں گے تو میں پاکستان لوٹ آؤں گا، لیکن میری بات کسی نے نہ سنی۔ ابو نے خالو کو ذلیل کر کے جانے پر مجبور کر دیا۔ ان کے اس رونے پر مجھے سب سے زیادہ تکلیف ہوئی کہ ابو نے ایسے کیوں کیا۔ خالو کے ساتھ اور میری خوشی کی پروا بھی نہیں کی۔ میں تو جیسے پاگل ہوگیا تھا کہ میرے ماں باپ اپنی اولاد کی خوشی کو نظر انداز کر کے بھائیوں کے فیصلے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ ہر طرح سے سب کو منانے کی کوشش کی، مگر میری کسی نے بات نہ سنی اور میں نے سعودی عرب کے قانون کے مطابق خود کو شرطے یعنی پولیس کے حوالے کر دیا اور کہا کہ میں عمرے پر آیا تھا، میرے پاس پاسپورٹ نہیں ہے اور ویسے بھی میرا پاسپورٹ میرے کفیل کے پاس تھا۔ مجھے جیل میں گئے ہوئے تو دن ہوگئے تھے۔ میرے کفیل نے فون کیا، کہاں ہو۔ میں نے کہا کہ میں ریاض میں ہوں اور میں یہیں کام کروں گا۔ اس کے ساتھ ابو تھے۔ ابو نے اس سے کہا کہ اسے کہو واپس آ جائے نہیں تو میں اس کا پاسپورٹ ہمیشہ کے لیے بند کروا دوں گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا باپ خود میرا کمپیوٹر ہمیشہ کے لیے بند کروا دیں گے۔ خیر میں 15 دن بعد پاکستان آ گیا لیکن گھر نہیں گیا۔ گھر والوں کو میرے بارے میں معلوم ہوگیا۔ میرے ماموں آئے اور مجھے ساتھ لے گئے، مگر اس طرح میں الناسب کی نظروں میں گر گیا تھا، حتیٰ کہ ارم نے بھی میرا حال تک نہ پوچھا۔ سب کو معلوم تھا کہ میں نے ایسے کیوں کیا، مگر پھر بھی کسی نے میرا ساتھ نہ دیا الناسب میرے دشمن بن گئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ گھر نہیں رہوں گا۔ میں نانی امی کے گھر چلا گیا، تین سال وہیں رہا۔ ان تین سالوں میں مجھے اتنا معلوم ہوا کہ ارم نے خود کسی لڑکے کو پسند کیا اور خود اپنی مرضی سے منگنی کی ہے اور میرے لیے جو رشتے آتے رہے میں ٹھکراتا رہا۔ جب معلوم ہوگیا کہ ارم نے منگنی کر لی ہے۔ ادھر امی ابو بھی مجبور کر رہے تھے کہ تم جس کی خاطر یہ سب کر رہے ہو وہ تو خود کسی کی ہو چکی ہے اور ابو نے صاف صاف کہا کہ اگر میری مرضی سے رشتہ نہیں کرنا تو میں تمہیں اپنے نام سے الگ کر دوں گا اور عاق کر کے جائیداد سے بھی بے دخل کر دوں گا۔ سب رشتے دار صرف دولت اور پیسے کے پجاری ہیں۔ آخر ہار مان لی اور ابو کے دل میں جو تھا وہ ان کا مقصد پورا ہوگیا اور میری منگنی بھی ابو نے پھوپھو کی بیٹی سے کر دی، مگر میرے دل میں اس بے وفا کی جگہ کم نہ ہوئی۔ انسان پہلا پیار کبھی بھول نہیں سکتا۔ میرے دل میں خالہ کی فیملی کی وہی جگہ تھی جو پہلے دن سے تھی۔ وقت گزرتا گیا اور خالہ کے بیٹے کی شادی تھی اور ہم بھی گئے ہوئے تھے۔

خالہ کی فیملی بھی وہاں آئی ہوئی تھی۔ میں خالہ کے پاس بیٹھ گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا، مگر میرا دھیان ارم کی طرف تھا جو موبائل پر مصروف تھی اور میرے دل میں جلن ہو رہی تھی۔ طرح طرح کے خیال دل میں آ رہے تھے۔ میں اٹھ کر اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد ارم میرے پاس آئی اور بولی کہ لگتا ہے ابھی تک ناراض ہو۔ میں نے کہا آپ کو کیا فرق پڑتا ہے، میری ناراضگی سے، پھر کہنے لگی کہ تھک گئے ہو، سر دبا دوں۔ میں نے کہا، میں تو غریب آدمی ہوں۔ اپنی محنت مزدوری کر کے اپنا ٹائم گزار رہا ہوں۔ آپ مجھ سے ہمدردی نہ جتائیں۔ ارم یہ سن کر کہنے لگی کہ آپ واپس کیوں آئے ہیں۔ آپ کو اپنے مستقبل کا خیال بھی نہ آیا۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ میں تو واپس ہی اس کی وجہ سے آیا تھا اور وہ ہی یہ سب کہہ رہی ہے۔ میں نے کہا کہ کاش آپ ایک بار کہہ دیتی تو میں کبھی لوٹ کر نہ آتا۔ تم نے میری قدر نہیں کی اور نہ میرے پیار کی۔ سارے زمانے میں رسوا کر دیا۔ ارم کہنے لگی مجھے ایک بار معاف کر دو تب میں دوسروں کی باتوں میں آ گئی تھی اور نادان تھی کچھ نہ کر سکی۔ اب میں آپ کا ساتھ دوں گی، میں ہوں آپ کے ساتھ جیسی مرضی قسم لے لو، میں کبھی نہیں چھوڑ کے جاؤں گی آپ کو۔ میں نے کہا ارم بہت دیر کر دی اب تم کسی اور کی ہو چکی ہو اور کوئی میری زندگی میں بھی آ چکا ہے۔ پھر ارم نے بہت وعدے کیے، بہت قسمیں کھائیں اور میں اس پر بھروسا کر بیٹھا۔ جتنے دن وہ ہمارے گھر رہے بہت خوشی خوشی وقت گزر گیا اور جاتے جاتے ارم نے کہا کہ میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی، میں نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر اور آپ مجھ سے ملنے آیا کرو گے ضرور، میں نے کہا آؤں گا۔ میں نے بھی ارم سے کہا۔ ”ارم، دیکھ لو اگر اب ایسے کرو گی تو میری زندگی تماشا بن جائے گی اور میں خود کو ختم کر دوں گا۔“ ارم نے کہا۔ ”میں نے ابھی پڑھنا ہے جب اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاؤں گی خود بول کر میں گھر والوں کو منا لوں گی۔“ یہاں سے زندگی نے نیا موڑ لیا اور میں اس راستے پر چلنے لگا جس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ میں پھر اس پر بھروسا کرنے لگا۔ ایک شام فون کی بیل بجی۔ ارم کا فون تھا، سلام دعا کے بعد ارم رونے لگی، میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی کہ لڑکے والے شادی کے لیے زور دے رہے ہیں اور میں مر تو سکتی ہوں مگر آپ کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ میں نے ارم سے کہا آپ گھر والوں کو کہو کہ ابھی آپ نے پڑھنا ہے اور اتنے میں، میں بھی اپنے آپ کو اس قابل بنا لوں گا پھر کرتے ہیں کچھ۔ ارم نے گھر والوں کو یہ کہہ کر چپ کروا دیا کہ وہ ابھی پڑھنا چاہتی ہے اور اس کے ابو نے بھی اسے پڑھنے کی اجازت دے دی اور ارم نے جوہر آباد یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اب وہ ایم۔اے کر رہی تھی۔ میرے گھر والے بھی شادی کی ضد کرنے لگے تھے، مگر میں بہانہ لگاتا رہا کہ ابھی میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے پھر کروں گا شادی۔ ادھر ارم بھی یہ کہہ کر خاموش کروا دیتی کہ میں ابھی خود بول کر نہیں کہہ سکتی، گھر والوں کو جب تک میری منگنی ٹوٹ نہیں جاتی۔ وقت گزرتا گیا اور ارم کو جوہر آباد گئے ہوئے 7 ماہ ہو گئے تھے اور اس دوران 4 دفعہ ارم سے ملنے گیا جوہر آباد۔ اسے کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی۔ ہر وہ چیز اسے دیتا جو اسے ضرورت ہوتی، یہاں تک کہ اسے فون میں بیلنس نہ کروانے دیتا۔ جب ضرورت ہوتی میں کروا دیتا بیلنس۔ ہر طرح سے وہاں میں نے ارم کا خیال رکھا۔ وہاں ارم ہوسٹل میں نہیں بلکہ اس کے بھائی کا ایک دوست تھا جس کے گھر وہ رہ رہی تھی اور مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ کسی اجنبی کے گھر رہ رہی ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ جان ہوسٹل میں رہو مگر ایک نہ سنی، ہر دن ہماری بات ہوتی۔ رات کو، دن کو، شام کو۔ نہ وہ رہ سکتی تھی میرے بغیر نہ میں اس کے بغیر۔ وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ ارم نے مجھ سے کہا آپ کی خاطر میں یہ رشتہ توڑ رہی ہوں اگر اگر آپ نے میرے ساتھ دھوکہ کیا تو میں مر جاؤں گی، کسی اور کی نہیں ہوں گی۔ اب اس کے دل میں کیا تھا، میں نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے رشتے سے جواب دیا تو اس لڑکے نے خالو کو بتا دیا کہ یہ اپنے کزن سے بات کرتی ہے اور اس لیے مجھ سے رشتہ ختم کر رہی ہے تو خالو نے ارم کو مارا بھی اور بہت برا بھلا بھی کہا اور ارم نے مجھے کہا کہ آپ کسی کو نہ بتانا کہ میں آپ سے بات کرتی ہوں،

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

آپ کو میری قسم۔ میں نے ارم سے کہا اگر معلوم ہوجائے تو ہمیں کیا ڈر ہے۔ تو ارم کہنے لگی نہیں ابھی نہیں، ابھی میں پڑھ لوں پھر خود بول کر کہوں گی اور آپ بھی اب اپنا رشتہ توڑو۔ تب کچھ عرصے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میں نے گھر بات کی۔ امی نہ مانی اور میں ارم کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ضد کی تو امی نے خالہ کے گھر فون کردیا کہ ارم کو سمجھاؤ یہ میرے بیٹے کو خراب کررہی ہے۔ خالہ نے ارم کی بہت بے عزتی کی اور مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں گھر والوں کے سرچڑھ کر نیند کی گولیاں زیادہ مقدار میں کھالیں اور پھر تین دن کوئی ہوش نہیں آیا اور بدقسمتی سے میں بچ گیا، پھر ارم سے میری بات ہوئی تو میں نے کہا۔ ارم میرے ساتھ جو ہوا سو ہوا۔ آپ گھر والوں کی نظروں میں نہ گرو۔ جو وہ کہتے ہیں وہ کرو۔ ارم نے کہا میں مرجاؤں گی اور اس کے ذمے دار آپ ہوں گے۔ اس کے جنون کو دیکھ کر میں ہار مان گیا اور وعدہ کیا کہ جان مرجاؤں گا، مٹ جاؤں گا پر آخری دَم تک آپ کا ساتھ دوں گا اور یاد رکھنا اگر آپ نے مجھے تنہا چھوڑا یا دھوکہ دیا تو میں خود کو ختم کرلوں گا۔ ارم نے بہت وعدے کیے اور میں اس پر اعتماد کرتا گیا۔ ارم نے کہا، میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ میں 31-07-2011 کو ارم سے ملنے سرگودھا گیا۔ بہت ساری چیزیں لے کر گیا ارم کے لیے۔ جو بھی وہ کہتی میں وہ دیتا۔ آج تک طعنے نہیں مارے۔ ارم کی خاطر میں کافر بن گیا تھا۔ اب پھر سے کوشش کرنے لگا کہ پاکستان میں رہ کر میرا کوئی مستقبل نہیں بنے گا۔ پیسوں کی پکڑ کی تھی، خالہ نو امی نے فون کیا کہ ہمیں کچھ روپے ادھار چاہئیں مگر خالہ نے صاف کہا۔ شہزاد واپس آجائے گا وہاں سے تو ہماری پیسے کون واپس دے گا۔ میں نے ارم کو بتایا کہ تمہاری امی نے یہ جواب دیا ہے، پھر بھی میں نے لوگوں کو غلط نہیں کہا، جہاں سے بھی ضرورت پوری کی اور چھ لاکھ روپے کا بندوبست کرلیا اور میرا ویزا لگ گیا۔

ادھر گھر میں حالات ایسے ہوگئے تھے۔ خود بخود ہی ایسی صورت حال پیدا ہوگئی کہ میرا رشتہ بھی ٹوٹ گیا، مگر میں چاہتا تو یہ سب نہ ہوتا، مگر میں نہیں جانتا تھا کہ اس نفرت کی آگ میں میری بہن کا گھر بھی اجڑ جائے گا۔ بہت غلط اور گھٹیا کام کیا تھا میری ساس یعنی کہ میری پھوپھو نے، بے شک وہ میرے باپ کی بہن تھی، مگر کسی بھی باپ کو اولاد کی عزت بہت پیاری ہوتی ہے۔ میں نے آخری دفعہ ارم سے صاف صاف پوچھا کہ ابھی بھی وقت ہے بتاؤ کیا میرا ساتھ دو گی۔ کہیں آدھے راستے میں تو نہیں چھوڑ دو گی، مگر ارم نے بہت وعدے کیے اور بہت قسمیں کھائیں۔ میں تو پہلے ہی اس پر بہت اور خود سے زیادہ بھروسا کرتا تھا، جو کام میری پھوپھو نے کیا تھا وہ میں نے ابو کو صاف صاف بتادیا اور اس طرح ابو بھی برداشت نہ کرسکے اور سارے گاؤں میں ہماری بہت بدنامی ہوگئی اور جس کی وجہ سے میری بہن کی بھی منگنی ٹوٹ گئی اور میری بھی۔ ارم نے آج تک دل کی بات اپنے گھر والوں کو نہیں بتائی تھی۔ میں نے اسے کئی بار کہا تھا کہ ایک دفعہ تو گھر میں بات کرو، وہ ٹال جاتی اور کہتی کہ سب کو معلوم ہے میرے دل میں کیا ہے۔ میں نے بھی گھر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ شادی کروں گا تو ارم سے ورنہ کسی سے نہیں۔ جب جب وہ بولتی میں ملنے جاتا، بچوں کی طرح اس کا خیال رکھتا۔ امی نے خالہ کو فون کرکے میری بہنوں کے رشتے کے لیے بات کی، مگر خالہ نے صاف انکار کردیا۔ اس پر میری امی ابو کو بہت دُکھ ہوا۔ میری بہن اقراء کا رشتہ ماموں شوکت کے سالے سے ہوگیا، جبکہ ماریہ کا رشتہ جو میری وجہ سے ٹوٹا تھا، وہ گوجرانوالہ ایک رشتے داروں میں طے ہوگیا۔ میں نے ارم کو فون کیا کہ ارم اب نہیں لگتا کہ ابو مانیں گے تمہارے گھر رشتے کو، کیوں کہ تمہاری امی نے ہمارے گھر سے رشتہ لینے سے صاف انکار کردیا ہے۔ رہی سہی کسر خالہ نے تب پوری کردی جب اقراء کی شادی میں آئیں تو غیروں کی طرح اور میرے ابو بھی چھٹی پر آئے ہوئے تھے، جو ہمارا امی ابو نے گفٹ کیے تھے خالہ کے بیٹے اور بیٹی کو وہ خالہ لے کر آئی اور کہا کہ میری بیٹیوں کو پسند نہیں ہیں۔ ان کے معیار کے نہیں ہیں۔ یہ آپ اپنی بیٹی کو دے دو۔ 2006ء کو میرے کزن کی شادی تھی تب ابو نے

گفٹ دیے تھے اور 2013ء میں خالہ وہ واپس کرنے آگئیں۔ آخر کب تک میری ماں برداشت کرتی، خالہ نے وہ لوٹا کر ہماری بہت بدنامی کروائی زمانے میں۔ جگ ہنسائی ہوئی مہمانوں کے سامنے، پھر بھی میں نے بات کو بڑھنے نہ دیا کہ مجھے ارم کا خیال آجاتا تھا۔ خالو نے کوئی بات نہ کی، پھر خالہ نے گھر جاکر خالو کو ہمارے خلاف بھڑکا دیا اور اسی دن بھائی ندیم جو کہ خالہ کے داماد ہیں، وہ بھی آئے ہوئے تھے ہمارے گھر۔ میں نے موقع دیکھ کر ندیم سے ساری بات کی اور کہا میرا یہ کام کرواؤ۔ انہوں نے کہا کہ میں ضرور حل نکالوں گا، تم پریشان نہ ہو۔ وہ کہنے لگا ایک بار ارم خود مجھے کہہ دے تو میں نے ارم کو بتایا کہ ندیم بھائی سے بات ہوئی ہے میری، آپ اس کو دل کی بات بتاؤ تاکہ کچھ تو مسئلہ حل ہوجائے۔ ارم الٹا مجھ پر بھڑک اٹھی کہ اس کو کیوں بتایا وہ گھر بتادے گا کہ میں آپ سے بات کرتی ہوں، پھر ابو مجھے باتیں کریں گے۔ میں نے کہا ارم اب بھی کسی کو کچھ نہیں بولو گی اور مجھے بھی نہیں بولنے دو گی تو یہ مسئلہ کس طرح حل ہوگا، مگر اس کے دل میں کیا تھا، میں نہیں جان سکا۔ شادی سے فارغ ہوئے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ میرا ویزا بھی لگ گیا اور میں نے سوچا ماریہ کی شادی اگر میرے سامنے ہوجائے تو ٹھیک ہے، کیوں کہ اس کا قصور وار میں تھا تاکہ لوگ باتیں کرنی ختم کردیں۔ جس دن میری بہن کی شادی تھی اس سے اگلے ہفتے میری فلائٹ تھی دبئی کے لیے۔ شادی کی تیاری پہلے سے کرلی تھی اور بہت دھوم دھام سے ہم نے شادی کی، ساری ذمے داری میرے اوپر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے عزت رکھ لی اور ارم بھی بہت پریشان تھی، کیوں کہ میں نے اس سے بہت دور ہوجانا تھا۔ ارم کا فون آیا کہ مل کر جانا۔ میں نے کہا اس دفعہ بہت مشکل ہے، شادی بھی قریب ہے اور بھی کام ہیں اور میں نے جانا بھی ہے مگر وہ بہت رونے لگ گئی اور کہتی تھی کہ میں کبھی معاف نہیں کروں گی، پھر میں ارم سے ملنے گیا اور بہت ساری چیزیں اس کے لیے خریدیں، کپڑے، جوتے، پرفیومز، کریم، موبائل، انگوٹھی، چوڑیاں، چین اور بہت کچھ بہت محنت سے وہیں گفٹ پیک تیار کیا اور خوشاب کے لیے روانہ ہوگیا۔ میں بھی کبھی ارم کو روتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں میرا تن من دھن سب کچھ ارم کے لیے تھا، مگر وہ میرا استعمال کررہی تھی۔ صرف خوشاب سے ہم جوہرآباد آئے اور کھانے کے لیے ہوٹل میں چلے گئے۔ کھانا کھانے کے لیے آج ارم سے دور ہونے کا احساس پیدا ہوا تھا میرے دل میں۔ میں نے ارم کو وہ سارے گفٹ دیے اور کہا گھر جاکر کھولنا۔ اب پھر جانے کب ملاقات ہو یا نہ ہو۔ ارم ایک دم رونے لگ گئی اور میرے سینے سے لگ کر خوب روئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ آنسو میری جدائی میں نہیں بہارہی یہ تو ڈراما کررہی ہے۔ خیر میں شام کو واپس آگیا اور اگلے دن رات آٹھ بجے میری فلائٹ تھی۔ اسلام آباد سے ابوظہبی میرے ساتھ میرا ماموں خالہ بھی تھا۔ جیسے ہی ابوظہبی ایئرپورٹ پر اترے گرم ہوا، گرم موسم، اجنبی ملک، اجنبی لوگ، بہت ہی عجیب محسوس ہورہا تھا۔ خیر میرے لیے کوئی مشکل نہیں تھا، کیوں کہ میں نے اس عمر میں پردیس کے بہت دھکے کھائے تھے۔ ایئرپورٹ پر کمپنی کا ڈرائیور آیا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کمپنی کے نام کا بورڈ تھا۔ بہت دیر نہیں لگی ڈھونڈنے میں، وہ کھڑا تھا، میں نے دیکھا اس کے قریب گیا۔ سلام دعا کے بعد اس کے ساتھ چل پڑے۔ ہم ٹوٹل 5 لڑکے تھے، گاڑی میں سوار ہوگئے۔ کسی سے کوئی بات نہیں کررہا تھا سب خاموش تھے اور میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ دو سال کیسے گزریں گے۔ کام کیسا ہوگا، جیسا بھی ہوا کرنا پڑے گا، کیوں کہ دل میں جنون اور محبت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ڈرائیور نے گاڑی ایک بہت بڑے گیٹ کے سامنے کھڑی کردی اور بولا اپنا سامان لے لو اور چلو۔ جیسے ہی پہلا قدم اندر رکھا، میں نے جائزہ لگالیا کہ اگر یہ رہائش ہے تو پھر کام بھی ایسا ہی ہوگا۔ ہر طرف گندگی، بدبو۔ نام بہت ہے کمپنی کا مگر صرف نام ہے کام نہیں۔ کام تو گدھوں سے زیادہ لیتے ہیں۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور کان میں کھسر پھسر کرنے لگا۔ نطور کے ساتھ جیسے لائٹ جلائی تو اُف اللہ اتنی گندگی۔ یہ بُو، مٹی جیسے برسوں سے کوئی اس کمرے میں نہ آیا ہو۔ اس نے ایک پتلا سا کمبل، گدا اور تکیہ دیا اور کہا سوجاؤ، صبح ترتیب کرلینا کمرے کی، سب لڑکے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

لگے سوالیہ نظروں سے۔ خاموشی توڑتے ہوئے میں بولا۔ دوستوں ابھی جو جگہ ملے وہیں سو جاؤ، صبح کو ترتیب کریں گے۔ سب لڑکے سونے کے لیے اپنی جگہ صاف کرنے لگے اور بہت جلد ہی نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا اور جب آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بجے تھے، باہر نکلے اور آسمان کی طرف دیکھا۔ دھوپ نہیں تھی بلکہ بارش ہوئی تھی رات کو۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی، ہم نے اردگرد کا جائزہ لیا پھر کمرے میں آئے اور سوچا کہ پہلے صفائی کریں۔ مل کر سب نے کمرے کی صفائی کی، ہر چیز کو ترتیب سے رکھا اور پھر اب کیا کرنا ہے۔ ایک لڑکا بولا۔ میں نے کہا جس جس کے پاس یہاں کی کرنسی ہے وہ پچاس درہم دو اور جس کے پاس نہیں ہے وہ پاکستانی روپے بدلی کروائے۔ لڑکے کو بلایا اور اسے بازار جانے کو کہا تو وہ کہنے لگا۔ ابھی تو میرے روم میں آؤ کھانا کھالو، پھر ایک آدمی میرے ساتھ چلے تو بازار ہو آئیں گے۔ ہم نے کھانا کھایا تھوڑی اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، پھر ہم مل کر بازار چلے گئے۔ سم لی، کچھ راشن لیا کھانے پکانے کا، واپسی لوٹے تو شام ہو چکی تھی۔ سب سے پہلے میں نے ارم کو فون کیا کہ جان ہم خیر خیریت سے ہیں اور پریشان نہ ہونا۔ نمبر لکھ لو یہ میرا نمبر ہے، جب یاد آئے بس کال دے دینا۔ وقت گزرتا رہا، ایک ماہ ہو گیا اور میں نے ارم کے پاس ڈھائی سو درہم بھیجے اور کہا کہ کچھ لے لینا اپنے لیے۔ اگر ضرورت پڑے تو بتا دینا۔ یہاں آئے ہوئے 4 ماہ گزر چکے تھے اور ارم بہت بدل چکی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا وہ ایسے کرے گی میرے ساتھ۔ میں نے ارم کو فون کیا جب موقع ملتا 12 بجے کھانے کا وقت 1 گھنٹہ آرام کے لیے ملتا ہے۔ میں نے کھانا نہیں کھایا فون نکالا اور فون کرنے لگ گیا، مگر ارم نے میرا فون نہیں اٹھایا۔ مسلسل ایک گھنٹہ فون کرتا رہا، کوئی ہزار دفعہ میں نے فون کیا ہوگا، مگر ارم نے میرا فون نہیں اٹھایا۔ میں کھانا کھائے بغیر کام پر چلا گیا اور دل بہت پریشان تھا۔ اس لیے جب تک ارم سے بات نہ ہوتی سکون نہ ملتا۔ تین بجے پھر فون کیا۔ آگے سے نمبر مصروف تھا، پھر سوچا کہ کیا اس نے میرا فون نہیں دیکھا۔ کیا میری کالیں اسے نظر نہیں آئیں۔ وہ مس کال کر کے تو پوچھ سکتی تھی کہ کیا بات ہے مگر نہیں، پھر میں نے جان بوجھ کر فون نہیں کیا۔ رات کو جب دیکھا کہ وہ تو نہیں کرے گی فون، مجھے خود ہی کرنا پڑے گا۔ اس بار اس نے فون ریسیو کر لیا اور کہنے لگی، میں کال اس لیے نہیں کر سکی کہ بیلنس نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ جب پاکستان تھا تب بھی تمہیں کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی اور یہاں آ کر بھی نہیں ہونے دوں گا۔ میں صبح بیلنس ڈلوا دوں گا پر جان اس طرح دور نہ ہوا کرو میری جان نکل جاتی ہے۔ میں صبح کی بجائے رات کو ہی بازار گیا اور پاکستانی پانچ سو روپے کا بیلنس ارم کو کروایا اور کہا کہ مل جائے تو بتا دینا تا کہ معلوم ہو جائے کہ مل گیا ہے۔ بیلنس کروا کر تین گھنٹے انتظار کرتا رہا مگر ارم نے واپس فون تک نہیں کیا۔ آخر تنگ آ کر خود فون کیا مگر نمبر مصروف۔ میں نے غصے میں آ کر موبائل توڑ دیا اور کہا کہ اب نہیں کرتا اس بے وفا کو فون، مگر کہاں رہنا ہوتا تھا، وہ تو جان تھی میری۔ اس کی ہر بات برداشت کرتا گیا۔ کچھ دن بعد پھر موبائل لے لیا۔ پانچ دن بعد صبح پانچ بجے ارم کا فون آیا اور سلام دعا کے بعد کہنے لگی۔ جان مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا بھیج دوں گا۔ تھوڑی سی بات کی اور نمبر بند کر دیا۔ میں آج بہت خوش تھا کہ چلو ارم کو میری یاد تو آئی، میں شام کو واپس آیا اور سیدھا بازار چلا گیا اور ارم کو تین سو درہم بھیجے اور کہا کہ جو ضرورت ہے استعمال کر لینا۔ دن بہ دن اس کا رویہ بدلی ہوتا گیا۔ جب جب فون کرتا کبھی کہتی باجی پاس ہیں کبھی بھائی، کبھی کچھ کبھی کچھ۔ ایک دن ارم کی بہت یاد آ رہی تھی کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ آسمان پر بادل جگمگا رہے تھے۔ دل آج بہت اداس تھا۔ میں نے ارم کو فون کیا مگر ارم نے میرا فون نہ اٹھایا۔ کوئی 3 گھنٹے گزر گئے مگر اس بے وفا کو میرا خیال نہ آیا۔ ساری رات میری روتے گزر گئی اور صبح طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ کام پر نہ جا سکا۔ آنکھ کھلی تو پھر فون کرنے لگا۔ صبح 7 بجے کا ٹائم تھا مگر ارم کا نمبر مصروف، میں تو پاگل ہونے لگ گیا تھا کہ ارم کو کیا ہو گیا ہے۔ میرے ساتھ ایسے کیوں کر رہی ہے۔ آخر کیا کمی ہے میرے پیار میں جو ایسے کر رہی ہے۔ جب بھی فون کرتا یا تو وہ کاٹ دیتی!

کہہ دیتی کہ باجی پاس ہیں اور فون بند کر دیتی، پھر میں فون کرتا تو نمبر مصروف، وقت گزرتا گیا۔ ارم دن بہ دن پہلے سے زیادہ بدل گئی۔ میں اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک دن صبح 6 بجے میں نے ارم کو فون کیا۔ ارم نے میرا فون اٹھایا اور کہنے لگی کہ تم صرف اپنے بارے میں سوچتے ہو، میری تمہیں کوئی پروا نہیں اور اگر فون نہیں اٹھا سکتی تو بار بار کرنے کا مطلب کیا ہوا۔ غصے میں آ کر فون بند کر دیا۔ میرا دماغ خراب ہو گیا تھا کہ میں اتنی وفا کر رہا ہوں اس کے ساتھ اور یہ میری وفا کا کیا صلہ دے رہی ہے۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میں اس بے وفا کے بغیر جینا چاہتا تھا۔ ڈیوٹی شروع ہو چکی تھی اور دن کے آٹھ بجے میں نے بجلی کی تار لگانے کے بہانے تار کو پکڑ لیا اور اس قدر شدید جھٹکا لگا کہ دور جا گرا اور میرا سر دیوار میں لگا اور پھر اس کے بعد کوئی ہوش نہیں کہاں ہوں، کہاں نہیں۔ دن کے بارہ بجے ہوش آیا۔ میرے ماموں میرے پاس کھڑے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ یہ سب کیوں ہوا، مگر وہ بول نہیں سکتے تھے۔ ماموں نے کہا۔ میں اسے فون کرتا ہوں اور پوچھتا ہوں اسے کیا تکلیف ہے، میں نے کہا کہ نہیں آپ اسے کچھ نہیں کہو گے، میں خود منا لوں گا۔ میں نے ارم کو میسج کیا کہ میرے ساتھ یہ واقعہ ہوا ہے مگر ارم نے گوارا نہ کیا حال تک پوچھنا۔ میں اکیلا پڑا روتا رہا کہ میں مر کیوں نہیں گیا۔ میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا، میں جتنا مرضی اس سے ناراض ہوتا مگر وہ ایک بار پیار سے بات کرتی میں سب کچھ بھول جاتا۔ میں نے ارم کو میسج کیا مگر ارم نے کوئی جواب نہ دیا۔ آج 5 دن ہو گئے تھے اس بے وفا نے حال تک نہ پوچھا۔ آخر پھر میں نے ارم کو فون کیا اور پہلے میسج کیا کہ میرا فون اٹھاؤ ضروری کام ہے، ورنہ کبھی میری آواز نہیں سن پاؤ گی، پھر میں نے فون کیا اور اس نے پہلی دفعہ ہی اٹھا لیا وہ آج بہت پیار سے بات کر رہی تھی جیسے کوئی مسئلہ ہو اور وہ حل کروانا چاہتی ہو۔ خیر میں بھی جو غصہ میں تھا وہ سب بھول گیا اور آرام سے بات کی۔ آخر میں اس سے اتنا کہا میرا قصور کیا ہے؟ کیوں مجھے پل میں زندگی اور پل میں موت کے حوالے کر دیتی ہو۔ میں نے پیار کیا ہے کوئی جرم تو نہیں، کیوں سزا دیتی ہو۔ ارم نے کہا کہ آخری دفعہ معاف کر دو آج کے بعد کبھی ایسے نہیں کروں گی۔ میں سارے غم بھول گیا، پھر جیسے خوشیاں لوٹ آئی ہوں۔ آج بہت دنوں بعد گھر فون کیا اور بہت پیار سے بات کی، ورنہ کسی سے دل نہیں کرتا تھا بات کرنے کو، مگر یہ خوشی زیادہ دن کے لیے نہیں تھی۔ ایک دن وہ کہنے لگی کہ ابو، بھائی ندیم اور باجی طاہرہ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ اگر آپ اسے وہاں بلا لو تو ابو کی پریشانی ختم ہو جائے گی اور پھر آپ کے لیے ان کے دل میں اور جگہ بن جائے گی اور میں تو ارم کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اگلے دن ہی میں نے ندیم کو فون کیا کہ پاسپورٹ بنواؤ اور جلدی سے کاپی مجھے بھجواؤ۔ آخرکار میری کوششوں سے ندیم کا ویزا بھی لگ گیا۔ ارم اسی طرح مختلف بہانوں سے مجھ سے پیسے منگواتی رہی اور میں بھی اس کی محبت میں دیوانہ وار اس کی خواہشات پوری کرتا رہا۔ ایک روز میں نے ارم کو فون کیا تو اس نے مجھے ایسی خبر سنائی کہ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ کہنے لگی کہ امی کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں تم سے بات کرتی ہوں اور انہوں نے نہایت سختی سے تمہارے ساتھ بات کرنے کو منع کر دیا ہے، ورنہ وہ مجھے آگے پڑھنے نہیں دیں گی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔ خالہ کیا چاہتی ہیں اور تم کیا چاہتی ہو؟ وہ کہنے لگی کہ جو میرے گھر والوں کا فیصلہ ہوگا وہی میرا فیصلہ ہے اور ویسے بھی تم میرے معیار کے نہیں ہو۔

ارم نے حد کر دی تھی۔ پل بھر میں پرایا کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ میرا کیا ہوگا۔ میری اتنی قربانیوں، اتنی محبتوں کا صلہ اس نے اس صورت میں دیا تھا، مگر شاید احساس نام کا جذبہ اس میں تھا ہی نہیں۔

کاش اس کے گھر والے ایک بار میرے متعلق بھی سوچتے، میں کوئی غیر نہیں ان کا اپنا ہی خون تھا۔ مجھے دنیا والوں کی نظروں میں تماشا بنا دیا گیا، لیکن میرا انصاف کرنے والا میرا رب موجود ہے۔ میں نے ارم سے کوئی حساب کتاب نہیں لینا، یہ کام میں نے اوپر والے پر چھوڑ دیا ہے۔

☆......☆

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پردیس سے دوسری کہانی

رئیسہ خالد

سرحد پار سے ایک ایسی سچائی جو جیتے جی درگور کردے

شام ہو چکی تھی اور اندھیرا تھا کہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ سامنے ایک ایسی عمارت کھڑی تھی، جہاں لاوارث بچے پرورش پارہے تھے۔ وہ شام ہونے تک باہر کھیلتے اور شور مچاتے رہتے تھے۔ اگرچہ وہاں بہت سی عورتیں بچوں کی دیکھ بھال کے لیے موجود تھیں اور ایک خاتون مس شیلا یہاں کی انچارج تھیں۔ یہاں بچوں کی دیکھ بھال بہتر طریقے سے کی جاتی تھی اور ان کو تعلیم بھی دی جاتی تھی، بلکہ کئی بچے تو بی اے تک تعلیم بھی حاصل کر چکے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہیں اسی آشرم کے کسی اسکول میں پڑھانا پڑتا تھا۔ اگر کوئی بچہ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تو اسے اس کی اجازت نہیں ملتی تھی اور پھر اسے آشرم سے نکل جانا پڑتا اور پھر اسے وہاں سے کوئی امداد نہیں ملتی تھی۔

موہن بھی ایسا ہی ایک بچہ تھا جو آگے پڑھنے کا خواہش مند تھا، لیکن آشرم سے اسے اجازت نہیں مل رہی تھی، لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل ضرور کرے گا، چاہے اسے آشرم چھوڑنا ہی کیوں نہ پڑے، آشرم والے جہاں اسے پڑھانے کے لیے بھیج رہے تھے، وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور وہاں مزید تعلیم کا حصول بھی بہت مشکل تھا۔

اس آشرم میں یوں تو بہت سے بچے تھے، لیکن مینا کو وہ بچپن سے ہی بہت پسند کرتا تھا، کیوں کہ وہ بچپن سے ہی بہت سلجھی ہوئی بچی تھی، بلکہ دونوں ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ آشرم چھوڑنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ مینا سے بھی کبھی نہیں مل سکتا تھا، لیکن اب اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، وہ آشرم چھوڑ دے گا، لیکن گاؤں میں پڑھانے کے لیے نہیں جائے گا۔

آشرم سے ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اسے مسٹر سنہا مل گئے۔ وہ شام کے وقت ٹہلنے کے بعد اپنے گھر واپس جارہے تھے۔ ان کی کوٹھی آشرم کے قریب ہی تھی۔ وہ آشرم کی بہت مدد کرتے تھے اور موہن کو بھی اچھی طرح پہچانتے تھے۔ مسٹر سنہا نے اس سے پوچھا کہ بی اے کے بعد اب تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

وہ شہر کے بہت بڑے آدمی تھے۔ ان کی عمر بھی پچاس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ جب وہ لندن پڑھنے کے لیے گئے تھے تو انہیں وہاں ایک لڑکی سے محبت ہوگئی تھی اور ان دونوں نے شادی کرلی تھی، لیکن ان کے والدین پرانے خیالات کے کٹر ہندو تھے۔ اس لیے انہیں ان کا اس طرح شادی کرنا پسند نہ آیا۔ یوں گھر والوں سے ان کا اختلاف بڑا شدید رہا۔ جب وہ بیرسٹری کرکے واپس آئے تو ان کی بیگم بھی ساتھ ہی آئیں، لیکن ان کے والدین ان کی بیوی کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے انہیں الگ گھر لے کر رہنا پڑا۔ ان کے گھر والے انہیں ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ اس عورت کو واپس اس کے گھر بھیج دو، لیکن مسٹر سنہا اس پر بالکل تیار نہ تھے۔ انہوں نے اسی آشرم کے قریب اپنی کوٹھی بنوائی تھی، کیوں کہ وہ علاقہ صاف ستھرا اور وسیع تھا۔

☆......☆

اُن کی بیگم زیادہ دن زندہ نہیں رہیں۔ لندن سے آنے کے چار سال کے بعد ہی بچے کی پیدائش کے سلسلے میں کچھ ایسی پیچیدگی ہوگئی کہ بچے کے ساتھ ہی مسٹر سنہا کو بیگم کی موت کا بھی صدمہ برداشت کرنا پڑا، لیکن انہوں نے پھر دوسری شادی نہیں کی۔ دوستوں اور رشتے داروں نے بہت سمجھایا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ ان کی بیگم اپنے ساتھ ایک لڑکی کو لے کر آئی تھیں، کہنے کو تو وہ ان کی آیا تھی، مگر وہ اس سے بیٹیوں کی طرح بہت پیار کرتی تھیں۔

بیوی کے مرنے کے بعد مسٹر سنہا نے اس کی شادی کردی تھی، لیکن وہ لڑکا صحیح نہیں نکلا۔ مسٹر سنہا نے اسے اپنے گھر کے سرونٹ کوارٹر میں رہنے کے لیے جگہ بھی دی تھی، مگر وہ اسے بہت مارتا پیٹتا تھا اور ایک دن موقع ملتے ہی وہ ظالم مسٹر سنہا کے گھر سے چوری کرکے بھاگ گیا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ اس بچی کا نام مارگریٹ تھا۔ مسٹر سنہا اس کا بیٹیوں ہی کی طرح بہت خیال رکھتے تھے۔ اب وہ ان کے ساتھ ہی ان کے بنگلے پر سرونٹ کوارٹر میں رہتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس کا خیال رکھنے سے ان کی بیوی کی روح خوش ہوگی، پھر یہ

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ ان کی ہی غلطی کی وجہ سے اس کی زندگی خراب ہوگئی تھی، اس کی دیکھ بھال ان کی ہی ذمے داری ہے اور وہی اب اس کا ذریعہ وسہارا بھی تھے۔ مس شیلا جب اس ادارے میں آئی تھیں تو ان کی عمر بیس یا پچیس سال ہوگی۔ اگرچہ وہ ایک دولت مند خاندان کی اولاد تھیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھیں، مگر ایک حادثے نے ان کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ یونیورسٹی میں ان کا ایک ساتھی تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور وہ شادی بھی کرنا چاہتے تھے، لیکن اچانک ایک حادثے میں وہ شخص مرگیا تو پھر انہوں نے کسی اور کے ساتھ شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا اور سماجی خدمت کا جذبہ لیے اس آشرم میں آگئیں۔

☆......☆

ایک رات جب وہ سوئیں تو انہیں ایک بچے کے رونے کی آواز آئی جوان کے دروازے کے باہر پڑا ہوا تھا۔ وہاں کے سارے بچے اسی انداز سے ملے تھے اور کچھ بچے اِدھر اُدھر سے بھی لائے گئے تھے۔ بچہ بہت چھوٹا تھا کہ وہ بول نہیں سکتا تھا، لیکن انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی، کیوں کہ وہ تھوڑا بہت چل پھر سکتا تھا۔ وہ بچہ بھی اسی آشرم میں پلنے لگا۔ یہ تو پتا نہیں چل سکا کہ اسے کون چھوڑ گیا تھا۔ اس بچے کا نام موہن رکھ دیا گیا۔ اس کا اصل نام کیا تھا، یہ کسی کو بھی پتا نہ تھا۔ اس کا نام تھا بھی یا نہیں۔ اسی طرح یہاں اکثر بے نام کے نئے نئے بچے آتے رہتے تھے۔ انہوں نے لاوارث بچوں کو پالنا ہی اپنا فیشن بنالیا تھا۔

مسٹر سنہا اس ادارے کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔ اکثر وہ مس شیلا سے مسکراتے ہوئے پوچھتے کہ ''اب تمہارے کتنے بچے ہیں'' تو وہ ہنس کر جواب دیتیں کہ اب ان کی تعداد پچاس سے اوپر ہوگئی ہے اور یہ کہ میں ان میں سے کسی کی ماں نہیں ہوں، مگر میرے بہت سے بچے ہیں، جنہیں میں اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی ہوں۔'' اسی طرح کئی سال گزر گئے اور بچے آشرم میں آتے رہے۔

ایک رات اچانک مس شیلا کی آنکھ کھلی تو ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی دروازے کے باہر چل رہا ہے، جب انہوں نے جاکر دیکھا تو تولیے میں ایک بچہ لپٹا ہوا پڑا تھا۔ انہوں نے اس بچے کو اٹھالیا۔ انہیں پتا تھا کہ کسی ماں نے اپنا گناہ چھپانے کے لیے بچے کو یہاں چھوڑ دیا ہے، لیکن ایک بات ان کے دماغ میں ضرور آئی کہ کسی ماں نے ان پر بھروسا کیا ہے، اس لیے ان کے دروازے پر چھوڑ گئی ہے۔ اب انہیں ہی اس کی پرورش کرنا ہے۔ انہوں نے اس بچی کا نام مینا رکھ دیا۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ اتنی بات ضرور سمجھ میں آتی تھی کہ موہن اور یہ بچی کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں گورے اور خوب صورت تھے۔

☆......☆

شروع شروع میں دونوں بچے ایک ہی عمارت میں رہتے تھے، لیکن جیسے جیسے بچوں کی تعداد بڑھتی گئی، لڑکے اور لڑکیوں کو الگ عمارت میں رکھا جانے لگا۔ مینا بھی اب میٹرک پاس کرکے آشرم کے کسی اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور یہ طے کرچکے تھے کہ وہ آپس میں ہی بیاہ کریں گے، اس میں قائدے اور قانون کی کوئی رکاوٹ بھی نہ تھی۔

موہن آشرم سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک سڑک پر ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا ہے، لیکن اس کا آخری فیصلہ یہی تھا کہ اسے آگے پڑھنا ہے، لیکن ابھی اس کے دماغ میں یہ بات صاف نہیں تھی کہ وہ کہاں جائے۔ اچانک اسے مسٹر سنہا آتے نظر آئے۔'' روزانہ ٹہلنے کے بعد اسی وقت گھر کی طرف جاتے تھے۔ موہن نے انہیں دیکھتے ہی پرنام کیا تو مسٹر سنہا رک گئے اور انہوں نے موہن سے پوچھا۔

''صبح صبح کہاں جارہے ہو۔'' اس نے سچ بتانا ہی بہتر سمجھا۔ مسٹر سنہا نے کہا۔

''پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تم اپنا سامان لے کر میرے پاس آجاؤ...... تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

موہن کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ مسٹر سنہا ضرورت مند کی مدد کرتے ہیں اور وہ بھی ضرورت مند ہے، اس لیے مسٹر سنہا اس کو سہارا دینا

چاہتے ہیں۔ وہ اس موقع کو غنیمت جان کر اسی دن ان کے گھر آگیا۔ انہوں نے ایک کمرے میں اس کا سامان سیٹ کرادیا جہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اب تک کوئی بھی چیز اس کی اپنی نہیں تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اتنا آرام تو اسے زندگی میں کبھی ملا ہی نہ تھا۔ اسے مینا یاد آگئی، پھر وہ سوچتا کہ وہ تو ابھی تک مصیبت میں ہے اور نہ جانے کب تک اس کو اسی حال میں رہنا ہوگا۔

اچانک مسٹر سنہا اس کے کمرے میں آگئے۔ وہ انہیں اس طرح یوں آتا دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ انہوں نے اپنی جیب سے نکال کر نوٹوں کی گڈی اسے تھماتے ہوئے کہا۔

''کھانا کھانے کے بعد تم بازار جاکر اپنے لیے کپڑے اور ضرورت کی چیزیں خرید لو۔'' وہ مارے حیرت کے ان کا شکریہ بھی ادا نہ کرپایا تھا کہ وہ کمرے سے نکل گئے۔

اتنے سارے روپے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟ بھگوان اس طرح اس پر کتنا مہربان کیوں ہوگیا ہے؟ کسی کو پناہ دینا اور بات ہے، لیکن وہ اس کے اوپر اتنے مہرباں کیوں ہوگئے؟ وہ تو ان کا شکریہ بھی ادا نہ کرسکا۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر خوشی کے آنسو بھر آئے۔

کسی کو پناہ دینا اور بات ہے، اس موقع پر اگر اس کا اپنا باپ بھی ہوتا تو شاید اسے اتنی آسانیاں نصیب نہ ہوتیں۔ اس نے اپنے ایک دوست سے اس کا تذکرہ کیا تو اس نے کہا کہ ''تو واقعی خوش نصیب ہے۔'' موہن اس کی بات پر ہنس پڑا اور کہا۔

''یار اتنا خوش نصیب ہوں کہ والدین نے پھنکوا دیا اور دنیا میں اپنا کوئی بھی نہیں، اگر مس شیلا نہ ہوتیں تو آج میں نہ جانے کہاں بھٹک رہا ہوتا۔ انہوں نے ہی مجھے ماں کا پیار دیا ہے، لیکن پھر بھی ایسا تو کوئی بھی نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں۔''

☆......☆

موہن جب بازار سے سامان لے کر واپس آیا تو مسٹر سنہا اس وقت گھر پر ہی تھے۔ دھرموان کا نوکر اسے دیکھ کر مسکرایا اور کہا۔

''صاحب چائے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

مسٹر سنہا اسے دیکھ کر مسکرائے اور پوچھا۔

''کیا تم نے اپنی ضرورت کی چیزیں لے لی ہیں، تمہیں کچھ اور پیسوں کی ضرورت تو نہیں ہے۔'' ابھی یہ لوگ چائے پی ہی رہے تھے کہ مس شیلا آگئیں، مسٹر سنہا بھی ہنستے ہوئے بولے۔

''مس شیلا آپ کا کوئی بچہ نہیں ہے، لیکن آپ بہت سے بچوں کی ماں ہیں۔ میرا بھی کوئی بچہ نہیں، لیکن میں بھی کچھ بچوں کا باپ بننا چاہتا ہوں۔'' مس شیلا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''مگر آپ بہت سے بچوں کی پرورش کر رہے ہیں۔ آپ کی وجہ سے ہی ہمارا آشرم اتنی کامیابی سے چل رہا ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ موہن اب آپ کی پناہ میں آگیا ہے۔ یہ آگے پڑھنا چاہتا ہے، لیکن آشرم اس کی اجازت نہیں دے رہا ہے۔'' مسٹر سنہا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب یہ جتنا چاہے پڑھ سکتا ہے، میں اسے آگے پڑھاؤں گا۔'' موہن کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا اور اس کا دل چاہا کہ اِن دونوں سے لپٹ جائے۔ یہ سن کر اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے تھے جو کہ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا اور ماں باپ نے بھی اسے چھوڑ دیا تھا، لیکن مس شیلا کی شکل میں اسے ایسی ماں ملی تھی، جس نے اسے پالا پوسا اور ماں کا پیار دیا تھا۔ اب مسٹر سنہا کی شکل میں اسے باپ بھی مل گیا تھا، جنہوں نے اس کی زندگی بنانے اور سنوارنے کی ذمے داری لے لی تھی۔ وہ دونوں بھی بہت خوش تھے۔ مسٹر سنہا نے موہن سے پوچھا۔

''تمہیں کب داخلہ لینا ہے، تم ایم اے کرلو اور لا بھی کرلو۔'' مسٹر سنہا نے سمجھاتے ہوئے کہا تو موہن نے جواب میں کہا۔ ''جیسی آپ کی مرضی اور رائے ہو، لیکن ایم اے کرنے کے لیے مجھے دوسرے شہر جانا ہوگا، کیوں کہ سنا ہے کہ آشرم والے مجھ سے بہت ناراض ہیں۔''

مسٹر سنہا نے کہا ''رانچی میں ابھی یونیورسٹی نہیں ہے، اس لیے بہتر ہوگا کہ تم کلکتہ چلے جاؤ۔''

ایک دن وہ مس شیلا سے باتیں کرتے ہوئے بولے ''دراصل ہمارے سماج کا ڈھانچہ بہت فرسودہ

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ لوگ اپنی غلطی سے ایک بچے کو دنیا میں لاتے ہیں اور پھر اسے کچرے میں پھینک دیتے ہیں یا خوامخواہ قتل کر دیتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قتل کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اگر وہ دنیا میں آ گیا ہے تو اسے پالنا چاہیے، ممکن ہے کہ وہ بچہ ملک کا کوئی بڑا انسان بن جاتا اور اگر بڑا نہ بھی بنتا تو عام شہری میں کوئی اچھا انسان بن جاتا۔ اگر وہ بھی نہ ہوتا تو کم سے کم اسے پیدا ہونے کے بعد زندہ رہنے کا حق تو تھا، انسان کے بنیادی مسئلے، دو ہی تو ہیں، بھوک اور شہوت۔ انسان نے اب تک جتنی جدوجہد کی ہے، اس کے پیچھے یہی دو جبلتیں کام کرتی رہی ہیں۔'' وہ کہہ رہے تھے۔

''جولیا کی موت کے بعد میں بڑی تنہائی محسوس کرتا ہوں۔ بڑی اُداس زندگی گزار رہا ہوں۔ میری بھی کچھ ذمے داریاں ہیں جو صرف میں جانتا ہوں۔ اگر ان کو پورا نہیں کروں گا تو خود اپنی نظروں میں مجرم بنا رہوں گا۔'' پھر وہ موہن سے مخاطب ہو کر بولے۔

''موہن تم کب تک جانا چاہتے ہو پڑھنے کے لیے؟ تم جلدی چلے جاؤ اور داخلہ لے لو، تمہیں ایک اچھا اور بہت بڑا آدمی بننا ہے۔''

☆......☆

مینا اب موہن کو بہت یاد آنے لگی تھی۔ اب وہ اکثر یہ سوچتا کہ میری طرح مینا کو بھی مسٹر سنہا جیسا پیار کرنے والا بندہ مل جائے، پوری طرح اس کی بھی زندگی سنور جائے گی۔

ایک دن شام کی چائے کے وقت مسٹر سنہا نے عجیب سا سوال کیا مینا کے بارے میں۔ ''وہ لڑکی کیا کرتی ہے جو مس شیلا کو اپنے دروازے کے پاس سے ملی تھی۔''

موہن یہ سن کر چونک پڑا۔

مِس شیلا کو اپنے دروازے پر دو بچے ملے تھے، ایک تو وہ خود تھا اور دوسری مینا تھی، باقی بچے اِدھر اُدھر سے لائے گئے تھے، پھر وہ بولے۔ ''وہ بڑی پیاری سی بچی تھی، کیا نام تھا اس کا۔''

''مینا۔'' موہن نے جواب دیا۔ ''وہ اب بچوں کے اسکول میں پڑھاتی ہے۔ میٹرک کے بعد اس نے ٹریننگ کر لی تھی، موہن نے انہیں بتایا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے زیادہ نہیں پڑھا۔'' مسٹر سنہا نے کہا۔

''یہ فیصلہ آشرم کرتا ہے اور لڑکیوں کو تو وہ زیادہ نہیں پڑھاتے۔'' موہن نے جواب دیا۔ موہن کو ایسا لگا کہ مسٹر سنہا مینا کو پسند کرتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے آشرم کی اور بچیوں کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا، حالاں کہ مس شیلا نے تو آشرم کی اور بھی بہت سی بچیوں کو پالا اور پرورش کی تھی۔

مسٹر سنہا موہن پر ایسے ہی مہربان تھے جیسے باپ اپنے بچوں پر ہوتا ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں کتنے ہوتے ہیں، اس کے دل میں ان کی عظمت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس کے خیال میں وہ اور لوگوں سے بہت مختلف تھے۔

مسٹر سنہا کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے، موہن کو ان کے واپس آنے کا انتظار تھا، واپسی کے بعد فوراً ہی انہوں نے موہن کو ہائر اسٹڈی کے لیے دوسرے شہر بھجوا دیا۔ موہن کے جانے سے پہلے مس شیلا ان سے ملنے آئیں اور بہت دیر تک مسٹر سنہا سے باتیں کرتی رہیں۔ مس شیلا نے آج ان کے چہرے پر بڑی اُداسی دیکھی تھی، اتنی مدت میں کبھی انہوں نے ان کا چہرہ اتنا بدلا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

اچانک انہوں نے مس شیلا کی طرف دیکھا اور کہا ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مینا میرے ساتھ رہے، میں اس کو اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گا اور اسے خوب پڑھاؤں گا۔'' مس شیلا نے کہا۔

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، مگر آشرم کو ہو سکتا ہے اور پھر اس کا فیصلہ مینا ہی کرے گی۔'' مسٹر سنہا اداس اور غمگین آواز میں بولے۔

''میرا اپنا تو کوئی بچہ نہیں۔ بچوں سے مجھے ہمیشہ ہی بہت پیار رہا ہے، اب بڑھاپے میں، میں بہت تنہائی محسوس کرتا ہوں، جی چاہتا ہے کہ وہ اب میرے پاس ہی رہے۔'' یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ کچھ دیر ماحول پُر سکوت رہا پھر وہ بڑی گہری آواز میں بولے۔

''مس شیلا تم جانتی ہو کہ مجھے جولیا سے کتنی محبت تھی۔ اس کے مرنے کے بعد میں دوسری شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، لیکن اب مجھے تنہائی کسی گناہ کی سزا معلوم ہوتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اب میں کسی کے لیے کچھ کروں اور وہ میرے لیے کچھ کرے۔ موہن بچپن سے مجھے بہت پیارا لگتا تھا۔ جب آشرم نے اسے نکال دیا تو میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اب میں اسے خوب پڑھاؤں گا اور بڑا آدمی بناؤں گا۔ مینا بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہے، میں اب اسے اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔''

موہن نے جب یہ سنا کہ مینا بھی اسی گھر میں رہے گی تو اس کے خوشی کی انتہا نہ رہی، اسے لگا کہ بھگوان نے اس کی سن لی ہے۔

مس شیلا نے ان کی کیفیت دیکھ کر کہا۔ ''میں کوشش کروں گی کہ میں آشرم والوں کو منا لوں اور مینا آپ کے پاس آ جائے۔''

☆......☆

موہن مینا کو بہت پسند کرتا تھا اور وہ دونوں یہ طے کر چکے تھے کہ حالات ٹھیک ہوتے ہی آپس میں شادی کر لیں گے، اس میں قاعدے اور قانون کی کوئی رکاوٹ بھی نہ تھی۔ موہن کی زندگی بدل چکی تھی، جتنی تکلیفیں اس نے اٹھائی تھیں، اب اتنا ہی آرام کی زندگی اسے مل گئی تھی۔ پہلے وہ معمولی سے کمرے میں کئی لڑکوں کے ساتھ رہتا تھا، لیکن اسے اب صاف ستھری عمارت میں ایک الگ کمرہ ملا ہوا تھا، جہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اچھا کھانا کھانے کو ملتا اور ضرورت کے وقت خرچ کرنے کے لیے کھلا پیسا بھی تھا۔

مسٹر سنہا بھی بڑے عجیب انسان تھے۔ مینا جب ان کے گھر آ گئی تو انہوں نے اسے بھی روپے دیے، تا کہ وہ بھی اپنی ضرورت کا سب سامان خرید لے۔ موہن ہوسٹل جا چکا تھا، لیکن خط و کتابت کے ذریعے وہ ایک دوسرے سے رابطے میں تھے۔

مسٹر سنہا مینا کو بھی آگے پڑھانا چاہتے تھے اور اسے کالج میں داخلہ دلوا دیا تھا، جو رانچی کا سب سے اچھا کالج تھا۔ مینا ان کے ساتھ ہی رہ رہی تھی۔ وہ دونوں ساتھ ہی ناشتا کرتے اور ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ دونوں بہت خوش تھے۔ ان کی خوشی سے موہن بہت خوش تھا کہ مینا کی زندگی بھی کانٹوں سے نکل کر پھولوں کی وادی میں آ گئی تھی...... اب وہ اکثر یہ سوچتا کہ ''ہم دونوں کو ایک ہونے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔''

☆......☆

ایک دن جب وہ یونیورسٹی سے واپس آیا تو اسے ٹیلی گرام ملا کہ ''مسٹر سنہا اچانک بیمار ہو گئے ہیں، تم فوراً واپس آ ؤ۔'' اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ وہ اسی دن وہاں سے روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچنے پر پتا چلا کہ وہ اسپتال میں داخل ہیں۔ موہن فوراً سامان وغیرہ گھر پر چھوڑ کر اسپتال گیا۔ مینا بھی وہیں موجود تھی۔ وارڈ میں ڈاکٹر ان کا چیک اپ کر رہے تھے۔ اس وقت ان کی حالت کافی بہتر لگ رہی تھی۔

ڈاکٹر ان سے کہہ رہا تھا کہ ''آپ بالکل ٹھیک ہیں اور اپنے گھر جا سکتے ہیں، لیکن آپ کو آرام کرنا ہوگا، کم از

عبدالرحمٰن ابنِ خلدون

دنیا کے تمام مورخین میں عبدالرحمٰن ابنِ خلدون کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس کی لکھی ہوئی دنیا کی تاریخ ''کتاب العبر'' اور اس کے مقدمہ کو اپنے موضوع پر سند کا درجہ حاصل ہے۔ یہ ''مقدمہ ابنِ خلدون'' کے نام سے دنیا میں معروف ہے۔ یہ خیالات کی گہرائی، وضاحتِ بیان اور وسعتِ رائے کے لحاظ سے اپنے زمانے کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ ابنِ خلدون نے اپنے اس مقدمے کی تحریر 1377ء میں مکمل کی تھی۔

www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کم ایک مہینا۔" وہ اسی دن گھر آ گئے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائے لیکن بولے کچھ نہیں۔

دھرموان کا پرانا نوکر تھا۔ اس نے موہن کو بتایا کہ مارگریٹ جوان کی بیگم کی آیا تھی، دس دن پہلے مرگئی۔ اسی دن سے صاحب اُداس سے رہنے لگے ہیں۔ کورٹ بھی نہیں گئے، کھانا بھی کم ہوگیا، رات کے وقت دیر تک جاگتے رہتے ہیں، اس لیے کمزوری بھی بڑھ گئی ہے۔ ایک رات بہت دیر تک جاگ کر کچھ لکھتے رہے، پھر دوسرے روز سے ہی طبیعت خراب ہوگئی۔ مینا گھر پر ہی تھی، اس نے ان کی بڑی خدمت کی۔"

گھر آنے کے بعد موہن اور مینا دونوں ہر وقت ان کے ساتھ رہتے اور ان کی خدمت میں لگے رہتے۔

☆......☆

مسٹر سنہا کو ان کی صحت یابی پر سب سے پہلے مبارک باد دینے کے لیے مس شیلا آئیں اور بہت دیر تک یہ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے، پھر جیسے ہی وہ جانے لگیں تو مسٹر سنہا بولے۔

"مس شیلا آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ آج رات کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں۔"

موہن کو یقین ہوگیا کہ وہ اس کے اور مینا کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں، شاید وہ ہم دونوں کی شادی کے بارے میں مس شیلا سے بھی مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ رات میں جب مس شیلا کھانے پر آئیں تو مسٹر سنہا بڑے خوش نظر آ رہے تھے اور بات بات پر ہنس رہے تھے۔ دونوں بچے ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ پہلے تو مسٹر سنہا نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی اور تو اس کمرے میں نہیں ہے، جب انہیں اطمینان ہوگیا تو پھر وہ بولے۔

"مس شیلا میں نے خاص طور پر تمہیں اس لیے تکلیف دی ہے کہ تم نے ان بچوں کو پالا ہے اور تم نے انہیں ماں کی طرح محبت دی ہے۔ اس لیے ان دونوں بچوں پر تمہارا بہت زیادہ حق ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ بچے تمہیں اپنی ماں سے کم نہیں سمجھتے، اس لیے ان کے بارے میں ہر بات جاننے کا تم کو حق ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر چپ رہے، کچھ سوچتے رہے، پھر بولے۔ "میں نے اپنی ساری جائیداد ان دونوں کے نام لکھ دی ہے۔ اب کوئی قانونی رکاوٹ بھی نہیں ہے، میرے بعد میری ساری جائیداد کے یہی دونوں مالک ہیں۔ ان کے علاوہ میرا کوئی بھی نہیں ہے۔"

موہن اور مینا سر جھکائے بیٹھے خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے۔ کچھ دیر بعد مسٹر سنہا نے پھر بولنا شروع کیا۔ "کئی بار۔ تم نے مجھے یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔" موہن اور مینا نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔ دونوں کے چہرے لال ہو رہے تھے اور دونوں کو یقین ہوگیا کہ اب وہ کہیں گے کہ ان دونوں کی شادی ہو جانا چاہیے، لیکن مسٹر سنہا نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔

"مگر موہن اور مینا کی شادی نہیں ہوسکتی، کیوں کہ یہ دونوں سچ مچ میرے ہی بچے ہیں، یعنی میرے اور مارگریٹ کے بچے ہیں۔"

مس شیلا کرسی سے اچھل پڑیں۔ موہن اور مینا کی گردنیں جھک گئیں، مسٹر سنہا نے کہا کہ "مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں ان دونوں کو ساتھ رکھتا۔ میں محض ان دونوں کے لیے ہی آشرم کے بچوں کی مدد کرتا رہا ہوں کہ یہ دونوں اچھی طرح اور آرام سے رہیں۔ مس شیلا میں تمہارا خاص طور پر شکر گزار ہوں، مجھے یقین تھا کہ تم انہیں اچھی طرح پال لوگی اور تم نے وہی کیا۔ میں نے ہی دونوں بچوں کو تمہارے کمرے کے باہر رکھوایا تھا اور تم نے ان کا خاص طرح سے خیال بھی کیا۔ میرے نوکر دھرمو کے سوا اس راز کو کوئی نہیں جانتا۔ اسی نے دونوں بچوں کو تمہارے دروازے کے پاس رکھا تھا۔ اب تو مارگریٹ بھی زندہ نہیں، اس بات کو کہنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ حقیقت کو نہ جاننے کی وجہ سے کہیں یہ دونوں آپس میں شادی نہ کرلیں۔"

یہ کہہ کر مسٹر سنہا جب چپ ہوگئے تو مس شیلا اور بھی سناٹے میں آگئیں۔ مینا اور موہن حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

☆......☆

کارِ جہاں دراز ہے

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے مجرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت سامان دل سوز تحریریں جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

کملی

صائمہ نفیس

کراچی سے ایک معصوم دوشیزہ کے مجرم بننے کی دلخراش داستان

میں زنانہ جیل کی نگراں ہوں۔ اپنی ملازمت کے اٹھارہ سالوں میں، میں نے بنتِ حوا پر اَن گنت ظلم دیکھے۔ میں نے حوا کی بیٹی کو اُس کے ناکردہ گناہ کی پاداش میں سسکتے اور دم توڑتے دیکھا۔ دُکھ کی انتہا تو یہ

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

ہے کہ وہ جرم جو اُس نے نہ کیے مگر اُس کی سزا کاٹنے کے بعد اُس کی سیاہی میں اُس کے سارے وجود کو ڈبو کر مجسم سیاہی بنا دیا گیا۔

میرے پاس بے شمار معصوم ملزمان کی داستانیں ہیں۔ مجھے خود سمجھ نہیں آتا کہ میں کس کی کہانی آپ کو سناؤں اور کس کی پردہ پوشی کروں۔

میں آپ کو زاہدہ کی کہانی سناؤں کہ جس کے شوہر نے شراب کے نشے میں گاڑی چلاتے ہوئے ایک راہگیر کو روند ڈالا، مگر زاہدہ نے الزام اپنے سر لے کر محبت کی انتہا کر ڈالی، جس کے بدلے آج وہ عمر قید کی سزا کاٹ رہی ہے اور جیل سے باہر اُس کا مجرم شوہر دوسری شادی کر کے اُسے طلاق دے چکا ہے۔

زاہدہ کی طلاق کی رجسٹری میں نے خود وصول کی، مگر میری ہمت نہ ہوئی کہ اُسے اُس کے شوہر کی طرف سے محبت کے صلے میں یہ بتا سکوں۔ وہ آج بھی اِس انتظار میں ہے کہ سزا مکمل ہونے کے بعد وہ چین سے اپنی باقی ماندہ زندگی بسر کرے گی۔ اُس کا شوہر اس کی پوجا کرے گا۔

شبانہ کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ بے چاری محبت میں اندھی ہو کر ایک کم ظرف پر اعتماد کر بیٹھی۔ ایئرپورٹ پر وہ اُس وقت گرفتار ہوئی جب اُس کے بیوٹی بکس سے نشہ آور اشیاء برآمد ہوئیں، مگر جب اُس نے اِس اُفتاد سے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اِس اندھیرے غار میں دھکیل کر اُس کا محبوب اُسے کہیں نظر نہ آیا۔ اب محبت اُس کا جرم اور اعتبار اُس کی سزا ثابت ہوئی۔

شبانہ اُس شخص کی بدولت جیل میں تھی جو اُس کے جنم کا باعث بنا، مگر رشوت، دھوکے بازی اور جعلسازی کی بدولت اکٹھی کی ہوئی دولت شبانہ کے نام نکلی، چنانچہ شبانہ رشتے کی پاسداری کی سزا کاٹ رہی ہے۔

ایسی ہی بے شمار کہانیاں ہیں، ایسے ہی بے شمار کردار ہیں جو بے گناہ ہیں۔ مہذب معاشرے کا قانون ہے کہ عورت کو پھانسی کی سزا نہیں دی جائے گی، مگر اِس معاشرے میں جہاں مرنا آسان ہے جدوجہد اور مشکل تو زندہ رہنے کے لیے ہے، کیوں یہ معاشرہ عورت کے احساسات، اُس کے جذبات، اُس کے محسوسات کا استحصال کرنے والوں کو سزا نہیں دیتا۔ سزا دینا تو بہت دور کبھی کوئی مجرم ہی سامنے نہ آیا، کیوں رودالی، کاری اور ستی ہمیشہ عورت ہی ٹھہری۔

زاہدہ جیل میں روز جیتی اور روز مرتی ہے۔ وہ اس دن کیسا محسوس کرے گی جب اسے پتا چلے گا کہ اس کا شوہر اسے طلاق دے چکا ہے۔ جیل سے نکلنے کے بعد وہ کہاں جائے گی۔ یہ معاشرہ، یہ دنیا کیا اسے جینے دیں گے۔ ایک ایک پل میں وہ ہزار ہزار بار مرے گی۔ کیا اس سے بہتر نہ ہوتا کہ اسے پھانسی ہی ہو جاتی؟

شہلا کا کیا ہوگا؟ جب جیل کے دروازے اس پر بند ہو جائیں گے۔ ایسا کون سا دروازہ ہوگا جو اس کے لیے وا ہوگا۔ اس کے محبوب جیسے چہرے اسے ہر جگہ نظر آئیں گے۔ ایسے مسخ شدہ چہروں والی دنیا میں کیسے جی پائے گی۔ کیا اس وقت وہ موت کو ترجیح نہ دے گی؟

شبانہ کا انجام بھی سوچ لیں، سزا کاٹ کر بھی یہ معاشرہ اس کا ناکردہ گناہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔ قانون کے بعد معاشرے کی سزا شروع ہو جائے گی۔ وہ اپنی طرف بڑھنے والے کس کس ہاتھ کو روکے گی۔ کہیں پھر کوئی کوٹھا نہ بن جائے اور نہ جی سکے نہ مر سکے۔ ضمیر اسے جینے نہ دے اور بے ضمیری اسے مرنے نہ دے۔ کیا ایسی زندگی سے پھانسی بہتر نہ ہوتی؟

ایسا ہی سوال لے کر کملی میرے پاس آئی۔

کملی ایک نئی قیدی عورت ہے۔ کورٹ نے اسے عمر قید کی سزا سنائی ہے۔ پنجاب کے ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والی کملی پر الزام ہے کہ اس نے ایک دس سالہ بچی ''رانی'' کو گاؤں کے کنویں میں دھکا دیا، جس سے اس بچی کی موت واقع ہو گئی۔ اس وقت یہ بچی اپنی گڑیا سے کھیل رہی تھی۔ یہ بچی کملی کے ساتھ کافی مانوس تھی۔

کتنا بھیانک جرم تھا کہ ایک دس سالہ بچی کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ یقیناً قابلِ نفرت ہے کملی اور قابلِ نفرت ہے اِس کا یہ فعل، اُسے یقیناً پھانسی ہی ہونی چاہیے مگر کملی پاگل ہے اور ایک عورت بھی، شاید اِسی لیے اُسے عمر قید کی سزا سنائی گئی۔

مگر نجانے کیوں مجھے کملی پر رحم آتا، کیوں کہ کملی عام پاگلوں جیسی حرکتیں نہ کرتی۔ جیل کے اسپتال نے بھی اسے بے ضرر قرار دیا، اسی لیے وہ پاگل خانے سے اس جیل میں منتقل ہوئی ہے۔ جیل میں جمع کرائے گئے اس کے شناخت نامے پر اس کا نام کملی ہی درج ہے اور باپ کے نام کی جگہ بنتِ حوا لکھا ہے۔

کملی سے کبھی کوئی ملاقات نہیں آئی۔ وہ صبح سے شام تک خاموش رہتی۔ وہ اکثر اپنی انگلیوں پر گنتی کرتی میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ کیا گنتی ہے۔ اپنی زندگی کی خوشیوں کا حساب کرتی ہے یا اپنے دُکھوں کو اندراج کرتی ہے۔

کملی اپنے باپ کے جرم کی پاداش میں پنچایت کے فیصلے کی بھینٹ چڑھائی گئی۔ اس کے باپ کا جرم تھا قتل اور قصاص کی شکل تھی کملی! ازل سے عورت کا استعمال ہوتا آ رہا ہے۔ قدیم یونان میں تو عورت کو بیچنے کے لیے منڈیاں لگا کرتی تھیں۔ وہاں عورتیں ویسے ہی بکتی تھیں جیسے مویشی بازار میں مویشی بکتے ہیں، پھر اگر آج ان لوگوں نے اپنی سزا کے عوض اپنی بیٹی دے دی تو کیا عجب ہوا۔ عورت تو مجسم قربانی ہے۔ وہ ازل سے قربان ہوتی آ رہی ہے۔ کبھی ماں بن کر، کبھی بیوی بن کر اور آج بیٹی بن کر کملی قربان ہوئی۔

مشرق سے نکلنے والے سورج نے دیکھا کہ ایک بے حد روشن صبح، گاؤں کے تمام اونچے شملے والے جمع ہوئے اور ایک بچی کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے تاریکی لکھ دی۔ اس چھ سالہ بچی کا نکاح نواسی سالہ بوڑھے سے کر دیا گیا۔ ایسا کر کے گویا انہوں نے قاسو (کملی کے باپ) پر ایک احسان عظیم کیا تھا کہ تمہاری بیٹی کو ہم اپنی عزت بنا کر لے جا رہے ہیں۔ یہ بے جوڑ شادی چوں کہ ایک جرم کے بعد عمل پذیر ہوئی ہے۔ اس لیے اسے رشتے داری بڑھانے کے لیے نہیں، بلکہ اپنی بیٹی سے ہمیشہ کے لیے رشتوں کا اختتام سمجھا جائے۔

اب اس چھ سالہ بچی سے اس گاؤں والوں کا، اس کے ماں باپ کا اور اس کے بھائی کا کوئی رشتہ نہ ہوگا۔

قاسو نے اپنی بیوی رشیدہ کو یہ کہہ کر تسلی دے دی کہ ہمیں آج نہیں تو کل اس کا بیاہ کرنا ہی تھا، ہم سمجھ لیں گے کہ ہم نے اس کا بیاہ دور دیس کر دیا ہے، مگر رشیدہ تو ماں تھی، وہ سمجھ سکتی تھی کہ جوانی میں دور دیس بیاہ کر دینا اور چھ سالہ بچی کا نواسی سالہ بوڑھے مرد کے ساتھ بیاہ کر دینا کتنی الگ الگ باتیں ہیں، مگر وہ مرد کے اس معاشرے میں مردوں کے بنائے ہوئے قوانین میں اپنی بیٹی کے لیے کہاں لچک تلاش کرتی ہے، بے چاری عورت تھی وہ بھی گاؤں کی ان پڑھ اور جاہل اور ایک مرد پر انحصار کرنے والی!

رشیدہ صرف غلط کو غلط محسوس تو کر سکتی تھی، مگر اس کا اظہار اسے بھی باغی قرار دے کر سزا کا مستحق بنا دیتا۔ بے چاری دل میں کڑھنے کے سوا کچھ نہ کر سکی اور روتے روتے اپنی بچی کو ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا۔

نئے گاؤں میں اس بچی کا سواگت بہت عجب انداز سے ہوا۔ کسی نے بھی خوشی کا اظہار نہ کیا بلکہ اس نے کئی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے، مگر بڑے زمیندار کی گردن کچھ اور اکڑ گئی تھی۔ اس بچی کو حویلی کی اوپری منزل میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک بوڑھا آدمی قبر میں پاؤں لٹکائے فرشتۂ اجل کے انتظار میں تھا۔ اب یہ بچی سارا دن کمرے کے دروازے پر بیٹھی رہتی۔ کمرے سے آتی مسلسل کھانسی کی آواز اُسے کسی دوسرے وجود کے وہاں ہونے کا احساس دلاتی۔ نوکر آ کر کھانا رکھ جاتے جسے وہ کبھی کھا لیتی اور کبھی چھوڑ دیتی، نیند آنے پر وہاں ہی سو جاتی۔ جب اماں ابا یاد آتے تو یہ روتی پھر روتے روتے تھک جاتی اور خود ہی خاموش ہو جاتی، وہ کچھ بھی نہ کہہ سکتی تھی۔ حویلی میں اُسے نیچے آنے کی اجازت نہ تھی، اوپری منزل کی جالیوں سے حویلی کے صحن میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھتی تو اس کا بھی دل چاہتا کہ وہ ان بچوں میں شامل ہو جائے اور ایسے ہی کھیلے، مگر اُسے نیچے آنے کی اجازت نہ تھی۔ کوئی اس کا پرسانِ حال نہ تھا۔

ایک صبح وہ جب سو کر اُٹھی تو کمرے سے کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ نہ کھانسی کی اور نہ ہی ہائے ہائے کرنے کی، ہر طرف ایک عجیب خاموشی کا راج تھا۔

جب وہ اس خاموشی سے اُکتا گئی تو خود ہی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس بوڑھے شخص کے بستر کے پاس گئی۔ آج دادو بہت ہی گہری نیند سو رہے تھے، وہ انہیں

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

غور سے دیکھنے لگی۔ دادو کے آدھ کھلے منہ سے کوئی آواز نہ نکل رہی تھی بلکہ مکھیاں اُس کے چہرے پر بھنبھنا رہی تھیں، مگر دادو بے حس وحرکت لیٹے ہوئے تھے۔ اُن کی ٹانگیں عجب انداز سے بستر پر پھیلی ہوئی تھیں اور دونوں بازو سیدھے تھے۔ ان کی ایڑیاں سفید ہو رہی تھیں۔ اسے عجب سی وحشت ہونے لگی، بے اختیار اس نے دادو کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ دادو! دادو مگر دادو کی نیند نہ ٹوٹی۔ وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آئی اور ملازمہ کا انتظار کرنے لگی۔

حویلی کی پرانی ملازمہ جب ناشتا لے کر اوپر آئی تو وہ بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ ملازمہ بھی ایک عورت تھی، اسے اس بے بس بچی پر بہت ترس آتا تھا، مگر اُس کا یہ ترس اس کے لیے کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اُس نے ملازمہ کو بتایا کہ آج دادو ٹھیک ہو گئے ہیں، انہیں تمام رات کھانسی بھی نہیں آئی، ان کے خراٹوں کی آواز بھی نہیں آ رہی، مگر وہ بہت گہری نیند سو رہے ہیں۔ ملازمہ کا ماتھا ٹھنکا، اس نے اسے اپنے سے علیحدہ کیا اور دادو کے کمرے کی طرف بڑھی پھر وہ جان گئی کہ اب دادو یہ دنیا چھوڑ چکے ہیں۔

ملازمہ نے اسے بتایا کہ دادو مر گئے ہیں، مگر تمہارے لیے تو یہ اچھا ہوا ہے تم اب آزاد ہو۔ یہ تمہاری خوشی کا دن ہے، تمہاری آزادی کا!

حویلی میں آناً فاناً دادو کی موت کی خبر پھیل گئی۔ دادو کی بہویں، بیٹیاں اور دوسرے رشتے دار آخری رسوم کی تیاریاں کرنے لگے۔

جب تمام حویلی سوگوار تھی، ہر ایک کی آنکھ میں آنسو تھے۔ گاؤں کی دوسری عورتیں بھی جمع تھیں، اسے ملازمہ کے الفاظ یاد آئے کہ تم آج آزاد ہو، تم خوش ہو جاؤ، یہ تمہاری خوشی کا دن ہے۔ یہ سوچ کر میت کے قریب دوسری تمام عورتوں کے بیچ میں بیٹھی وہ مسکرانے لگی۔ تمام گاؤں کی عورتیں اسے غور سے دیکھنے لگیں اور ایک دوسرے کی طرف سوال بھری نظروں سے دیکھنے لگیں کہ دادو کی بڑی بہو نے اسے ڈانٹا۔

ارے کیا تو جھلی ہو گئی ہے۔ کوئی ایسے ہنستا ہے میت کے پاس تو تو کملی ہے۔

کملی!

پھر تو ہر کوئی اسے جھلی سمجھ کر کملی ہی کہنے لگا۔

دادو کو دفنا کر آنے کے بعد سب لوگ کھانا کھانے لگے اور پھر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ اس سے کسی نے کچھ بھی نہ پوچھا کہ وہ کس حال میں ہے بلکہ یوں کہیں کہ کسی کو اس کا خیال ہی نہ آیا، شام ہو گئی! اور پھر رات اسے آج اپنے کمرے میں جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ اسے جب کچھ نہ سوجھا تو اس نے اچانک زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اس کے رونے کی آوازیں سن کر سب لوگ اس کے اردگرد جمع ہو گئے اور انہیں احساس ہوا کہ اب اس کا کیا کریں۔

حویلی کی عورتیں کہنے لگیں، یہ سچ مچ کملی ہے۔ جب سب لوگ رو رہے تھے تو یہ ہنس رہی تھی، اب سب لوگ خاموش ہیں اور یہ رو رہی ہے، ہے ناں کملی!

پھر گھر کی پرانی ملازمہ نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اسے اس کے کمرے میں نہیں بلکہ جانوروں کے طویلے میں سلا دیا۔ وہ اپنے کمرے کی نسبت یہاں خوش تھی کہ یہاں کم از کم جانوروں کی آوازیں تو تھیں۔

وہ جانوروں کے بھوسے پر سو گئی۔ اسے آج بہت پرسکون نیند آئی۔ صبح سویرے وہ اُٹھ بیٹھی پھر وہ طویلے سے نکل کر گاؤں کی گلیوں میں گھومنے لگی۔ رات وہ جانوروں کے طویلے میں سوتی تھی۔ وہاں بستر تو تھا نہیں، وہ جانوروں کے چارے اور بھوسے کے ڈھیر پر سوتی تھی۔ بھوسے کے تنکے جو رات اس کا بستر تھے، اب اس کے بالوں اور میلے لباس میں اٹکے ہوئے تھے۔

وہ اسی حالت میں گاؤں کی گلیوں میں گھوم رہی تھی کہ کنویں پر پانی بھرنے والی عورتیں اسے دیکھ کر ڈر گئیں، پھر پہچان کر بولیں۔ یہ بے چاری تو کملی ہو گئی ہے۔

اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ لوگ اسے کملی کیوں کہہ رہے ہیں۔ اماں ابا نے تو اس کا نام نوراں رکھا تھا۔ شاید گاؤں بدلنے سے نام بھی بدل جاتا ہے۔ کل دادو کی میت پر بھی ان کی بڑی بہو مجھے کملی ہی کہہ رہی تھی، یہ ضرور میرا نیا نام ہے۔ نوراں یہ سوچتے سوچتے آگے بڑھ گئی۔

اس کی نظریں اماں ابا کو تلاش کر رہی تھیں، مگر وہ کہیں نظر نہ آ رہے تھے۔

وہ گلیوں میں چلتی جا رہی تھی کہ اچانک اسے بچوں کو شور سنائی دیا وہ اس کی طرف آ رہے تھے اور اسے کملی کملی بھی کہہ رہے تھے۔ کچھ لمحے پہلے وہ اماں ابا کو یاد کر کے رو رہی تھی اب بچوں کو دیکھ کر خوشی سے ہنسنے لگی۔ وہ بچوں کی جانب مڑی کہ میں ان کے ساتھ کھیلوں، مگر بچے ڈر گئے۔

بکھرے بالوں والی لڑکی جو ننگے پاؤں تھی، جس کا لباس میلا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کے بالوں اور لباس میں بھوسے کے تنکے اٹکے ہوئے تھے جو آنسو بہاتی آنکھوں کے ساتھ ہنس رہی تھی۔ یہ سب کچھ اُسے سچ مچ کملی بنا دینے کے لیے کافی تھا۔ اب بچے نوراں کے آگے آگے بھاگ رہے تھے اور کملی کملی چیخ بھی رہے تھے، پھر تو نوراں بھول گئی کہ وہ کون ہے، کیا ہے۔

اسے تو بس اتنا یاد رہا کہ اسے ہر کوئی کملی ہی پکارتا ہے۔ بچے بھی اس سے ڈرتے ہیں اور گاؤں کی عورتیں اس پر ترس کھاتی ہیں۔ گاؤں کی عورتوں کو یہی ترس اسے پیٹ بھرنے کو بچی ہوئی روٹی اور تن ڈھانپنے کو پرانے کپڑے بھی دے دیتا۔

کملی کے ماہ وسال ایسے ہی گزرتے گئے۔ کملی گاؤں کی ان گلیوں میں ایسے ہی اپنے اپنے اماں ابا کو تلاش کرتے کرتے بڑی ہو گئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ جہاں اس کے خدوخال بدلے، وہاں اس کی آنکھوں کا خوف بھی بڑھ گیا۔ وہ اب بھی جانوروں کے طویلے میں سوتی، مگر پہلے وہ بھوسے کے اوپر سوتی تھی، مگر اب وہ سوتے ہوئے بھوسا اپنے اوپر اوڑھ لیتی۔

اب اسے انسانوں سے خوف آتا، مگر جانوروں کا یہ طویلہ اسے پناہ دیتا۔

خوف ہمیشہ اسی سے آتا ہے جس سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کملی کو بھی نظروں کی ہمدردیاں خوف زدہ کرتیں۔ اس خوف سے بچنے کے لیے وہ پاگل پن کی چادر اپنے اوپر تان لیتی۔ بچپن میں جب وہ بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے مڑتی تھی تو بچے خوف سے بھاگنے لگتے اور رونے لگتے ایک دو تو اس پر پتھر بھی اچھال دیتے۔

اب کملی ایسا ہی کرتی!

جب کوئی ہمدرد اس سے کھیلنے کے لیے مڑتا تو وہ بھی بھاگنے لگتی، چیخنے اور رونے لگتی اور کبھی کبھی تو وہ پتھر بھی مار دیتی۔ آہستہ آہستہ سب ہارنے لگے، مگر کسی نے بھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ کملی نے کبھی کسی بچے کو یا کسی عورت کو پتھر کیوں مارا۔

کیا کملی سچ مچ پاگل تھی یا یہ پاگل پن اس کی پناہ گاہ تھی۔

پھر ایک دن کملی نے دیکھا کہ گاؤں میں پنچایت بیٹھی ہے۔ وہ آج ایک اہم فیصلہ کرنے والے ہیں مقدمہ کیا تھا، قصوروار کون تھا، کسے انصاف چاہیے تھا۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی، مگر جب کرمو ہاتھ جوڑے ایک ایک سے رحم کی اپیل کرنے لگا اور کہتا جاتا کہ رحم کرو، رحم کرو۔ میری ایک ہی بیٹی ہے اور وہ ابھی بہت چھوٹی ہے، اس کی ماں مر جائے گی لیکن کسی گردن کا خم کم نہ ہو رہا تھا۔

ایسے میں کملی بڑے میدان سے گاؤں کے کچے مکانوں کی طرف لپکی۔ اس نے دیکھا کرمو کی بیٹی رانی کنویں کے قریب بیٹھی اپنی گڑیا سے کھیل رہی ہے، کرمو کی بیوی نذیراں کنویں سے پانی بھر رہی ہے کہ اچانک کملی نے رانی کو اُٹھایا اور کنویں میں پھینک دیا۔ یہ سب دیکھ کر نذیراں کے اوسان خطا ہو گئے، جب تک اُس کے اوسان بحال ہوتے، اُس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی، رانی مر چکی تھی۔ ایک ہفتے میں ایک ہی گاؤں میں دو دو خون گاؤں والوں کو چھپانے مشکل ہو گئے اور پولیس کا عمل دخل شروع ہو گیا۔

کملی کا جرم ثابت ہو چکا تھا، چناں چہ کملی کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ کملی نے ایسا کیوں کیا؟ کملی کی زندگی یقیناً اتنی تلخ، اتنی تکلیف دہ، اتنی زخم خوردہ رہی ہو گی کہ اس نے سوچا ہو گا کہ ہر روز لحہ لحہ مرنے سے بہتر ہے کہ رانی کو ایک ساتھ ہی مار دیا جائے اور پھر اس نے ایسا ہی کیا، میں چاہوں گی کہ ہم سب مل کر سوچیں کہ کیا کملی نے صحیح کیا یا غلط، اگر صحیح کیا تو کب تک عورت کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہے گا، اگر غلط تو ہوش مندوں میں کب کب کملی جنم لے گی؟ لیکن یہاں ایک سانحہ اور بھی ہوا کہ کل تک جو کملی پاگل پن کی چادر اوڑھے رہتی تھی، آج وہ سچ مچ پاگل ہے۔

☆......☆

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

سرگودھا سے ایک یادگار، اسٹیشن کہانی

کہا جاتا ہے کہ سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے، جبکہ زندگی بہ ذات خود ایک سفر ہے اور زندگی کے اس سفر میں انسان کئی طرح کے سفر کرتا ہے۔ آج کل سفر کے لیے بہت سے ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں، جن میں کاریں، بسیں، ویگنیں، ایئر کنڈیشنڈ کوچز، ریل گاڑی اور ہوائی جہاز وغیرہ شامل ہیں، مگر ٹرین کے سفر کا اپنا ہی مزا ہے اور اس میں ایک طرح کی انفرادیت بھی ہے۔ لمبے سفر کے لیے ٹرین ایک بہترین اور کم خرچ سواری ہے۔

ٹرین پر سفر کرنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر جا کر پہلے ٹکٹ لینا پڑتا ہے، پھر پلیٹ فارم پر جا کر ٹرین کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ پلیٹ فارم، جہاں پر گاڑی آ کر رُکتی ہے اور یہیں سے چلتی بھی ہے۔ مسافر پلیٹ فارم پر اترتے ہیں اور سوار بھی ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں بے شمار سفر کیے ہیں، مگر آج تک میں پلیٹ فارم، ٹرین، بھاپ اڑاتی چائے، پکوڑے اور پیسٹریوں سے جڑی یادیں فراموش نہیں کر سکا۔

سرگودھا شہر، جی ہاں "شاہینوں کا شہر" سرگودھا، ہلالِ استقلال کا اعزاز حاصل کرنے والے شہر سرگودھا کا ریلوے اسٹیشن شہر کے عین وسط میں واقع ہے، جس کی ایک جانب فاطمہ جناح روڈ، دوسری جانب ریلوے روڈ، پھر اوور ہیڈ برج، ریلوے پھاٹک اور ساتھ ہی ٹرسٹ پلازہ ہے۔ فاطمہ جناح روڈ پر بھی اوور ہیڈ برج، ریلوے پھاٹک ہے اور یہ سڑک سیدھی لاری اڈہ جاتی ہے۔ سرگودھا کا ریلوے اسٹیشن ایک کشادہ وسیع ریلوے جنکشن ہے، جس کے چار پلیٹ فارم ہیں۔ ملک کے طول وعرض سے ریل گاڑیاں یہاں آتی ہیں اور گزرتی ہیں، اسی ریلوے اسٹیشن اور پلیٹ فارم سے مجوی اپنی یادوں کی کہانی سنانے سے پہلے میں اپنا تعارف کروا دوں۔

میرا نام سعید عرف سُنی ہے۔ بیس سال کی عمر میں ایف۔ ایس۔ سی کے بعد ٹیکنیکل ڈپلوما پاس کرنے کے فوراً بعد مجھے گورنمنٹ کے ایک ایسے محکمے میں ملازمت مل گئی جس میں کروڑوں روپے کی مالیت کا سامان خریدا جاتا تھا اور وہ سامان عوام الناس کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس محکمے کے افسران اور ملازمین دونوں طرف سے خوب مال کماتے تھے۔ سامان کی خریداری میں بغیر کسی خوف کے گھپلا ہوتا تھا اور ملازمین وہاں سے خاصا کمیشن کماتے تھے، پھر لوگوں سے بھی خوب پیسے وصول کرتے تھے، کیوں کہ وہ سامان ان کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

چوں کہ میں نے شروع سے ہی اس سسٹم کا حصہ بننے سے انکار کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افسران اور دیگر ملازمین مجھ سے ناخوش رہتے تھے۔ میرے ساتھ سوتیلوں جیسا بدترین سلوک کیا جاتا اور مجھے مختلف حیلوں بہانوں سے تنگ کیا جاتا تھا۔ میری ڈیوٹی میری سیٹ اور عہدے سے ہٹ کر لگائی جاتی۔ دوسرے ملازمین کو ماہانہ ٹی۔ اے۔ ڈی اے بھی دیا جاتا تھا، مگر میں نے کبھی بوگس TA/DA بل نہیں بنایا، صرف اس وقت ہی بل بھرتا تھا، جب کبھی وہ ڈیوٹی سرانجام دیتا تھا۔ میرا ذریعۂ آمدنی صرف میری تنخواہ تھی، جو کہ اللہ کے فضل وکرم سے میں حلال کر کے وصول کرتا۔

تنگی تُرشی میں میرا وقت گزرتا رہا، لیکن میرے ساتھ والے ملازمین اپنے کالے کرتوتوں کے سبب کہاں سے کہاں جا پہنچے تھے۔ وہ کاروں میں گھومتے، کوٹھیوں میں رہتے، جبکہ میں نے اپنا دامن ہر حال میں ناجائز کمائی کی گندگی سے آلودہ ہونے سے بچائے رکھا تھا۔

پچیس سال کی عمر میں میری شادی ہوگئی تو بیوی بھی ایسی ملی جو ہر حال میں صبر وشکر کرنے والی، شریعت اور صوم و صلوٰة کی پابند تھی۔ کرائے کا چھوٹا سا ایک گھر تھا۔ میرے والدین وفات پا چکے تھے، صرف ایک بھائی، بھاوج، بھتیجا اور بھتیجی تھے۔ بھائی الگ مکان میں رہتا تھا اور ایک پرائیویٹ ملازمت کرتا تھا۔ میرے پاس سواری کے لیے ایک سائیکل تھی، جس پر میں دفتر آتا جاتا اور دیگر گھریلو کام اور بازار سے سودا سلف بھی اسی پر ہی لے کر آتا۔ مجھے اللہ پاک نے اولاد کی نعمت اور رحمت سے بھی نوازا تھا۔

وقت گزرتا رہا، اسی اثناء میں بھائی اور بھاوج ایک حادثے میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ یہ ہمارے لیے

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بہت بڑا صدمہ تھا۔ بھتیجا اور بھتیجی یتیم ہو گئے تو میں ان کو اپنے گھر لے آیا اور ان کے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ میری بیوی ان کو اپنی حقیقی اولاد کی طرح ماں کا پیار دیتی تھی۔ ہمارے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی، اس طرح اب چھ بچوں کی کفالت، تعلیم و تربیت اب ہمارے ذمے تھی۔ اُدھر دفتر میں میرے حالات دن بہ دن تنگ ہوتے جا رہے تھے، مگر میں نے صبر کا دامن ہر حال میں تھامے رکھا تھا۔ میری بیوی، جو کہ ایک صابر و شاکر، پرہیزگار اور نیک سیرت خاتون تھی، وہ ہر حالات میں میرے ساتھ ثابت قدم رہی اور بچوں کی پرورش بہترین انداز میں اسلامی طریقوں پر کرتی رہی۔ اس نے میرے بھتیجے اور بھتیجی کو سگی ماں کا پیار اور شفقت دی تھی، پھر اچانک میرا ٹرانسفر ایک دور افتادہ علاقے میں کر دیا گیا۔ اس شہر میں بس یا ویگن براہ راست نہیں جاتی تھی، وہاں صرف ٹرین ہی جاتی تھی، اس لیے میں نے ٹرین کے ذریعے گھر سے آفس اور واپسی کا روزانہ آنے جانے کا پروگرام بنایا اور ماہانہ کی بنیاد پر ریلوے پاس بنوالیا، جو کہ ٹکٹ کی نسبت بہت سستا پڑتا تھا، اس طرح میں نے روزانہ ٹرین کے ذریعے آنا جانا شروع کر دیا۔

صبح جو ٹرین سرگودھا آتی، ویسے تو اس کا ٹائم ساڑھے چھ بجے کا تھا، مگر وہ عموماً ایک گھنٹہ لیٹ آتی تھی، اس طرح ساڑھے سات بجے وہ آتی اور تقریباً نو بجے کے قریب مجھے اپنے ڈیوٹی والے شہر میں پہنچا دیتی۔ دفتر ٹائم نو بجے شروع ہوتا تھا اور ہمارا آفس ریلوے اسٹیشن کے بالکل ہی قریب تھا، اس لیے ٹائم کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ صبح مجھے ہر حال میں ساڑھے چھ بجے تک ریلوے اسٹیشن پہنچنا ہوتا تھا، کیوں کہ کئی دفعہ وہ ٹرین اپنے مقررہ وقت پر سرگودھا پہنچ بھی جاتی تھی، مگر اکثر مہینے میں بیس دن لیٹ آتی تھی، تو پلیٹ فارم پر اس کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ وہ ٹرین پلیٹ فارم نمبر 3 پر آ کر رکتی اور پانچ منٹ اسٹاپ کرتی اور پھر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتی۔

اسی پلیٹ فارم اور ٹرین پر میری ملاقات ایک اپنے ہم عمر شخص جس کا نام عابد حسین تھا، سے ہوئی تھی۔ وہ ایک خالصتاً دیہاتی، میٹرک پاس، انتہائی سلجھا ہوا، مہذب، ملنسار، بہت اچھے اخلاق والا پُر خلوص انسان تھا۔ وہ سرگودھا کے ساتھ ایک قریبی گاؤں کا رہنے والا تھا اور ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازم تھا۔ اس کی تھوڑی سی زمین بھی تھی، جس پر وہ کاشت کاری کرتا تھا۔ وہ اپنے ادارے کی بنی ہوئی مصنوعات کی فروخت کے سلسلے میں روزانہ اپنے سامان کے ساتھ سرگودھا سے اسی شہر میں جاتا جہاں میری ڈیوٹی تھی۔ سرگودھا کے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر 3 پر ہماری دوستی کی ابتدا ہوئی تھی۔ اسی پلیٹ فارم پر ایک چائے کا اسٹال ہے جس کا مالک بابا عمر دین تھا۔ اسٹال پر چائے کے علاوہ کیک اور پیسٹریاں بھی ملتی تھیں اور سردیوں میں ابلے ہوئے انڈے بھی دستیاب ہوتے تھے۔ اسی اسٹال کے سامنے ایک بینچ بھی ہے، جس پر میں اور عابد بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرتے اور ایک ایک کپ چائے کا پیتے اور کبھی کبھی کیک پیسٹری کھانے کی عیاشی بھی کرتے تھے۔ دن بہ دن میری اور عابد کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہم دونوں کی عادتیں، طبیعت اور مزاج قریباً ایک جیسا تھا۔ بابا عمر دین سے بھی ہماری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور وہ بھی ہماری طلب اور مزاج کے مطابق ہمارے لیے اسپیشل گرما گرم بھاپ اُڑاتی چائے بنا کر ہمیں پلاتا۔ اب اس کے ساتھ بھی ماہانہ کی بنیاد پر حساب کتاب ہوتا تھا اور وہ بھی ہمیں خصوصی رعایت سے نوازتا تھا۔ ایک مہینا چائے کا بل میں ادا کرتا اور ایک مہینا عابد بل پے کرتا تھا۔ میں اور عابد اپنے تمام مسائل اور گھریلو حالات پر بات چیت پلیٹ فارم نمبر تین کے بینچ پر بیٹھ کر کرتے تھے۔ عابد بھی شادی شدہ تھا۔ اس کو اللہ پاک نے ایک بیٹی اور دو بیٹوں کی رحمت اور نوازا تھا۔ رفتہ رفتہ ہماری دوستی دن بہ دن گہری ہوتی چلی گئی اور ہمارا آنا جانا ایک دوسرے کے گھروں میں بھی شروع ہو گیا تھا۔ مہینے میں دو مرتبہ وہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر ہمارے گھر آتا، اسی طرح ہم سب بھی عابد کے گاؤں میں مہینے میں دو بار جاتے اور چھٹی کا دن اس کے گاؤں میں ہی گزارتے۔ وہاں عابد کا کینو اور مالٹے کا ایک چھوٹا سا باغ بھی تھا۔ سب بچے مل کر مالٹوں کے باغ میں جاتے اور تازے مالٹے توڑ کر کھاتے، پھر اسی طرح کماد کے کھیت میں

جاتے اور گنے توڑ کر چوستے، وہیں ایک بیلنا تھا، جس میں گنے کا رس نکالا جاتا تھا اور پھر گڑ تیار ہوتا تھا۔ بچے تازہ گرم گرم گڑ کھاتے، الغرض بچوں کی بہت اچھی تفریح ہو جاتی تھی۔ عابد کے ماں باپ زندہ تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ بہت پیار کرتے اور اپنی اولاد کی ہی طرح سمجھتے تھے۔ میرے بچے ان کو دادا دادی کہتے تھے۔ عابد کی بیوی رابعہ جو کہ میری بہن بنی ہوئی تھی، اس لیے میرے بچے اس کو پھوپھو بولتے تھے، اسی طرح عابد کے بچے میری بیوی عاصمہ کو پھوپھو کہہ کر بلاتے، الغرض سگے رشتے داروں سے بڑھ کر ہم ایک دوسرے پر اپنا پیار اور خلوص نچھاور کرتے تھے۔ واپسی پر ہمیں سوغات کے طور پر ڈھیر سارا ساگ، مکئی کا آٹا، مالٹے، گنے اور گڑ دیا جاتا تھا۔ بچے خالص دودھ اور لسی پی کر بہت خوش ہوتے تھے۔ اسی چاہت اور پیار کے ماحول میں ہمارا وقت گزرتا رہا۔ ہمارے سب بچے زیر تعلیم تھے۔ وہ بہت ذہین اور بہت ہی لائق تھے۔ میں اور عابد پلیٹ فارم کے بینچ پر بیٹھ کر خوب باتیں کرتے اور آگے بڑھنے کے لیے ترقی کے لیے جائز اور حلال طریقۂ آمدنی پر غور کرتے۔ سر دست ہمارے پاس کوئی سرمایہ بھی نہ تھا، جس سے کسی چھوٹے موٹے کاروبار کا ہم آغاز کرتے۔ اسی طرح صلاح مشوروں اور باتوں میں وقت گزرتا رہا۔ ہماری واپسی بھی ٹرین کے ذریعے ہوتی۔ ایک فاسٹ ایکسپریس ٹرین لالہ موسیٰ سے واپس آتی تھی، وہ ساڑھے تین بجے اس اسٹیشن پر آتی۔ اُس ٹرین کا اصل نام تو شاید کسی کو معلوم نہیں تھا، مگر وہ ٹرین ”دھماکہ ایکسپریس“ کے نام سے مشہور تھی۔ وہ اپنے مقررہ وقت پر آتی تھی۔ وہ لالہ موسیٰ سے سرگودھا اور پھر سرگودھا سے واپس لالہ موسیٰ جاتی۔ میں اور عابد تین بجے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جاتے تھے۔ ہمارے چھٹی کا ٹائم بھی تین بجے ہی کا تھا، جبکہ عابد بھی تین بجے تک اپنا سارا کام نمٹا لیتا تھا۔ ہم ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر سب سے پہلے ظہر کی نماز ادا کرتے، پھر اسٹیشن کے اسٹال کے بنے پکوڑے کھاتے اور جب ٹرین آ جاتی تو اس میں سوار ہو کر چار بجے سرگودھا ریلوے اسٹیشن پہنچ جاتے تھے۔ ٹرین سے اُتر کر ہم بابا عمر دین سے دعا سلام کرتے، پھر گلے مل کر اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا جاری رہا۔

رمضان المبارک کا مقدس، بابرکت رحمتوں والا مہینا آتا تو ایک دوسرے کے ہاں افطاریوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ میں اور عابد ہر سال ایک ہی مسجد میں اعتکاف کرتے۔ ہمارا اعتکاف سرگودھا شہر کی ایک بہت بڑی، وسیع و عریض مرکزی جامع مسجد المعروف مسجد پیر سید حامد علی شاہؒ میں ہوتا تھا۔ یہاں پر سحری اور افطاری کا انتظام مسجد کی انتظامیہ کرتی ہے۔ پہلے دن سے ہی ہر معتکف سحری و افطاری کے لیے ایک رقم جمع کروا دیتا تھا۔ یہاں پر نامور علمائے کرام روزانہ درسِ قرآن دیتے اور ستائیسویں کی رات شب بیداری ہوتی تھی اور مسجد میں بڑا روحانی ماحول ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر شب برأت کو بھی محفل ہوتی تھی۔ اس میں بھی میں اور عابد شرکت کرتے، شب بیداری ہوتی اور روزہ رکھنے کا انتظام بھی مسجد میں ہی ہوتا تھا۔ انہی شب و روز اور معمولات میں ہمارا وقت گزرتا رہا۔ اب ہمارے بچے بڑے ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارے اخراجات اور ذمے داریاں بڑھ رہی تھیں، جبکہ ہمارے منصوبے بھی روز بنتے اور روز ٹوٹتے تھے۔ اس دوران ہمارا ٹرین کا سفر پلیٹ فارم نمبر 3 کے بینچ پر بیٹھ کر باتیں کرنا، بابا عمر دین کی چائے، کیک، پیسٹری اور اُبلے انڈوں سے شغل بھی جاری رہا۔ اب بابا عمر دین بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ جاتا تھا، کیوں کہ اس کے بیٹے اب اسٹال کو سنبھال رہے تھے۔ بابا عمر دین ہم دونوں کے حالات سے بہ خوبی واقف ہو گیا تھا۔ اس لیے اب وہ بھی ہمارے ساتھ شاملِ گفتگو ہوتا تھا۔ ایک دن بابا عمر دین نے ہمیں مشورہ دیا کہ اس طرح خالی باتوں سے کچھ بھی نہیں ہوگا، اس کے لیے ہمیں عملی طور پر کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ اس کے لیے بابا عمر دین نے ہمیں یہ مشورہ دیا کہ تم دونوں باہر کے ملک جا کر قسمت آزماؤ۔ بابا عمر دین کی یہ صلاح ہمیں بہت اچھی لگی تھی۔

عابد چوں کہ ٹریکٹر وغیرہ چلا لیتا تھا، اس لیے اس نے باقاعدہ ہیوی گاڑیوں اور ٹرالروں کی ڈرائیونگ سیکھی اور پھر لائسنس بنوایا، پھر فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے عابد بیرون ملک جائے گا اور قسمت آزمائی کرے گا۔ میں نے اور اس نے مل کر کچھ کمیٹیاں ڈالی ہوئی تھیں اور کچھ رقم ہماری

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیویوں نے بھی پس انداز کی ہوئی تھی۔ عابد نے اپنی زمین دو سال کے لیے ٹھیکے پر دے دی تھی اور تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد عابد کو سعودیہ کا آزاد ویزا مل گیا۔ ٹکٹ اور ویزے کے اخراجات ہم دونوں نے مل کر کمیٹیوں میں ملنے والی اور پس انداز کی ہوئی رقم اور زمین کے ٹھیکے سے حاصل کی ہوئی رقم سے پورے کیے اور پھر ایک دن ہم سب نے ایک ویگن کرائے پر لی اور دونوں گھرانے عابد کو ایئر پورٹ چھوڑنے لاہور گئے اور آنسوؤں اور دعاؤں کے سائے میں عابد کو رخصت کیا۔

جب عابد سعودیہ چلا گیا تو مجھے ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم کھانے کو دوڑتا اور میں بینچ پر بیٹھ کر چپکے چپکے روتا۔ جب مجھے عابد کی بہت یاد ستاتی تو بابا عمر دین میری دلجوئی کرتا اور مجھے تسلیاں دیتا اور کہتا کہ اپنے دوست بھائی کی کامیابی کے لیے دعا کرو۔ میں ہر نماز کے بعد دل کی گہرائیوں سے اللہ کی بارگاہ میں عابد کی کامیابی کے لئے دعائیں کرتا، اُدھر عابد بہ خیریت سعودیہ پہنچ گیا تھا۔ پہلے تین مہینے تو اس کو کوئی کام نہ ملا، پھر ایک پاکستانی کے توسط سے اسے ڈرائیور کی نوکری مل گئی۔ اب ہمارا پی ٹی سی ایل ٹیلی فون پر رابطہ رہتا، کیوں کہ موبائل تو اسے دور میں تھے نہیں۔

عابد بڑی تندہی سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ عابد ایک ماہ کی چھٹی پر وطن واپس آیا تو خوب رونق لگی۔ عابد نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی سی۔ وی، یعنی اپنا مکمل بائیو ڈیٹا (کوائف) بنا کر اسے دوں، جو کہ میں نے اسے بنا کر دے دیا۔ پلک جھپکتے ہی ایک مہینے گزر گیا اور عابد دوبارہ سعودیہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میری ٹرانسفر واپس سرگودھا ہوگئی اور میں نے یہاں ڈیوٹی جوائن کرلی۔ تو میرا ٹرین کا روزانہ کا سفر اختتام کو پہنچ گیا۔ کوئی چھ ماہ کے بعد عابد کا فون آیا اور اس نے مجھے پاسپورٹ بنوانے کا کہا جو کہ میں نے بنوالیا۔ وہ میرے لیے سعودیہ میں کام کی تلاش میں بھرپور کوشش میں مصروف تھا۔

ہمارے سب بچے ہونہار ہو چکے تھے اور ان کے تعلیمی مراحل بڑی تیزی سے گزر رہے تھے۔ بچے بڑی کلاسوں میں آ گئے تھے، وہ ہر امتحان میں پہلی پوزیشن اور انعامات لیتے تھے۔ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ بچے بہت ہی فرماں بردار اور تمیز دار نکلے تھے، پھر ایک دن عابد نے مجھے خوش خبری سنائی کے میرے لیے کام کا اور ویزے کا بھی بندوبست ہو گیا ہے اور میں فوراً سعودی عرب آنے کی تیاری کروں۔ چناں چہ میں نے سفر کی تیاری شروع کردی۔ اسی دوران میرا ویزہ بھی آ گیا اور تھوڑی بہت بھاگ دوڑ کے بعد میری دو سال کی چھٹی بھی منظور ہوگئی۔ میرے ویزے کے اخراجات عابد نے ادا کیے تھے۔ اُنہی دنوں ہماری ایک کمیٹی نکل آئی تو میں نے تھوڑا سا اپنی بیوی کا زیور فروخت کیا۔ اس طرح میرے ٹکٹ کا بندوبست ہوگیا اور میری سعودیہ جانے کی تاریخ آ گئی۔ اس کے بعد میں ریلوے اسٹیشن گیا اور بابا عمر دین سے ملا۔ ان کی دعائیں لیں اور پھر ہمارے دونوں گھرانے مجھے لاہور ایئر پورٹ چھوڑنے آئے، اس طرح میں بھی سعودیہ پہنچ گیا۔ وہاں ایئر پورٹ پر عابد مجھے لینے میرا استقبال کرنے کے لیے پہلے سے موجود تھا۔ ہم گلے ملے اور عابد کی رہائش پر پہنچ گئے۔ چوں کہ میری چھٹی مع پوری تنخواہ کے ساتھ منظور ہوئی تھی، اس لیے بیوی بچوں کے اخراجات کی مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ میرے گھر والوں کو مل جاتی تھی، پھر اللہ پاک نے کرم فرمایا اور مجھے میری تعلیم، ٹیکنیکل ڈپلوما اور محکمے کے کام کے تجربہ کی بدولت بہت شان دار ملازمت سعودیہ میں مل گئی۔ جس کمپنی میں مجھے کام ملا تھا، وہ ایک انٹرنیشنل لیول کی بہت بڑی کمپنی تھی، جس کا مالک ایک انگریز تھا۔ اس کے بہت سارے پروجیکٹ سعودیہ، شارجہ، دبئی اور قطر میں چل رہے تھے۔ میں نے پوری ایمان داری، دیانت داری اور تندہی سے کام شروع کردیا اور بہت تھوڑے عرصے میں کمپنی کے مالک کا اعتماد حاصل کرلیا۔ چوں کہ میں پڑھا لکھا تھا، اس لیے انگریزی زبان بولنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میری ایک لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی تھی اور پچیس سے تیس ہزار اوور ٹائم بن جاتا تھا۔ کمپنی کا معاہدہ دس سال کا تھا اور اس عرصے میں اس نے اپنا پروجیکٹ مکمل کرنا تھا۔ کمپنی کا مالک میرے کام سے بہت خوش تھا، پھر میں نے مالک سے عابد کو اپنے ساتھ کام کی اجازت مانگی تو اس

نے بہ خوشی عابد کو بھی کام دے دیا۔ میں نے دو تین ماہ میں اسے کام میں ٹرینڈ کر دیا اور اس کی بھی لاکھ روپیہ تنخواہ مقرر ہوگئی اس طرح ڈرائیوری سے اس کی جان چھوٹ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو سال گزر گئے تو میں اور عابد ایک ایک ماہ کی چھٹی پر پاکستان آئے۔ میرے پاس پچیس لاکھ روپے جمع تھے۔ میں نے آتے ہی اپنے محکمے سے ریٹائرمنٹ لے لی تو مجھے گریجویٹی کی مد میں آٹھ لاکھ روپے ملے، پندرہ ہزار روپے میری پنشن بنی تھی۔ جبکہ اسی دوران محکمے کا اسپیشل آڈٹ ہوا تو سب کھلے، فراڈ اور کرپشن منظر عام پر آ گئے۔ کیس نیب (NAB) کو دے دیا گیا، کیوں کہ فوجی حکومت آ گئی تھی۔ تمام کرپٹ اور بدعنوان افسران اور ملازمین گرفتار کر لیے گئے اور ان پر مقدمات بنا کر جیل بھیج دیا گیا۔ کرپشن سے بنائی گئی تمام جائیداد حکومت نے ضبط کرلی تھی۔ صرف ایمان دار، کرپشن سے پاک افسران اور ملازمین کی عزت پر کوئی آنچ نہ آئی تھی اور ان کی ملازمتیں برقرار رہی تھیں، جبکہ کرپٹ لوگوں کو لمبی سزائیں ہوگئی تھیں اور ان کی ملازمتیں بھی ختم ہوگئی تھیں۔

ہم اپنے رشتے داروں اور تمام عزیز و اقارب کے لیے ڈھیروں تحائف لے کر آئے تھے۔ سب سے پہلے میں اور عابد ریلوے اسٹیشن گئے اور بابا عمر دین سے ملے۔ ہم اس کے لیے بھی بہت سارے تحفے اور ساتھ آب زم زم، کھجوریں، تسبیح، ٹوپی، جائے نماز لے کر آئے تھے۔ وہیں پلیٹ فارم نمبر 3 کے اُسی بینچ پر بیٹھ کر ہم نے چائے پی۔ بابا عمر دین نے ہماری کیک، پیسٹریوں، بسکٹوں سے خوب تواضع کی۔ تین گھنٹے وہاں بیٹھ کر ہم نے خوب اس سے باتیں کیں، تو باتوں باتوں میں ہمیں محسوس ہوا کہ بابا عمر دین دیارِ مقدس کے سفر اور مدینہ پاک حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کا شدید طلب گار ہے۔ جب ہم بابا عمر دین سے مل کر واپس آئے تو عابد کہنے لگا۔ ”یار سنی بابا عمر دین کے مشورے پر عمل سے ہی ہماری کایا پلٹی ہے، تو اس طرح بابا عمر دین ہمارا محسن ہوا نا......؟“

تو میں نے کہا۔ ”بے شک، اگر بابا عمر دین ہمیں صلاح نہ دیتا تو شاید ہم آج اسی مقام پر ہوتے۔“ پھر ہم نے باہمی صلاح مشورے سے بابا عمر دین کو حج کروانے کا فیصلہ کیا اور جا کر اس کو خوش خبری سنائی کہ وہ تیاری رکھے، اس سال بابا عمر دین حج کا مقدس فریضہ سرانجام دے گا، جس پر بابا عمر دین کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ خوشی سے مسرور ہوگیا، پھر میں نے سرگودھا کے ایک پوش علاقے میں ایک کنال کا پلاٹ لیا۔ کوٹھی کا نقشہ پاس کروایا اور کوٹھی کی تعمیر کا ٹھیکا ایک جاننے والے ایمان دار ٹھیکے دار کے سپرد کیا۔ اُدھر عابد نے گاؤں میں ایک بڑی سی حویلی کی تعمیر شروع کروا دی۔ یوں ہم ایک مہینے کی

امریکہ کی آزادی

4 جولائی 1776ء کو امریکہ نے برطانیہ سے آزادی حاصل کرلی۔ امریکہ میں انگریزوں کی آبادکاری سترہویں صدی کے اوائل میں ہونا شروع ہوگئی تھی، آہستہ آہستہ یہ نوآبادیاں پورے امریکہ میں پھیل گئیں اور امریکہ کے طول و عرض میں متعدد ریاستیں قائم ہوگئیں۔ ساتھ ہی ساتھ امریکہ میں انگلستان کے ساتھ تعلقات کے مسئلے پر دو بڑے طبقے وجود میں آ گئے ایک طرف سیموئیل ایڈمز اور جان ہنکاک جیسے انتہا پسند تھے جو امریکہ کی آزادی کے خواہاں تھے اور دوسری طرف جارج واشنگٹن، بنجمن فرینکلن اور ٹامس جیفرسن تھے جو برطانیہ سے وفاداری پر ثابت قدم تھے اور علیحدگی اور آزادی کے خیال کو ناپسندیدہ سمجھتے تھے۔ ایسے میں ٹامس پین کے ایک پمفلٹ کی اشاعت نے فیصلہ کن کردار ادا کیا اور آزادی کے مخالفین بھی آزادی کے ہم نوا ہوگئے۔ 10 جون 1776ء کو اس امر پر اتفاق ہوگیا کہ تین ہفتے بعد آخری فیصلے کے لیے ووٹ لیے جائیں۔ اس زمانے میں جیفرسن، ایڈمز اور بنجمن فرینکلن نے بڑا کام کیا اور انہی کی کوششوں کے نتیجے میں 4 جولائی 1776ء کو تیرہ کی تیرہ ریاستوں نے امریکہ کے اعلانِ آزادی پر دستخط کردیے۔

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

چھٹی گزار کر واپس سعودیہ لوٹ گئے، پھر ہم نے اپنے بیوی بچوں کو اور عابد نے بھی اپنے ماں باپ، بیوی بچوں کو حج پر بلایا اور وہاں بابا عمر دین کو بھی ان کے ساتھ بلایا اور یوں ہم سب نے مل کر حج ادا کیا۔ مدینہ پاک میں حاضری دی۔ بابا عمر دین کی خوشی قابل دید تھی۔ وہ ساری ساری رات عبادت کرتا، طواف، نوافل کی ادائیگی کرتا۔ ہم نے تمام مقدس مقامات کی زیارات کیں، یوں حج کے بعد سب پاکستان چلے گئے۔ پھر ایک سال بعد ہم چھٹی پر پاکستان آئے تو ہماری کوٹھی تکمیل کے آخری مراحل میں تھی، اسی طرح عابد کی حویلی بھی تقریباً مکمل ہو چکی تھی، پھر چند دنوں کے بعد ہم اپنی نئی کوٹھی میں شفٹ ہو گئے۔ وہاں جاتے ہی، ہم نے سب سے پہلے محفل میلاد کا انعقاد کروایا اور تمام رشتے داروں، عزیزوں اور دوستوں کو مدعو کیا۔ سب بچوں کے عقیقے کیے۔ اسی طرح عابد نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ بھی اپنی نئی حویلی میں شفٹ ہو گیا۔ چھٹی گزار کر ہم پھر سعودیہ چلے گئے۔ ہم نے پھر خوب محنت کی۔ ہماری محنت و لگن کی وجہ سے ہماری تنخواہیں اور اوور ٹائم بھی بڑھا دیا گیا تھا۔ ہم کمپنی کے کام کے سلسلے میں پورا گلف گھومے پھرے، اسی طرح دیکھتے ہی دیکھتے دس سال کا عرصہ بیت گیا۔ کمپنی کا پروجیکٹ مکمل ہو چکا تھا۔ اللہ پاک نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو خوب نوازا تھا۔ پھر ہم نے مستقل واپسی کا پروگرام بنایا اور ایک دن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واپس اپنے ملک پاکستان آ گئے۔ ہم حسب معمول بابا عمر دین کو ملنے گئے تو دیکھا کہ بابا کی آنکھوں میں موتیے کی وجہ سے بینائی بہت کمزور ہو گئی ہے۔ میں نے چپکے سے بابا کو چالیس ہزار روپے دیے کہ اپنی آنکھوں کا آپریشن کروالو، پھر ہم اپنی مستقبل کی پلاننگ میں مصروف ہو گئے۔ میرا بڑا بیٹا ایم۔بی۔بی۔ایس پاس کرنے کے بعد اسپیشلائزیشن کر رہا ہے۔ دوسرا بیٹا انجینئرنگ کی ڈگری لے کر ایک بہت بڑی فرم میں انجینئر ہے۔ بیٹی میڈیکل کالج میں فورتھ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ چوتھا بیٹا ایم۔کام کر رہا ہے۔ اسی طرح بھتیجا FCMA کرنے کے بعد ایک بہت بڑی چارٹڈ فرم میں منیجر کے عہدے پر فائز ہے اور بھتیجی ایم۔ایس۔سی کر رہی ہے۔ عابد کا بڑا بیٹا بھی ڈاکٹر ہے۔ دوسرا یونیورسٹی میں لیکچرار ہے اور پی۔ایچ۔ڈی کر رہا ہے، جبکہ بیٹی نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ بابا عمر دین نے یہ کیا کہ اُن چالیس ہزار روپوں سے پرائز بانڈ لے لیے اور خاموشی سے سرگودھا شہر کے قریب شاہ پور میں ایک بہت بڑے آنکھوں کے ٹرسٹ اسپتال LRBT سے مفت آنکھوں کا آپریشن کروالیا، جو کہ کامیاب رہا۔ ایک دن بابا عمر دین کا بیٹا اکبر جو کہ چائے کے اسٹال پر کام کرتا تھا، ٹرین میں مسافروں کو چائے پلا کر برتن سمیٹ کر چلتی گاڑی سے اترتے ہوئے پاؤں سلپ ہو جانے کی وجہ سے گر گیا اور ٹرین کے پہیوں کے نیچے آ کر جاں بحق ہو گیا۔ یہ بابا عمر دین کے لیے بڑھاپے میں بہت بڑا صدمہ تھا۔ اکبر کی دو ہی بیٹیاں ہیں، بیٹا کوئی نہیں ہے۔ بابا بہت غم زدہ رہنے لگا تھا۔ اب خدا کا کرنا یہ ہوا کہ بابا عمر دین نے چالیس ہزار کے جو پرائز بانڈ خریدے تھے، ان میں اس کا پندرہ لاکھ روپے کا انعام نکل آیا۔ عمر دین کے دو بیٹے اور بھی ہیں، تو اس نے چائے کا وہ اسٹال ختم کر کے ریلوے اسٹیشن کے باہر ہی ایک بہت بڑا جنرل اسٹور خرید لیا، جس میں سگریٹ، پان، کولڈ ڈرنک، منرل واٹر، جوس وغیرہ سے لے کر ضرورت کا ہر سامان ملتا ہے اور وہ اسٹور چوبیس گھنٹے خوب چلتا ہے۔ اس کے دونوں بیٹے باری باری جنرل اسٹور پر بیٹھتے ہیں۔ اب بابا عمر دین کے گھر بھی خوش حالی آ گئی ہے۔ اکبر کی موت کا دُکھ اور غم بابا عمر دین کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا اور ایک دن بابا حاجی عمر دین کا انتقال ہو گیا۔ ہم سب اُس کی تجہیز و تدفین میں شامل ہوئے۔

سعودیہ سے مستقل واپس آ کر میں نے ایک کمرشل پلازہ بنایا ہے، اسی طرح سولہ فلیٹس پر مشتمل ایک اور رہائشی پلازہ بنایا۔ ریلوے اسٹیشن کے باہر ہی ریلوے روڈ پر کاروں کا ایک بہت بڑا شوروم ہے جہاں زیرو میٹر گاڑیوں سے لے کر سیکنڈ ہینڈ گاڑیوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ عابد نے گاؤں میں بہت ساری زمین خرید لی ہے۔ اس کے اپنے بہت سارے کینو، مالٹے کے باغات ہیں اور ایک بہت بڑی کینو مالٹے ایکسپورٹ کرنے کی فیکٹری ہے جس میں مالٹے پالش کیے جاتے ہیں اور پھر جدید پیکنگ میں بیرون ملک ایکسپورٹ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سارے زرعی آلات اور بہت بڑا فارم اس نے بنایا ہوا ہے اور ساٹھ ستر گائیں، بھینسیں اس کے فارم میں ہیں۔ جن سے وہ خالص دودھ سپلائی کرتا ہے۔ اس کے فارم کا دودھ پورے علاقے میں بہت مشہور ہے۔ ہر سال ہم دونوں خاندان عمرہ اور حج کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور ہر سال ربیع الاوّل کے مہینے میں بہت بڑی محافل نعت منعقد کرواتے ہیں۔ ہم اپنے تمام غریب اور کمزور رشتے داروں کی مالی مدد بھی کرتے ہیں۔ اپنے کئی رشتے داروں کو ہم عمرہ کروا چکے ہیں۔

قارئین کرام! یقین جانیے کہ اللہ کی راہ میں ہم جتنا خرچ کرتے ہیں تو اس سے کئی گنا بڑھ کر اللہ ہمیں اور دے دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بیواؤں، یتیموں کی کفالت بھی دل کھول کر کرتے ہیں۔ اب ہم نے اپنے بچوں کے رشتے کچھ اس طرح طے کیے ہیں۔ بڑے ڈاکٹر بیٹے کا رشتہ عابد کی بیٹی سے طے کیا ہے۔ دوسرے انجینئر بیٹے کا رشتہ اپنی بھتیجی سے طے کیا ہے۔ اپنی بیٹی کا رشتہ بھتیجے سے طے کیا ہے۔ عابد نے اپنے ڈاکٹر بیٹے کا رشتہ اپنی یتیم بھانجی سے طے کیا ہے اور بابا حاجی عمر دین کی دو پوتیاں، جو کہ اکبر مرحوم کی بیٹیاں ہیں، ایک رشتہ میں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے، جو کہ ایم۔کام کر رہا ہے، اس کے ساتھ طے کیا ہے اور دوسری کا رشتہ عابد نے اپنے بیٹے، جو کہ یونیورسٹی میں لیکچرار ہے، کے ساتھ طے کیا ہے اور یہ سب رشتے ہم دونوں نے اپنی اولادوں کی رضا مندی سے طے کیے ہیں اور ان سب نے سعادت مندی سے اور خوشی سے یہ منظور کیے ہیں۔

بابا حاجی عمر دین کی زندگی میں ہی میں نے اور عابد نے اس کی دونوں یتیم پوتیوں کے رشتے مانگ لیے تھے۔ سرگودھا کا ریلوے اسٹیشن اُسی طرح سے قائم و دائم ہے اور ریل گاڑیوں کی آمد و رفت اپنے معمول کے مطابق جاری و ساری ہے۔ پلیٹ فارم نمبر 3 پر وہ بینچ بھی موجود ہے اور چائے کا وہ اسٹال بھی اسی طرح قائم و دائم ہے، مگر وہاں بابا عمر دین نہیں ہے، لیکن ہماری یادیں اب بھی اس سے قائم ہیں۔

عابد جب بھی مجھے ملنے آتا ہے تو میں شوروم سے اُٹھ کر عابد کو ساتھ لے جا کر اُسی بینچ پر بٹھا کر اُسی اسٹال سے چائے، کیک، پیسٹری سے اپنے جگری یار عابد کی تواضع کرتا ہوں۔ ہم کافی دیر وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ بابا عمر دین مرحوم کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بخشش و مغفرت کی دعائیں بھی کرتے ہیں۔ مسافر اب بھی آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، گاڑیاں آتی ہیں تھوڑی دیر رُکتی ہیں اور پھر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتی ہیں۔ وہ چھوٹا سا مکان جس میں ہم ایک لمبا عرصہ کرائے پر رہائش پذیر رہے، میں نے اب وہ بھی خرید لیا ہے اور ہم اکثر پورے گھر والے وہاں جاتے ہیں، بیٹھتے ہیں اور دلی سکون حاصل کرتے ہیں۔ وقت اپنی پوری تیز رفتاری سے گزر رہا ہے۔

محترم قارئین کرام! آپ میں سے کچھ لوگوں کو یہ سب باتیں فرضی اور افسانوی لگیں گی، مگر یاد رکھیے، اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اگر انسان اپنے ربّ پر کامل یقین اور بھروسے سے جائز اور حلال کوشش کرے تو قسمت ضرور بدلتی ہے۔ دوسرے یہ کہ رشتوں کے تقدس کا خیال رکھنے سے احترام انسانیت سے سچی، مخلص، بے لوث، دوستی سے بیگانے بھی اپنوں اور خون کے سگے رشتوں کی طرح بن جاتے ہیں اور تیسرے یہ کہ حلال، جائز اور طیب کمائی سے اولاد کی پرورش اور تربیت بہتر انداز سے کی جائے تو وہ ہمیشہ سعادت مند اور نیک ہوتی ہے، کبھی سرکش اور باغی نہیں ہوتی۔ آخر میں سب سے اہم بات کہ ہم نے اپنی غربت اور تنگدستی کے اُن دنوں کو کبھی فراموش نہیں کیا، بلکہ اسے ہمیشہ یاد رکھا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمیں پورا پورا سال گوشت کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا، صرف عیدالاضحیٰ پر کسی گھر سے تھوڑا بہت آ جاتا تو وہ پک جاتا، مگر ہم ہر حال میں صابر اور شاکر رہے، پھر اللہ کی ذات نے ہمیں ہمارے صبر اور شکر کا بہت بڑا ثمر عطا فرمایا اور آج ہمیں بہت زیادہ نوازا ہے اس قناعت و شکر کے بدلے میں۔

☆......☆

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ ”ناگن۔“ آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کردے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر:5

گزشتہ قسط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پردادا کو اس کے گرو نے مرتے سے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آجائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر ساون میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں نے ان ناگوں کو ناز ونعم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آچکا تھا۔

وہ رات بھی اماوس کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جارہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ مہاراج کو ٹھکانے لگا دیا جائے تاکہ یہ بادشاہت اس کے حصے میں آجائے۔ آخری بلیدان کے لیے جوڑے کا بندوبست ہوچکا تھا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کررہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیرلب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کرکے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کررہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ جو عجیب سی نظروں سے صابو کو دیکھ رہے تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔ راستے میں ان کی ملاقات رندھیر سے ہوتی ہے، جو انہیں اپنے گھر لے جاتا ہے۔ شکنتلا کا حسن دیکھ کر اس کی نیت خراب ہوجاتی ہے۔ ایک روز ارجن باہر جاتا ہے تو رندھیر شکنتلا کے ساتھ زور زبردستی کرتا ہے۔ شکنتلا غصے میں اسے بتاتی ہے کہ وہ انسان نہیں ناگن ہے اور چوں کہ رندھیر نے انہیں اپنے گھر میں جگہ دی ہے، اس لیے وہ اس کی جان بخشی کررہی ہے۔ یہ کہہ کر وہ ناگن کا روپ دھار کر نکا گی

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

آب کے رستے باہر نکل جاتی ہے۔ رندھیر بدحواس ہو کر باہر آتا ہے اور سانپ سانپ چلانے لگتا ہے۔ اس کی چیخ پکار سن کر لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ ارجن بھی سانپ کا روپ دھار کر رندھیر کے گھر میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے۔ ”ارجن کے قاتلوں! تم نے میرے ناگ کی ہتھیا کر کے بڑا انیائے کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔“

شکنتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔ مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

شکنتلا سمجھ جاتی ہے کہ مہاراج اس کے حسن کے جادو کا شکار ہو چکے ہیں وہ ان سے کہتی ہے کہ وہ اسے اپنی مہارانی بنا لیں۔ راجہ رام ناتھ اس کے ناز و انداز کے زیر اثر کہتے ہیں کہ ہم کل ہی بھرے دربار میں تمہیں اپنی رانی بنانے کا اعلان کریں گے اور شکنتلا کو با اختیار زندگی گزارنے کا خواب پورا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اگلے روز دربار میں مہاراج رام ناتھ شکنتلا سے دوسری شادی کا اعلان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آج اسی وقت شادی کی رسوم ادا کی جائیں۔ رام ناتھ اور شکنتلا کے سات پھیرے آگ کے گرد مکمل ہو جاتے ہیں۔ شکنتلا مہارانی ماریہ کی خاص کنیز کوشلیا کو کنیزوں کی سرداری سے برطرف کر دیتی ہے اور پریہ کو کنیز عالیہ بنا دیتی ہے۔ دوسری طرف ماریہ سامری جادوگر سے شکنتلا کے متعلق پوچھتی ہے، لیکن سامری جادوگر اسے کہتا ہے کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں اس کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے گرو کی روح سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ مہارانی اسے جلد از جلد شکنتلا سے نجات دلانے کا کہتی ہے۔ سامری جادوگر ماریہ سے شکنتلا کو شاہی محل سے نکالنے کا وعدہ کرتا ہے۔ کوشلیا روز صبح اسے محل کے تمام واقعات آ کر بتاتی تھی، لیکن اس روز وہ غائب تھی۔

مہارانی ماریہ اس کے نہ آنے پر پریشان ہوتی ہے اور سوچتی ہے کہ کہیں شکنتلا کو پتا تو نہیں چل گیا کہ کوشلیا مہارانی کی جاسوسہ ہے۔

شکنتلا کی کنیز خاص پریہ کوشلیا سے کہتی ہے ان تمام لوگوں کے نام بتاؤ جو تمہارے سمیت رانی ماریہ کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔ وہ اسے دھمکی دیتی ہے کہ معلومات فراہم نہ کرنے پر مجھے مہارانی شکنتلا کی مکمل آشیرباد حاصل ہے کہ جو چاہے وہ سلوک تمہارے ساتھ کروں، تب کوشلیا فرفر اسے سب کچھ بتا دیتی ہے۔ رام ناتھ نے سامری جادوگر سے رانی شکنتلا کی جنم کنڈلی (زائچہ) کی بابت دریافت کیا۔ سامری راجہ رام ناتھ کو جواب دیتا ہے کہ وہ اس بارے میں اپنے گرو شداد جادوگر کی بدروح سے ملاقات کر کے بتائے گا۔

شکنتلا راجہ رام ناتھ سے جو اس پر بری طرح فریفتہ تھا۔ ان قیدیوں کو سزا دینے کا کہتی ہے کہ میری چھوٹی سی اچھا ہے کہ ان چاروں قاتلوں کو کسی خفیہ تہ خانے میں بند کر کے چابی اس کے حوالے کر دی جائے، جہاں میں ان سے آہستہ آہستہ انتقام لے سکوں۔ شکنتلا دیوی کے دیوانے راجہ رام ناتھ اسے اس قید خانے کا بتاتے ہیں جو کہ اس خواب گاہ کے عین نیچے ہے اور جہاں قید ہونے کے بعد رام ناتھ کا دشمن دوبارہ آسمان دیکھنے کی خواہش دل میں لیے دنیا سے چلا جاتا ہے۔ شکنتلا حیرت سے یہ بات سنتی ہے اور مہاراجہ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ دوسری طرف دلاور کا دوست جبار دلاور کی بیوی غزالہ کو عامل کے پاس لے جانے کا کہتا ہے، لیکن اس سے پہلے ہی غزالہ جبار کا خون کر دیتی ہے۔

سامری جادوگر اپنے گرو شداد جادوگر سے ملاقات کرتا ہے جو اسے کہتا ہے کہ وہ ناگن ہے اور ”تو سب کچھ چھوڑ ناگن سے ناتا جوڑ“ سامری یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ سامری شکنتلا سے ملاقات کرتا ہے اور اسے سانپ زادی کہہ کر مخاطب کرتا ہے مہارانی شکنتلا یہ سن کر سمجھ جاتی ہے کہ سامری اس کے راز کو جان گیا ہے۔ شکنتلا کہتی ہے کہ ”آؤ سامری ہم ایک ہو جائیں اور دونوں مل کر اس وسیع ریاست پر اپنی حکمرانی قائم کریں، میں سانپوں کی ملکہ ہوں اور تم جادوگروں کے بادشاہ، ہم دونوں بادشاہ اور ملکہ بن جاتے ہیں۔ سامری اسے کچھ دن بعد جواب دینے کا کہتا ہے۔ شکنتلا اپنی ملازمہ خاص پریہ کو بھی اپنی سچائی کے بارے میں بتاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ آج کے بعد میرے لیے نوجوان انسانی خون کی فراہمی تمہاری ذمے داری ہو گی۔ پریہ یہ سن کر بہت خوف زدہ ہوتی ہے۔ شکنتلا اس سے کہتی ہے کہ اگر یہ بات کسی کو پتا چلی تو وہ پریہ کا خون کر دے گی، دوسری صورت میں اسے تابانہ کی حکومت میں اعلیٰ عہدہ دیا جائے گا۔ پریہ مہارانی کے حکم کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔

شکنتلا مہاراجہ سے دربار میں جانے کی فرمائش کرتی ہے اور اس سے پورے محل کا دورہ کرنے کا کہتی ہے۔ دربار میں شکنتلا سپہ سالار بلگرام کو اپنی نگاہوں سے اسیر کر لیتی ہے۔ وہ محل کے دورے پر نکلتی ہے، محل کے منتظمین مہارانی کی اچانک آمد سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ شکنتلا محل کے منتظم آنند اور منتظمہ کلپنا سے ملتی ہے اور ان سے محل کے انتظامات کے حوالے سے معلومات کرتی ہے۔ تب وہ پریہ سے کہتی ہے کہ اسے شک ہے کہ حساب کتاب میں گڑبڑ ہے۔ وہ ان دونوں کو گرفتار کر کے زنداں میں بھیج دیتی ہے اور ساتھ ہی زنداں کے داروغہ کو بھی گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ شکنتلا اپنی خواب گاہ کے نیچے پوشیدہ تہ خانے میں جاتی ہے جہاں رندھیر، تلک رائے، کرم سنگھ اور ایک نوجوان بندھے ہوئے فرش پر پڑے تھے۔ شکنتلا انہیں پنجرے میں قید کر دیتی ہے اور انہیں مخاطب کر کے کہتی ہے کہ میں شکنتلا ناگن ہوں۔ میرے ناگ کو تم لوگوں نے میرے سامنے جلا کر مار دیا تھا لیکن آج وقت میری گرفت میں ہے مجھے تمہارا وہ حشر کرنا ہے کہ تم خود موت مانگنے لگو۔ مہارانی شکنتلا سپہ سالار بلگرام کو کھانے کی دعوت دیتی ہے اور اس میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرتی ہے۔ ماریہ مہارانی کالی کے مندر کے بڑے پجاری گرو نرائن سے ملاقات کرتی ہے اور رو رو کر اس سے مدد طلب کرتی ہے۔ گرو جی اس سے مدد کا وعدہ کرتے ہیں اور اسے بتاتے ہیں کہ اس کے لیے ایک کنیا بلیدان کرنا پڑے گی۔ سامری مہارانی ماریہ سے کہتا ہے کہ وہ شکنتلا کو نیچا دکھانے کا خواب اپنے دل سے کھرچ دے، کیوں کہ دیوتا اس کے ساتھ ہیں۔

شکنتلا پریہ سے کہتی ہے کہ محل کے ہر اہم عہدے پر ہمارا بندہ تعینات ہے اب ہماری مرضی کے بغیر یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شکنتلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں انہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گرو نرائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شکنتلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک ہجوم شکنتلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شکنتلا کے سامنے کر دیتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ سپہ سالار بلگرام شکنتلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔ شکنتلا سامری جادوگر کو یاد کرتی ہے تو سامری جادوگر فوری حاضر ہو جاتا ہے۔ گرو نرائن بھی سامری سے خوف زدہ ہو کر فرار ہو جاتا ہے اور کلکتہ میں کالی کے مندر جا پہنچتا ہے۔ اب سامری اور شکنتلا سے مقابلے کے لیے اسے کالی کے مندر میں ایک کنیا کا بلیدان کر کے تیرتھ جاپ نو دن کرنا تھا اور اس جاپ کے لیے نوجوان لڑکی کو کالی کے چرنوں میں قربان کرنا ضروری تھا۔

(اب آگے ملاحظہ کیجیے)

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پنڈت پجاری سادھو اور یاتری کثیر تعداد میں گھوم رہے تھے اور یاترا کر رہے تھے۔ چاروں طرف دیکھتے ہوئے گروزائن نپے تلے قدموں سے دیوی کے چرنوں میں جا پہنچا۔

اس وقت رات کا ابتدائی وقت تھا۔ بے شمار مرد عورتیں یاترا اور پوجا پاٹ میں مصروف تھیں، ایسے میں گروزائن کی نظر ایک سانولی سلونی پندرہ سولہ سالہ دوشیزہ پر آ کر ٹک گئی۔ لڑکی گو کچے سالوں میں تھی، مگر خاصی دل کش تھی۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر جوڑا بھی تھا، غالباً یہ اس کے والدین تھے۔ یہ فیملی کالی کے بت کے بہت ہی قریب تھی۔ لڑکی دو زانو ہاتھ جوڑے کالی کے آگے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ گروزائن کی آنکھیں پر جوش انداز میں چمکنے لگیں۔ وہ من ہی من میں ہرے رنگ کی ساڑی میں ملبوس اس لڑکی کے بلیدان کا فیصلہ کرنے لگا اور غیر محسوس انداز میں لڑکی کے قریب ہوتا چلا گیا۔ اتنا قریب کہ اب وہ آسانی سے اس پر ہاتھ ڈال سکتا تھا، لہٰذا وہ زیر لب اوجھل جاپ کا منترا الاپنے لگا۔ اسے پتا تھا کہ اوجھل جاپ مکمل ہوتے ہی وہ نہ صرف سب کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا، بلکہ لڑکی پر ہاتھ ڈالتے ہی لڑکی بھی کسی کو دکھائی نہ دے گی۔ یہی سوچتے سوچتے اس نے منتر مکمل کر لیا۔ جس کے ساتھ ہی وہ سب کی نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی سب سے اوجھل ہو گیا۔ ہال میں رش ہونے کی بناء پر کسی نے بھی ایک شخص کے اچانک غائب ہو جانے پر ردعمل کا اظہار نہ کیا، تاہم قریب ترین کے چند افراد لمحے بھر کو چونکے ضرور، مگر اپنی نظروں کا دھوکا جان کر اپنے سروں کو جھٹکنے لگے۔

غائب ہوتے ہی گروزائن نے پھرتی سے ڈب میں اڑسا ہوا چمک دار پھل والا خنجر نکال کر منہ میں رکھ کر دانتوں سے ماہرانہ انداز میں پکڑ لیا اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے لڑکی کو دبوچ لیا...... جو اس کے آگے تھی۔ لڑکی اس اچانک اُفتاد سے گھبرا کر چلاّنے لگی۔ اب صورتحال کچھ یوں تھی کہ اس کی چیخ پکار سن کر لوگ چونک اُٹھے...... مگر کوئی بھی لڑکی کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ گروزائن نے موقع غنیمت جانتے ہوئے کسی تجربہ کار قصائی کی طرح لڑکی کی ٹانگ اور ہاتھ پکڑ کر دھڑام سے پہلو کے بل لٹایا، گھٹنا اس کی رانوں پر دبا کر رکھا اور پھرتی سے خنجر سیدھے ہاتھ میں پکڑا اور بغیر وقت ضائع کیے لڑکی کی صراحی دار گردن کسی ڈبل روٹی کی طرح کاٹ ڈالی۔ حسین دوشیزہ موت کی پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ ڈکرانے لگی۔ اس کی گردن سے خون کا فوارہ نکل کر کالی کے چرنوں کو چھو رہا تھا۔ گروزائن نے انتہائی تیز خنجر پوری طاقت سے چلایا تھا۔ نتیجے کے طور پر گردن پوری کٹ گئی۔ گروزائن کا کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ لڑکی کو مرغ بسمل کی مانند چھوڑ کر اپنی راہ لگ گیا...... جیسے ہی لڑکی کو گروزائن نے چھوڑا...... پورا ہال چیخوں سے گونج اٹھا، کیوں کہ ہرے رنگ کی ساڑی میں ملبوس نوجوان لڑکی کا سر بریدہ جسم موت کا رقص کر رہا تھا، جبکہ سر کچھ فاصلے پر الگ پھدک رہا تھا اور خون کالی کے چرنوں میں بکھر چکا تھا۔

☆......☆

گروزائن نے باہر آ کر مندر کے صحن میں بنے ہوئے بہت بڑے تالاب تیرتھ میں چھلانگ لگا دی۔ خاصی دیر ٹھنڈے پانی سے اشنان کرنے کے بعد مندر سے ملحقہ شمشان گھاٹ میں آ گیا۔ یہ بہت بڑا اور پرانا شمشان گھاٹ تھا، جہاں صدیوں سے مردے نذر آتش کیے جاتے تھے۔ درختوں کی بہتات بھی تھی۔ اس نے شمشان گھاٹ کے آخری کونے کو پسند کیا جہاں درختوں کا ایک گھنا جھنڈ بھی تھا۔ گروزائن نے خنجر کو نوک سے اپنے گرد ایک منڈل کھینچا اور تیرتھ اشنان کرنے کے بعد نوے دن کے لیے منڈل کے اندر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور تیرتھ جاپ شروع کر دیا، تا کہ ناگن شکنتلا کو اپنا غلام بنا سکے۔

☆......☆

''ہٹو ہٹو مہارانی کی سواری آ رہی ہے، ہٹ جاؤ راستہ چھوڑ دو، تابانہ کی ملکہ آ رہی ہے۔'' شاہی اہلکار زور زور سے ہنٹر برسا رہے تھے اور لوگوں سے راستہ خالی کرا رہے تھے، رش کائی کی طرح چھٹنے لگا، تھوڑی دیر میں تمام راستے اور بازار غریب کی جیب کی طرح خالی ہو گئے۔

ہنٹر برداروں کے بعد مسلح سپاہیوں کا ہراول دستہ گزرنے لگا، اس کے بعد گھڑ سوار تھے۔ اردگرد کی تمام عمارتوں کے اوپر لوگ کھڑکیوں اور بالکونیوں سے لگے ملکہ کی ایک جھلک دیکھنے کے منتظر تھے۔

اب ملکہ کی بگھی لوگوں کو نظر آئی، آٹھ پہیوں والی اس بگھی پر مخمل کے پردے تھے جو سمٹے ہوئے تھے اور اس کے اندر تقریباً اٹھارہ سالہ انتہائی خوب صورت گوری رنگت اور سیاہ لمبے بالوں والی حسین و جمیل لڑکی انتہائی قیمتی لباس زیب تن کیے، پورے طمطراق کے ساتھ صوفہ نما گدے میں دھنس کر بیٹھی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ذہانت اور غرور کی چمک تھی۔ ملکہ کے دونوں طرف دو کنیزیں دو زانو ہو کر با ادب بیٹھی تھیں۔ بگھی کے پچھلے حصے میں ملکہ کی خدمت گار، چند غلام اور کنیزیں چاق چوبند موجود تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ بگھی کے آگے گھوڑوں کی جگہ انسان جُتے ہوئے تھے۔ چار مرد اور چار خوب صورت لڑکیاں، سب کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں اور گلے میں طوق تھے۔ جلاّد نما حبشی غلام ان کو وقفے وقفے سے کوڑے مار کر بگھی کھینچنے پر مجبور کر رہے تھے۔ شڑاپ شڑاپ کی ہر آواز کے ساتھ بگھی کھینچنے کی تکلیف سے نڈھال تھے اور اذیت ناک اور کرب ناک انداز سے کراہ رہے تھے۔ منظر اس قدر بھیانک تھا کہ اس کی تاب نہ لا کر کئی لوگوں نے اپنے گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیے۔

بگھی میں سوار خوب صورت کم سن ملکہ اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ قیدیوں کی بڑھتی ہوئی آہوں، سسکیوں اور کراہوں کو سن کر ملکہ تابانہ، شکنتلا...... اپنی آنکھیں سرشاری لذت سے بار بار بند کر کے کھول رہی تھی اور اس کے سرخ مخروطی لبوں پر مسکراہٹ گہری سے گہری تر ہوتی چلی جا رہی تھی اور آنکھوں میں پراسرار چمک بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

بگھی کے آگے جتی ہوئی لڑکیوں میں کوشلیا اور سابقہ رانی ماریہ بھی تھیں، جبکہ مردوں میں رندھیر، کرم سنگھ، تلک رائے اور سابق والئی ''ریاست تابانہ'' رام ناتھ تھے۔ یہ آٹھوں ملکہ کے دشمن اس وقت زخموں سے چور بے بسی اور بے کسی کی علامت بنے ہوئے تھے۔ ماریہ اور رام ناتھ جو چند دن پیشتر اس ریاست کے حکمراں تھے، اب عبرت کا نشان بنے ہوئے تھے۔ حبشی غلام کسی روبوٹ کی طرح مخصوص وقفے کے بعد سب کو باری باری ہنٹروں سے پیٹ رہے تھے۔ ہر ہنٹر کے بعد ان کے جسموں پر خون آلود لکیر کا اضافہ ہو جاتا۔ ملکہ شکنتلا کی شاہی سواری پورے جلال کے ساتھ کالی دیوی کے مندر سے ملحقہ اس میدان کی جانب بڑھ رہی تھی، جہاں جشن کے انتظامات کیے گئے تھے۔

کھلے وسیع میدان میں عوام نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مندر کی طرف لکڑی کے تختوں پر مشتمل مضبوط چبوترہ بنایا گیا تھا جس پر خوب صورت قالین بچھے ہوئے تھے۔ چبوترے کے اوپر منقش، آرام دہ کرسیاں اور درمیان میں جواہرات سے مزین تخت تھا۔ کرسیوں پر سامری، بلگرام، پریہ، بال ٹھاکرے اور دیگر زعما تشریف فرما تھے اور تخت ملکہ عالیہ شکنتلا کے لیے تھا۔ اب شکنتلا چبوترے کی سیڑھیاں نپے تلے قدموں سے چڑھتی آ رہی تھی۔ کئی کنیزیں پشت کی جانب سے ملکہ کا لباس سنبھالے ہوئے تھیں۔ شکنتلا اس وقت حسن کا شعلۂ جوالہ دکھائی دے رہی تھی۔ حسن اپنے پورے جوبن پر تھا۔ سیاہ ناگن جیسی لمبی زلفوں کے درمیان گلابی دمکتا چہرہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کالے بالوں کے درمیان چاند۔ ملکہ کی آمد پر ہزاروں کبوتر فضا میں چھوڑے جا رہے تھے۔ شکنتلا چبوترے پر کھڑی ہو گئی اور عوام کی طرف منہ کر کے اس نے دونوں بازو فضا میں بلند کر دیے۔ پورا پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ عوام، ملکہ شکنتلا زندہ باد...... سامری زندہ باد، شکنتلا کی جے کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ اب شکنتلا نے ہاتھ نیچے گرا دیے اور متانت کے ساتھ اپنے تخت پر بیٹھ گئی۔ اس کی کنیز اور مشیر خاص پریہ نے اٹھ کر جشن کی کارروائی شروع کرنے کا اعلان کیا۔ پہلے مخصوص لوگوں نے چبوترے پر آ کر تقریریں شروع کیں اور تقریر میں ملکہ کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ سابقہ حکمرانوں کے مظالم کی فہرستیں پیش کرنا شروع کیں اور کئی ایک نے سابقہ حکمرانوں اور ان کے ساتھیوں کے لیے خوفناک سزاؤں کا مطالبہ کیا۔

ان معززین میں اکثر وہی تھے جو آج سے قبل رام ناتھ کی حکومت میں بھی چلتے پرزے تھے، ان خوشامدی تقریروں کے بعد کھیل تماشے شروع ہوئے جو خاصی دیر تک جاری رہے، لوگوں کی دلچسپی دیدنی تھی۔

کھیل تماشے کے بعد پوری ریاست کے ہنر مندوں نے اپنی اپنی بنائی ہوئی اشیاء پیش کیں، پھر ڈھول تاشوں کی تھاپ پر گھوڑوں کے رقص پیش کیے گئے۔ اس کے بعد، حسین و جمیل لڑکیوں نے اعضائی شاعری کا مظاہرہ کیا۔ اس دوران پنڈال میں رش مسلسل بڑھتا چلا گیا۔ سرکاری اہل کار جا و بے جا لاٹھی کا استعمال بے دردی سے کرتے رہے۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

آخر میں پر یہ نے اُٹھ کر تمام پنڈال کو ہاتھ بلند کر کے خاموش ہونے کا حکم دیا اور پھر بولی۔

"تابانہ کے باسیو! ملکہ شکنتلا نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کئی منصوبے شروع کرنے کا حکم دیا ہے۔ سب سے پہلے مسافروں کے لیے پکے راستوں پر سایہ دار درخت اور درختوں کے نیچے پانی کے کنویں ہوں گے، تاکہ مسافروں کو سفر آسان معلوم ہو۔ سرکاری اخراجات پر بچوں کے لیے تعلیمی ادارے بنائے جائیں گے اور مندروں کی حالت بہتر بنانے اور غریبوں کے لیے مندروں کے اندر بھوجن کا مفت انتظام وغیرہ شامل ہیں۔ ان منصوبوں پر بھاری اخراجات آئیں گے اور ہم سے قبل جو حکمران تھے، انہوں نے شاہی خزانہ اپنے اللّوں تللّوں پر اُڑا دیا ہے، یہ اخراجات پورے کرنے اور ریاستی امور کو چلانے کے لیے سرکار تابانہ کو مالی مشکلات کا سامنا ہے، لہٰذا آپ کی ملکہ نے آپ کے مفاد میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ تابانہ کا ہر کاشت کار، دکان دار، جاگیر دار، سرکاری اہلکار اور تمام رہائشی اپنی آمدنی کا دسواں حصہ سرکاری خزانے میں جمع کرائیں گے، جو شخص اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا وہ سخت سزا کا مستوجب ہوگا اور اس کا حشر بھی ان لوگوں جیسا ہوگا، جیسا حشر ابھی آپ کے سامنے سابقہ حکمران رام ناتھ اور دوسرے لوگوں کا ہونے والا ہے۔

سب جان لیں کہ ایسے سیکڑوں لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے جو ملکہ شکنتلا کے لیے خطرہ بن سکتے تھے یا غداری کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ان تمام لوگوں کو ابھی سب کے سامنے کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا۔" یہ تقریر کرنے کے بعد پر یہ بیٹھ گئی اور اب ایسے پابہ زنجیر قیدیوں کو میدان میں لایا جانے لگا جن پر غداری کا الزام تھا اور یہ سب شاہی دربار کے معززین اور ان کے اہل خانہ تھے جو رام ناتھ کے دست راست تھے۔

ان میں مرد عورتیں دونوں تھیں۔ ان سب کے ہاتھ پیچھے بندھے تھے اور گلے میں بھاری طوق تھے۔ میدان میں کھلے دائرے میں ان سب کو کھڑا کر دیا گیا۔ پر یہ نے اعلان کیا کہ چند بڑے غداروں کو ملکہ شکنتلا خود سزا دے کر ان سزاؤں پر عمل کا آغاز کریں گی۔

سب سے پہلے رندھیر، کرم سنگھ اور تلک رائے سامنے لائے گئے اور ملکہ کو سزا دینے کی دعوت دی گئی۔ ملکہ شکنتلا آنکھوں میں خوشی اور غرور سجائے چبوترے سے اُتر کر پنڈال میں آنے لگی۔

اس کا خوب صورت لباس اور حسن، عوام کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا، وہ قاتلانہ مسکراہٹ کے ساتھ تینوں قیدیوں کی طرف خراماں خراماں قدم اٹھانے لگی۔ تینوں قیدیوں کو لکڑی کے قدرے بلند چبوتروں پر لٹا کر باندھا گیا تھا۔ پر یہ نے ملکہ شکنتلا کے ہاتھوں میں ایک لمبا چمکدار پھل کا خنجر نہایت ادب سے پیش کیا۔

شکنتلا رندھیر کی طرف آئی اور خنجر اس کی گردن پر رکھ کر آہستگی سے بولی۔

"میرے ارجن کے قاتلو! دیکھ لو آج تم کیسی بے دردی اور بے چارگی کی موت مرو گے۔ ناگن اپنا انتقام پورا کر کے رہتی ہے، چاہے وہ شب کی سیاہی میں کرے یا میری طرح چمکتے سورج تلے۔" رندھیر کی زبان موت کے خوف سے گنگ ہو چکی تھی اور اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبل رہی تھیں۔ اس کے منہ سے بمشکل "وشش...... شکنتلا بہن، نکلا" "ہونہہ بہن، اگر تُو اس وقت بہن کہتا تو نہ تجھے میرے ناگن ہونے کا پتا چلتا، نہ ارجن بے گناہ اور بے بسی کی موت مرتا اور نہ تیرے اوپر یہ وقت آتا۔" "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔" یہ کہہ کر شکنتلا نے زلفوں کو مخصوص طریقے سے جھٹک کر پیچھے کیا اور عوام کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور تیزی سے خنجر رندھیر کی شہ رگ پر پھیر دیا۔ رسیوں سے جکڑا رندھیر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا...... شکنتلا تیزی سے پیچھے ہٹی، تاکہ خون کی دھار اس کے قیمتی لباس کو خراب نہ کر دے۔ پھر تلک رائے کے پاس پہنچی اور بولی "دیکھ تلک رائے، ناگن اپنا انتقام کیسے پورا کر رہی ہے۔ بظاہر تم کو غداری کی سزا مل رہی ہے، لیکن دراصل میں تمہیں ارجن کے قتل میں سزائے موت دے رہی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے شکنتلا نے لذت بھرے انداز سے ہونٹوں کو نیم دائرے کی شکل دی اور سفاکی سے خنجر تلک رائے کے گلے پر پھیرنا شروع کر دیا۔ تلک رائے کا بے بس لاشہ جھٹکے کھانے لگا لیکن شکنتلا اب کرم سنگھ کے اوپر موت بن کر جھک چکی تھی۔

"ہاں تو تم گاؤں کے سرپنچ ہو، پنچایت کے سربراہ اور میرے ارجن کو گھیرنے کی ترکیبیں بتانے والے، اپنے تجربے

تم نے میرے ناگ کو تو گھیر کر جلا ہی دیا، لیکن بھول گئے کہ ناگن اپنا انتقام نہیں بھولتی۔ دیکھ لو، اپنی آنکھوں سے دنیا کا نظارہ آخری بار، اب تمہاری آنکھ نرکھ میں ہی کھلے گی۔" یہ کہتے ہوئے شکنتلا نے خنجر تیزی سے کرم سنگھ کی گردن پر پھیرا تو خون کا فوارہ بلند ہوا، جسے دیکھ کر شکنتلا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا، خون کی پیاسی ناگن اب خون دیکھ دیکھ کر پاگل ہوتی جا رہی تھی۔

شکنتلا نے بڑی مشکل سے اپنا آپ سنبھالا اور واپس چبوترے کی طرف چلنے لگی۔ پر یہ اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ چبوترے کی ایک سیڑھی چڑھ کر شکنتلا کے خون آلود ہاتھ دھلوائے گئے۔ سپاہیوں اور جلّادوں نے پر یہ کا اشارہ پا کر سیکڑوں بے گناہوں کی گردنیں تلواروں سے اتارنی شروع کر دیں۔ پورے پنڈال میں موت کی سی خاموشی طاری تھی، صرف تلواروں کے چلنے کی آوازیں اور قیدیوں کی چیخیں بلند تھیں۔ خون کا دریا پنڈال میں بہنے لگا۔ عوام کو سانپ سونگھ گیا، انہیں نئی ملکہ سے ایسے ظلم اور بربریت کی توقع نہ تھی، لیکن لوگوں کو پتا نہیں تھا کہ یہ تو ابھی آغاز ہے۔ آنے والا وقت تابانہ کے لوگوں کے لیے کیسی نحوست لے کر آ رہا ہے، اس بات کا اگر لوگوں کو قبل از وقت علم ہو جاتا تو تابانہ کی تاریخ شاید مختلف ہوتی۔

سیکڑوں لوگ غداری کے الزام میں مارے گئے۔ یہ وہ تھے جن پر شکنتلا، پر یہ، بلگرام یا ان کے ساتھیوں کو ذرہ برابر بھی سابقہ حکومت کے ساتھ ملنے کا شک گزرا تھا۔

اب مہاراج رام ناتھ کو گھسیٹ کر پنڈال میں لایا جا رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ شکنتلا نے بذات خود تین قیدیوں کو ذبح کیا ہے اور سیکڑوں دوسروں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔ تکلیف کی شدت سے رام ناتھ کی آنکھیں باہر کو اُبل رہی تھیں۔ رام ناتھ کو ساری زندگی مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے شاہانہ زندگی بسر کرنے کے بعد آخرکار ایسی بد نصیب موت کی توقع ہرگز نہ تھی۔ آج رام ناتھ کو احساس ہو رہا تھا کہ جب وہ دوسروں کو معمولی باتوں پر سزائے موت سنایا کرتا تھا تو مرنے سے پہلے ان کی حالت غیر کیوں ہو جاتی تھی۔ مہاراج کو ذبح ہونے والے قیدیوں سے ذرا فاصلے پر لٹا کر اس کے گرد چار طاقت ور گھوڑے کھڑے کر دیے گئے۔ دو مختلف گھوڑوں سے اس کے پاؤں مضبوط زنجیر سے باندھ دیے گئے اور بازو بھی علیحدہ علیحدہ گھوڑوں سے باندھ دیے گئے۔ چاروں گھوڑوں کا رُخ مختلف سمتوں میں کر دیا گیا اور پھر شکنتلا نے ہاتھ اوپر لے جا کر نیچے گرایا تو چاروں گھوڑے، جن پر تجربہ کار گھڑ سوار موجود تھے، مختلف سمتوں میں دوڑنے کے لیے زور لگانے لگے تو مہاراج کا جسم فضا میں جکڑا ہوا بلند ہونے لگا اور مہاراج کسی تار کی مانند کسے گئے۔

بوڑھے مہاراج کی دلدوز چیخیں پنڈال میں موجود ہر شخص سن رہا تھا۔ چاروں گھوڑے مختلف سمتوں میں کھنچے جا رہے تھے اور پھر لوگوں کے اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔ رام ناتھ کے جسم سے خون رسنے لگا اور پھر چڑ چڑ کی آوازوں کے ساتھ رام ناتھ کا جسم چار ٹکڑوں میں چار گھوڑوں کے ساتھ لٹکنے لگا۔ ٹانگوں اور ہاتھوں کے بغیر دھڑ میدان میں اذیت ناک طریقے سے تڑپ رہا تھا۔ عوام کی اکثریت نے یہ منظر دیکھ کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے، لیکن ناگن تخت پر بیٹھی ٹانگ پر ٹانگ رکھے شراب سے دل بہلا رہی تھی۔ رام ناتھ جو کہ اس کا پتی بھی تھا، وہ اس کی کرب ناک موت سے پوری طرح مزہ لے رہی تھی۔ پر یہ بھی اپنی جگہ مطمئن و مسرور بیٹھی مسکراتے ہوئے موت کی خوف ناک سزاؤں پر عمل درآمد ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اسے اب ایسی چیزوں میں مزہ آنے لگا تھا، تاہم بلگرام بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اسے یہ سب کچھ عجیب معلوم ہو رہا تھا، اسے تو شکنتلا کے ناگن ہونے کا پتا بھی اس وقت چلا تھا جب رام ناتھ نے اس کو شکنتلا کے ساتھ گرفتار کر لینے کا حکم دیا تھا، لیکن اس وقت شکنتلا کا ساتھ دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، البتہ سامری جادوگر سپاٹ چہرے کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کے لیے یہ باتیں کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں، کیوں کہ سفلی علوم اور برہم چاری جاپ کے دوران وہ کئی انسانوں کا بلیدان کر چکا تھا۔ وہ تو صرف شکنتلا کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کے روپ میں اب ایک حسین و جمیل لڑکی روزانہ اس کی خواب گاہ میں رونق افروز ہوگی۔ یہ باتیں ابھی سامری سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

☆......☆

سامری کے اس طرح چونک کر کھڑے ہونے کو شکنتلا نے بھی بری طرح محسوس کیا۔

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کیا بات ہے سامری جی...... کیا ہوا......؟"

"شکنتلا میرے لیے فوری طور پر اپنی حویلی کے اندر جادو نگری پہنچنا بہت ضروری ہے، میں آ کر محل میں بات کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے سامری تیزی سے چبوترے کی سیڑھیوں اُترتا چلا گیا۔ شکنتلا حیران و پریشان اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

اب اس کا جشن سے جی اُچاٹ ہونے لگا۔ ویسے بھی اس کے راستے کے سارے کانٹے اور ناگ کے قاتل قتل ہو چکے تھے۔ اس نے جشن ختم کرنے کا عندیہ دیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی، اس کے ساتھ ہی محفل جشن برخاست ہوگئی۔

☆......☆

شام ہوتے ہی شکنتلا نے پریہ کو بلوایا کہ سپہ سالار بلگرام کو خواب گاہ میں بھیج دے اور سابقہ رانی ماریہ کو خواب گاہ سے ملحقہ خفیہ قید خانے میں پہنچا دیا جائے۔ اندھیرا گہرا ہوتے ہی شکنتلا نے مشاطہ کنیزوں کو طلب کر لیا جو اسے مزید خوب صورت کرنے لگیں، پھر شکنتلا نے اپنے سراپے کا خود جائزہ لیا اور بلگرام کے استقبال کے لیے بے تابانہ انتظار کرنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پریہ نے خواب گاہ کے اندر جھانک کر مسکراتے ہوئے بلگرام کی آمد کی اطلاع دی۔ شکنتلا نے جواباً ہنسی کے موتی بکھیرتے ہوئے اسے اندر بھیجنے کی ہدایت کی، تھوڑی ہی دیر میں پردہ ہلا اور بلگرام کی آواز ابھری۔

"ملکہ عالیہ! داس اندر آنے کی آگیا چاہتا ہے۔"

"پدھاریے پردھان منتری پدھاریے۔ چشم ماروشن دل ماشاد" اور بلگرام اندر داخل ہوگیا۔

شکنتلا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے قاتلانہ مسکان کے ساتھ گوری گوری چوڑیوں سے کھنکھناتی عریاں سڈول بانہیں وا کر دیں۔ یہ منظر بلگرام کے لیے قطعی غیر متوقع اور خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔ وہ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا تو شکنتلا انداز دلربائی سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور ہاتھوں سے اسے پھر آگے آنے کا اشارہ دیتے ہوئے ہونٹوں سے پھول بکھیرنے لگی تو غیر شادی شدہ بلگرام کی سانسیں تیز ہونے لگیں۔ اس کے من میں خوشی کے دیپ مزید روشن ہونے لگے۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے ایک ہی جست لگا کر آگے بڑھا اور اس نے بھی اپنے بازو کھول دیے اور دوسرے ہی لمحے شکنتلا بلگرام کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں تھی۔ بلگرام کے ہاتھ شکنتلا کے ریشمی پیرہن سے پھسلتے گئے اور پھر اس نے ایک جھٹکے سے شکنتلا کے خوشبودار ہلکے پھلکے بدن کو بازوؤں سے سہارا لیا۔ شکنتلا کے پاؤں خوب صورت جوتوں سمیت زمین سے اُٹھ گئے۔ اب شکنتلا نے سر کے جھٹکے سے ناگن زلفیں بلگرام کے چہرے پر گرا دیں۔ بلگرام کمرے کے وسط میں پیروں کی مدد سے اپنے محور پر گھومنے لگا۔ شکنتلا کی میٹھی میٹھی خود سپردگی کی مانند ہنسی بلگرام کو یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے پہاڑی جھرنے سے پانی گرنے کی آواز......

☆......☆

بلگرام نہایت سکون سے نیند کی دیوی کی آغوش میں پہنچ چکا تھا، لیکن شکنتلا کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اس کی نیند گہری ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر بعد آہستگی سے مسہری سے نیچے اُتر کر بلگرام کی پائنتی آ گئی ہلکی سی پھنکار کے ساتھ ایڑی کے وزن پر گھوم کر شیش ناگن کا روپ اختیار کر گئی اور پھر مسہری کے پائے کے ذریعے اوپر آ گئی، پھن اُٹھایا اور منہ آہستگی سے بلگرام کے پاؤں پر مار کر زہر کی ہلکی سی مقدار اس کے جسم میں داخل کر دی جس سے بلگرام نیند کی وادی سے بے ہوشی کی گہرائی میں اُتر گیا۔

شکنتلا نے تیزی سے انسانی روپ اختیار کیا، مسہری کے نیچے سے خنجر نکال کر لباس کے اندر چھپایا اور قید خانے میں چلی گئی۔ سامنے فرش پر ماریہ اسے نہایت خوف زدہ اور زخم خوردہ بیٹھی نظر آئی۔ ماریہ رحم طلب نظروں سے شکنتلا کو دیکھنے لگی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے شکنتلا کے قدموں میں گر گئی۔

"ملکہ عالیہ...... میری جاں بخش دیں...... میں سارا جیون آپ کے چرنوں میں باندی بن کر بتا دوں گی۔ میری سانس بھی آپ کی مرضی سے چلے گی۔" ماریہ اس کے قدموں سے لپٹی جیون بھکشا کی طلب گار تھی اور شکنتلا اپنی کمر پہ ہاتھ رکھے اسے طنزیہ نظروں سے مسکراتی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ اسے ماریہ کی بے بسی اور بے سکونی سے سکون مل رہا تھا۔ وہ اس

منظر کا پورا لطف لے رہی تھی۔

ماریہ کو علم تھا کہ شکنتلا ناگن ہے۔ جشن پر بھی اس نے ظلم و بربریت کی نئی تاریخ رقم کی تھی، وہ منظر ابھی ماریہ کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

"کھڑی ہو جاؤ ماریہ......" شکنتلا نے پرسکون لہجے میں کہا۔

ماریہ روتی سسکتی کھڑی ہوگئی۔ اس نے دونوں ہاتھ شکنتلا کے آگے جوڑ دیے۔ اسے اپنی موت کا پورا یقین تھا، اسی لیے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ شکنتلا نے مسکراتے ہوئے خنجر نکال کر سیدھے ہاتھ میں پکڑا اور الٹے ہاتھ سے زلفیں سنوارنے لگی۔

"مہاراج رام ناتھ کو دربار سے میرے کمرے تک کون لے کر آیا تھا؟" شکنتلا نے پوچھا۔ ماریہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ لرزتے ہونٹوں سے دیکھتی رہی، "شیشے میں میرا عکس سب کو کس نے دکھایا تھا؟"

"اور اگر میں پکڑی جاتی تو مجھے آگ میں جلا دیا جاتا، کیوں یہی تمہاری سازش تھی نا؟ بول؟" شکنتلا نے اپنی لانبی زلفوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"مجھے شما کر دیجیے ملکہ عالیہ میں سب کچھ جانتی ہوں۔" ماریہ گڑگڑائی۔

"میرا نام شکنتلا ہے اور میں نسل کی سانپ ہوں۔" شکنتلا نے خنجر کی نوک سے ماریہ کی ٹھوڑی اوپر کرتے ہوئے کہا تو ماریہ کی خوب صورت آنکھیں خوف سے پھیلتی چلی گئیں اور خون کے چھوٹے چھوٹے قطرے اس کی ٹھوڑی پر نمودار ہوگئے۔

"انسانی خون پینا میری ضرورت اور انسانوں کو اذیت ناک اور دردناک موت سے ہمکنار کرنا میرا من پسند مشغلہ ہے۔ جس کے ساتھ کوئی دشمنی نہ ہو، میں اس کا لحاظ نہیں کرتی تم تو میری سوتن ہو۔"

یہ کہتے ہوئے شکنتلا کی آنکھوں میں پراسرار چمک اور لہجے میں سختی اور سفاکی عود آئی۔

ماریہ اتنی دہشت زدہ ہو چکی تھی کہ اس کی زبان بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی اور وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے پنجرے کی سلاخوں سے لگ کر بید مجنوں کی مانند کپکپانے لگی...... پھر شکنتلا نے خنجر اُٹھایا اور نپے تلے قدموں سے پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ ماریہ کی طرف بڑھنے لگی۔

"ملکہ عالیہ۔" ماریہ گھگھیائی۔

"آج تمہیں زندہ رکھوں گی۔" لیکن ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اچانک ایک آواز پیچھے سے آئی......

"سامری کا جادو کبھی جھوٹ نہیں بولتا بلکہ ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔" شکنتلا نے فوراً گردن گھما کر دیکھا تو سامری ایک جانب سلاخوں کے سہارے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"شکنتلا دیوی۔ درخت ہم اُگائیں اور پھل دوسرے کھائیں۔ سامری نے تجھے رام ناتھ سے بچایا، ملکہ بنایا، لیکن خواب گاہ میں بلگرام کو بلایا، بول کیوں؟" سامری کے لہجے میں تلخی نمایاں تھی۔

"سامری جی!" شکنتلا خنجر پھینک کر دوڑی اور تیزی سے سامری کے سینے سے لگ گئی۔ "سامری جی آپ کہاں چلے گئے تھے؟ کچھ بتایا ہی نہیں میں تو پریشان تھی۔ آپ خیریت سے تو ہیں؟" شکنتلا ایک ہی سانس میں کہتی چلی گئی۔ اس کے کومل شریر کی سوندھی خوشبو اور لمس سے سامری کے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔

"شکنتلا دیوی! تمہارے لیے ایک بُری خبر لایا ہوں۔" سامری نے شکنتلا کو الگ کرتے ہوئے کہا۔

"کیسی خبر۔" شکنتلا حیرانی سے بولی۔

"گرو نرائن نے تیرتھ جاپ شروع کر دیا ہے۔"

"یہ کیا ہوتا ہے سامری۔" شکنتلا نے بھولپن سے بانہیں سامری کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ کالی دیوی کا بڑا شبھ جاپ ہے جس سے اس کے سیوک کو ایسی شکتی پراپت ہو جاتی ہے کہ وہ جسے چاہے اپنا غلام بے دام بنا لیتا ہے۔ تو جانتی ہے گرو نرائن کے لیے من پسند مخلوق تُو ہے۔"

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کیا......؟" شکنتلا دھک سے رہ گئی اور اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔

"پرنتو تو چنتا نہ کر شکنتلا دیوی۔" سامری نے اسے کمر سے پکڑ کر زمین سے اُٹھا کر دوبارہ نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"سامری کے ہوتے ہوئے کوئی مائی کا لعل تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے سمترا چڑیل کو بھیج دیا ہے جو گرونرائن کا دھیان بٹا کر عمل کو بھرشٹ کردے گی۔"

"پرنتو تو نے میرا انتظار نہ کیا شکنتلا بلگرام سے پاپ کرلیا نا؟" سامری خفگی سے بولا تو شکنتلا وارفتگی سے اس کے قریب ہوگئی اور بولی۔

"ہم کالی طاقتوں کے سیوک ہیں سامری جی، پاپ ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا، میرا شریر اور میں ہر وقت آپ کی سیوا کرنے کو تیار ہیں۔"

"تو سندرتا دیوی ہے شکنتلا۔" سامری نے اس کو بالوں بھرے سیاہ بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا، لیکن اچانک سامری ایک جھٹکے سے غضبناک نظروں سے چھت کو گھورنے لگا......اور بولا...... "اپرادھی...... تیری یہ جرأت میں خود آرہا ہوں۔" اور پھر چشم زدن میں سامری غائب ہوگیا۔ شکنتلا طویل سانس لے کر رہ گئی اور خنجر اُٹھا کر ماریہ کی طرف بڑھی، ماریہ پر خوف طاری ہوتا چلا گیا۔ شکنتلا اس کے نزدیک پہنچ کر بولی۔ "ماریہ میں تجھے قتل نہیں کروں گی صرف تمہارا خون پیوں گی۔"

یہ کہہ کر اس کا جواب سنے بغیر شکنتلا نے خنجر ماریہ کی کلائی پر چلایا۔ ماریہ سسکائی اور شکنتلا نے فوراً اپنا منہ اس کی کٹی ہوئی کلائی سے لگا دیا۔ ماریہ سسکتی تڑپتی رہی، لیکن شکنتلا ہونٹ اس کی کلائی پر رکھے بڑے مزے سے اس کا خون چوستی رہی۔ ماریہ پر نقاہت طاری ہونا شروع ہوگئی، لیکن شکنتلا اس کی حالت سے بے نیاز تھی۔

کافی دیر بعد جب شکنتلا نے کلائی سے سر اُٹھایا تو وہ خون سے لتھڑے ہونٹوں کے ساتھ ایک چڑیل دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ماریہ کے کپڑے پھاڑ کر پٹی بنائی اور ماریہ کی کلائی پر مضبوطی سے کس دی۔

"کل پھر آؤں گی ماریہ۔" شکنتلا غرائی، لیکن ماریہ کا چہرہ ایک طرف ڈھلک گیا۔

☆......☆

پچھلی پیری سمترا چڑیل سامری کے حکم سے کلکتہ کی طرف اُڑتی ہوئی جارہی تھی۔ زمین سے کئی سو فٹ بلند تھی، رات بھر سفر کے بعد وہ کالی کے مندر میں شمشان گھاٹ میں اسی جگہ اُتری جہاں منڈل کے اندر گرونرائن تیرتھ جاپ میں مصروف تھا۔ گرونرائن کو عمل شروع کیے آج دوسرا دن تھا اور اس دوران اسے کسی پریشانی سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس وقت رات کے آخری پہر ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔

سمترا کچھ دیر منڈل کے آس پاس فضا میں تیرتی رہی، اس کے بعد اس نے لمبا ہونا شروع کیا، اب وہ پچاس فٹ طویل نہایت خوب صورت چڑیل کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ لمبے لمبے دانت باہر نکلے ہوئے اور ناخن بھی بے تحاشہ لمبے تھے۔ اس کے جسم سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ منڈل کے نزدیک ہوتی چلی گئی اور پھر گرونرائن کے سامنے کی طرف آگئی، اچانک ہی اس نے ظاہر ہو کر ایک زوردار چیخ ماری جس سے دھرتی و آکاش لرز گئے، پرندے گھونسلوں سے نکل کر خوفزدگی کے عالم میں اُڑنے لگے۔

گرونرائن نے اس اچانک پیدا ہونے والی چیخ کے نتیجے میں ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ سامنے درختوں سے اونچی چڑیل دیکھ کر اس کے ہوش اُڑنے لگے، ایک لمحے کو وہ جاپ بھول گیا، معاً اسے خیال آیا کہ جاپ کے دوران ناٹک اور شعبدے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ فوراً سنبھلا اور ہاتھ کے اشارے سے چڑیل کو بھاگ جانے کا اشارہ کیا اور اپنے جاپ میں مگن ہوگیا۔

سمترا نے پہلا وار خالی جاتے دیکھ کر ایک بار پھر فلک شگاف چیخ ماری اور اس طرح آگے بڑھی جیسے گرونرائن کو اپنے پنجوں میں دبوچ لے گی۔ اس کے بعد اس نے لامتناہی چیخوں کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ گرونرائن کے لیے جاپ جاری رکھنا مشکل ہوگیا اور وہ بار بار بھولنے لگا۔ چڑیل دیوانہ وار منڈل کے گرد طواف کررہی تھی اور واہی تباہی بک رہی تھی۔ آخر

کار تنگ آ کر گرونرائن منڈل کے اندر کھڑا ہوگیا اور جاپ اونچی آواز میں جپنے لگا۔ اب سمترا نے ایک درخت کو ہاتھ ڈالا تو موٹے تنے کا درخت کڑکڑاتے ہوئے زمین سے باہر آگیا۔ چڑیل نے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر درخت کو سر سے بلند کرکے پورے زور سے گرونرائن کی طرف پھینکا۔ درخت پوری رفتار سے اس کے ہاتھوں سے نکلا اور گولی کی طرح گرونرائن کی طرف بڑھا تو گرونرائن کی آنکھوں میں تشویش کے آثار اُمڈ آئے۔ درخت تیزی سے منڈل کی طرف آرہا تھا اور گرونرائن نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی میزائل نما درخت قریب آیا وہ منڈل میں لیٹ جائے گا، لیکن اگلا لمحہ حیران کن ثابت ہوا۔ جب درخت منڈل کی حدود کو چھو کر واپس پلٹا اور بجلی کی تیزی سے اس کا رُخ الٹا ہوکر سمترا کی طرف ہوگیا اور چشم زدن میں سمترا کی گردن سے ٹکرایا تو تڑاخ کی کانوں کو پھاڑ دینے والی آواز سے چڑیل سمترا کی گردن ٹوٹی اور چڑیل کو آگ لگ گئی، پھر دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلے آسمان سے بلند ہونے لگے۔ سمترا بھسم ہوچکی تھی۔

پورا شمشان گھاٹ سمترا کی چیخوں سے گونجنے لگا، لیکن یہ چیخیں صرف گرونرائن یا جانوروں نے سنیں۔ سمترا کی جلی ہوئی لاش زمین پر پڑی تھی اور پھر لاش گلنے لگی اور بھاپ بن کر ہوا میں اُڑ گئی۔ اب گرونرائن نے بیٹھ کر سکون سے اپنا تیرتھ جاپ پھر سروع کردیا۔ سامری کا یہ وار خالی جاچکا تھا۔

یہ عین وہی لمحہ تھا جب سامری غضب ناک ہوکر شکنتلا کے پاس سے اُٹھا تھا۔

☆......☆

سامری سیدھا جا کر اپنے خاص کمرے جادو نگری میں ظاہر ہوا اور تیزی سے سامنے رکھے ایک مستطیل سنگ مرمر کی شفاف تختی، جسے وہ دار ورشن کہتا تھا، کی طرف بڑھا۔ دونوں ہاتھ اس کے اوپر ایک خاص طریقے سے پھیرے تو پلک جھپکنے میں اس پر ایک منظر نمودار ہوا۔

یہ شمشان گھاٹ کا منظر تھا، جہاں گرونرائن منڈل میں تیرتھ جاپ میں مصروف تھا اور اس کے پاس ہی ایک بہت بڑا ٹوٹا ہوا درخت اور کچھ گدلا سا گرم ابلتا پانی پڑا تھا جس سے ابھی دھواں اُٹھ رہا تھا۔ سامری فوراً سمجھ گیا کہ سمترا چڑیل آگ کی نذر ہوچکی ہے۔ اب سامری کے چہرے پر جلال آنے لگا۔ اس کے نتھنے پھول گئے، آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اس نے مارے غصے کے مٹھیاں بھینچ لیں۔ گرونرائن گزشتہ چند دنوں میں دوسری بار اس کو مات دے گیا تھا۔ پہلی بار جب شکنتلا کے کمرے سے کھڑکی سے چھلانگ لگائی اور غائب ہوگیا اور اب سمترا کی موت کی صورت میں دوسری شکست تھی۔ بات اب سامری کی برداشت سے باہر تھی کہ ایک مہان جادوگر کے مقابلے میں ایک معمولی پجاری فتح یاب ہو رہا تھا اور اگر وہ اپنے عمل میں کامیاب ہوگیا تو شکنتلا اس کی لونڈی بن جائے گی۔ سامری نے فوراً کلکتہ پہنچنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆......☆

دروازے پر سبز رنگ کی پگڑی باندھے خاصے چھوٹے قد کے ایک باریش بزرگ کھڑے تھے اور ان کے ہاتھ میں انڈوں سے بھری ٹوکری تھی۔

"مجھے شاہ صاحب کہتے ہیں۔ دلاور ہٹ جاؤ۔" باریش بزرگ پورے جوش سے بولے اور پھر ہاتھ سے دلاور کو ہٹاتے ہوئے بغیر اجازت تیزی سے اندر گھس گئے۔

دلاور کو ان کے آنے سے تحفظ کا احساس ہوا اور وہ بھی ان کے پیچھے تیزی سے چلتا ہوا کمرے میں آگیا۔

غزالہ اس وقت خون پی کر کھڑی ہوچکی تھی اور اس وقت ایک خون آشام کے روپ میں تھی۔ دلاور اس کو دیکھ کر تھرا اُٹھا۔ شاہ صاحب اندر داخل ہوتے ہی ٹوکری سے انڈے نکال نکال کر غزالہ پر پھینکنے لگے اور ساتھ ساتھ کہنے لگے "عنکبوت میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا، تُو نے شریف لوگوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔"

انڈا جیسے ہی غزالہ کے جسم کو لگتا تو پٹاخہ پھٹنے جیسی آواز اُبھرتی اور ساتھ ہی غزالہ کی بھیانک چیخ نکلتی۔ غزالہ انڈوں کی بارش سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگی، مگر شاہ صاحب مسلسل اسے انڈوں کی یلغار پر لیے ہوئے آہستہ آہستہ گھیر کر اس کو پلنگ کی طرف لارہے تھے۔ آخر غزالہ بے دم ہوکر پلنگ پر گر پڑی اور تیز تیز سانس لینے لگی۔ اس کی سانس کی بھاری

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

آواز سے دلاور کو محسوس ہوا جیسے کوئی درندہ سانس لے رہا ہو۔ اب غزالہ چاروں شانے چت پلنگ پر لیٹ چکی تھی۔

جبار کی گلا کٹی لاش کمرے کے فرش پر پڑی تھی اور خون پورے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔

شاہ جی اب بھی ٹوکری سے انڈے نکال نکال کر غزالہ پر پھینک رہے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ٹوکری اب بھی انڈوں سے لبالب بھری ہوئی تھی۔

"عنکبوت! میں نے رات ہی پیغام بھجوا دیا تھا کہ انسانوں کی بستی سے دور نکل جاؤ، لیکن تو نے میری بات نہ مانی......" شاہ صاحب اپنے پستہ قد کے ساتھ غصّے سے لرز رہے تھے۔

"میرے راستے سے ہٹ جاؤ شاہ جی...... ورنہ پچھتانے کے لیے بھی وقت نہ ملے گا۔" غزالہ جو پلنگ پر لیٹی تھی ایک دم بھاری مردانہ آواز میں بولی اور پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کو اُٹھتے دیکھ کر شاہ جی نے پھر تیزی سے دو انڈے نکال کر اس پر پھینکے تو وہ پھر پلنگ پر گر گئی...... دلاور ان تمام مناظر کو دیکھ کر حواس باختہ ہو رہا تھا...... غزالہ کی شکل اور آواز سے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے اندر کوئی بدروح حلول کر گئی ہو۔

اب شاہ صاحب نے غزالہ کے پلنگ کے اردگرد انگلی سے دائرہ لگانا شروع کر دیا۔ جیسے ہی انہوں نے دائرہ لگانا شروع کیا غزالہ پھر اُچھل کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں ایک دم بہت پھیل گئیں اور پھر اس کے حلق سے فلک شگاف چیخ بلند ہوئی اور وہ تیزی سے شاہ صاحب کی انڈوں کی ٹوکری پر جھپٹی اور ٹوکری کو زوردار جھٹکا دیا۔ شاہ صاحب ٹوکری بچانے کے لیے تیزی سے پیچھے ہٹے تو فرش پر پڑی جبار کی لاش سے ٹکرا گئے اور پشت کے بل فرش پر گر گئے، انڈوں کی ٹوکری ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ گرتے ہی تمام انڈے ٹوٹ گئے اور ان سے سرخ رنگ کا دھواں نکلنے لگا۔ دھوئیں نے پلک جھپکتے میں پورے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دلاور کو کوئی شے دکھائی نہ دے رہی تھی۔

اس کو ڈر لگنے لگا، کیوں کہ شاہ صاحب اور غزالہ دونوں کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ لہٰذا دلاور جو دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا کمرے سے نکل کر صحن میں آ گیا۔ گلی محلے کے لوگ شور شرابہ سن کر اکٹھے ہو چکے تھے۔ انہوں نے دلاور کو گھیرے میں لے لیا اور استفسار کرنے لگے، لیکن دلاور کی زبان گنگ تھی۔ وہ کسی کے سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔ تھوڑی دیر میں سرخ دھواں کم ہونے لگا تو سب لوگوں نے کمرے کا رُخ کیا، دلاور بھی ان کے ساتھ تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کی خون آلود لاش آڑھی ترچھی کمرے میں پڑی تھی، جسم پر کوئی زخم نہ تھا، جبکہ خون مساموں سے بہہ نکلا تھا۔ سارے جسم پر خون کے قطرے تھے، جو جم چکے تھے جبکہ غزالہ کے حلق سے انتہائی کرخت، بھدی، مردانہ اور کھردری آواز نکلی جو کہ غزالہ کی اپنی آواز ہرگز نہ تھی۔

"دلاور تُو نے میرے بچوں کو زخمی کیا، میں نے تیری بچی سے بدلہ لے لیا، اب تیری پتنی غزالہ مجھے پسند آ گئی ہے، لہٰذا اس کو میں اپنے پاس بلا رہا ہوں، اب اس کا وچار اپنے من سے کھرچ دے اور اسے بھول جا، اب غزالہ میری ہے۔ شانتی چاہتا ہے تو اب کسی عامل کے چکر میں نہ پڑنا، میرا نام عنکبوت ہے، عنکبوت...... ہاہاہا...... ہی ہی ہی...... ہو ہو ہو...... ہے ہے ہے۔"

غزالہ چارپائی پر لیٹی دیوانوں کی طرح ہنس رہی تھی اور پھر پورا کمرہ زلزلے سے لرزنا شروع ہو گیا۔ کمرے کے اندر موجود تمام لوگ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

غزالہ جس چارپائی پر لیٹی تھی وہ زیادہ لرز رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے غزالہ جو چاروں شانے چت لیٹی تھی، اسی حالت میں چارپائی سے اُوپر کو اُٹھنے لگی۔ وہ کمرے کی فضا میں لیٹی ہوئی حالت میں اوپر اُٹھ رہی تھی۔ قہقہے اس کے حلق سے اسی طرح نکل رہے تھے وہ اور اُوپر اُٹھی اور چھت کے ساتھ لگ گئی۔ اب چھت کی کڑیاں کڑکڑانے لگیں اور مٹی اینٹیں اور بالے چیخ کر نیچے گرنے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اوپر کئی افراد چھت تیزی سے توڑنے میں مصروف ہوں۔ ذرا سی دیر میں چھت کے اندر بہت بڑا سوراخ ہو گیا۔ کمرہ گرد و غبار سے اَٹ گیا اور غزالہ لیٹی لیٹی چھت سے باہر نکلتی چلی گئی۔ اس کے معدوم ہوتے قہقہے اب بھی سنائی دے رہے تھے۔ چھت سے اوپر ہوتے ہی دلاور سمیت تمام لوگ کمرے سے باہر نکل کر

چھت کی طرف بھاگے لیکن؟ چھت پر پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ وہاں مکمل خاموشی تھی۔ غزالہ کا نام و نشان تک نہ تھا اور چھت بھی ایسے برابر تھی جیسے توڑی ہی نہ گئی ہو۔

☆......☆

دلاور کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ بیٹی کے بعد بیوی کی جدائی اسے بھری دنیا میں تنہا کر گئی تھی۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا، اس کی زندگی بے رنگ و بے کیف ہو چکی تھی۔

اچھی خاصی صحت و رنگت رکھنے والا نوجوان دلاور برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا تھا، کام کاج ختم ہو چکا تھا۔ اس کی رات کروٹیں بدلتے اور دن سوتے اور سوچتے گزرتا۔ ہمسائے بھی سارا دن ہمدردی جتانے کے لیے آتے رہتے لیکن اس کے زخموں کا مسیحا تو کوئی نہ تھا اس کے غم کا علاج تو کسی کے پاس نہ تھا، تاہم پھر بھی لوگوں کے آ کر تسلی تشفی دینے سے اس کا حوصلہ بڑھ جاتا اور دل بھی لگا رہتا۔ اب تک تو کھانا پینا بھی اس کا اہلِ محلّہ کے دم سے ہی تھا۔

سارا دن محلے کی عورتیں اور مرد آتے اور بھانت بھانت کی بولیاں بولتے، انہی میں سے کچھ لوگوں نے اسے سائیں مرچو کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا۔ لوگوں نے اسے بتایا تھا کہ سائیں مرچو کے اپنے قبضے میں بھی کئی جن ہیں، بہت بڑا عامل ہے۔

"عامل تو بابو جی بھی تھے، جو جنات کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جنوں کو حاضر تو شاہ صاحب بھی کرتے تھے، لیکن عنکبوت کا نشانہ بن گئے۔" دلاور مایوسی سے بولا۔

"عاملین کے بھی درجے ہوتے ہیں دلاور......" ایک بزرگ شخص اسے بتانے لگا۔ "سائیں مرچو تو درجہ اوّل کے عامل ہیں۔ جنات تو خود ان کے کام کرتے ہیں، تمہیں ایک بار ان کے پاس حاضری ضرور دینی چاہیے۔"

دلاور نے بھی سوچا، کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔ ہوسکتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کوئی سبب پیدا کر دے اور غزالہ کا کوئی سراغ مل جائے۔ غزالہ کا خیال آتے ہی اس کا دل بھر آیا تھا۔

اس وقت بھی دلاور گھر میں تھا۔ دن کو کافی لوگ حال پوچھنے آئے تھے اور ایک ایک کر کے اب سب جا چکے تھے۔ غزالہ کے واقعہ کو آج دس بارہ روز گزر چکے تھے اور اس کے بعد کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہوا تھا، دلاور کا خیال تھا کہ جلد سائیں مرچو کے گاؤں جائے گا جو یہاں سے تقریباً دس کوس تھا۔ رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ دلاور انہی سوچوں میں غرقاب آہستہ آہستہ نیند کی وادی میں اُتر گیا۔

رات کے کسی پہر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔

اسے اپنے بستر پر کسی دوسرے وجود کا احساس ہوا۔ گھپ اندھیرے میں اس احساس کے اُبھرتے ہی دلاور خوف سے کانپنے لگا۔ دہشت سے اس کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ خنک موسم میں بھی اسے پسینا آ گیا۔

"ڈرو نہیں...... دلاور میں ہوں...... غزالہ"

"غزالہ......؟" دلاور کے خوف پر حیرت غالب ہو گئی۔ "تت...... تم...... تو...... عنکبوت...... جن......" دلاور کی زبان لڑکھڑا گئی...... اس کی عقل اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ غزالہ کی اس وقت اس کے بستر پر موجودگی، اس کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کر گئی۔ وہ اس بات کو عقل کے کسی خانے میں فٹ نہ کر سکا، کیوں کہ اسے یاد تھا کہ وہ رات کو تمام کھڑکیاں دروازے بند کر کے سویا تھا۔

"چھوڑو سب باتوں کو دلاور آؤ مجھے اپنی بانہوں میں لے لو۔ میں بڑی مشکل سے آئی ہوں، میں بکھر چکی ہوں، مجھے سمیٹ لو۔ غزالہ کی اپنائیت سے بھرپور باتیں دلاور کا دل سنبھال گئیں۔"

☆......☆

صبح جب دلاور کی آنکھ کھلی تو دن خاصا نکل چکا تھا۔ دلاور نے بھرپور انگڑائی لی۔ رات کا واقعہ اسے یاد آیا تو بے اختیار اس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"غزالہ......" دلاور نے زور سے غزالہ کو آواز دی، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ "غز......ا......لہ......" دلاور نے پھر با آواز بلند پکارا لیکن جواب ندارد......اب دلاور کو تشویش ہوئی کہ غزالہ کہاں گئی۔ وہ جلدی سے بستر سے اترا اور تیزی سے پورا گھر چھان مارا لیکن غزالہ تو ایسے غائب تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

دوپہر کو جب اس نے ہمسائیوں کو بتایا کہ رات کو غزالہ آ گئی تھی اور صبح پھر چلی گئی ہے تو لوگوں نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ دلاور اس واقعے کے بعد واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ وہ کیسے اس بات کو مان لیتا کہ غزالہ اس کے خواب میں آئی تھی۔

اس کے بعد چند دن خاموشی سے گزر گئے۔ ایک رات پھر ایسے ہی ہوا دلاور رات کا کھانا کھا کر ذرا باہر ٹہلنے کے لیے نکل گیا۔ واپس آیا تو گلی کا دروازہ کھلا تھا اور غزالہ در تھامے کھڑی تھی۔

دلاور کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ غزالہ نے اس وقت اچھا خاصا بناؤ سنگھار کیا تھا۔ جیسے وہ ابھی کسی خوشی کی تقریب سے واپس آئی ہو۔ دلاور حیران تھا کہ تالے کی چابی تو اس کے پاس تھی۔ غزالہ نے دروازہ کیسے کھولا، لیکن غزالہ نے اسے یہ سوچنے کی مہلت ہی نہ دی اور ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر لے گئی۔

دلاور آج اس سے ساری باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ اپنی تمام اُلجھنیں دور کرنا چاہتا تھا، لیکن غزالہ نے اسے چارپائی پر بٹھایا اور خود اس کے قدموں میں سر رکھ کر رونے لگی۔ "دلاور......" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "مجھے معاف کر دو میں نے تمہیں بہت دُکھ دیے ہیں۔"

دلاور اس کو تسلیاں دینے لگا اور کوئی سوال نہ پوچھ سکا......لیکن؟ جب صبح اُٹھا تو غزالہ کا نام و نشان نہ تھا......اب دلاور کو اپنے دماغ پر شبہ ہونے لگا اور اس نے فوری طور پر سائیں مرچو کے ڈیرے پہنچنے کا تہیہ کر لیا۔

☆......☆

ایک زناٹے دار آواز کے ساتھ سامری گرونرائن کے قائم کردہ حصار سے بولا۔

"چوہے کی اولاد......تُو نے میری سمترا کو تباہ کر دیا۔ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ میرا نام سامری جادوگر ہے، جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اب بھی وقت ہے منڈل سے باہر آ کر میرے چرن چھو کر ڈنڈوت کر کے مجھے گرو مان کر میرا چیلا بن جا۔ تیری شما کی صرف یہی آخری صورت ہے، ورنہ تیری آتما بھی چین نہ پائے گی۔"

گرونرائن نے اس کی تیز آواز سن کر اپنی آنکھیں کھولیں اور ہاتھ کے اشارے سے اسے بھاگ جانے کا اشارہ کیا اور تیزی سے ہونٹ ہلانے لگا۔

سامری نے اس حرکت سے مزید غضب ناک ہو کر دونوں ہاتھ پھیلائے تو گرونرائن کو اپنے عقب میں سے کئی شیروں کے ایک ساتھ دھاڑنے کی آوازیں آئیں۔ یہ آوازیں اسے بالکل پشت پر محسوس ہوئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے شیر اس کی گردن پر اپنا پنجہ مارنے ہی والے ہیں۔ گھبرا کر گرونرائن نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو اسے عین اسی لمحے اپنے آگے کی طرف اس سے بھی زیادہ شیر دھاڑتے محسوس ہوئے تو گرونرائن بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور اسی بوکھلاہٹ میں اس کا ایک پاؤں منڈل سے باہر آ گیا۔ بس اسی لمحہ کا سامری کو انتظار تھا کہ ایک دفعہ گرونرائن منڈل سے باہر ہو جائے۔

سامری نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اس کا پاؤں پکڑ لیا اور گھسیٹ کر منڈل سے باہر لا پھینکا۔ اب بازی الٹ چکی تھی، پانسہ پلٹ چکا تھا، سامری نے جے کالی ماتا کا نعرہ بلند کیا اور اس کے ساتھ ہی دونوں ہاتھ گرونرائن کی طرف کر کے زور سے جھٹکے دیے تو گرونرائن کو اپنے تن بدن میں شعلے گھستے ہوئے محسوس ہوئے، اس کے چاروں طرف آگ لگ چکی تھی۔ وہ شعلوں میں گھرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گرونرائن نے عجلت سے اوجھل جاپ پڑھا۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے اور سامری جے کالی کا نعرہ لگا کر فوراً اپنی جگہ سے غائب ہو گیا اور پھر اپنی جادونگری میں جا کر ظاہر ہوا۔

☆......☆

سامری اور شکنتلا دونوں باغ میں ٹہل رہے تھے۔ سامری ابھی ابھی اس کے کمرے میں آیا تھا اور شکنتلا اس وقت باغ کی سیر کے لیے کنیزوں کے ہمراہ نکلنے ہی والی تھی۔ سامری کے آنے پر اس نے کنیزوں کو اپنے سے دور رہنے کا حکم دیا اور اب وہ دونوں نہر کنارے ساتھ ساتھ ٹہل رہے تھے۔

"گرونرائن کا وہ حشر کیا ہے کہ اس کی آتما ابد تک نرکھ میں بیاکل رہے گی۔" سامری نے شکنتلا کو خوش خبری سنانے کے انداز میں مخاطب کیا۔

"وہ کیسے؟" شکنتلا نے سامری کے ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"بڑا مہان پنڈت بنا پھرتا تھا، پرنتو وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ سامری کا جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ایک ہی ناٹک میں اسے منڈل سے باہر لا پھینکا اور پھر آگ اس کو ایسے کھا گئی جیسے سوکھی لکڑی کو۔" سامری نے سینہ پھلا کر اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہوئے کہا اور شکنتلا مارے خوشی سے اس سے لپٹتے ہوئے بولی۔

"سامری تیرا جواب نہیں۔ تُو مہان ہے مہان۔"

"اس میں شک بھی کیا ہے۔" سامری خوشی اور فخر سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ "لیکن مجھے سمترا کے المناک انجام کا بے حد قلق ہے شکنتلا۔" سامری ایک دم اُداس ہوتے ہوئے بولا۔ "وہ میری دست راست تھی، اس کی موجودگی میں مجھے بہت کم کام خود کرنے پڑتے تھے، وہ ہر جگہ سے ہر خبر لے آتی تھی۔ اب سامری اکیلا رہ گیا ہے۔" سامری بدستور رنجیدہ تھا۔

"تو کیا سامری۔ سمترا کے علاوہ تیرے پاس کوئی اور شکتی نہیں۔"

"یہ بات نہیں شکنتلا۔ پرنتو سمترا بڑی خاص چیز تھی۔ شکتیاں تو میرے پاس اَن گنت ہیں۔ بے شمار بیر، مہابیر اور سنکھے میرے ایک اشارے پر پہاڑوں کو اُلٹا سکتے ہیں۔ سامری نے سارا جیون کٹھن تپسیا میں گزار کر دیوتاؤں کے آشیرباد لے رکھے ہیں۔ سامری آج اس نہج پر ہے کہ موت بھی اس کے قریب آنے سے قبل سوچے گی ضرور۔"

"روپ تو ہر ایک میں بھی دھار سکتی ہوں سامری......" شکنتلا نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتا ہے۔" سامری اپنا گنجا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اب خواب گاہ میں آ چکے تھے، باہر اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ شکنتلا اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی اور سامری بڑی سی کرسی پر بیٹھ گیا۔ شکنتلا نے تمام باندیوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ تخلیے کے بعد وہ قدم قدم چلتی سامری کی کرسی کے پاس آئی اور پھر اس کے پاؤں میں بیٹھ کر دونوں ہاتھ سامری کی پنڈلیوں کے گرد لپیٹ کر اپنی ٹھوڑی اس کے گھٹنوں سے لگا دی اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں سامری کی آنکھوں میں ڈال کر بولی۔

"سامری مجھے بھی اپنی شاگردی میں لے لو، میں بھی جادو سیکھوں گی۔"

"تُو تو خود بہت بڑی ساحرہ ہے شکنتلا۔" سامری اپنی بھدی انگلی اس کے ہونٹوں پر رکھ کر پیار سے بولا۔ "تیرے حسن کا جادو جس پر چل جائے وہ دنیا سے بیگانہ اور تیرا دیوانہ ہو جاتا ہے۔"

"مجھے ٹالو نہیں۔" شکنتلا منہ بسورتے ہوئے بولی۔ "میں ہر وقت ڈرتی رہتی ہوں کہ کسی دن میرے دشمن مجھے آگ میں نہ جلا دیں اور پھر تلوار اور نیزہ بھی تو مجھے کاٹ کر رکھ سکتے ہیں اور میں ابھی دنیا کا مزہ لینا چاہتی ہوں، مرنا نہیں چاہتی۔ تم مجھے کوئی ایسا عمل بتا دو کہ میرا جیون محفوظ ہو جائے، تاکہ ہم دونوں امر ہو جائیں اور آزادی سے جیون کا لطف لیں۔"

"تو پرتعیش زندگی کی عادی ہوتی جا رہی ہے شکنتلا، جبکہ سفلی علم، کالا جادو کرنے کے لیے من کو مارنا پڑتا ہے، بڑے کشٹ کاٹنے پڑتے ہیں۔ کٹھن تپسیا کرنی پڑتی ہے۔ دیوی دیوتاؤں کو رام کرنا معمولی بات نہیں۔ جان جوکھوں کا کام ہے، عمل غلط ہونے یا دھیان بٹنے کی صورت میں جان بھی جا سکتی ہے۔"

"مجھے منظور ہے، میں کروں گی، آج سے تو میرا گرو اور میں تیری چیلی ہوں سامری۔" شکنتلا خوشی اور بے تابی سے کھڑی ہوتی ہوئی بولی اور سامری کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی اپنے پلنگ کی طرف چل پڑی۔

☆......☆

سامری، شکنتلا، بلگرام اور پریہ چاروں تابانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

خلاف نہ ہوسکتا تھا۔ عوام کی فلاح کا کوئی خیال نہ تھا۔ ہر طرف ظلم کا راج تھا اور تمام موقع پرست ان کے گرد رہنے لگے۔ پر یہ محل کے ہر کام پر اثر انداز تھی۔

شکنتلا کو ہر دوسرے تیسرے دن تازہ انسانی خون فراہم کیا جاتا۔ عیاشی دونوں کی عادت بن گئی۔ شکنتلا جسمانی تسکین کے بعد اسی مرد کا خون پی لیتی۔ سامری اور بلگرام بھی شکنتلا پر پورا حق رکھتے تھے بلکہ محل اور ریاست کی جس کنیا کو چاہتے اٹھوا لیتے۔ پر یہ ریاست کے ہر فرد سے اس کی آمدن سے معقول لگان حاصل کرتی جس کی وجہ سے خزانہ بھرنے لگا اور عوام غربت اور ظلم کی چکی میں پسنے لگے۔ ہر ماہ کالی کے مندر کے احاطے میں شاہی عدالت لگتی اور سزا اور انصاف کے نام پر سیکڑوں بے گناہ...... اذیت ناک طریقے سے مروا دیے جاتے۔ پر یہ اور شکنتلا کی شاہی سواری کے آگے انسان جتے ہوتے تھے، جن پر شاہی جلاد مسلسل کوڑے برساتے۔ انسانوں کی چیخیں اور خون کے اُڑتے چھینٹے پر یہ اور شکنتلا کی تسکین کا باعث بنتے۔ بلگرام گو عام سا سپہ سالار تھا لیکن ظلم کے اس سیلاب میں وہ بھی بہ نکلا۔ وہ جانتا تھا کہ شکنتلا اور سامری مہان شکتیوں کے مالک ہیں، ان سے ذرا سا اختلاف اسے عبرت ناک انجام سے دوچار کرسکتا ہے اور سامری کے لیے تو جادو ہی سب کچھ تھا۔ انسانی زندگی یا حکومت اس کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ تابانہ میں ہر طرف ظلم کی آندھی چھا چکی تھی۔ شریف طبع امراء اور درباری گوشہ نشین ہو چکے تھے۔

کسی کی عزت محفوظ نہ تھی، انصاف ناپید اور خوشحالی عوام کی دسترس سے دور ہونے لگی۔ ہر جگہ پر کالا راج قائم ہوگیا۔ ادھر شکنتلا نے سامری کو رام کرلیا تھا۔ سامری اسے عمل کرنے کا طریقہ اور جاپ بتا دیتا تھا جو شکنتلا کے لیے مشکل نہ تھا، کیوں کہ یہ اس کا من پسند شوق تھا۔ اس عمل کی رو سے اسے کالی دیوی کو رام کرنا تھا۔

منتر نوے ہزار مرتبہ پڑھنا تھا۔ منتر پڑھنے کے ساتھ ساتھ چھری یا خنجر کی تیز نوک انسانی پیٹ میں دائیں سے بائیں طرف گھماتے ہوئے پیوست کرنی تھی۔

یہ ایک کالا عمل تھا لیکن مہان شکتی کے حصول کے لیے شکنتلا اس سے بھی نچلی سطح پر جا سکتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ کرنے پر بخوشی تیار ہوگئی۔ شکنتلا نے تیاری کرنی شروع کردی اور کالی کے مندر میں بڑے ہال کے بیچوں بیچ کالی ماتا کے بت کے نیچے یہ عمل کرنے کی ٹھانی۔ اس مقصد کے لیے عام لوگوں کے لیے مندر بند کرنے اور مندر کے چاروں طرف فوج کا پہرہ لگا دینے کا حکم جاری ہوا۔ مندر کے ایک گوشے میں سلاخوں سے بنے ہوئے بہت بڑے مضبوط پنجرے کا بندوبست کیا گیا، جس میں تمام قیدی جو بلیدان ہونے تھے، سما سکیں۔

☆......☆

کالی دیوی کے مندر میں شکنتلا سامری کے بنائے ہوئے منڈل میں اپنا جاپ شروع کرچکی تھی۔ سامری اس جاپ کی براہ راست نگرانی کر رہا تھا اور پر یہ شکنتلا کی مدد کے لیے اس کے پاس موجود تھی۔

شکنتلا اب تک کئی قیدی کامیابی سے ذبح کرچکی تھی۔ مندر کے ہال میں خون ہی خون نظر آرہا تھا۔ سامری قریب ہی ایک کرسی پر براجمان انتہائی چوکنا تھا۔

ہال میں مکمل خاموشی تھی اور ہال کی دیواروں کے ساتھ بنی ہوئی رنگ برنگی مورتیاں اور کالی کا زبان نکالے کھڑا سیاہ بت اندھیرے میں خوف ناک منظر پیش کر رہا تھا، باقی ریاست کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ کالی کے مندر کے اندر کیسا گھناؤنا اور انسان کش کھیل کھیلا جارہا ہے۔ بیروں کی شکتی حاصل کرنے اور کالی دیوی کو رام کرنے کے لیے یہ عمل ابھی تین دن مسلسل جاری رہنا تھا اور آج پہلا دن تھا۔

☆......☆

اوجھل جاپ کے مکمل ہوتے ہی گرو نرائن اپنی جگہ سے غائب ہوگیا۔ اب آگ کے شعلے اس پر کوئی اثر نہ کر رہے تھے، لیکن منتر پڑھنے سے قبل جو آگ اس کے جسم کو جھلسا چکی تھی۔ اس کی تکلیف سے ہی اس کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ سامری اس کی موت کو یقینی جان کر جا چکا تھا، لیکن گرو نرائن آہستہ آہستہ شعلوں سے باہر آیا اور کالی کے مندر کی طرف چل

پڑا، تاکہ کوئی نئی تدبیر کرسکے۔

اپنی کوٹھڑی میں پہنچ کر وہ لیٹ گیا۔ اس کو جاپ ادھورا رہ جانے کا بہت قلق تھا۔ مکمل ہونے کی صورت میں شکنتلا اس کی داسی بن جاتی اور وہ مہان ہوجاتا، لیکن اب اس کے لیے یہی کافی تھا کہ سامری کے خیال میں وہ زندہ جل چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ دوبارہ منڈل بنا کر جاپ شروع کردیا جائے، کیوں کہ اب سامری اس کی طرف سے غافل تھا، لہٰذا اگلے دن وہ حکیم سے جلے حصے پر لیپ کرنے کی دوا لے آیا اور اس کو سارے شریر پر مل لیا، جس سے اس کو سکون آ گیا، رات تک وہ کافی آرام محسوس کرنے لگا۔

اور پھر چند دن بعد ایک رات کے آخری پہر تیرتھ اشنان کرکے دوبارہ شمشان گھاٹ آکر منڈل کھینچ کر بیٹھ گیا اور اپنا جاپ شروع کردیا۔

شکنتلا کالی دیوی کا جاپ مکمل کرنے کے بالکل نزدیک تھی۔ وہ اس وقت مکمل خون آشام نظر آرہی تھی۔ اس کا سارا جسم، ہاتھ، پاؤں، منہ، سر خون سے بھرے ہوئے تھے۔ کئی دنوں سے خون دیکھ دیکھ کر اس پر وحشت سوار ہوچکی تھی، کیوں کہ بلیدان کا خون وہ نہ پی سکتی تھی۔

وہ آخری منتر جپنے لگی۔ اچانک مندر میں لگی تمام گھنٹیاں آہستہ آہستہ بجنے لگیں۔ سامری چونک پڑا اور اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہونے لگے اور اس نے فوراً سر پھیر کر کالی دیوی کے بت کو دیکھا تو دیوی کی سرخ زبان اور کالے سیاہ ہاتھ آہستہ آہستہ ہلنے لگے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بھجن گانے کی آوازیں اُبھریں۔ محسوس ہو رہا تھا کہ کئی دیو داسیاں مل کر کورس کے انداز میں دھیمے لہجے کے اندر بھجن گا رہی ہوں۔ مندر کی گھنٹیاں اس کورس میں ان کی سنگت کر رہی تھیں۔ وہ اب زیادہ مستعدی سے اپنا عمل جاری رکھے ہوئے تھی۔ خاصی دیر تک وہ منتر پڑھتی رہی۔ گھنٹیاں بجتی رہیں، دیو داسیاں بھجن گاتی رہیں اور کالی دیوی کی سرخ زبان ہلتی رہی۔ اب شکنتلا منتر مکمل کرنے کے نزدیک تھی۔

آخری بلیدان مکمل ہو رہا تھا۔ اب شکنتلا نے اپنا جاپ مکمل کرلیا تھا۔ اس کی خوف ناک صورت دیکھی نہ جاتی تھی۔

اچانک دیوی نے زور سے سانس اندر کی طرف کھینچنا شروع کیا تو فرش پر بکھرا خون دھار کی شکل میں اُٹھنے لگا اور سیدھا دیوی کی ہلتی زبان کے اوپر پڑنے لگا۔ سانس جو اندر کھینچا جارہا تھا، اس میں کوئی وقفہ نہ تھا۔ فرش پر بکھرا خون اب دیوی کی زبان پر گر کر غائب ہو رہا تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر ساکت تھے۔ سامری نے شکنتلا کو اپنے منڈل سے باہر آنے سے منع کردیا تھا۔ وہ نڈھال سی کھڑی تھی۔ اچانک گھپ اندھیرا چھا گیا۔ تمام شمعیں اور دیے بجھ گئے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ کوئی آدمی دوسرے کو نظر نہ آرہا تھا۔ اندھیرا قبر کے اندھیرے سے بھی گہرا ہونے لگا، لپ لپ کی آواز بدستور آرہی تھی، جیسے کوئی درندہ خون یا کچھ اور پی رہا ہو یا زبان سے کچھ چاٹ رہا ہو، پھر آہستہ آہستہ اندھیرا کم ہونے لگا۔ ایک دوسرے کے چہرے دکھائی دینے لگے۔ دور ایک کونے سے اوپر کی جانب سے روشنی گہری ہونے لگی، جیسی صبح صادق کے وقت پو پھٹتی ہے۔ اب کمرہ صبح کی روشنی کی مانند روشن ہوگیا۔ شکنتلا، پر یہ، سامری اور دونوں غلام موجود تھے اور حیرانی سے چاروں جانب دیکھ رہے تھے جہاں خون کا ایک چھینٹا تک نہ تھا۔ کوئی لاش وہاں نہ تھی، ان کے جسموں پر بھی خون کا کوئی نشان نہ تھا۔ تمام لوگ صاف ستھرے لباسوں میں تھے، جیسے بلیدان اور جاپ سے پہلے پہنے آئے، بالکل ویسے ہی تھے۔

ابھی وہ حیران ہی تھے کہ اچانک بھیانک اور کرخت آواز اُبھری جو کسی عورت کی معلوم ہوتی تھی۔

''شکنتلا......''

''جی دیوی جی......'' شکنتلا کی زبان سے غیر ارادی طور پر نکلا۔

''تو نے وہ جاپ کیا، جو بڑے بڑے مہان پنڈت پجاری نہ کر پائے۔ تُو آج سے کالی ماتا کی مہا سیوک ہے۔ کالی کے مہابیر اب تیرے داس ہیں۔ تیرے ایک اشارے پر تیری بھاؤنا پوری کریں گے۔ شکنتلا تو نے کالی کی وہ پیاس بجھائی جو صدیوں کی تھی۔ کالی ماتا تجھ سے بہت خوش ہے اور تجھے آشیرباد کا تلک لگایا جاتا ہے۔ سامری نے بھی تیری جو سہائتا کی ہے، وہ بھی تعریف کے لائق ہے۔ تم دونوں مل کر کالی طاقتوں کے لیے کام کرو۔''

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے ساتھ ہی کالی دیوی خاموش ہوگئی۔ سامری کے اشارے سے اب شکنتلا منڈل سے باہر آ گئی اور دوڑ کر سامری سے لپٹ گئی۔ مارے خوشی کے اس کی زبان سے لفظ نہیں نکل رہے تھے۔

''سامری! سامری آج سے میں بھی جادوگرنی ہوگئی ہوں۔ میں بھی مہان ہوں۔ مجھے کالی دیوی نے آشیرباد دی ہے۔'' اور سامری نے شکنتلا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ دونوں مندر سے ایک دم غائب ہوگئے۔ دونوں غلام حیران تھے، لیکن پریہ مسکرانے لگی۔ وہ سمجھ گئی کہ سامری شکنتلا کو لے کر شاید محل پہنچ گیا ہوگا اور اب وہ دونوں کئی دنوں کی تھکاوٹ اُتاریں گے۔

شکنتلا اب صرف ایک ناگن نہ تھی بلکہ جادوگرنی بن چکی تھی۔ کالی دیوی کے بیروں کی بجائے مہابیر اس کے قبضے میں تھے۔ عام قسم کے جادوگر اس کے سامنے کوئی چیز نہ تھے۔ پریہ یہ بات اچھی طرح سمجھتی تھی کہ شکنتلا اب اور زیادہ طاقتور اور بااختیار ہو چکی ہے، لہٰذا پریہ نے اس کی خوشامد اور چاپلوسی میں اضافہ کرنے کا سوچ لیا۔ سامری اور شکنتلا مندر سے سیدھے خواب گاہ پہنچے تھے۔ آرام و سکون کرنے کے بعد اگلی صبح کو ہی بیدار ہوئے۔ شکنتلا نے لیٹے لیٹے خوب صورت انداز میں دونوں ہاتھ اُٹھا کر انگڑائی لی تو حسن مرکز کی طرف مائل بہ پرواز ہونے لگا۔ سامری نے بھرپور نظروں سے اس کے وجود کو جانچا اور مسکرا دیا۔

''جادوگری کی دنیا میں پہلی صبح مبارک ہو شکنتلا دیوی۔'' تو شکنتلا نے مسکرا کر ہاتھ نیچے گرا دیے اور میٹھی نظروں سے سامری کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''سامری اگر تم نہ ہوتے تو یہ صبح بھی نہ ہوتی۔ یہ کامیابیاں بھی نہ ملتیں۔ تم میرے محبوب ہو۔ تمہی میرے گرو ہو، میں اپنا سارا جیون تمہارے سنگ بتانے کی بھاؤنا رکھتی ہوں۔ اب سارے جگ پر ہمارا راج ہوگا۔ پرنتو میں نے ابھی تک اپنی شکتی کو آزمایا نہیں۔''

''تو آج آزما لیں گے۔'' سامری نے لاپروائی سے کہا۔ ''کالی ماتا تجھ سے بہت خوش ہو چکی ہے شکنتلا۔ یہ بہت بڑی بات ہے تیرے ماتحت مہابیر کام کریں گے، تو صرف بولے گی یا سوچے گی۔''

''میں اندر آ سکتی ہوں۔'' پریہ کی آواز اُبھری۔

''آ جاؤ پریہ......'' پردے ہلے اور پریہ کا چہرہ نظر آیا۔

''صبح بخیر ملکہ عالیہ! آپ کو جیون کے نئے انداز کی پہلی صبح مبارک ہو۔'' سامری اور شکنتلا دونوں اپنے اپنے انداز میں مسکرانے لگے۔

''ملکہ عالیہ کوئی چمتکار بھی تو دکھایئے۔''

''ناشتے کے بعد تمہیں چمتکار دکھائیں گے پریہ۔''

''اچھا بھئی شکنتلا میں تو چلا'' سامری بولا۔

''کہاں چل دیے ناشتا تو کرتے جاؤ سامری۔''

''نہیں شکنتلا دیوی مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔ میں اب ذرا کچھ دنوں بعد آؤں گا۔ اب تو تم اتنی مضبوط ہو کہ تمام مشکلات کا مقابلہ کر سکتی ہو، لیکن جب چاہو مجھے بلا سکتی ہو۔''

''جا کہاں رہے ہو؟''

''یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا'' اور پھر سامری پلک جھپکنے میں غائب ہوگیا۔ شکنتلا نے پریہ کو دیکھا تو پریہ آگے بڑھی۔

''پریہ پہلے ہم تیار ہو کر ناشتا کریں پھر تمہیں چمتکار دکھائیں گے۔'' کچھ ہی دیر بعد شکنتلا زبردست بناؤ سنگھار کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بال کھلے اور شانوں پر بکھرے تھے، بڑی بڑی آنکھوں میں کجلے کی دھار قیامت ڈھا رہی تھی، باریک ریشمی لباس اسے جچ رہا تھا۔ اونچی ایڑی والے جوتے اس کے پاؤں میں خوب صورت لگ رہے تھے۔ بالوں میں تازہ گلاب، ہونٹ سرخ، ماتھے پر تلک، سر پر سونے کا تاج زیورات سے لدی پھندی، چہرے پر معصومیت اور شرمیلا پن لیے

وہ باوقار طریقے سے بیٹھی ناشتا کر رہی تھی، تمام کنیزیں مؤدب نظریں جھکائے کھڑی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد بلگرام نے حاضری کی اجازت چاہی۔ شکنتلا نے فوراً اسے اندر بلانے کا اشارہ کیا اور وہ نمستے کر کے بیٹھ گیا۔ شکنتلا اس کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ مسکرانے سے گالوں کے بھنور گہرے ہوتے چلے گئے، ناشتا کر چکنے کے بعد شکنتلا نے تمام کنیزوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اب پریہ، بلگرام اور شکنتلا رہ گئے تھے۔

''ملکہ عالیہ کوئی ہمیں بھی اپنی مہان شکتی کا چمتکار دکھایئے نا۔'' بلگرام نے مسکراتے ہوئے فرمائش کی۔

''بلگرام! اپنی شکتی سے تو ابھی شکنتلا خود بھی واقف نہیں، ابھی آزما کر دیکھ لیتے ہیں۔ آؤ باغ میں چلیں۔'' تینوں باغ کی طرف چل دیے۔ صبح کا وقت تھا، باغ میں پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ پرندے چہچہا کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے میں مصروف تھے۔ سرو کے تراشیدہ پودے بھلے معلوم ہوتے تھے اور باغ کے بیچوں بیچ نہر میں صاف پانی رواں تھا۔ کنیزوں اور غلاموں کے درمیان چلتے ہوئے وہ عین اس جگہ پہنچ گئے جہاں پہلے ہی جڑاؤ کرسیاں رکھ دی گئی تھیں، تمام غلام اور کنیزیں گھاس پر بیٹھ گئے۔

شکنتلا نے طائرانہ نگاہوں سے سب کو دیکھا اور مسکرائی۔ اب ایک بیٹھے گنجے غلام کی طرف انگلیوں سے اشارہ کر کے شکنتلا نے کالی دیوی کا منتر پڑھ کر سوچا کہ اس کو آگ لگ جائے، اچانک اس غلام کے گرد آگ کے شعلے بھڑک اُٹھے اور وہ باغ میں سرپٹ بھاگنے لگا۔ اس کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں، پھر وہ زمین پر لوٹنے لگا۔ اب شکنتلا نے اسے چھوڑ کر ایک کنیز کی طرف اشارہ کیا اور منتر پڑھنے کے بعد اس کو زبردست خارش ہو جانے کا سوچا۔ فوراً ہی وہ کنیز ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ کبھی پیٹ پر کبھی بازو پر کبھی گردن پر، اس کو خوفناک قسم کی خارش ہونے لگی تھی۔ کھجلی کرتے کرتے اس نے اپنے کپڑے پھاڑنے اور جسم سرخ کرنا شروع کر دیا۔ آگ لگے غلام اور خارش زدہ کنیز دونوں اذیت ناک انداز میں فریادیں کرنے لگے اور چیخنے لگے۔ شکنتلا ہاتھ سینے کے نیچے باندھ کر کھڑی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ یوں دیکھنے لگی جیسے یہ کوئی ناٹک ہو۔ اس کی انا کی تسکین ہو رہی تھی اور اندر کی ناگن خوش ہونے لگی، اس کا احساس برتری گہرا ہوتا چلا گیا۔ گردن قدرے اور تن گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام انسان میرے آگے بہت حقیر ہو چکا ہے۔ اس نے سوچا اور اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ غلام کی لاش اب گھاس پر پڑی تھی۔ اس کا جسم جل کر کوئلہ ہو چکا تھا۔ شکل پہچانی نہ جاتی تھی۔ کنیز ابھی تک پاگلوں کی طرح خود کو نوچ رہی تھی۔ تمام غلام اور کنیزیں خوفزدہ ہو چکے تھے۔ پریہ نیم باز آنکھوں سے بڑی پرسکون بیٹھی تھی، جبکہ بلگرام کی آنکھوں میں حیرت و خوف کے آثار نمایاں تھے۔ اب شکنتلا نے ایک غلام کو سامنے آنے کا اشارہ کیا، وہ بیچارہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور خوف سے پتھر ہو چکا تھا۔ اس سے حرکت نہ ہو سکی۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ فضا میں ایک موٹا ڈنڈا نمودار ہوا اور اس غلام پر برسنے لگا، وہ غلام اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنے لگا...... لیکن ڈنڈا مسلسل برس رہا تھا۔ سر پر، کمر پر، منہ پر، بازو پر غلام کے جسم کے مختلف حصوں سے کھال پھٹنے لگی اور خون رسنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے غلام لہولہان ہوگیا۔ شکنتلا اور پریہ شریر نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھیں۔ شکنتلا سرور سے مدہوش ہو رہی تھی۔ اس کو اپنی شکتی پر فخر ہونے لگا۔ چاروں غلام اور کنیزیں خوف ناک انجام کو پہنچ چکے تھے۔

☆......☆

شکنتلا ریاست تابانہ پر پوری طرح پنجے گاڑ چکی تھی۔ خواص کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی پتا چل چکا تھا کہ یہ ایک ظالم لڑکی اور زبردست جادوگرنی ہے۔ انسانی جان اس کے آگے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اس کا دل کسی کے لیے ہمدردی میں نہیں دھڑکتا اور اس کو صرف اپنی خوشیاں اور عیاشیاں پسند ہیں۔ عوام کی خوشی سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون تھا۔ بلگرام صرف کٹھ پتلی تھا اور سامری کو راج پاٹ سے کوئی سروکار نہ تھا۔ پریہ اس کے رنگ میں مکمل طور پر رنگ چکی تھی۔ اسے پتا تھا کہ شکنتلا کی خوشنودی ہی اسے اس مقام پر قائم رکھ سکتی ہے۔ جس دن کسی بات سے شکنتلا ناراض ہوگئی پریہ کا کھیل ختم ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے لیے دولت جمع کرنی شروع کر دی تھی۔ خفیہ طور پر تابانہ سے دور ایک دوسری ریاست کے اندر اس نے مختلف طریقوں سے اپنی دولت بھجوانی شروع کر دی۔ عوام پر مختلف

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ٹیکس عائد کرنے شروع کر دیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے شکنتلا کی چاپلوسی اور خدمت میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے لیے ہر روز ایک خوب صورت نوجوان مہیا کرتی۔ صبح سویرے اس کی نچڑی ہوئی لاش جلادی جاتی۔

☆......☆

پریہ اپنی شاہی سواری میں شہر کی سیر کر رہی تھی۔ بگھی جس کے آگے کنیزیں اور غلام جتے ہوئے تھے، ہولے ہولے چل رہی تھی اور پریہ باہر شہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ جلاد بگھی کے آگے جتے ہوئے انسانوں پر مسلسل کوڑا زنی کر رہا تھا، جس کی وجہ سے وہ مسلسل سسک رہے تھے، لیکن پریہ ان کی سسکیوں سے لاپرواہ دلچسپ نظروں سے شہر کے نظارے دیکھ رہی تھی۔ پریہ کی شاہی سواری گزرتی تو خاص وعام راستہ خالی کر دیتے تھے۔

اچانک ہی پریہ کی نظریں ایک خوب صورت نوجوان پر ٹھہر گئیں۔ یہ نوجوان دائیں ہاتھ کی کہنی بائیں ہاتھ کی پشت پر جمائے راستے کے کنارے ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دائیں ہاتھ میں اس نے کالے رنگ کا گلاب پکڑا ہوا تھا، جسے وہ مسلسل سونگھ رہا تھا۔ سبزی مائل آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والے اس نوجوان نے دھوتی اور کرتا زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کی نظریں پریہ کے چہرے پر جمی تھیں۔ پریہ کی نظریں اس سے چار ہوئیں تو ایک لمحے کے لیے پریہ ساکت ہوگئی، اس کی آنکھوں میں بے باکی اور چمک تھی۔ پریہ نے نظریں پھیر لیں۔ وہ اس نوجوان کی جرأت پر حیران تھی کہ وہ کیسے شاہی سواری کے راستے پر کھڑا ہے۔ یہ گستاخی اس کی جان بھی لے سکتی تھی۔ پریہ نے سپاہیوں کو اشارہ کیا تو سپاہیوں نے اس کو گھیر لیا۔ پریہ نے اشارے سے نوجوان کو بگھی کے قریب لانے کا حکم دیا۔ بگھی روک دی گئی اور نوجوان سپاہیوں کے گھیرے میں خراماں خراماں خود ہی بگھی کے قریب آ گیا۔ پریہ نے دل ہی دل میں ٹھان لی کہ اس نوجوان کا تحفہ آج شکنتلا کو پیش کروں گی۔ اس نے سپاہیوں کو ہدایت جاری کر دی کہ اس نوجوان کو شاہی محل پہنچا دیا جائے۔ گھنگریالے بالوں والے نوجوان نے بغیر کسی مزاحمت کے گرفتاری دے دی۔

☆......☆

شکنتلا سبز آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر مبہوت ہوگئی۔ مردانہ وجاہت کا ایسا شاہکار اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ بلگرام بھی مضبوط جسم اور خوب صورت مردانگی کا مالک تھا، لیکن اس نوجوان کا کسا کسا حسین وجمیل جسم، گھنی مونچھیں اور مونچھوں تلے دبی ہلکی مسکراہٹ، گندمی رنگت دیکھ کر شکنتلا دم بخود تھی۔ یہ مردانہ حسن کا مکمل پیکر...... یہ پریہ کو کہاں سے ملا؟...... اب شکنتلا کو پریہ پر پیار آنے لگا جس نے ایسا نوجوان تلاش کیا تھا۔

''آگے آؤ......'' شکنتلا تحکمانہ لیکن پیار کے لہجے میں بولی تو نوجوان آگے آ گیا۔

''آج کی رات تم میرے مہمان ہو۔'' نوجوان کچھ نہ بولا۔ خاموش گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ شکنتلا بھاری بھرکم لباس سنبھالتے ہوئے نوجوان کے بالکل قریب کھڑی ہوگئی اور بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔

''کیا نام ہے تمہارا خوب صورت نوجوان؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی......

''خسکران......'' نوجوان کے ہونٹ ہلے۔

''خسکران۔'' شکنتلا نے زیر لب دہرایا۔

''یہ کیسا نام ہے؟''

''ہمارے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' نوجوان ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولا۔

''میری پیاس بجھا سکو گے خسکران......'' شکنتلا پر نوجوان کی وجاہت کا جادو چھانے لگا۔

''میں تمہیں سیراب کر دوں گا۔'' نوجوان نے آپ کی بجائے تم کا لفظ استعمال کیا تو شکنتلا تھوڑا سا چونکی۔

''بہت دلیر ہو، جانتے ہو تم اس وقت ملکہ تابانہ شکنتلا کے سامنے موجود ہو؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا......'' نوجوان اپنے مخصوص انداز میں بولا...... ''ویسے بھی اس وقت ضرورت مند تم ہو۔'' وہ مسلسل گستاخی کے موڈ میں تھا۔ اس سے پیشتر کہ شکنتلا مزید کچھ بولتی، فوراً ہی اس نے شکنتلا کو بچی کی طرح پکڑ کر اٹھا لیا اور لا کر بستر کے اوپر پھینکا اور خود بھی تیزی سے چھلانگ لگا کر اس کے اوپر آ گرا اور اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ

لیا۔ شکنتلا کو اس کا یہ انداز بہت اچھا لگا، وہ سہمے سہمے نوجوان سے تنگ آئی ہوئی تھی۔ یہ خوب صورت نوجوان بہت آگے جا رہا تھا، شکنتلا دم بخود تھی۔ اس کی ہر حرکت خسکران کی تابع ہو رہی تھی۔

خسکران شکنتلا کی توقع سے بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ بڑے دنوں کے بعد شکنتلا صحیح معنوں میں سیراب ہوئی تھی۔ اب اس کی نظریں خسکران کے بازوؤں کی پھڑکتی مچھلیوں پر تھیں۔ خسکران کی رگوں میں دوڑتا بہتا گرم لہو اس کو پاگل بنا رہا تھا، اب وہ موقع کی تلاش میں تھی اور آنکھیں موندے زبان ہونٹوں پر پھیر رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد خسکران کے خراٹے فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگے۔ شکنتلا نے آہستگی کے ساتھ آنکھیں کھولیں اور خسکران کو بے سدھ پایا۔ اس کے خراٹے اونچی آواز میں گونج رہے تھے۔ شکنتلا خسکران کو دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگی۔ خسکران نے اس کا پورا جسم جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا انگ انگ دُکھ رہا تھا اور شکنتلا نے اس بات کا برا بھی نہیں منایا تھا، کیوں کہ اب وہ خسکران سے اس محبت کا معاوضہ لینے والی تھی، اس کے خون سے اپنی ناگن جوانی کی پیاس بجھا کر۔ ایک لمحے کو سوئے ہوئے خسکران کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ چند دن اس کے ساتھ اور گزارے جائیں، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی خونی پیاس اس کے پہلے خیال پر حاوی ہوتی چلی گئی اور وہ خون پینے کے لیے بے چین ہوگئی...... بستر سے اتر کر اس نے ایک جگہ چھپایا ہوا تیز دھار خنجر نکالا اور دھیرے دھیرے خسکران کی جانب بڑھنے لگی نزدیک آ کر خنجر اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑ کر بلند کیا اور خسکران کی شہ رگ پر چلا دیا...... لیکن یہ کیا؟ خسکران کی گردن پر خون کا نشان تک نہ تھا۔ جلد بھی برابر ہو چکی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خنجر گردن پر چلا ہی نہ ہو...... شکنتلا کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے بے یقینی کے انداز میں دوبارہ پوری قوت کے ساتھ خنجر خسکران کی گردن میں پیوست کر دیا، لیکن دوبارہ بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، خنجر گردن کے اندر تھا۔

''ہاہاہا...... ہی ہی ہی۔ ہو ہو ہو ہو'' خسکران نے اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ کر قہقہہ لگایا۔ اس کے ہنسنے کی آواز اس کی جسامت سے کئی گنا زیادہ تھی۔ شکنتلا ششدر رہ گئی اور خوف کی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔

ایسی صورت حال سے پہلے کبھی اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ خسکران اُٹھ کر بیٹھ گیا اور شکنتلا کی کمر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اسے اٹھا لیا اور کمرے کے اندر چکر لگانے لگا۔ دو چکر لگانے کے بعد اس نے دھپ سے اسے بستر پر پھینکا اور خود کھڑا ہو گیا۔

''تت...... تم...... کون ہو؟'' شکنتلا نے خوف پر قدرے قابو پاتے ہوئے پوچھا تو خسکران نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں پکڑا اور بولا......

''اے بھولی صورت...... تو ہے مٹی کی مورت اور میں آگ کا شرارہ ہوں۔ جنات کے بادشاہ لشکران کا اکلوتا بیٹا خسکران ہوں۔''

''تم جن ہو......؟'' شکنتلا اب سنبھل چکی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں منتر پڑھ کر خسکران کو جلا دینے کے لیے پھونک ماری...... کچھ بھی نہ ہوا...... البتہ خسکران قدرے غصے میں آ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر شکنتلا کے بال اپنی مٹھی میں پکڑ کر جھٹکا دے کر چھوڑتے ہوئے کہا۔

''شکنتلا جادوگرنی! میں خود آتش ہوں۔ تمہارا کوئی جادو مجھ پر کارگر نہیں لیکن اگر میں چاہوں تو تمہیں ابھی بھسم کر دوں۔''

اب شکنتلا ہراساں ہو چکی تھی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ کالی دیوی کے منتر خسکران پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ وہ فوراً خسکران کے پاؤں پر گر گئی اور بولی۔

''خسکران مجھے شما کر دو، میں بنتی کرتی ہوں۔''

''سیدھی ہو کر بیٹھ جاؤ۔'' خسکران قدرے نرم لہجے میں بولا اور شکنتلا خوش ہو کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

☆......☆

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول کی اگلی قسط مارچ میں ملاحظہ کیجیے)

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

محبت اور نفرت کی دھیمی دھیمی آنچ
میں لو دیتی ہوئی شعلہ ساماں تحریریں

سنبل

دوست، دشمن کی پہچان کراتی ایک ایسی کہانی جو آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردے گی

اس کی جیسیکا شمل سے پہلی ملاقات امریکن اسلامک سینٹر میں ہوئی تھی۔ وہ باقاعدگی سے اسلامک سینٹر آتی تھی اور وہ ویسا ہی تھا جیسے کہ سب مسلمان ہوتے ہیں، کسی کسی دن اور جمعے کو اکثر وہ بھی اسلامک سینٹر چلا جاتا تھا اور باجماعت نماز کی سعادت سے مستفید ہوتا اور بعد میں اکثر رحیم الدین چشتی کے درس سے اپنے سوئے ہوئے ایمان کو تازہ کرنے کی کوشش کرتا۔ چشتی صاحب کا انداز اتنا خوب صورت اور دل موہ لینے والا تھا کہ جب وہ درس سن کر اٹھتا تھا تو ضرور اپنا قبلہ درست کرنے کا اعادہ کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ اب ضرور بہت سی لغویات سے پرہیز کرنا ہے، مگر ایمان کی کمزوری کے باعث اس درس کا اثر بہ مشکل تمام ایک دن اور بہت سے بہت دو دن رہتا اور پھر یہاں کا معاشرہ اور ماحول اسے للچانے لگتا اور وہ پھر اسی راہ پر ہولیتا۔

اس کے والد اوائل عمری میں ہی امریکہ آگئے تھے اور یہیں بس گئے تھے۔ انہوں نے یہیں ملازمت کی اور یہیں پر ایک انڈین مسلم فیملی میں شادی کرلی۔ اس کی والدہ بھی جاب کرتی تھیں۔ اس کے والدین کا تعلق خاصے مذہبی خاندان سے تھا اور انہوں نے اپنے معاشرتی اور مذہبی اقدام کو ان میں کوٹ کوٹ کر بھرنے کی کوشش کی تھی، یہ اور بات کہ انہوں نے ایسے معاشرے میں ایسی کوشش کی تھی کہ جو اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے اور جس میں ایسی کوششوں کا خاطر خواہ اثر شاذ و نادر ہی نکلتا ہے۔ اس کی دونوں بہنیں، جو کہ جڑواں تھیں، ان دونوں پر والدین کی اسلامی تعلیمات اور مشرقی طرز معاشرت کا خاصا گہرا اثر تھا۔ ان کا لباس تو ظاہر ہے کہ یہاں کے طرز معاشرت کے مطابق اسکرٹ اور پینٹ شرٹ ہی تھا، مگر وہ منیز اور بکنیز سے ابھی تک دور تھیں اور گھر میں اور گھر سے باہر ہمیشہ ان کے سر اسکارف سے ڈھکے ہوئے ہوتے تھے۔ بس ایک وہ ہی تھا جس پر اس معاشرے کا پوری طرح سے اثر تھا۔ وہ بوقت ضرورت ڈرنک بھی کرلیا کرتا تھا، مگر یہ اس کی عادت نہیں تھی۔ اگر یاروں کی محفل میں کبھی دور چل جاتا تھا تو وہ انکار نہیں کرتا تھا اور کیوں کرتا، وہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کا قائل ہی نہیں تھا۔ اس کی گرل فرینڈز بھی بے تحاشہ تھیں، مگر صرف باہر کی حد تک، کسی نے کبھی اس کے گھر کی دہلیز پار نہیں کی تھی، مگر اس کی وجہ اس کی پاک بازی نہیں تھی، بلکہ والدین کا احترام اور ان کی تربیت کا اثر بلکہ ایک حد تک ڈر بھی تھا، ورنہ وہ کوئی ایسا زاہد خشک بھی نہیں تھا، بہرحال اس کے گھر والے باقاعدگی سے

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسلامک سینٹر جایا کرتے تھے۔

ہاں تو بات تھی جیسی کی، وہ نسلاً یہودی تھی اور اس کا تعلق اسرائیل سے تھا۔ یہاں وہ تعلیم حاصل کر رہی تھی اور یہاں پر وہ اپنے آنٹی اور انکل کے پاس مقیم تھی۔ جیسی کے انکل اور والد بزنس ٹائیکون تھے۔ جیسی کے والد ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے مالک تھے اور ان کا بزنس پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا، مگر جیسی کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اتنے امیر و کبیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ انتہائی سادہ مزاج اور سادہ لباس، وہ عموماً اسکرٹ (لونگ) اور اسکارف میں ملبوس ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر حد درجے معصومیت اور بھولپن تھا اور حسن تو جیسے اس کے گھر کی باندی تھا، اس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ بڑے جذب کے عالم میں درس سنا کرتی تھی، اس کے علاوہ وہ قاری و مبلغ ابوبکر احمد کی قرآن کی تلاوت، ترجمے اور تفسیر سے متعلق کلاس بھی لیا کرتی تھی۔

عریش سے پہلی بار بات بھی جیسی نے خود کی تھی، گویا دوستی کی ابتدا اس کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔

''سنو! جیسی تم اسلامک سینٹر کیوں آتی ہو۔'' ایک دن وہ پوچھ بیٹھا۔

''تم کیوں آتے ہو؟'' اس نے بجائے جواب دینے کے سوال در سوال کیا۔

''میرے آنے کا تو واضح جواز موجود ہے۔'' اس نے اپنے تئیں اسے خاصا تسلی بخش جواب دیا۔

''یہی کہ تم مسلمان ہو۔'' اس نے اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں عریش پر گاڑ دیں۔

''یس! آف کورس۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''اور میں غیر مسلم ہوں۔'' اس نے دوسری طرف منہ پھیر کر پوچھا۔

''ہاں۔'' اس کا لہجہ ہنوز لاپروا سا ہی تھا۔

''اور اگر کوئی غیر مسلم، مسلمانوں سے اور ان کے مذہب اسلام سے متاثر ہو تو اسے کہاں جانا چاہیے۔'' اس نے عریش کی طرف چہرہ کر کے دیکھا تو وہ ایک دم چونک سا گیا۔ ''یعنی کہ تم......''

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں۔ میرے دل نے، میرے اندر نے کبھی بھی اپنے مذہب کو قبول نہیں کیا۔ میری مام بہت مذہب پرست، بلکہ مذہبی جنونی تھیں۔ وہ اس معاملے میں مجھ پر بڑی سختی کرتی تھیں۔ ڈیڈ کی اپنی بزنس کی مصروفیات تھی۔ سموئیل مام کی طرح سے ہی مذہبی تھا اور وہ ڈیڈ کے ساتھ بزنس میں بھی مصروف رہتا تھا، یعنی ان دونوں کی محبتیں وصول بھی کی تھیں اور ان کا قرض بھی اتار دیا تھا، مگر میری دلچسپی نہ بزنس میں تھی اور نہ ہی مذہب میں، پھر بھی مام زبردستی کرتی تھیں میرے ساتھ، مگر مذہب اور محبت زبردستی کے معاملے نہیں ہیں، یہ تو دلوں کے معاملے ہیں۔ یہ دلوں کے بھید ہیں، میں کبھی اپنی مرضی سے ''سائنا گاگ'' (یہودیوں کی عبادت گاہ) نہیں گئی، کیوں کہ عبادت کا تعلق دل سے ہے، اس کا تعلق روح سے ہے اور میرا دل اور میری روح اس طرف مائل ہی نہیں تھی۔ پتا نہیں کیوں میرے اندر ایک کھوج سی تھی کسی سچائی کی۔ میں نے بہت سے مذاہب کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ کچھ مذاہب کو میری عقل نے تسلیم نہیں کیا اور کچھ نے میرے دل پر اثر کیا۔ آج کل الہامی کتب یعنی اہلِ کتاب میرے زیرِ مشاہدہ ہیں، ان میں سب سے آخری مسلمان ہیں۔'' یہ سب کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

''اسلام کو تم نے کیسا پایا؟ عریش نے پتا نہیں کس جذبے کے تحت پوچھا۔

''ہوں'' اس نے ہنکارا بھرا۔ ''اس کی تعلیمات بہت اچھی ہیں۔'' اس نے دور کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جما دیں۔

''ابھی تو تم نے کہا تھا کہ اگر کوئی مسلمانوں اور اسلام سے متاثر ہو تو۔'' عریش نے اس کی بات اسی کو لوٹا دی۔

''وہ تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی، ورنہ میں اتنی جلدی فیصلے کرنے کی عادی نہیں ہوں، کیوں کہ مجھے ٹھنڈا کر کے کھانے کی عادت ہے اور جب میں نے اس پر اتنا ورک کیا ہے، تو اب ایک دم سے فیصلہ کیسے لے لوں۔ میں نے بہت محنت کی ہے، اسی سلسلے میں۔ بہت سے لوگ تو اپنی عبادت گاہوں میں داخل بھی نہیں ہونے دیتے، بہت مشکل سے انہیں اپنا مطمع نظر سمجھانا پڑتا ہے،

تب بھی بڑی مشکل سے اجازت ملتی ہے۔'' اس نے اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

''پھر اب کیا ارادہ ہے تمہارا۔'' عریش نے یوں ہی بات بڑھانے کو کہا۔

''میں نے اب تک جن مذاہب کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے، ان مذاہب کی خصوصیات اور خامیوں کو میں نوٹ کرتی جاتی ہوں۔ مذاہب کے علاوہ میں ان مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا بھی مشاہدہ کرتی ہوں کہ اس مذہب کی تعلیمات میں، ان کی کتاب میں، ان پر اترنے والے نبی میں کتنی طاقت ہے اور اس مذہب کے ماننے والے ان تمام باتوں کو کس حد تک مانتے ہیں۔'' اس نے کہا اور اسی وقت قرآن کی کلاس کا وقت ہو گیا اور وہ اٹھ کر چل دی اور عریش اس کے بارے میں سوچتا ہوا باہر کی جانب چل دیا۔

☆......☆

اس طرح جیسی سے ملتے ملاتے ہنستے ہنساتے عریش کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب وہ دوستی کی راہیں بدل کر محبت کی راہوں کا مسافر بن بیٹھا۔ سیاہ صاف ستھرے راستوں پر چلتے، فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹس، کولڈ ڈرنک کارنرز، مختلف جگہیں، مختلف موضوعات، ڈھیروں موضوعات، سیر حاصل گفتگو، لایعنی بحث ایک دوسرے کے قریب رہنے کے بہانے، ملنے کے مواقع، گفٹس دینے کے بہانے، چھوٹی چھوٹی خوشیاں سیلیبریٹ کرنا۔ یوں ہی ایک دن میکڈونلڈ میں سیلف سروس کے دوران اس نے برگر اور کولڈ ڈرنک لیتے ہوئے پتا نہیں کسے بڑی شستہ فرنچ میں گالیوں سے نوازا تو عریش نے مڑ کر اسے دیکھا، کیوں کہ فرنچ سے اس کی بھی تھوڑی بہت شُدبُد تھی۔

''کون ہے وہ خوش نصیب جسے اتنی عزت و احترام سے نوازا جا رہا ہے۔ عریش نے شوخی سے پوچھا۔

''اویس یار...... چھوڑو بس، یوں ہی۔'' اس نے گول مول بات کی، پھر وہ ایک ٹیبل کی جانب بڑھ گئے۔

''تم فرنچ جانتی ہو۔'' عریش نے برگر کا ایک بائٹ لے Sprite کا ایک گھونٹ لیا۔

''صرف فرنچ، عقل مند انسان میں عربی، اُردو، ہندی، جاپانی، سنہالی، اسپینش کے علاوہ بھی کئی زبانوں کی شُدبُد رکھتی ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں کسی کی زبان جانے بغیر کیسے اس کے مذہب کا مشاہدہ و مطالعہ کر سکتی ہوں، ہر کوئی تو انگلش نہیں جانتا اور مذہبی انتہا پسند تو یوں بھی اپنی زبان میں ہی بات کرنا پسند کرتے ہیں یا پھر اپنی مذہبی کتاب کی زبان میں۔'' اس نے عریش کی طرف دیکھ کر جواب دیا اور پھر فرنچ فرائز سے انصاف کرنے لگی۔

''سنو تم امریکہ کیوں آئی ہو؟'' عریش نے یوں ہی بات کرنے کو پوچھا۔

''اگر آپ کو بُرا لگا ہے تو میں واپس چلی جاتی ہوں۔'' اس نے شوخی سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں نہیں! میرا مطلب یہ ہے کہ تعلیم تو تم وہاں اسرائیل میں بھی حاصل کر سکتی تھیں اور یہاں سے بہتر، پھر......؟'' عریش نے شرمندہ ہو کر توجیہ پیش کی۔

''ہاں! کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو، لیکن اصل میں ڈیڈ چاہتے تھے کہ میں بزنس ایڈمن میں ماسٹرز کروں اور میں بین الاقوامی تعلقات عامہ میں ماسٹر کرنا چاہتی تھی، کچھ کچھ آئی ٹی کی طرف بھی رجحان تھا میرا۔ وہ اپنی کہتے تھے اور میں اپنی کرنا چاہتی تھی، سو جب یہ رسّا کشی حد سے بڑھی تو میں یہاں اپنے انکل کے پاس آ گئی۔'' وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے کھانے میں مصروف تھی۔

''یعنی تم اپنے والدین کو ناراض کر کے آئی ہو۔'' عریش نے اسے شرم دلانی چاہی۔

''ہاں کہہ سکتے ہو، مگر اس کی وجہ ہمارا نظریاتی اختلاف ہے۔ زندگی گزارنے کا ان کا نظریہ الگ ہے اور میرا الگ ہے۔'' اس نے اپنا برگر ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا نظریہ کیا ہے؟ میرا مطلب ہے نظریۂ زندگی۔'' عریش نے تمسخر سے پوچھا۔

''میرا نظریہ یہ ہے کہ مذہب، تعلیم اور محبت ہر شخص کے ذاتی معاملات ہیں، ان میں کسی کو بھی مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ تعلیم وہ، جس طرف رجحان ہو، مذہب وہ، جسے ذہن تسلیم کرے اور محبت وہ، جسے دل

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

چاہیے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مگر میں نے تو سنا ہے کہ یہودی قوم ہر کسی کے رجحان کو مدنظر رکھ کر اس کی صلاحیت سے فائدہ اٹھاتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے عریش بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”خاصے باخبر ہو تم۔“ اس نے پتا نہیں اس پر طنز کیا تھا یا......؟ جسے وہ سمجھ نہیں سکا تھا، اس لیے اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس کی بات کا اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر آ گئے تھے۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا نا! کہ میری مدر اور فادر مذہبی جنونی تھے، قطعی انتہا پسند اور ایسے لوگ عموماً اولاد کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں اور ویسے بھی ڈیڈ کا اپنا بزنس ہے، ان کا کسی سے کیا لینا دینا، وہ خود اپنا کھاتے کماتے تھے۔ یہودی گورنمنٹ اگر ہمارے لیے کچھ کرتی ہے تو سود کے ساتھ ہم سے وصول بھی کرتی ہے۔ اس سلسلے میں یہودی قطعی ہندو بنیے ہیں۔“ اس نے آگے بڑھ کر اپنی رولز رائس کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر دوسری سائڈ کا دروازہ کھول دیا عریش کے بیٹھنے کے لیے۔

”تم ڈرائیور کیوں نہیں رکھ لیتی، تم تو افورڈ کر سکتی ہو۔“ عریش نے اسے چھیڑا۔

”ہاں کر تو سکتی ہوں، مگر مجھے پسند نہیں ہے، کیوں کہ میں فطرتاً سادگی، قناعت پسند ہوں۔“ اس نے اگنیشن میں چابی ڈال کر کار اسٹارٹ کر لی۔

”یا اللہ! ایسی سادگی، اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا! رولز رائس کی سواری اور قناعت اور سادگی کی باتیں۔“ عریش نے اس کا تمسخر اڑایا تو وہ ہولے سے ہنس دی۔

”یہ ڈیڈ اور انکل کی ضد ہے، حالاں کہ میں نے منع بھی کیا ہے، کیوں کہ یہاں کالوں نے اندھیر مچا رکھی ہے، اس سے میں اچھی طرح واقف ہوں، اسی وجہ سے شاید آج دوسری بار تمہارے سامنے اس میں آئی ہوں، ورنہ میں خود اس کے استعمال سے خائف ہوں۔ کالوں کا تو یہ حال ہے کہ مال یا جان یا پھر دونوں۔ وہ تو خالی ہاتھ ہونے پر بھی غصے میں جان سے مار دیتے ہیں اور رولز رائس تو لے کر میں جب بھی نکلتی ہوں تو کوئی نہ کوئی اسلحہ اپنی حفاظت کے لیے ضرور ساتھ لے کر نکلتی ہوں۔“ اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

”جیسی! اس کی وجہ یہ ہے کہ کالے یہاں کا پسا ہوا طبقہ ہیں۔ وہ اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہیں اور اس سلسلے میں اپنی محرومیوں کے ازالے کے لیے وہ جو بہتر محسوس کرتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ ذرا میں بھی تو دیکھو تم ایسا کیا ہتھیار لے کر نکلتی ہو، جو کہیں نظر ہی نہیں آتا۔“ عریش نے پھر اس کا تمسخر اڑایا، تب اس نے سامنے ڈیش بورڈ پر پڑا ہوا اپنا پرس اٹھا کر اس میں سے ایک ننھی منی سی پسٹل برآمد کر لی اور عریش کی اس کو دیکھ کر ہنسی چھوٹ گئی۔

”اس سے مقابلہ کرو گی تم کالوں سے، غالباً ابھی کسی کالے سے واسطہ نہیں پڑا ہے تمہارا، وہ تمہیں تمہاری کار اور پسٹل سمیت اغوا کر لیں گے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو گی۔“ عریش نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تم بھی مجھے نہیں جانتے، کیوں کہ ابھی تمہارا صحیح طرح سے میرا واسطہ نہیں پڑا ہے، میں بھی تربیت یافتہ ہوں اور یہ ننھی سی پسٹل بھی کوئی عام نہیں بلکہ خاصی غیر معمولی ہے۔ یہ یہودی ذہن کی پیداوار ہے۔“ وہ روانی میں بولتی چلی گئی اور عریش نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تربیت یافتہ، کس کی تربیت یافتہ؟“ عریش نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور جیسی کے چہرے پر ایک تاریک سایہ سا آ کر گزر گیا۔

”ارے بھئی! مختلف مذاہب کے مطالعے اور مشاہدے کے دوران مختلف قسم کے لوگوں سے ملنا جلنا اور مشکل حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اسی لیے میں نے مارشل آرٹ بھی سیکھا ہے اور اسلحہ چلانے کی بھرپور ٹریننگ بھی لی ہے اور بس۔“ اس نے اپنی بات کی وضاحت کی، تب بھی عریش الجھی ہوئی نظروں سے کچھ سوچتا رہا اور اسے شک بھری نظروں سے دیکھتا بھی رہا۔

جیسی وہ پہلی لڑکی تھی، جس نے عریش کے گھر کی دہلیز پار کی تھی۔ مما نے جیسی کے سامنے تو کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا، مگر بعد میں عریش کے لتے لے لیے، کیوں کہ وہ کٹر مذہبی عورت تھیں۔

”عریش! تمہیں ہمت کیسے ہوئی اس یہودن کو اس گھر میں لانے کی۔“ مما جیسی کے جاتے ہی شروع ہو گئی تھیں۔

”مما! میں اس سے پیار کرتا ہوں۔“ یہ اسی معاشرے کا اثر تھا کہ جوان اولاد بڑی ڈھٹائی سے کسی سے بھی اپنی محبت کا اعتراف کر لیتی تھی۔

”تمہیں محبت کے لیے ایک یہودن ہی ملی تھی۔“ مما کو سب سے زیادہ غصہ اس کے یہودی ہونے پر تھا۔

”اوہ! مما یہودی اہلِ کتاب ہیں اور ان سے شادی جائز ہے۔“ عریش نے مما کا غصہ کم کرنے کے لیے کہا۔

”ہونہہ! اسلام بڑے خاص مواقع پر یاد آتا ہے تم لوگوں کو۔ تمہیں پتا ہے کہ بددعا ہے انہیں ہمارے نبی پاک ﷺ کی۔ قرآن میں ان کا ذکر ہے، پھٹکار ہے ان پر تا زندگی اور تا قیامت یہ لوگ تا زندگی بے وطن اور بے زمین ہی رہیں گے۔“ مما کی آواز شدتِ جذبات سے کانپنے لگی تھی۔

”مگر مما! ان کا تو وطن ہے۔“ عریش نے گویا مما کی بات رد کی۔

”کسی کی جگہ پر غاصبانہ قبضے سے وہ جگہ اپنی نہیں ہو جاتی۔“ عریش کی باتیں سن کر مما کی آنکھیں آگ اگلنے لگی تھیں۔

”مما غاصبانہ قبضہ تو نہیں کہا جا سکتا اسے، انہوں نے عربوں سے وہ جگہیں خریدی تھیں اور کچھ مخصوص جگہیں خرید کر انہوں نے وہاں آباد ہونا شروع کر دیا تھا اور اگر ایسی کوئی بات تھی تو عربوں کو چاہیے تھا کہ وہ ان کی اس پری پلاننگ کو سمجھتے نہ کہ ان کی سازش کا حصہ بنتے رہے اور ویسے بھی مسلمان ذاتی مفاد میں اجتماعی مفاد کو ہمیشہ نظرانداز کرنے والی قوم ہے اور یہودی ایک ذہین و فطین قوم ہے اور انہوں نے مسلمانوں کی اسی خامی اور کمزوری سے فائدہ اٹھالیا۔“ عریش نے کہا۔

”کسی کی جگہیں خرید کر وہاں بسنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں اپنی ریاست قائم کر لی جائے اور اہلِ زمین پر زمین و زندگی تنگ کر دی جائے اور یہودی پری پلاننگ کرنے والی قوم ہے، یہ تو تم سمجھو۔“ مما نے طنزیہ کہا۔

”کیا مطلب ہے مما آپ کا؟ جیسی ایک صاف و شفاف اور کھری لڑکی ہے۔“ عریش کو مما کا لہجہ بہت برا لگا تھا۔

”مطلب میرا صاف ہے، مگر تمہاری آنکھوں پر تو عشق کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ تم اسے کھول کر دیکھو، پھر پتا لگے گا تمہیں کہ جیسی کیسی لڑکی ہے؟ وہ جیسی لڑکی ہے، وہ اس کے چہرے پر صاف صاف رقم ہے۔“ مما کسی طرح سے مان ہی نہیں رہی تھیں۔

”مما یہ لاحاصل بحث ہے، نہ آپ اپنے موقف سے ہٹیں گی اور نہ میں۔“ عریش نے چڑ کر کہا۔

”پھر اب آپ کیا کریں گے۔“ مما نے کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

”اگر آپ لوگ مان جاتے تو اچھا تھا، ورنہ......؟“ عریش نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ورنہ آپ کورٹ میرج کر لیں گے، ہے نا......“ مما نے اس کی بات کو گویا زبان دے دی تھی۔

”یس مما! مجبوری ہے، کیوں کہ اب واپس پلٹنا میرے لیے ازحد مشکل ہے۔“ عریش نے قطعی انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے، اس کے بعد ہمارا اور آپ کا قطعی کوئی واسطہ نہیں ہو گا۔ نسل گندی کرنے سے بہتر ہے کہ نسل سے تعلق ہی توڑ لیا جائے۔“ مما نے بھی قطعی انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے مما، جیسی آپ کی مرضی۔“ عریش یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

عریش کے پیش نظر جیسی کا قیامت خیز حسن ہی نہیں تھا، بلکہ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ بھی تھا۔ ایک دم Zero سے Infinity کا مقام حاصل کر لینا اس کے دل کو گدگدا رہا تھا اور یہ تصور اس پر جیسے سحر طاری کر دیتا تھا، اسے مسرور کر دیتا تھا، اس پر ایک طرح کا نشہ طاری کر دیتا تھا۔

☆......☆

ڈیڈی نے جب یہ سنا تو وہ حیران رہ گئے۔ وہ کافی دیر تک اسے دیکھتے رہے، پھر بولے۔

”تمہارا تو سمجھ میں آتا ہے کہ تم اس سے کیوں متاثر ہو، مگر اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے بھئی۔“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”ڈیڈی! وہ مجھ سے پیار کرتی ہے۔“ عریش نے بڑے پتے کی بات کی اور ڈیڈی ہنس پڑے، پھر یوں گویا ہوئے۔ ”میرے پیارے بیٹے، وہ نسلاً یہودن ہے اور یہودی کبھی بھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔ تم یہ پتا

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

لگاؤ کہ درونِ خانہ بات کیا ہے......؟'' ڈیڈی نے گویا اسے سمجھایا۔

''ڈیڈی! وہ تو خود اپنے مذہب سے خائف ہے۔ وہ یہودیوں کو پسند نہیں کرتی۔'' عریش نے کہا۔

''لو ایک اور لطیفہ، کیا کسی مزاحیہ کتاب پر کام کر رہے ہو تم۔'' ڈیڈی نے اس کی بات ہوا میں اڑا دی۔

''ڈیڈی آپ سمجھتے کیوں نہیں؟'' عریش نے زچ ہو کر کہا۔

''بیٹا بات سمجھ بھی تو آئے، کیا اس کے گھر والے اس پر راضی ہیں؟'' ڈیڈی نے سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' عریش نے مختصراً کہا۔

''مگر تمہاری مما تو بتا رہی تھیں کہ اس کے گھر والے کٹر مذہبی ہیں، تو کیا پھر بھی؟'' ڈیڈی نے پھر جرح کی۔

''ڈیڈی اس لیے کہ شادی اس کا ذاتی معاملہ ہے اور مسلمانوں کی طرح کوئی بھی اولاد کو اپنی جاگیر نہیں سمجھتا۔'' عریش نے چڑ کر کہا۔ ''بجائے اس کے کہ آپ مما کو راضی کریں، آپ بھی ان کے ہم نوا بن گئے ہیں۔''

''وہ اپنی جگہ درست ہے، ہمارے گھرانوں میں ملازم بھی نسل دیکھ کر رکھے جاتے ہیں اور ہم بہو بے دین، بے نام و نسب، بے نسل لے آئیں اور اگر اپنی آنکھوں سے عشق کی پٹی اتار سکو تو معلوم کرو کہ بات کیا ہے، کیوں وہ لوگ اتنی آسانی سے جیسی کی شادی تمہارے ساتھ کرنے پر راضی ہیں، جبکہ اس کی کوئی واضح وجہ بھی نہیں ہے اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ یہودیوں نے اپنے مفاد کے لیے ہمیشہ بے دریغ اپنی عورت اور اپنی دولت کا استعمال کیا ہے، اس لیے تم صرف وہ وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرو......ارے ہاں، کہیں تم نے مذہب بدلنے کا تو ارادہ نہیں کر لیا ہے؟'' ڈیڈی کو شبہ ہوا کہ کہیں وہ لادین تو نہیں ہونا چاہتا ہے۔

''ڈیڈی! بھلا مذہب بدلنے کی کیا تک ہے۔ وہ اہلِ کتاب ہے، اس سے شادی ویسے ہی جائز ہے۔ جب اس نے ایسی کوئی فرمائش ہی نہیں کی ہے، تو میں کون ہوتا ہوں کہ اس سے فضول کے مطالبات منواؤں، جبکہ وہ حسب نسب میں مجھ سے بہتر ہے۔'' عریش تنگ آ گیا تھا۔ اس جرح و بحث سے۔ اس نے اس بات کو جتنا آسان سمجھا تھا، یہ بات اتنی ہی اس کے گلے میں اٹکتی جا رہی تھی۔

''حسب میں وہ ضرور آپ سے بہتر ہو گی، مگر نسب میں کبھی بھی بہتر نہیں ہو سکتی۔'' ڈیڈی نے اس کی بات یکسر رد کر دی۔

''پھر ڈیڈی اس مسئلے کا کیا حل ہے جو کہ میری نظر میں مسئلہ ہے بھی نہیں، بلکہ بنا دیا گیا ہے۔'' عریش نے چڑ کر کہا۔

''اس مسئلے کا سادہ سا حل یہ ہے کہ تم ہماری بات مان جاؤ، بہ صورت دیگر تمہاری مما نے تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے اور وہی میرا فیصلہ ہے۔'' ڈیڈی نے قطعی انداز میں بات کی۔

''ڈیڈی آپ اتنی سی بات کے لیے اپنی پلی پلائی اولاد کو چھوڑ دیں گے۔'' عریش نے ان کو جذباتی طور پر بلیک میل کیا۔

''اولاد والدین سے ہوتی ہے بیٹا، والدین اولاد سے نہیں؟ یہ بات تو اولاد کو سمجھنی چاہیے نا اور رہ گئی دوسری بات، تو چھوٹ تو تم ہم سے ویسے بھی جاؤ گے۔ تم یہودی قوم کو نہیں جانتے، ہاں اگر عمل کر سکو تو معلوم کرو کہ اس سارے معاملے کے پس پردہ کیا کہانی ہے، کیوں، صرف تم ہی......کیوں؟'' ڈیڈی نے کیوں پر زور دیا۔

اور پھر عریش نے ہونہہ کہہ کر اپنے کندھے اچکائے اور مستقبل کے خوش آئند سپنوں میں کھو گیا۔

☆......☆

دو دن بعد اس نے جیسی سے شادی کر لی، جس میں اس کے آنٹی اور انکل نے شرکت کی۔ باقاعدہ پارٹی کا اہتمام اور ہنی مون کا پروگرام اسرائیل پہنچنے پر رکھا گیا تھا۔ اس سے اگلے ہفتے ہی وہ یروشلم میں موجود تھے۔ یہاں آنے سے پہلے وہ اپنے گھر بھی گیا تھا اور اپنی بہنوں، مما اور ڈیڈی سے مل کر آیا تھا۔ وہ سب بہت افسردہ تھے، کیوں کہ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور اب سب نے ہی اسے مس کرنا تھا۔

جیسی کا گھر، اُف کیا گھر تھا ان کا، سنگ مرمر کا وائٹ محل نما گھر اور بڑا سا لان، غیر متوقع طور پر جیسی کے مام، ڈیڈ اور بھائی سموئیل بھی خاصی خندہ پیشانی سے ملا۔

اسے تو بڑی حیرانی ہوئی، بہ قول جیسی کے، اس کے گھر والے کٹر قسم کے مذہبی تھے، مگر یہاں تو سب کے رویوں سے لگ رہا تھا کہ جیسے اس نے کسی یہودی سے ہی شادی کی ہو، جبکہ ڈیڈی اور مما نے کسی قدر شدید ردِعمل کا اظہار کیا تھا، یہاں تک کہ اپنی اکلوتی نرینہ اولاد سے قطع تعلق تک کر لیا تھا اور یہ سب کس طرح سے اس کے آگے پیچھے پھر رہے تھے، تو کیا یہ بات درست ہے کہ مسلمان انتہاء پرست اور جنونی قوم ہے؟ کیا واقعی یہ ایک وحشی قوم ہے جو کہ مہذب دنیا میں رہنے کے باوجود آج تک غاروں میں مقیم ہے؟ عریش کا پورا دن یہی سوچتے ہوئے گزر گیا اور رات سر پر آ گئی۔

☆......☆

رات میں جیسی نے میرون کلر کی نائٹی میں کمرے کو رونق بخشی، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ کلر بنا ہی جیسی کے لیے ہے۔ اس کی دمکتی ہوئی رنگت اور چمکتا ہوا حسن جس کے آگے ستارے چھپ رہے تھے اور چاند کو بادلوں کی اوٹ لینا پڑ رہی تھی، عریش نے اپنی بانہیں وا کر دیں۔

''ہوں! ابھی نہیں پہلے دودھ آ رہا ہے وہ پیو۔'' کسی استانی کی طرح جیسی نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''مگر......'' وہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ تو دودھ پیتا ہی نہیں ہے، مگر اسی وقت اسکرٹ پر ایپرن میں ملبوس ایک خوش شکل اور نوعمر لڑکی نے اندر آ کر سائڈ ٹیبل پر ٹرے میں سلیقے سے ڈھک کر رکھا ہوا دودھ کا گلاس رکھ دیا اور باہر چلی گئی۔

''چلو جلدی سے یہ دودھ پی کر ختم کرو، میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ جھپاک سے باہر نکل گئی اور عریش پھر سوچتا رہ گیا کہ دودھ کو منع کر دے، مگر جیسی نے موقع ہی نہیں دیا اور باہر نکل گئی، تب اس کے ہونٹوں پر ہنسی پھیل گئی۔ بچپن میں جب مما اسے دودھ دیتی تھیں، تو وہ خاموشی سے جا کر واش بیسن میں بہا دیتا تھا یا بلی کو پلا دیا کرتا تھا، اب بھی اس نے خاموشی سے گلاس اٹھایا اور واش روم میں جا کر تمام دودھ واش بیسن میں بہا دیا اور گلاس لا کر ٹرے میں رکھ دیا۔ اسے کبھی بھی دودھ پسند نہیں رہا تھا اور تب ہی جیسی ایک بار پھر بڑی عجلت میں اندر آئی۔

''تم نے دودھ پی لیا ویری گڈ، اب تم لیٹو، میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔'' اس نے اپنی طرف سے خالی گلاس سے نتیجہ اخذ کیا اور عریش کی بات سنے بغیر باہر نکل گئی اور پھر پانچ سے پندرہ منٹ گزر گئے، مگر وہ نہیں آئی تو عریش کو الجھن سی ہونے لگی۔ وہ ابھی اس گھر کے راستوں سے بھی پوری طرح سے واقف بھی نہیں تھا، پھر مزید پانچ منٹ گزرے تو عریش الجھ کر باہر نکل آیا، باہر مکمل اندھیرا تھا، کہیں کوئی سرگرمی نظر نہیں آ رہی تھی، گویا سب لوگ سو چکے تھے۔ ایک آدھ فینسی لائٹ روشن تھی جو اس بھیانک اندھیرے میں کسی اُمید کے دیے کی طرح سے روشن تھی۔ آخری کمرے میں روشنی تھی، اس نے قدم اسی جانب بڑھا دیے۔

☆......☆

آخری کمرے کے پاس پہنچ کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ پورے گھر کی چھت اس کے سر پر آ گری ہو۔ سامنے ہی صوفے پر سموئیل بیٹھا ہوا تھا اور اس کے بالکل قریب، انتہائی قریب جیسی بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسی کے انداز میں خود سپردگی تھی اور سموئیل اس کی نائٹی کے بندوں سے کھیل رہا تھا۔ عریش کا غیرت مند اور جوشیلا خون اس کے دماغ اور اس کی کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ اس کے لیے یہ اندازہ لگا لینا چنداں مشکل نہیں تھا کہ انہوں نے اپنے درمیان جس رشتے بتایا تھا وہ تو اس رشتے سے قطعی مختلف ہے، جو کہ اس وقت نبھایا جا رہا تھا۔ عریش کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی اندر جا کر ان دونوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، مگر اس وقت اس کے ذہن میں ایک ہی بات گونج رہی تھی، جو کہ ڈیڈی نے کہی تھی کہ ''درونِ خانہ کیا بات ہے، وہ معلوم کرو۔'' وہ فوراً دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''ڈارلنگ! آپ کو اتنے دنوں تک میری یاد نہیں آئی کہ ایک فون تک نہیں کیا، نہ ہی چیٹ روم میں آئے۔'' جیسی بڑی لگاوٹ سے بول رہی تھی، ایسی لگاوٹ سے تو اس نے کبھی عریش سے بھی بات نہیں کی تھی۔

''ایسا ہو سکتا ہے سویٹ ہارٹ، مگر چیف کا آرڈر تھا

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ تم کسی اہم مشن پر ہو اور تم سے رابطہ کسی صورت نہیں کرنا ہے۔ ویسے وہ سوچکا ہوگا نا؟ اطمینان ہے نا!'' سموئیل نے کہا۔

''ہاں دودھ میں ویلیئم کی 5mg کی چار گولیاں ڈالی تھیں، اب تک تو وہ گہری نیند میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہوگا۔'' جیسی کی ہنسی کی کھنکتی ہوئی آواز آئی۔ اسے کیا پتا تھا کہ وہ تو بڑی گہری نیند سے جاگ گیا تھا۔

''اتنی مقدار کہیں خواب خرگوش میں ہی اوپر کوچ نہ کر جائے۔'' سموئیل نے خباثت سے کہا۔

''ارے نہیں، سر سے بات ہوئی تھی، انہوں نے کہا تھا کہ بڑی ڈوز دینی ہے، کیوں کہ اسے یہاں سے G-8 شفٹ کرنا ہے۔'' جیسی نے کسی اہم خفیہ جگہ کا کوڈ نیم لیا۔

''اور وہ تمہارا اہم مشن کیا تھا۔ اس مرتبہ تو اتنی راز داری برتی گئی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔'' سموئیل نے کہا۔

''ہاں وہ مشن۔ ویسے تو کل کی میٹنگ میں اس کو بریف کرنا ہے، مگر تمہاری بات اور ہے۔'' جیسی نے دلبری سے کہہ کر سموئیل کے کاندھے پر سر رکھ لیا اور سائڈ ٹیبل سے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر لبوں سے لگالی، جسے سموئیل نے لائٹر سے جلادیا۔

''یوں تو فلسطینی اور تمام دنیا کے مسلمان بھی بلکہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، مگر ایک بات ہے کہ مسلمان ہے بڑی جری اور بہادر قوم۔ یوں تو ہم نے ان کا خاصا نقصان کیا ہے، ان کی جان و مال اور املاک تک برباد کردی ہیں، مگر ان کے فدائی حملوں نے ہماری ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کتنا مشکل ہوتا ہے ناکہ یہ معلوم ہو کہ اگلے ہی پل ہماری زندگی ختم ہونے والی ہے، مگر صرف اپنی قوم کے لیے اور دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے لیے اپنی جان قربان کردی جائے۔'' جیسی نے یہ کہہ کر سگریٹ کا ایک گہرا کش لگایا اور پھر اس کی ناک اور ہونٹوں سے سفید دھواں باہر آنے لگا۔

''ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان ہے بڑی بہادر قوم۔'' سموئیل نے تائیدی انداز میں کہا۔

''دوسری طرف یہودی قوم ذہین ہے، فطین ہے، دانشور ہے، سائنس دان ہے، مگر بہادر نہیں۔ ہماری دولت، ہماری عورت سب اپنی قوم کے لیے ہے، مگر جان نہیں ہے۔ ہم جدید، بہترین اور تابکار ہتھیار بناسکتے ہیں اور دوسرں پر ان کا استعمال بھی کر سکتے ہیں، مگر خود ہم پر کوئی ان کا استعمال کرے، ہم یہ قطعی برداشت نہیں کرسکتے اور یہ مسلم، یہ تو فدائی حملوں پر کمر بستہ تھے۔'' جیسی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پھر بھی، تم اب مسلمانوں کی رطب اللسانی بند کرو اور اس مشن کا جلدی سے بتاؤ، اب تو بے چینی ہو رہی ہے مجھے کہ وہ اہم مشن کیا تھا۔'' سموئیل کی آواز سے بے تابی مترشح تھی۔

''تب میں نے چیف کو ایک مشورہ دیا اور اس اہم مشن کا نام G-11 رکھا گیا۔ اس مشن میں میرے علاوہ مزید نو لڑکیاں شامل تھیں اور ہم نے اپنے مشن کے لیے امریکہ کو چنا تھا۔ مشن یہ تھا کہ وہاں سے مسلمان فریش لڑکوں کو باسہولت بغیر کسی دھونس، دھمکی اور ہتھیاروں کے استعمال کے اسرائیل لانا تھا اور اس کے لیے ہر لڑکی آزاد تھی کہ وہ اس مشن کی تکمیل کے لیے جو طریقہ استعمال کرنا چاہے کرسکتی ہے، مگر بازور طاقت نہیں۔ انہیں کسی بھی طرح سے اپنے مشن کا احساس دلائے بغیر یہاں لانا تھا، مگر غریب مسلمانوں کو، جو دولت اور حسن کے بھوکے ہوں۔ ہماری تمام کی تمام لڑکیاں محض دولت اور حسن کی جھلک دکھلا کر ان سب کو تسخیر کرچکی ہیں اور باقی سب بھی کچھ ہی عرصے میں واپس آنے والی ہیں۔ میں ان سب کو لیڈ کر رہی تھی۔'' جیسی نے ختم ہوتی سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا۔

''اوہ! اب سمجھا میں تمہارا مشن۔'' سموئیل نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''چلو سمجھ تو گئے اب ہم G-8 میں ان سب کی برین واشنگ کریں گے اور یہ ہیں ہمارے دنیا کے ہر خطرناک بم سے بھی زیادہ خطرناک بم اور یہ ہیں ہمارے فدائی یعنی مسلمان فدائی، جن کو ہم ان ہی کی قوم کے خلاف استعمال کریں گے۔'' اور پھر ان دونوں کے وحشیانہ قہقہوں سے سارا کمرہ گونجنے لگا۔

☆......☆

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کون بنے گا کروڑ پتی

محمد سرفراز ناز

فیصل آباد سے جرائم کی دنیا کے راز عیاں کرتا شعلہ

شعور، لاشعور کو دستک دے کر نیند بھری آنکھوں کے ذریعے جب احساس کو کچوکے دینے لگا تو میں نے خود کو حوالات کے پتھریلے فرش کی بجائے اپنے آپ کو کسی کمرے کے نرم بستر پر پایا تو میں اپنی خوش نصیبی پر حیرت زدہ ہوگیا۔ گو کہ حوالات، جیل، عدالت، کچہریاں میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی، مگر قتل کے مقدمے سے لے کر چوری اور بردہ فروشی سے لے کر بھتہ خوری کے ہر دھندے میں ملوث ہوجانے کے باوجود اکثر اوقات قسمت مجھے مکھن میں سے بال کی طرح دنیا کی بڑی جیل میں لا پھینکتی تھی، جو کہ اس بات کی نوید تھی، شاید کہ میرے لیے توبہ کا دروازہ ہنوز کھلا ہوا تھا...... نرم بستر کی گرم چادر جب مجھے ماں کی آغوش یاد دلانے لگی تو مجھے اپنے قتل کے بعد معاملہ گڑ بڑ ہونے اور وہاں سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے کسی کار سے ٹکرانے کا خوف ناک منظر یاد آ گیا۔ جب میں اچانک اندھا دھند بھاگتے ہوئے ایک کار کی زد میں آ گیا اور اس کی ٹکر سے فٹ بال کی مانند اچھلتا ہوا، دھڑام سے زمین کے ساتھ ٹکرا گیا تھا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا...... اب ہوش میں آتے ہی دفعتاً میں اپنے جسم کو ٹٹولنے لگا تھا، تب ہی مجھے اپنی ایک ٹانگ پر پلستر چڑھائے جانے کا احساس ہوا تھا۔ جسم کے کسی حصے پر بھی پلستر کے چڑھائے جانے کا مطلب کئی ہفتوں تک کی لاچاری ہوتی ہے، مگر اپنے ماضی قریب کے کرتوتوں کی نسبت یہ چوٹ اور یہ پلستر بھی مجھے ایک نعمت ہی محسوس ہوئی تھی۔ اس موقع پر اگر میں اپنی پچاس برس کی عمر کے واقعات کو تحریر کروانا شروع کردوں تو شاید میری کہانی سالوں میں شائع ہونے والی تخیلاتی ''سچی'' کہانیوں پر حاوی ہوجائے، مگر میں اپنے صحافی دوست کی ہدایت پر زیر نظر حادثہ والا واقعہ ہی مکمل کروں گا۔ شاید میں اپنی زبان کبھی نہ کھولتا، مگر یہ کہانی لکھنے والے میرے صحافی دوست نے بھی اس میں لاکھوں روپے گنوائے تھے، لہٰذا جب وہ میری عیادت کرنے کے لیے آیا تو میں نے اس کے احساس جرم اور اپنے ضمیر کا بوجھ کم کرنے کے لیے اپنی زبان کھول دی اور اس کے لیے اپنے گروہ کو دیے گئے حلف کو بھی توڑ دیا۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ کو اِدھر اُدھر کی سنانے کی بجائے سیدھا اصل واقعے کی طرف آجاؤں تو وقت کا ضیاع ہوجانے سے بچ جائے گا۔

☆......☆

ہر گھرانے کی طرح میں بھی اپنے والدین کی اولاد میں نمایاں اور لاڈلا تھا، مگر پسماندہ علاقے کے بگڑے بچوں سے راہ و رسم کی بناء پر کوئی قابل ذکر ڈگری حاصل نہ کرسکا اور اپنے والد کے کھوکھے کے کام میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا، عموماً سگریٹ، پان، نسوار وغیرہ کے کھوکھے بے کار نوجوانوں کے لیے کیفے ٹیریاز ثابت ہوتے ہیں، جہاں رنگ برنگی عادات میں مبتلا لڑکوں کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں، چناں چہ سگریٹ وغیرہ فروخت کرتے کرتے میں خود بھی سگریٹ، پان، چرس اور شراب وغیرہ جیسی بُری علتوں کا عادی ہوگیا تھا، پھر ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جوئے اور بھتہ وصولی جیسے کاموں میں بھی شامل ہوکر اکثر اوقات حوالات اور جیل کی ہوا کھانے لگا تھا۔

بالخصوص کسی جرم میں سال چھ مہینے کے لیے جیل جانا میرے اور میرے دوستوں کے لیے اس لیے بڑا سود مند ثابت ہوتا تھا کہ ہمیں کم خطرات والے بڑے کھیل سیکھنے کو مل جاتے تھے، بہرکیف یہ سلسلہ کئی برسوں تک چلتا رہا اور پھر ایک جھگڑے میں میرے ہاتھوں ایک نوجوان قتل ہوگیا۔ تب پہلی بار مجھے سنجیدگی سے احساس ہوا کہ میں یک لخت پھانسی گھاٹ تک آن پہنچا ہوں۔ اس کیس میں میرے والدین کی تمام جمع پونجی قانون کے ہاتھوں لٹ گئی، تاہم میں سزائے موت سے

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
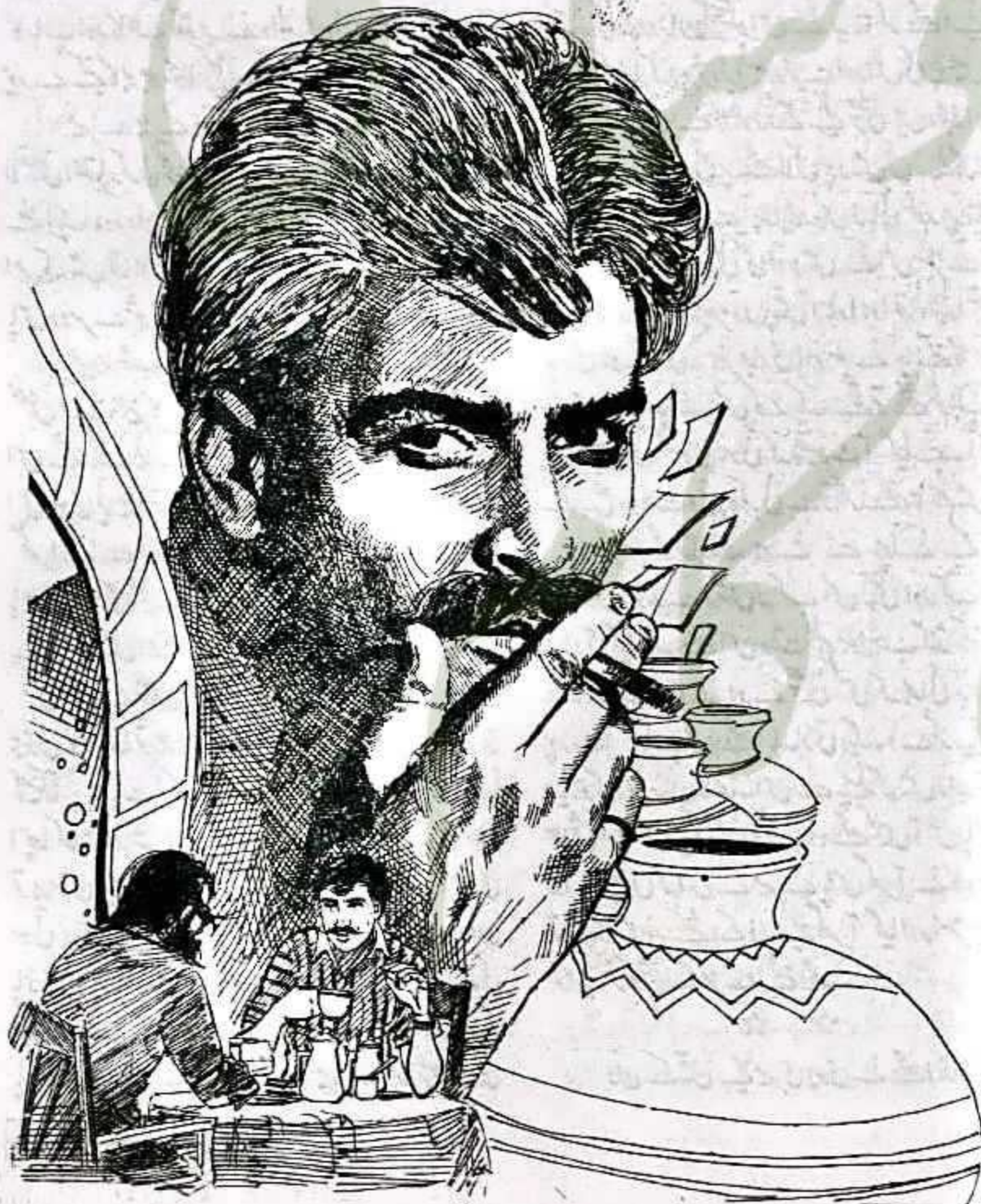
بچ کر عمر قید کے لیے حوالۂ زنداں کردیا گیا۔ کم و بیش آٹھ سال کی قید کاٹنے کے بعد جب میں رہا ہوا تو میری چھوٹی بہنوں اور بھائی کا بیاہ ہوچکا تھا۔ مجھ سے بڑے بھائی اکرم لاہور میں ملازمت کرتے اور خود شادی کی عمر پار کرچکے تھے، جبکہ مجھ سے چھوٹا بھائی افتخار شادی کے بعد امریکہ جاچکا تھا۔ اب میں گھر میں اکیلا یعنی محمد اسلم تھا اور میرے والدین۔

میرے والدین نے میری رہائی کے بعد فوری طور پر میری شادی کردی جو کہ بچپن سے ہی طے شدہ تھی۔ میں نے بھی ماضی کو فراموش کرکے ٹرک ڈرائیوری شروع کردی اور اپنی زندگی جیسے تیسے گزارنے لگا تھا۔ جب میری بیوی نے ایک دو سال کے وقفے سے مجھے دو بیٹوں کا باپ اور کاتب تقدیر نے والدین سے محروم کردیا تو پورے کنبے کا بوجھ مجھ اکیلی جان پر آن پڑا۔

میرے بڑے بھائی محمد اکرم نے اب گھر سے مکمل لاتعلقی اختیار کرلی تھی اور عید کے موقع پر محلے داروں سے ملنے ایک دو، دن کے لیے چلے آتے تھے۔ چھوٹا بھائی امریکہ میں تھا اور اس کی بیوی، جو کہ اپنے والدین کے پاس دوسرے شہر میں رہتی تھی۔

عید، شب برأت کے موقع پر ملنے کے بہانے محض اپنے جہیز کا سامان چیک کرنے آجایا کرتی تھی۔ اس کے رنگ برنگے کپڑے اور ''ٹور شور'' دیکھ کر مجھے اپنی بیوی پر بڑا ترس آتا، گو کہ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا اور وہ ایک باوفا عورت تھی، جس کے باعث وہ کبھی تنگی حالات کا شکوہ نہیں کرتی تھی، مگر میں نے ماضی میں اچھے دن دیکھ رکھے تھے، جن کی یاد مجھے کبھی کبھی بے چین بھی کردیتی، مگر جب میں اپنے کمسن بیٹوں کو دیکھتا تو جرم کے راستے کو اپنے ذہن سے نوچ پھینکتا...... بات ٹرک ڈرائیوری کی کروں تو اس میں عموماً اچھا کھانا اور نشہ پانی مفت کا ہی ہوتا ہے۔ چرس کی لت تو برسوں پرانی تھی، جو کہ جیل میں بھی جیسے تیسے پوری ہوتی رہی تھی، مگر ٹرک ڈرائیوری کی نوکری کے دوران پاؤڈر کی پرواز سے آشنائی حاصل کی تو چرس، گھوڑے کی لید نظر آنے لگی۔ ایسے ہی دنوں میں جب میں نے پاؤڈر کی پرواز کے دوران ٹرک کو جہاز بنا کر اڑانے کی کوشش کی تو حادثات روزمرہ کا معمول بن گئے جس کے باعث بڑی گڈز کمپنیوں نے مجھے بلیک لسٹ کردیا۔ یہ انہی بے کاری کے دنوں کا واقعہ ہے کہ میں کسی نوکری کے سلسلے میں راولپنڈی سے فیصل آباد آرہا تھا کہ میرے ساتھ والی نشست پر ایک بزرگ براجمان تھا اور حسب روایت مسافروں کی طرح ہماری بھی بات چیت ہونے لگی۔ بزرگ نے اپنا نام راجہ خان بتایا اور مجھ سے میرا پیشہ پوچھا۔ جب میں نے اسے اپنے ڈرائیور ہونے کے بتایا تو وہ اچانک میرے ساتھ بے تکلف ہوگیا۔ چوں کہ وہ مجھے ایک بے ضرر بزرگ نظر آرہا تھا، لہٰذا چھوٹی چھوٹی ڈینگوں کے علاوہ میں نے زیادہ غلط بیانی سے کام نہ لیا، البتہ اپنے جرائم و عادات سے پردہ پوشی اختیار کی۔ دوران گفتگو اس نے یہ بتا کر مجھے اپنے اور قریب کرلیا کہ وہ خود ٹرانسپورٹر ہے اور اس کی چوبیس سیٹر گاڑیاں پنڈی سے لاہور کے لیے چلتی ہیں، لہٰذا وہ لیہ سے واپسی کے موقع پر مجھے لائل پور میں مل لے گا۔ جس کے لیے میں نے اسے اپنا ایڈریس زبانی طور پر بتادیا۔

اب رات گہری ہوچلی تھی اور میں نے اس سفر سے پہلے پرواز کا سامان پھیپھڑوں میں اتارا ہوا تھا، لہٰذا غنودگی طاری ہونے لگی۔ سفر جاری اور سونے جاگنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اچانک بس کو بریک لگے تو مجھے خواب میں آواز سی آتی محسوس ہوئی کہ چنیوٹ آگیا ہے۔ اگر کسی نے رفع حاجت وغیرہ کرنی ہے تو کرلے، تاہم میں نے اپنے سُرور کو غارت ہونے سے بچانے کے لیے آنکھیں موندے رکھیں۔ کب بس چلی اور کب فیصل آباد آگیا۔ یہ مجھے اس وقت علم ہوا جب کنڈیکٹر نے مجھے زور سے ہلاتے ہوئے پھبتی کسی کہ بھائی جان ایئر پورٹ آگیا ہے اور مجھے ایک دستی بیگ دے کر نیچے اتار دیا جو کہ راجہ خان کا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں راجہ خان کو تلاش کرتا بس یہ گئی کہ وہ گئی۔ وہ مجھے کہیں آس پاس نظر نہ آیا۔ چوں کہ اس نے میرے پاس گھر آنے کا وعدہ کیا تھا، لہٰذا میں رکشے کے ذریعے گھر آگیا اور بستر پر گر کر خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔

☆......☆

دن کے تین بجے میری بیوی نے مجھے اٹھایا اور بتایا

کہ دوپہر کا کھانا تیار ہے۔ میں نہا دھو کر تیار ہوگیا اور کھانا تناول کرنے کے بعد جب کڑک چائے معدے میں اتری تو دماغ کی کھڑکیاں بھی کھل گئیں۔ بیوی گھر کے کاموں میں مشغول ہوگئی تو میں راجہ خان کے دستی بیگ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا، مگر اس میں ترتیب سے کاٹے گئے سفید کاغذوں کے ایک چھوٹے سے بنڈل کے علاوہ کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے اس بنڈل میں سے ایک کاغذ نکال لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ایسے ہی میں جب وہ کاغذ روشنی اور میرے پردۂ بصارت کے درمیان میں آیا تو میرا دل اُچھل کر گویا کہ کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا اور میں کرنٹ زدہ مریض کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چند ہی لمحات میں، میں نے خود پر قابو پایا اور بہ نظر عمیق کاغذ کا جائزہ لینے لگا۔ یہ بات میرے لیے حیرت انگیز تھی کہ مجھے اس سفید کاغذ میں روشنی کی طرف کرتے ہوئے ''مخفی'' بابائے قوم کی فوٹو اور وہ لکیر نظر آرہی تھی جو کہ تمام کرنسی نوٹوں میں نظر آیا کرتی ہے۔ میں نے دروازہ بند کیا اور راجہ خان کے دستی بیگ کی تفصیلی تلاش لے ڈالی، مگر اس میں کچھ زیادہ سامان نہیں تھا۔ تین مختلف محلول، ضروری شیشیاں، وزیٹنگ کارڈز اور شیشے کی دو عدد رنگین ڈائیاں اس دستی بیگ کا کل اثاثہ تھیں۔ ایک شیشے میں سے سو روپے کے نوٹ کا اگلا حصہ اور دوسرے شیشے میں سے نوٹ کا پچھلا حصہ روشنی کی طرف کرنے میں نظر آتا تھا۔

میں بے چینی سے اٹھ کر کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ پاؤڈر کی پرواز دل و دماغ پر دستک دینے لگی تھی، مگر پہلی مرتبہ میں نے اپنی اس خواہش کو بُری طرح دبا کر اپنی بیوی سے کڑک دار چائے کی فرمائش کرڈالی۔

میں چوں کہ جرم و سزا کی دنیا ایک حصہ رہ چکا تھا اور اس بات کو پاگیا تھا کہ یہ نوٹ بنانے والی مشین ہے۔ اگلے دو تین گھنٹوں میں میری بیوی تشویش میں مبتلا ہوگئی کہ مجھے چائے پر چائے کا کیا دورہ پڑگیا ہے؟ تاہم میں نے سر درد کا بہانہ بنا کر اسے مطمئن کردیا اور راجہ خان کا دستی بیگ ایک تالہ بند ٹرنک میں محفوظ کرکے اگلا لائحہ عمل تیار کرنے لگا...... یقین مانیے مجھے لگ رہا تھا کہ میں جاگتی آنکھوں ایک ایسے کمرے میں کھڑا ہوں جہاں چاروں اطراف نوٹوں کے بنڈل فرش سے چھت تک ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ اتنے سارے نوٹ کہاں کہاں خرچ کروں؟ میں اپنے ہی محلے کے ایک صحافی سرفراز کو جانتا تھا جو کہ تین چار گلیاں چھوڑ کر اسی محلے میں پیدا ہوا تھا۔ گو ہمارے درمیان دوستی کا کوئی رشتہ نہیں تھا، مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے ہم عمر تھے اور اچھی طرح ایک دوسرے کو جانتے تھے، بلکہ پرائمری میں ہم جماعت بھی رہے تھے۔ اِدھر میں بیٹھے بٹھائے خود کو لکھ بلکہ کروڑ پتی بنا محسوس کررہا تھا اور جانتا تھا کہ یہ کہانی میں اپنے جرم کے ساتھیوں کو سناؤں گا تو کئی حصے دار پیدا ہوجائیں گے اور اگر اکیلے راجہ خان سے پنگا لوں گا تو کوئی گواہ نہیں ہوگا، لہٰذا سرفراز کا نام میرے ذہن میں بار بار گونجنے لگا اور میں نے اسے ہمراز بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

میرے ذہن میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ صحافی ہونے کی وجہ سے نوٹ بنانے کی معلومات سرفراز کے پاس بھی یقیناً ہوگی۔ چناں چہ اب مجھے راجہ خان کا انتظار تھا۔ میں اس کی بات سن کر اگلا لائحہ عمل ترتیب دینا چاہتا تھا۔

فیصل آباد سے لیہ آنے جانے کا دورانیہ زیادہ سے زیادہ پانچ چھ گھنٹے کا ہے...... اور اب تو بارہ گھنٹے سے زائد کا وقت گزر چکا تھا، مگر راجہ خان کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔ رات گہری ہونے لگی تھی، مگر خلاف معمول پیٹ بھوک سے بے نیاز اور طبیعت پاؤڈر سے بیزار تھی۔ چائے تھی، سگریٹ تھی اور انتظار تھا جو کہ رات دس بجے کے قریب پورا ہوا۔ راجہ خان نے بیٹھتے ہی اپنے دستی بیگ کے بارے میں استفسار کیا تو میں نے اسے مطمئن کردیا اور اس کے ساتھ کھانا تناول کیا۔ چائے پانی سے فارغ ہوکر جب ہم سونے کے لیے لیٹنے لگے تو میں منتظر تھا کہ وہ بیگ کے بارے میں کوئی کہانی سنائے گا، مگر وہ لیہ کا سفرنامہ لے بیٹھا تو میرے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے اور میں نے اسے صاف صاف بتادیا کہ میں اس کے دستی بیگ کی اصلیت سے مکمل طور پر آگاہ ہوچکا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ راجہ خان بن پانی کی مچھلی کی طرح پھڑکنے لگا۔ کبھی دھمکیاں تو کبھی خوشامد کرنے لگا

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ تم دس پندرہ ہزار روپے مجھ سے لے لو اور دستی بیگ میرے حوالے کردو، ورنہ ہم دونوں بے موت مارے جائیں گے، مگر میں اس کی دھمکیوں میں کب آنے والا تھا، لہٰذا واشگاف الفاظ میں اسے بتادیا کہ میں ڈرتا ورتا کسی سے نہیں ہوں اور میں نے یہ معاملہ اپنے ایک دوست کو بھی بتادیا ہے، لہٰذا شرافت سے سو جاؤ، اب تفصیلی بات چیت صبح کو اسی دوست کی موجودگی میں ہوگی۔ بہرکیف سونا ہم نے خاک تھا۔ ایک دوسرے کو دھمکیاں دیتے رات گزر گئی۔ صبح سویرے میں اپنے تعلق دار صحافی کے گھر چلا گیا تو اس کے والد نے خاصی مشکوک نظروں سے مجھے دیکھ کر کام کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے انہیں مطمئن کیا کہ کوئی خبر وغیرہ شائع کروانی ہے تو انہوں نے کہا۔ ''دس، گیارہ بجے آنا، یہی سرفراز کے اٹھنے کا وقت ہے۔'' میں گھر پہنچا اور راجہ خان کو ناشتا وغیرہ کروایا۔ جس دوران اس نے اپنی رقم پچاس ہزار روپے تک بڑھا کر معاملہ رفع دفع کرنے کی پیشکش کی، مگر میں ماننے والا تھا، نہ ہی مانا۔ ہاتھ لگی مایا کی دیوی کو میں کیسے جانے دیتا؟ دس بجے کے قریب میں سرفراز کے گھر کے قریب ایک ٹی اسٹال پر جا بیٹھا۔ چوں کہ محلے میں میری شہرت کچھ اچھی نہ تھی، لہٰذا میں نہیں چاہتا تھا کہ بار بار اس کے گھر جا کر اس کی ناراضگی مول لے لوں۔ بہرکیف ایک گھنٹے کے بعد سرفراز مجھے اپنے گھر کے سامنے سگریٹ بازی کرتا نظر آیا تو میں نے اسے اشارہ کیا۔ وہ میری طرف چلا آیا اور ہم نے ایک دوسرے کی خیر خیریت دریافت کی۔ جب میں نے سرگوشی میں اسے ایک نئی نویلی خبر کے بارے میں تفصیلات فراہم کرنے کی پیشکش کی تو وہ بہ خوشی قریبی نہر کنارے جانے پر آمادہ ہوگیا۔ تنہائی میسر آنے پر جب میں نے ڈرتے جھجکتے اسے ٹوٹی پھوٹی بات بتائی تو اس نے کہا ''اگر تمہیں میری مدد چاہیے تو بے خوف ہو کر سب کچھ سچ سچ بتاؤ، چوں کہ تم نے ابھی کوئی جرم کیا نہیں ہے، دوسرا ہماری محلے داری بھی ہے، سو یہ کہ ہم ایک دوسرے کے خاندان کو بھی جانتے ہیں، لہٰذا مجھے بھی خبر شائع کرنے کی کوئی جلدی نہیں اور شاید ایک بڑا فراڈ بھی بے نقاب ہوجائے، لہٰذا سب کچھ سچ سچ اُگل دو۔''

چناں چہ اگلے ایک آدھ گھنٹے میں جب تمام تفصیلات سرفراز کے علم میں آئیں تو اس کی کیفیات بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہیں تھیں، تاہم اس نے مجھ سے کہا کہ اس کا تعارف صحافی کی بجائے ایک خفیہ ادارے کے اہلکار کے طور پر کرایا جائے گا۔ ''سامانِ جرم'' ہمارے قبضے میں ہونے کے باعث راجہ خان سچ بولنے پر مجبور ہوجائے گا، جبکہ فرار کے راستے مسدود ہونے کی وجہ سے بھی وہ کوئی ہنکی پھنکی کرنے سے باز رہے گا۔ اگلے پندرہ منٹوں میں مجھ سمیت تینوں کردار میری بیٹھک میں تھے۔ میری حیثیت خاموش تماشائی کی سی تھی، جبکہ سرفراز اور راجہ خان میں سوال وجواب ہونے لگے۔ جب راجہ خان کو علم ہوا کہ سرفراز کا تعلق ایک خفیہ ادارے سے ہے تو اس کی حالت پتلی نظر آنے لگی۔ تب اس نے ایک لمبی کہانی سنائی، جس کا حاصل وصول یہ تھا کہ......

''وہ حقیقتاً ٹرانسپورٹر ہی ہے اور فلاں نام سے اس کی کمپنی چلتی ہے۔ اس میں اتنی ویگنیں ہیں وغیرہ وغیرہ (ٹیلی فونک معلومات کے تبادلے میں سرفراز نے یہ تفصیلات درست پائیں) تاہم ٹرانسپورٹ کے بزنس میں راجہ خان ایک بڑی پارٹی کی بڑی رقم تلے آ گیا تھا اور کسی کی مدد سے وہ یہ اصلی نوٹ چھاپ کر قرضہ اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

کہتے ہیں کہ صحافی بڑے زیرک ہوتے ہیں، مگر اس ملاقات میں ظاہر ہو رہا تھا کہ راجہ خان نے ہر سوال کے جواب میں سرفراز کو چت کردیا۔ الٹا اس کی کہانی سے ہم ظالم اور راجہ خان مظلوم نظر آنے لگا۔ آخر میں سرفراز نے راجہ خان سے کہا کہ ''تم راز داری کے لیے ہمیں کیا دیتے ہو؟'' راجہ خان نے ایک دن کی مہلت سے ایک لاکھ روپیہ یک مشت دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ (ان دنوں دو ہزار روپے میں، میں احسن طریقے سے اپنا گھر ماہانہ کی بنیاد پر چلا لیا کرتا تھا)۔

اس سے پہلے کہ سرفراز، راجہ خان سے ڈیل فائنل کردیتا، میں اسے مشورہ کرنے کی غرض سے بیٹھک سے باہر لے گیا اور اسے بتایا کہ مجھے یہ ڈیل کسی صورت

میں منظور نہیں، البتہ اگر تم چاہو تو تم بھی اس میں شامل ہوجاؤ، ورنہ خاموش رہو۔ سرفراز نے کہا ''اس کی اپنی تنخواہ پندرہ سو روپے ہے، مگر وہ کسی جرم میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔''

میں نے اسے حلف دیا کہ اگر معاملہ گڑبڑ ہوگیا تو میں اس کی نیک نامی پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گا اور اکیلا راجہ خان سمیت قانون کا سامنا کرلوں گا۔ راتوں رات لکھ پتی بننا کسے اچھا نہیں لگتا؟ سرفراز بھی مجھے آمادہ نظر آنے لگا۔ تو میں نے اسے کہا کہ اب مذاکرات میں خود کروں گا اور سرفراز میرے والا خاموش تماشائی کا کردار ادا کرے گا۔ اب میں نے راجہ خان سے کہا کہ ہم ڈیل بعد میں فائنل کریں گے۔

''پہلے تم ہمیں نوٹ بنا کر دکھاؤ۔'' راجہ خان متذبذب نظر آنے لگا۔ وہ ہمیں یقین دلا چکا تھا کہ یہ نوٹ جعلی ہرگز نہیں ہیں۔ صرف طریقہ کار خلاف معمول ہے، وگرنہ شیٹ بینک کی مشینوں اور اس کی ڈائیوں کے نتیجے میں بننے والے نوٹ میں کوئی فرق نہیں۔ ہم دونوں ہی یہ طریقہ کار دیکھنے کے تمنائی تھے۔ راجہ خان مجبور کا کردار ادا کر رہا تھا، لہٰذا کافی پس و پیش کے بعد وہ نوٹ بنانے کی فیکٹری دکھانے پر آمادہ ہوگیا اور ایک ہیٹر، پانی کی ٹرے اور ایک استری لانے کی فرمائش کر ڈالی۔ میں نے اگلے چند لمحوں میں یہ تمام چیزیں حاضر کردیں۔

میرا احساس تھا کہ اس تجربے نے مجھے تحیر زدہ کر رکھا ہے، مگر سرفراز مجھ سے کہیں زیادہ مستغرق تھا۔ راجہ خان نے ایک سفید کاغذ نکالا اس پر محلول کا لیپ ایک چھوٹے سے برش کے ذریعے کیا۔ اسے ڈائی میں رکھا اور مجھے پکڑا کر ڈائی کو دونوں اطراف سے چند لمحات کے لیے گیس کے چولہے کی لو سے چند فٹ کی دوری سے سینکنے کے لیے کہا۔ جب میں یہ کام کر گزرا تو اس نے پہلے سے تیار پانی کی ٹرے کہ جس میں ایک اور محلول کے چند قطرے حل کیے جاچکے تھے۔ شیشے کی ڈائی میں سفید کاغذ جو کہ اب کالا ہوگیا تھا، نکال کر پانی کی ٹرے میں پھینک دیا، پھر اسی طریقے سے دوسرا کاغذ بھی ٹرے کی نذر کردیا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں کالے کاغذ کو سو روپے کے لال نوٹ میں تبدیل ہوتے ہوئے ہمیں ایسے لگا جیسے ہم نے مرغی کے انڈے سے بچے کا اخراج اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ جب نوٹ پانی میں بطخ کی طرح تیرنے لگے تو راجہ خان نے انہیں نکال کر ہلایا اور ایک کپڑے کے اوپر مزید کپڑا ڈال کر انہیں استری کردیا۔ اب کڑک نوٹ تیار اور ہم بے حال ہوچکے تھے۔ ہم دونوں ایک ایک نوٹ کو نازک بچے کی طرح الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے کہ راجہ خان گویا ہوا کہ یہ اصلی نوٹ ہیں۔ اب انہیں بازار کر چلا کر آؤ مگر سرفراز بالخصوص کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا اور اس کے تحفظات پر راجہ خان خود ہمارے ساتھ ہولیا۔ ہمارے ہی اصرار پر اس نے ایک بینک سے سو روپے کا چھٹا حاصل کیا، جس سے حوصلہ پا کر دوسرے نوٹ سے سگریٹ سرفراز نے ایک دکان سے خریدے۔ یہ نازک بلکہ اہم ترین مرحلہ طے ہونے کے بعد ہم دونوں ایک فیصلے پر پہنچ گئے تھے۔ محض سو سو روپے کے دو نوٹوں نے ایک سزا یافتہ مجرم اور ایک نوجوان صحافی کے اصولوں کو سگریٹ کے دھوئیں کی طرح ہوا میں اُڑا کر رکھ دیا تھا۔ میری بیٹھک میں پہنچنے کے بعد ہماری دستبرداری کی قیمت راجہ نے دوگنی کرتے ہوئے دو لاکھ روپے تک بڑھا دی۔ ساتھ ہی لاہور سے تعلق رکھنے والے ایک مشہور زمانہ سونے کے اسمگلر کے نام سے دھمکی بھی دے ڈالی کہ معاملہ خراب ہوگیا تو اس دھندے کا سربراہ اسمگلر ہم سب کے گھرانوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دے گا، تاہم ہم دونوں اس وقت تک طے کرچکے تھے کہ، اب نہیں تو پھر کبھی نہیں۔

جب راجہ خان نے کسی طرح بھی اپنی چلتی نہ دیکھی تو اس نے وضو کروانے کے بعد ہم سے راز داری کا باقاعدہ حلف لیا اور پھر جو کہانی سنائی وہ اس طرح تھی۔

تمام مالیت کے کاغذی نوٹ بوسیدہ ہوجانے کے بعد ملک کے بڑے شہروں میں مرکزی بینک کی برانچوں میں قائم آگ کی بھٹیوں میں نذر آتش کردیے جاتے ہیں، مگر ملک کا ایک بڑا مافیا اپنے سرکاری کارندوں کے ذریعے جلائے جانے والے ان

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

نوٹوں کے نمبرز حاصل کر کے انہی پرنٹ کاغذی نوٹوں کی شیٹس حاصل کر لیتا ہے۔ چوں کہ یہ نمبرز مرکزی بینک کی فہرستوں سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں اور اس کا ریکارڈ بھی اس بینک کے پاس ہوتا ہے، لہٰذا اس مافیا کے سرکاری کارندے، مل ملا کر انہی مسترد شدہ نمبروں کی کاغذی شیٹس حاصل کر کے ان کی کٹائی کرتا ہے اور ایک لاکھ روپے کے عوض دس لاکھ روپے کے نوٹوں کے کاغذات کے بنڈلز مذکورہ مافیا کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے۔ اس کے بعد نوٹ بنانے والے جانیں اور ان کا کام۔ یہ مافیا اور اہلکار کوئی ذمے داری قبول نہیں کرتے، البتہ کاغذی بنڈل فراہم کرنے والے نوٹوں کی تیاری کے بعد دس میں سے ایک لاکھ روپیہ وصول کر لیتے ہیں اور نوٹوں کی تیاری والے محلولز مفت میں فراہم کر دیتے ہیں۔ گو کہ آج یہ کہانی سناتے اور لکھتے وقت بہت آسان معلوم ہوتا ہے کہ اس کہانی میں سے کئی جزئیات نکال کر نتیجے پر پہنچا جا سکتا تھا، مگر اپنی آنکھوں کے سامنے اصلی نوٹ بنتے دیکھ کر ہم دونوں کی عقل گھاس چرنے کے لیے جا چکی تھی اور دوسری ہڈی پانے کے لیے ہماری مثال اس کتے جیسی ہو گئی تھی جس نے لالچ میں اپنی اصلی ہڈی سے بھی ہاتھ دھو لیے تھے۔ راجہ خان نے ہمیں نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو تم ابھی نوجوان ہو۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، لہٰذا لالچ میں نہ پڑو۔ ہم تینوں ایک ایک لاکھ روپے کا انتظام کرتے ہیں اور تیس لاکھ روپے کے بنڈلز اٹھا لیتے ہیں۔ زیادہ زیادہ ایک مہینے کی راتوں کا کام ہے۔ ہم تین لاکھ روپے ایجنٹ کو دینے کے بعد فی کس نو لاکھ روپے کے مالک بن جائیں گے، لہٰذا کچھ عرصہ عیش و عشرت کرنا اور ہم ایک سال بعد دوبارہ ملیں گے۔ یہ منصوبہ بنا کر راجہ اپنے ایک لاکھ کا بندوبست کرنے کے لیے دو دن کی مہلت لے کر راولپنڈی چلا گیا اور ہماری ہمارے سر ڈال گیا۔

اپنے ایک لاکھ روپے کا انتظام کرنے کے لیے مجھے اپنے ہی گھر میں ڈاکا ڈالنا پڑا اور میں گھر میں موجود اپنے امریکہ والے بھائی کی بیوی کے پڑے سامان میں سے کچھ زیور تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا، جبکہ سرفراز کو بھی یہ انتظام کرنے کے لیے اپنی بیوی اور والدین کے قیمتی سامان پر ہاتھ صاف کرنا پڑا۔ قصہ مختصر دو دن بعد راجہ خان نے مجھے اپنے ساتھ لاہور لے گیا اور چوک یتیم خانہ کے ایک چائے خانے پر بٹھا کر کاغذی بنڈل وصول کرنے کے لیے چلا گیا۔ رات گئے ہم لاکھ روپے کے کاغذی نوٹوں سے بھرا بڑا بیگ لے کر واپس فیصل آباد پہنچ گئے۔ یہ کاغذی بنڈلز اسی طرح بڑے بیگ میں ترتیب سے رکھے ہوئے تھے، جیسا کہ آپ نے اکثر فلموں میں اسمگلروں کو بیگز کے تبادلے کرتے وقت دیکھ رکھا ہوگا۔

☆......☆

اس موقع پر ہونے والی ملاقات میں سرفراز نے مجھے بتایا کہ وہ دو دنوں سے یہ خواب دیکھ رہا ہے کہ اس نے اپنا ذاتی روزنامہ نکال لیا ہے، جبکہ میں نے اسے ذاتی کوسٹر چلانے کا خواب سنایا۔ راجہ خان سے میٹنگ میں یہ طے پایا کہ نوٹوں کی چھپائی میری ہی بیٹھک میں رات دس بجے کے بعد سے صبح اذان فجر تک بلاناغہ ہوا کرے گی، کیوں کہ ایک تو میرا مکان ذاتی اور میری شہرت کی وجہ سے اہل محلہ مجھ سے گریزاں رہتے تھے۔ دوسرا گھر میں کم گو بیوی اور دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور سر دست کسی دوست یا رشتے دار کے اچانک وارد ہونے کے امکانات دور دور تک موجود نہیں تھے۔ سرفراز نے تجرباتی طور پر دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی حاصل کر لی، کیوں کہ اس دھندے میں صحافت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی تھی۔ بہرکیف تیسرے چوتھے دن کی ایک تاریک رات کو ہم نوٹوں کی چھپائی کے لیے تیار ہو گئے۔ بیٹھک کے تمام دروازے بند اور درزیں کاغذوں و پرانے کپڑوں سے پُر کر دی گئیں۔ مذکورہ کام کو تین افراد میں تقسیم کر دیا گیا۔ راجہ خان کی ڈیوٹی کاغذ کو محلول لگانا، میرا کام شیشے کی ڈائیوں کو حرارت پہنچانا، جبکہ تیار شدہ نوٹوں کو استری کرنے کا فریضہ سرفراز کو سونپا گیا۔ سب کچھ ایک مشین کی مانند چلنے لگا کہ دیکھتے ہی دیکھتے معاملے کا ڈراپ سین ہو گیا اور میری دنیا اندھیر۔ ہوا ہے کہ ابھی کم و بیش تین ہزار روپے کے نوٹ تیاری کے مراحل طے کر چکے تھے کہ راجہ خان کے حفاظتی تدابیر نہ بتانے کے

باعث میرا منہ حرارت دیتی ڈائیوں کے عین اوپر چلا گیا۔ تیز گیس کا ایک تیز شعلہ گندھک کے تیزاب کی طرح میری آنکھوں کے قرنیوں سے ٹکرایا اور شیشے کی ڈائیاں میرے ہاتھ سے چھوٹ کر تڑاخ کی آواز کے ساتھ پختہ فرش کے ساتھ ٹکرا کر چکنا چور ہو گئیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری چیخ کی آواز نے ماحول کی ویرانی کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا اور قبل اس کے کہ میری چیخ پکار کے نتیجے میں پورا محلہ بیدار ہو جاتا، سرفراز نے بکرے کی طرح مجھے ٹانگوں تلے دبوچ کر میری بولتی بند کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں کا بھرپور استعمال کیا۔ میں ماہی بے آب کی طرح ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا اور میری آنکھیں گویا کہ لال مرچیں پڑنے سے شعلہ بار ہو رہی تھیں۔ اسی اثناء میں راجہ خان نے جائے وقوعہ کے تمام آلات کپڑوں میں غائب کر دیے تھے اور میری آنکھوں پر پانی کی بوتل سے چھڑکاؤ کرنے لگا۔ تاہم اندر سے میری بیوی آوازیں دینے لگی کہ معاملہ کیا ہے؟ سرفراز نے اسے مطمئن کرنے کے لیے بتایا کہ سگریٹ جلاتے ہوئے محمد اسلم کا ہاتھ جل گیا ہے مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ نیک روح اس تاویل سے مطمئن ہو کر اندر جا سوئی اور تین چار منٹوں کے بعد میری آنکھوں کی جلن قدرے کم ہوئی تو میرے اشارے پر سرفراز نے میرا منہ اپنے ہاتھوں سے آزاد کر دیا۔ میں نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے پانی کی باقی ماندہ بوتل گلے میں انڈیل لی مگر آنکھوں کے سامنے ناچتے تاریک تارے ہنوز روشن ہوتے دکھائی نہ دیتے تھے۔ تاہم راجہ خان نے تسلی دی کہ پانچ سات منٹ میں آنکھیں درست ہو جائیں گی۔ ساتھ ہی ساتھ نرم الفاظ میں راجہ خان نے ہم دونوں پر چارج شیٹ بھی لاگو کر کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے کہ میں نے ”میڈ ان فرانس“ شیشوں کی ڈائی توڑ کر کم از کم دس لاکھ روپے کا نقصان کر دیا ہے اور ہمیں مافیا کے سرغنہ کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچنے کے لیے یا تو رقم کا فوری انتظام کر لینا چاہیے یا اپنے اہل خانہ کی بربادی کے لیے تیار ہو جائیں۔ معاملہ انتہائی اپ سیٹ ہو گیا تھا، لہٰذا میری طبیعت قدرے بحال ہونے کے بعد سرفراز انتہائی پریشانی کی حالت میں اپنے گھر روانہ ہو گیا اور بتایا کہ تفصیلی بات چیت صبح کسی پارک وغیرہ میں کی جائے گی۔

اس کے جانے کے بعد راجہ خان نے مجھے انتقام و وحشت کی چند مزید کہانیاں سنائیں، جنہیں سننے کے بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ اپنی جان بچانے کے لیے شاید ایک اور خون میرے ہاتھوں ہونے ہی والا ہے۔

☆......☆

اگلی صبح سرفراز نے دوران مذاکرات اچانک اپنے ہتھیار پھینکتے ہوئے اپنی اصلیت راجہ خان پر ظاہر کر دی اور اپنے ایک لاکھ پر لعنت بھیج کر گیم سے آؤٹ ہونے کا اعلان کر دیا جس پر راجہ خان نے پینترا بدل کر کہا ”تم صحافی ہو یا کہ تھانے دار، اس سے حقائق تبدیل نہیں ہوں گے۔ دس لاکھ روپے کا نقصان تو ہم تینوں کو ہی فوری پورا کرنا پڑے گا۔“

سرفراز کی حالت پتلی دیکھ کر میرے اپنے حوصلے ٹوٹنے لگے۔ میرے لیے یہ قدرے تکلیف کی بات تھی کہ میں نے اپنے مفاد کی خاطر ایک شریف محلہ دار اور باعزت صحافی کو اس بکھیڑے میں ڈال دیا تھا، الٹا اسے چور بنا کر ایک لاکھ کا نقصان بھی کروا دیا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر راجہ خان نے ایک اور قلابازی لگائی، مگر ہم عقل کے اندھوں کو پھر کچھ نہ سوجھا اور ہم پھر پرانی بوتل میں سے ہی نئی شراب پینے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس نے تیار شدہ تین ہزار روپے کے نوٹ تین حصوں میں تقسیم کیے اور کہا کہ میں آج لاہور جاتا ہوں اور معاملہ سیٹ کرنے کی بات کرتا ہوں۔ ہمارے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ سو کے کاغذات کے بنڈلز کے عوض پانچ سو روپے نوٹوں کے بنڈلز اور نئی ڈائی ادھار میں لے کر معاملہ درست کرنے کی کوشش کرے گا، تاکہ ہم تینوں کی بچت کی کوئی راہ نکل آئے۔ چناں چہ راجہ خان ہمیں ہمارے خیالوں میں چھوڑ کر لاہور چلا گیا اور سارا دن آوارہ گردی کے بعد سرِ شام ہی اپنا غم دور کرنے کے لیے ہم اپنے ہی تیار کردہ نوٹوں سے ”محلول آوارگی“ خرید لائے۔

☆......☆

چوتھے دن راجہ خان کی واپسی ہو گئی۔ وہ یہ خوش خبری لے کر حاضر ہوا تھا کہ بات بن گئی ہے۔ تیس لاکھ سو کے کاغذات کے عوض میں پانچ سو روپے کے نوٹوں

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

والا کاغذ ایک لاکھ اُدھار میں تبادلہ ہو جائے گا...... پانچ سو روپے کا نوٹ بنانے والی ڈائی بھی اُدھار میں مل جائے گی مگر...... نئے محلول کے لیے کم از کم ڈیڑھ لاکھ روپے کا مزید انتظام کرنا پڑے گا۔

راجہ خان نے بتایا کہ نوٹوں کے کاغذات کا تبادلہ آج ہی شاہ کوٹ کی بائی پاس پر ہوگا۔ جس کے بعد شیشے کی ڈائی اور محلول کا معاملہ طے پائے گا، چوں کہ یہ ڈیل بغیر روپے کے تھی، لہٰذا اسی دن میں نے اک واقف کار سے کار چند گھنٹے کے لیے مستعار لی۔ شاہ کوٹ اور فیصل آباد کا درمیانی راستہ ایک گھنٹے سے بھی کم ہے۔ ہم نے سرفراز کو بھی ساتھ چلنے کی پیشکش کی مگر اس نے یاد دلایا کہ وہ کسی بھی مزید عمل کا حصہ دار نہ بننے کے فیصلے پر کاربند ہے۔ یہ معاملہ جس قدر مشکل نظر آ رہا تھا، اس قدر آسان ثابت ہوا۔ شاہ کوٹ کی بائی پاس پر چند لمحوں میں بیگز کی تبدیلی کا عمل مکمل ہو گیا۔ دوسری پارٹی بھی تاریک شیشوں والی ایک کار میں موجود تھی جبکہ اپنی طرف سے کوئی احتیاط پیش نظر نہیں تھی۔ راجہ خان نے گاری سے اُتر کر بیگ دیا اور لیا اور دونوں گاڑیاں اپنی اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئیں۔

☆......☆

پانچ سو روپے کے نوٹ کا سفید کاغذ روشنی کی طرف کر کے میں اور سرفراز اس کے اصلی ہونے کی تصدیق کر چکے تھے، کیوں کہ اس میں بابائے قوم کی مخفی فوٹو اور سائیڈ والی لکیر بڑی آسانی سے نظر آ رہی تھی اور پانچ سو کا ہندسہ بھی نمایاں تھا۔ اب معلوم ہوا کہ پانچ سو روپے والی شیشوں کی ڈائی نئے محلولز کا حصول کراچی کے سہراب گوٹھ نامی علاقے سے ہوگا، جس کے لیے پرانے محلول کی واپسی اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد ادا کرنا ہوگا اور ظاہر ہے کہ ایک لاکھ روپے کا انتظام مجھے اور سرفراز کو کرنا تھا۔ شام کو سرفراز نے مجھے بیس ہزار روپے کے انعامی بانڈز دیتے ہوئے کہا کہ "وہ بیوی کی تمام تر جمع پونجی چُرا لایا ہے اور گھر میں مزید کچھ موجود نہیں، لہٰذا اسی تناسب سے اس کا حصہ کم کر دیا جائے۔" مگر مجھے بھابی کے زیورات کا آسرا تھا، لہٰذا میں نے سرفراز کا حصہ حسب سابق قائم رکھنے کا اعلان کرتے ہوئے ستر ہزار روپے کا خود انتظام کر لیا۔ راجہ خان کے پاس پچاس ہزار روپے پہلے سے ہی موجود تھے، لہٰذا رقم کا انتظام ہوتے ہی ہم دونوں کراچی بذریعہ ٹرین روانہ ہو گئے۔

سہراب گوٹھ نامی علاقے میں پہنچنے کے بعد راجہ نے ایک جگہ پچاس روپے کے عوض شب بسری کا انتظام کرتے ہوئے مجھے وافر مقدار میں "پاؤڈر" بھی فراہم کر دیا۔ دن ہوتے ہی راجہ خان اپنی نامعلوم منزل مقصود اور میں بازاروں میں آوارہ گردی کرنے نکل کھڑا ہوتا۔ چوں کہ گھر والوں کے لیے میں وافر مقدار میں راشن پانی چھوڑ آیا تھا۔ بہانہ بھی نوکری کا کر دیا تھا، لہٰذا وقت کے ضیاع کا کوئی احساس نہیں تھا۔ پاؤڈر بھی سستے داموں بازار میں دستیاب نمک کی طرح کھلے عام مل رہا تھا، لہٰذا میرا ہر دن عید اور رات شب برأت جیسی تھی۔ رات گئے راجہ خان منہ لٹکائے آ جاتا کہ بات کل بنے گی۔ تاہم ایک ہفتے کے بعد جب میں ذرا تلخی پر اُتر آیا تو راجہ خان نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے کہا کہ ایک تو میں تمہاری ہی وجہ سے نئی مصیبت میں پھنس گیا ہوں...... میری ذاتی ادائیگی بھی تاخیر کا شکار ہو گئی ہے جس کے باعث اس کی زندگی پر خطرات منڈلا رہے ہیں۔ روپڑے ایک صحافی کو بھی حصہ دار بنا ڈالا ہے اور رُعب بھی اُسی پر ہی جھاڑا جا رہا ہے تو میں خود کو جھوٹا اور راجہ خان کو سچا تصور کرتے ہوئے پاؤڈر کی پرواز میں کھو گیا۔

☆......☆

گیارہویں یا بارہویں دن راجہ خان نے کھلی باچھوں کے ذریعے مجھے پانچ سو روپے کے نوٹ والی شیشوں کی سبز رنگ کی ڈائی کا دیدار کروایا تو میں بھی خوشی سے اچھلنے لگا اور دل میں کہا کہ اس وقت سرفراز بھی موجود ہوتا تو کیا بات ہوتی...... نئی ڈائی ملنے کی خوشی ذرا کم ہوئی تو مجھے نیا محلول بھی یاد آ گیا جس پر راجہ خان نے کہا تھا کہ اس کے لیے ہمیں مزید ایک ہفتہ یہاں رکنا ہوگا، مگر لاہور سے محلول ہمیں چند گھنٹوں بعد مل جائے گا تو میں فوری واپسی کے لیے تیار ہو گیا۔ ہاتھی نکل گیا تھا تو پونچھ بھی نکل جائے گی، کے مصداق میں لاہور بھی مجھے پڑوس میں نظر آیا۔ فیصل آباد پہنچنے کے بعد ہم نے نئی ڈائی سرفراز کو دکھائی تو اس کی مایوس آنکھوں میں مجھے اُمید کے چراغ پھر سے روشن ہوتے دکھائی دیے۔ میں اس وقت راجہ خان کے ساتھ لاہور جانے کے لیے تیار تھا، مگر اس نے سفر کی تھکاوٹ کے باعث مجھے آرام کرنے کو کہا اور دو دن کے بعد لاہور میں یتیم خانے والے پرانے چائے کے کھوکھے پر ملنے کا وقت دے دیا۔ چوں کہ نوٹوں کے کاغذات اور ڈائی میرے قبضے میں تھی، لہٰذا ہم نے فراخ دلی سے اسے لاہور کوچ کرنے کا پروانہ مرحمت فرما دیا۔ بہر حال مقررہ دن مقررہ وقت پر میں لاہور پہنچ گیا، مگر راجہ خان پورا دن نہ آیا تو میں چائے والے کو اگلے دن کا بتا کر واپس فیصل آباد آ گیا، پھر تو یہ روزانہ کی بات ہو گئی۔ میں کئی کئی دنوں تک لاہور میں ٹھہرا رہا، مگر راجہ خان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اِدھر سرفراز کا رویہ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا بلکہ اس نے مجھے کئی اخباری تراشے دکھائے، جن میں نوٹ بنانے کے ذریعے کئی خاندانوں کو لوٹ لینے کی خبریں شائع ہو چکی تھیں، مگر وہ تذبذب کا شکار بھی تھا، کیوں کہ یہ نوٹ ہم نے خود بنا کر بازار میں بھی خود ہی چلائے ہوئے تھے۔ اس دوران واردات کیسے ہوئی تھی؟ یہ ہمارے وہم و قیاس میں نہیں تھا، کیوں کہ ابھی تک کوئی گروہ قانون کے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ رفتہ رفتہ سرفراز سے ملتے وقت مجھے شرمندگی اور اسے تکلیف ہونے لگی تو ہم ایک دوسرے کی راہ چھوڑنے لگے۔ وہ مجھے اور میں اسے دیکھ کر راستہ بدلنے لگا۔

☆......☆

سرفراز اور مجھے ایک دوسرے سے ملے ہوئے مہینوں گزر چکے تھے۔ ایک دو دفعہ وہ مجھے مسجد سے نکلتے دکھائی دیا تو فقط اتنا ہی کہا کہ میں بھی نماز پڑھ کر صبر کی دعا مانگا کروں۔ وہ یقیناً صبر کی راہ پر گامزن ہو چکا تھا، جبکہ میں ہر دوسرے، چوتھے دن پانچ سو روپے والی شیشے کی ڈائی اور کاغذی بنڈل دیکھ کر تسلی کر لیتا۔ اسی طرح کم و بیش ایک سال گزر گیا۔ کاغذی بنڈلوں میں ہلکی سی نمی آنے کے باعث میں ان کی ترتیب بدلنے لگا کہ ان میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ برآمد ہوا۔ (وزیٹنگ کارڈ کی موجودگی بھی طے شدہ تھی) یہ وزیٹنگ کارڈ لاہور کے ایک ایم پی اے کا تھا جو کہ اب مرحوم ہو چکا ہے۔ میں نے اسے غنیمت جانا اور اپنے علاقے کے ایم پی اے کے پاس لے گیا کہ مجھے اس سے کوئی کام ہے۔ ہمارے ایم پی اے نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ اس کی شہرت اچھی نہیں ہے، کسی مصیبت میں نہ پھنس جانا۔ میں نے جیسے تیسے اسے مطمئن کیا اور کہا کہ مجھے اس کی شہرت سے کوئی مطلب نہیں۔ کسی ٹرانسپورٹ کمپنی میں اس کے تعلق ہیں اور مجھے محض اس کی سفارش چاہیے۔

میرے ایم پی اے نے ایک سفارشی رقعہ ایم پی اے کے نام تحریر کر دیا۔ اگلے ہی دن تمام تر توانائیاں جمع کر کے میں ایم ڈی، ایم پی اے کا دفتر تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا، جہاں اس کے پی اے نے ٹیلی فون پر بات کرنے اور معلومات دینے کے بعد مجھے ایک ایڈریس لکھ دیا کہ شام 4 بجے کے بعد میں ان سے مل سکتا ہوں...... وقت مقررہ پر میں ایک آبادی کے چار دیواری شدہ وسیع احاطے میں پہنچ گیا۔ ایم ڈی ایم پی اے کا یہ ڈیرہ کسی پنڈ کے چوہدری کی حویلی نظر آ رہا تھا اور شکلوں سے ہی بدمعاش ظاہر ہونے والے کئی افراد ٹولیوں میں اِدھر اُدھر تاش بازی کر رہے تھے۔

ایک لڑکے نے میری رہنمائی کرتے ہوئے مجھے ایک ایسے گوشے میں پہنچا دیا جہاں دھوتی اور بنیان پہنے ایک عمر رسیدہ خرانٹ شخص پیاز کاٹ رہا تھا۔ اس کے قریب ایک میز پر بلیک لیبل کی قیمتی بوتل کھلی پڑی تھی۔ بلیک لیبل اور پیاز کی کٹائی کا یہ انوکھا منظر میں دیکھ ہی رہا تھا کہ اس شخص نے مجھے پاس بٹھا کر انکشاف کیا کہ اسی کا نام ایم ڈی ایم پی اے ہے۔ اس نے مجھے مزید حیران کرتے ہوئے بتایا کہ وہ میرے ماضی کے تمام قابل ذکر جرائم سے بخوبی آگاہ ہے جس کی تصدیق میرے سفارشی ایم پی اے نے بھی ٹیلی فون پر کر دی تھی۔ بہر کیف یہ کوئی مخفی باتیں نہیں تھیں۔ میرے ماضی سے میرا پورا محلہ آگاہ تھا۔ باتیں کرنے کے دوران ایم ڈی نے مرغی کی ہانڈی چولہے پر چڑھا دی تھی اور بلیک لیبل کے پیگ سے مسلسل چسک بازی بھی کرتے چلا جا رہا تھا۔

میرا انہماک دیکھ کر اس نے خود ہی بتایا کہ اپنی ہانڈی وہ خود ہی تیار کرتا ہے۔ جب تک بوتل ختم ہوگی

www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

تب تک ہانڈی گوشت بھی تیار ہو جائے گا، پھر میرے بتانے سے کچھ پہلے ہی وہ گویا ہوا کہ ”محمد اسلم میں خوب جانتا ہوں کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟“ گو کہ وہ مجھے حیران کرنے کے لیے بازی پر بازی مار رہا تھا، مگر میں بھی اس کا ماحول دیکھ کر اندازہ لگا چکا تھا کہ اس کا راجہ خان سے کوئی گہرا تعلق ہے۔ اگلے ہی لمحے اس نے میرا اندازہ خود ہی سچ کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”کاکا اسلم بات یہ ہے کہ اگر تم کسی سفارش کے بغیر مجھ تک پہنچتے تو بات الگ ہوتی، مگر اب درمیان میں تم نے اپنا ایم پی اے بھی ڈال لیا ہے، تو میری نصیحت ہے کہ اپنے چار پانچ لاکھ روپے کے نقصان پر مٹی ڈالو اور اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کر سو جاؤ۔ تم نے محلے کی بدمعاشی دیکھی اور قتل کی سزا بھگت کر رہا ہو چکے ہو، مگر جرائم کی یہ دنیا بڑی وسیع اور ظالم ہے۔“ اس نے یہ بھی بڑے کھلے دل سے تسلیم کیا کہ اس کے کئی راجہ خان ملک کے بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں اور میں نے ان کی دنیا کا بس ایک ٹریلر ہی دیکھا ہے۔ ایم ڈی کی باتیں میرے دل کو لگ رہی تھیں، مگر میں نے کہا کہ میرا نقصان پورا ہو جائے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ جس پر ایم ڈی نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا کہ ”کاکا اسلم یہاں لوٹ کا مال روزانہ کی بنیاد پر تقسیم ہو جاتا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ راجہ خان پانچ لاکھ روپے ہڑپ کر گیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے حصے میں پچاس ہزار روپے بھی نہیں آئے ہوں گے۔ یہاں بے ایمانی کا دھندا پوری ایمانداری سے چل رہا ہے، جس میں کریمنل سے لے کر سپاہی تک تمام اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ اگر تم اپنی رقم حاصل کرنے کے لیے قانون کے پاس جانا چاہتے ہو تو ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔ اگر رقم ہم سے وصول کرنی چاہتے ہو تو پھر راجہ خان کا ساتھی بننا ہوگا۔“ اسی اثناء میں اس کے مزید ملاقاتی آ گئے تو اس نے مجھے دارو پانی دے کر ایک رات ٹھہرنے اور فیصلہ کرنے کا وقت دیا۔ مجھے ایک آرام دہ کمرے میں ٹھہرایا گیا اور تمام ضروریات پوری کر دی گئیں۔ میں پوری رات غور و فکر کرتا رہا کہ چند سو روپے چوری کرنے پر پولیس والے ہم جیسوں کی چمڑی اُدھیڑ کر رکھ دیتے تھے اور یہاں ایم پی اے کی نگرانی میں شہر کے بیچوں بیچ دھڑلے سے جرائم کی ایک دنیا آباد و شادمان تھی۔ میں نے اس سمندر میں چھلانگ لگانے کا فیصلہ کر لیا کہ جب نہانا ہی ہے تو پھر نہر کیا، دریا کیا اور سمندر کیا...... جو ہوگا دیکھا جائے گا...... اگلے دن ایم ڈی میرا فیصلہ سن کر زیادہ خوش نظر نہیں آیا اور کہا ”جیسی تمہاری مرضی مگر پھر بھی تمہارے لیے رعایت یہ ہے کہ جب تک تم کسی جرم میں پکڑے نہیں جاتے، تمہاری واپسی کا راستہ کھلا ہے، مگر جیسے ہی تم کبھی قانون کے ہتھے چڑھ گئے تو پھر...... آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا“

بہرحال اس کے لیے شرط یہ ہے کہ واپس جاؤ اور ڈائی و نوٹوں کے کاغذوں والے بنڈلز واپس لے کر آؤ۔ اگلے دن واپس آ کر میں یہ سامان لاہور لے گیا اور اس کے حوالے کر دیا، جس کے بعد میری فرمائش پر اس نے مجھے راجہ خان کا ایڈریس دے دیا اور بتایا کہ ان دنوں وہ مریدکے، میں سرگرم عمل ہے، لہٰذا میں مریدکے جا پہنچا اور ایک سال کے وقفے سے میری دوبارہ راجہ خان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ پہلے سے زیادہ بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے بھی مجھ سے ایم ڈی جیسی ہی باتیں کیں اور میں نے محسوس کیا کہ جرائم کی اس دنیا کا کوئی بھی باسی حقیقتاً خوش نہیں تھا۔ وہ گردن گردن جرائم میں پھنسے ہوئے تھے، پھر بھی میں ان میں شامل ہونے کے لیے بے تاب تھا۔ میں نے راجہ خان سے نوٹوں والی ٹیکنالوجی کے بارے میں دریافت کیا، حقیقتاً اس معمے نے مجھے ایک برس سے پاگل پن کی حدوں تک پہنچا رکھا تھا۔ راجہ خان گویا ہوا کہ یہ کوئی بڑی بات یا سائنس نہیں ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ جب تک انسان میں لالچ اور راتوں رات امیر بننے کی ہوس موجود ہے ہم جیسوں کے وارے نیارے ہیں، ورنہ تھوڑی سی عقل استعمال کرنے والا ہمیں فوری بے نقاب کر سکتا ہے اور اس کا گروہ متعدد مرتبہ ناکامی سے بھی دوچار رہا ہے۔

اس نے بتایا کہ کسی بھی مالیت کے نوٹ کی ڈائی بنانے کے لیے بازار میں سے چند سو روپے کا عام رنگین شیشہ خرید لیا جاتا ہے۔ رنگین شیشہ اس لیے لیا جاتا ہے کہ اس میں جعل سازی عموماً پکڑی نہیں جاتی، چناں چہ شیشے کو نوٹ کے سائز کے برابر کاٹ لیا جاتا ہے۔ پھر اسی مالیت کے اصلی نوٹ کی فوٹو اسٹیٹ باریک پلاسٹک شیٹ پر کروائی جاتی ہے اور عام ملنے والی ایک گوند کے ذریعے یہ فوٹو الگ الگ شیشے پر چپکا دی جاتی ہے جس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شیشے پر ہی نوٹ کا عکس پرنٹ شدہ ہے۔ اب باری آتی ہے نوٹوں کے کاغذات کے بنڈلز کی تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہر بنڈل کے اوپر، نیچے تین چار اصلی نوٹ ہی ہوتے ہیں۔ باقی تمام محض کاغذات ہوتے ہیں۔ اگر کوئی باریک بین درمیان میں سے سادہ کاغذ بھی نکال لے تو اس کے لیے جعلی ساز نے اپنی جیب میں اصلی نوٹ چھپا کر رکھے ہوتے ہیں۔

اب رہ گئی محلول کی بات، تو یہ ایک عام کیمیکل ہے جو بازار میں آسانی سے دستیاب ہے۔ اس کے لگانے سے نوٹ کا رنگ غائب اور اس کو گرم کرنے سے واپس آ جاتا ہے، جبکہ ڈائی کے لیے جو شیشہ خریدا جاتا ہے وہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ کیمیکل اپنا کام نہ بھی دکھائے تو اس نے جلد یا بدیر ٹوٹ ہی جانا ہوتا ہے، لہٰذا پہلی مرتبہ نوٹوں کی چھپائی کے دوران کوئی بھی کاریگر کیوں نہ ہو۔ تیس، چالیس نوٹوں کی گنتی پوری ہونے تک شیشے نے ٹوٹنا ہی ٹوٹنا ہوتا ہے۔ اُدھر شیشہ ٹوٹا، اِدھر ہمارا دھندا شروع ہو جاتا ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ وہ پھنس جانے والے مرغے کو اتنا ہی دباتے ہیں کہ وہ جتنا دب سکے۔ جب دیکھا جاتا ہے کہ مرغ مر جائے گا یا گروہ کو لے بیٹھے گا تو وہ راہ فرار اختیار کر جاتے ہیں۔ اس نے مجھے غریب ترین سائل قرار دیتے ہوئے کہا کہ جن لوگوں پر پانچ سو یا ہزار روپے کے نوٹ کے ذریعے آپریشن شروع کیا جاتا ہے تو وہ اپنی جائیدادیں تک فروخت کر کے فٹ پاتھوں پر آ جاتے ہیں، بلکہ اس نے درجنوں مثالیں دے کر بتایا کہ ان کے ہتھے چڑھنے والے کئی افراد نے خودکشیاں تک کر ڈالیں، پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔

”کیا میں واقعی ان کے گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہوں؟ میرا جواب اثبات میں پا کر اس نے کہا کہ فی الحال انہوں نے اپنی لائن تبدیل کر ڈالی ہے، کیوں کہ نوٹوں کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو جانے سے لوگ ہوشیار ہو گئے تھے۔ بہرکیف میں ان کے گروہ میں شامل ہو گیا اور پانچ چھ مہینے کے عرصے میں ایک ہی نوعیت کی تین چار وارداتیں کر ڈالیں، مگر مجھے ان تمام کا معاوضہ پچاس ہزار روپے کے لگ بھگ ہی وصول ہو سکا۔ چوں کہ ان وارداتوں کی نوعیت ایک جیسی ہی تھی، لہٰذا میں اپنی آخری واردات سنا کر اپنا قصہ ختم کرتا ہوں، جس سے آپ کو تمام وارداتوں کی سمجھ آ جائے گی۔ اس واردات میں، میں ایک دیہاتی کا کردار ادا کرتا تھا کہ جسے ہل چلاتے ہوئے اپنے کھیتوں میں سے سونے کی صدیوں پرانی کئی تھیلیاں مل چکی ہوتی ہیں، مگر گاؤں کے چوہدری کی وجہ سے میں انہیں چھپائے رکھنے پر مجبور ہوں۔

ایک دن میری بیوی بیمار ہوتی ہے اور میں اسے علاج کے لیے لاہور لے آتا ہوں۔ سونے کی اصلی پانچ چھ ٹکیاں میرے پاس موجود اور چند غریب رشتے دار میرے ساتھ موجود ہیں۔ ہمارے گروہ کے ارکان انہی اصلی سونے کی ٹکیوں کی مدد سے کوئی نہ کوئی آسامی سستا سونے کی لالچ میں گھیر گھار کر ایک کوارٹر میں لے آتے تھے۔ جہاں پچاس ہزار یا ایک لاکھ کے عوض میں پانچ چھ لاکھ روپے مالیتی سونے کی ٹکیاں سائل کے حوالے کر دیتا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے تحت رقم کی ادائیگی ہوتے ہی ہمارے گروہ کے ارکان آپس میں لڑ پڑتے تھے اور انارکلی بازار سے خریدے گئے ایک اصلی نما نقلی پستول سے مجھ پر فائر کر دیتے تھے، میں نے پہلے ہی پیٹ پر لال رنگ بھرے غبارے باندھ رکھے ہوتے تھے، لہٰذا فائر ہوتے ہی میں غباروں کو پھاڑ دیتا اور چیخ مارتے ہوئے فرش پر مرنے کی اداکاری کرنے لگتا، اس ہڑبونگ میں سائل سے سونے کی اصلی ٹکیاں اور مجھ سے رقم چھین کر سب فرار ہو جاتے۔ جس کے چند لمحوں بعد میں بھی کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا اور ایک مخصوص راستے کے ذریعے کپڑے تبدیل کر کے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتا۔

میری آخری واردات میں پھنسنے والا مرغا ایک نوجوان تھا۔ جب حسب سابق میرے ساتھیوں نے مجھ پر فائر کھولا اور میں گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا تو وہ نوجوان

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈرنے کی بجائے مقابلے پر جم گیا اور فائر کرنے والے سے پستول چھیننے میں کامیاب ہو گیا، پھر اس نے للکارا مارا۔ ''اوئے فراڈیوائے پستول تے تعلی اے۔'' مگر کوئی بات نہیں میں بھی تھانے دار کا لڑکا ہوں۔ اب یہ سن کر جس کا جدھر منہ اٹھا وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ گرا ہونے کی وجہ سے مجھ سے تاخیر ہو گئی اور وہ نوجوان میرے پیچھے لگ گیا۔ اس بھاگ دوڑ میں مجھے اس نوجوان سے تو چھٹکارا مل گیا، مگر ایک حادثے کے نتیجے میں، میں اسپتال جا پہنچا۔ ایک مرتبہ پھر میری خوش نصیبی تھی کہ حادثے کا مرتکب ہونے والے نے راہ فرار اختیار کرنے کی بجائے مجھے ایک پرائیویٹ کلینک پہنچا دیا۔ جاتے وقت وہ کلینک والوں کو اتنی رقم دے کر گیا تھا کہ میرا علاج بھی ہو جائے اور کلینک والوں کا منہ بند۔

تین ہفتوں کے بعد میں بیساکھی کے ذریعے چلنے کے قابل ہوا تو ایم ڈی کے پاس جا پہنچا۔ اس نے کہا کہ ''ہاں بھئی کاکا اسلم، اب کیا ارادے ہیں؟''

میں نے بتایا کہ ''میں اب واپس گھر جا رہا ہوں، پھر کبھی نہ آنے کے لیے۔'' یہ بات سن کر ایم ڈی۔ ایم پی اے بہت خوش ہوا اور بہ طور خرچہ مجھے پانچ ہزار روپے عنایت کرتے ہوئے کہا کہ ''اپنے ایم پی اے کو جا کر میرا اسلام پہنچا دینا۔''

اس واقعے کو سولہ برس گزر چکے تھے۔ میں محلے کے چائے خانے پر بیٹھا چسکیاں لے رہا تھا۔ اچانک مجھے سرفراز اپنی طرف آتے دکھائی دیا تو میں نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ تب مجھے سرفراز کی ہنستی مسکراتی آواز سنائی دی۔

''اسلم صاحب ساڈے نال غصے او۔''

مجھے کچھ حوصلہ ہوا اور میں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور کہا ''مجھیں یار شرمندگی اے۔''

سرفراز نے میرا حال احوال پوچھا اور بڑی چاہت سے مجھے اپنے گھر کی بیٹھک میں لے گیا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اچانک اتنے برسوں بعد میری یہ خاطر داری کس لیے؟ میں نے تو اسے سوائے مالی نقصان اور دکھ کچھ نہیں دیا تھا...... پھر وہ اتنا مہربان کیوں ہے؟ تب سرفراز نے کہا کہ آج میں اس کی ایک فرمائش پوری کر دوں۔ میں تو پہلے ہی قرض بار تھا۔ سرفراز گویا ہوا کہ نوٹ چھاپنے والی کہانی کا اگر کوئی انجام ہوا تھا تو اسے مکمل کروں۔ میں نے بھی حیران ہو کر اس سے دریافت کیا کہ اچانک اتنے برسوں کے بعد اس کی ضرورت کیوں پیش آ گئی ہے؟ تو اس نے میری دل جوئی کی خاطر بتایا کہ صحافیوں کے ایک وفد کے بیرون شہر دورے کے دوران تمام شرکاء نے سفر کی طوالت کاٹنے اور تبدیلی آب و ہوا کے لیے تمام صحافیوں نے اپنی اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی سچا واقعہ سنایا تو سرفراز نے زیر نظر واقعہ سنا دیا، تاہم اس کا کوئی انجام نہ ہونے کے باعث سب صحافی تجسس میں مبتلا ہو گئے۔ اب یا تو وہ اپنے واقعے کو جھوٹا قرار دے کر تمام دوستوں کو پارٹی دے گا یا کہانی مکمل کر کے میری ملاقات بھی ان سے کروائے گا۔ زندگی کے تمام نیک و بد شعبوں میں اس طرح کی دوستانہ پارٹیاں لی اور دی جاتی ہیں۔ صحافیوں کی پارٹی والی بات سن کر میں مسکرا دیا اور جب اسے یہ بتایا کہ میرے بیٹے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایک بیٹا کمپیوٹر کے کسی پروگرام میں اگلے مہینے بیرون ملک جا رہا ہے، جبکہ دوسرا تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک ورکشاپ میں بھی کام کر رہا ہے، تو وہ بہت خوش ہوا۔ یقیناً آپ کو بھی خوشی ہو گی۔ میرا بڑا بھائی برسوں پہلے انتقال کر چکا ہے۔ چھوٹا بھائی اپنی الگ جائیداد بنا کر ذاتی کاروبار کرتا ہے، جبکہ تمام بہن بھائیوں نے میرے حالات کے پیش نظر وراثتی مکان میری بیوی کے نام کر دیا تھا۔ بیٹوں نے مجھے فکر معاش سے آزاد کر رکھا ہے، مگر وقت گزاری کے لیے میں اب بھی مختلف جائز کام کرتا رہتا ہوں۔ جب سرفراز نے مجھے سگریٹ پیش کی تو میں نے اسے بتا کر حیران کر دیا کہ میں اب سگریٹ بھی نہیں پیتا، نشہ پانی تو بہت دور کی بات ہے، مگر اس میں میرا کوئی کمال نہیں، یہ سب سوہنے رب کی عطا ہے کہ جب لاہور میں اپنے قتل کی واردات کے بعد فرار ہوتے ہوئے میں زخمی ہو کر اسپتال پہنچا تھا تو دل سے رب سے دعا کی تھی کہ اب خیریت سے گھر پہنچ گیا تو کبھی پھر غلط دھندوں میں نہیں پڑوں گا۔ دعا دل سے نکلے تو عرش پر سنی جاتی ہے۔ میں اس کی ایک روشن مثال ہوں۔

☆......☆

سسٹم

محمد تقی

سسٹم کی خرابی سے وجود میں آنے والا ایک شعلہ

ساون کا مہینہ تھا۔ دوپہر شام میں ڈھلنے والی تھی۔ آج صبح ہی سے فلک پر بادلوں کی غیر معمولی نقل و حرکت دیکھنے میں آ رہی تھی۔ بادل آسمان پر ادھر سے اُدھر یوں آ جا رہے تھے جیسے انہیں کوئی اہم ذمے داری

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

سونپی گئی ہے۔ کوئی ایسا کام ان کے سرڈالا گیا ہے جسے سرانجام دینے کی تگ و دو میں وہ صبح سے لگے ہوئے ہیں۔ صبح سے ان کی یوں آمدورفت کا نتیجہ کچھ تو نکلنا ہی تھا۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ ان بادلوں کی سیاہی گہری ہوتی چلی گئی اور پھر شام ہونے تک ان بادلوں نے نیلے آسمان پر اِدھر سے اُدھر تک سیاہ چادر تان دی تھی۔ ہوا جو کچھ دیر پہلے تک موجود تھی، یکا یکی نا جانے کہاں غائب ہوگئی۔ ہوا کے بند ہوتے ہی درخت بھی اپنی جگہ ایستادہ ہوگئے، جیسے کسی کے استقبال کے لیے الرٹ ہوگئے ہوں اور پھر جس کی آمد کے لیے صبح سے خاص ماحول بن رہا تھا، بالآخر وہ آ ہی گئی۔ گھنگھور سیاہ بادلوں سے نکل کر اس نے زمین پر اپنے قدم رکھے۔ اوپر سے موٹی موٹی بوندیں نیچے گرتے ہی لوگوں میں جیسے برقی رَو دوڑ گئی اور پھر لوگوں نے بارش کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے گاڑیوں کے شیشے چڑھا دیے۔ ونڈ اسکرین پر وائپر متحرک ہوگئے اور ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھ گیا۔ تقریباً ہر فرد کی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچ جائے اور بارش کو انجوائے کرے۔ پوش علاقوں کی خوب صورت سڑکیں بارش کے پانی سے دُھل دُھل کر نکھرنے لگیں اور گرین بیلٹ پر لگی گھاس، درخت اور پودے کچھ اور سبز ہوگئے تھے۔ بارش کے پانی نے جیسے ان میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ نازک پھول البتہ اس موسلا دھار بارش کی بوچھار کو سہ نہ سکے تھے اور تواتر سے ہوتی ہوئی موٹی موٹی بوندوں نے پھولوں کے نازک بدن زخمی کردیے تھے، بعض پھولوں کی تو پتیاں ہی ان کے جسم سے جدا ہوگئی تھیں۔ سیوریج سسٹم کی بہتری کے باعث شاید ہی کسی سڑک پر پانی جمع ہو رہا ہو۔ موسلا دھار بارش کا پانی چوڑی شاہراہیں دھوتا ہوا کہیں غائب ہوتا جارہا تھا۔ بنگلوں، کوٹھیوں اور عالی شان گھروں میں بارش رحمت بن کر برس رہی تھی۔ ان میں لگے لان بارش کے پانی سے دُھل کر سرسبز ہوچکے تھے۔ اور مکین انبساط کی دولت سے مالا مال ہو رہے تھے۔

بارش نے گرمی اور حبس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اے سی بند کردیے گئے تھے۔ فضا میں چاروں طرف قدرتی ٹھنڈک کا راج ہوگیا تھا۔ بارش تھی کہ رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ہر چند کہ ابھی رات نہیں ہوئی تھی، مگر چاروں اور پھیلے ہوئے سیاہ بادلوں کے باعث فضا میں اندھیرا اتر آیا تھا۔ KESC نے یہاں اپنا سسٹم خاصا مضبوط کیا ہوا تھا۔ الیکٹرک بدستور وہنوز موجود تھی، بالفرض چلی بھی جاتی تو کیا۔ زیادہ تر گھروں میں اعلیٰ درجے کے ساؤنڈ پروف جنریٹر موجود تھے، جنہیں کو ٹیک آپریٹ کرنے کے لیے آپریٹر ہمہ وقت موجود تھے۔ زندگی ان گھروں میں اپنی تمام تر آسائشوں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود تھی۔ اوپر سے یہ موسم گویا قیامت ڈھا رہا تھا۔ گھروں میں موجود ماہر کک نے برسات کے پکوان بنانا شروع کردیے تھے۔ کچھ من چلے لانگ ڈرائیو پر جانے کے لیے کمر باندھ رہے تھے اور کچھ سمندر کے ساحل پر کھڑے نظارہ کررہے تھے، کیوں کہ سمندر اس وقت سب سے زیادہ دلکش منظر پیش کررہا تھا۔ نیچے مستی میں سمندر مچل رہا تھا، اوپر آسمان سے بارش برس کر اسے پاگل کیے دے رہی تھی۔ حدِ نظر تک بجز پانی کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ موسم بہت دلکش ہوچکا تھا۔ شام کب رات میں تبدیل ہوئی، آسمان پر چھائے کالے بادلوں کے باعث پتا ہی نہیں چلا۔ موسلا دھار بارش اب ہلکی بارش میں بدل چکی تھی۔ سوئے اتفاق کہ آج ویک اینڈ بھی تھا۔ پوش ایریاز میں اس شب برسات کے باعث آج کا ویک اینڈ بھی اسپیشل ہوگیا تھا۔ کلبوں میں خلافِ معمول خاص گہما گہمی شروع ہوچکی تھی۔ بار بی کیو کی مہک فضا میں پھیل رہی تھی۔ بلوریں جاموں میں سنہری شراب چھلکنے لگی تھی۔ شباب اپنی تمام تر دلکشی اور رنگینیوں کے ساتھ تھرکنے لگا تھا۔ فضا شداد کی بنائی ہوئی جنت لگ رہی تھی۔ باہر بارش سبزہ کی خوش بُو، مٹی کی مہک، اندھیرا، سکوت اور سکون اور اندر ان کلبوں میں شباب، شراب اور کباب، اجالا، موسیقی اور مدہوشی۔ سب سے بڑھ کر بے فکری جو مست کیے دے رہی تھی۔

زندگی اپنی تمام تر ہیجان انگیزی کے ساتھ تھرک رہی تھی۔ کچھ من چلے لانگ ڈرائیو پر نکل چکے تھے۔

جن سڑکوں پر ان کی خوب صورت اور آرام دہ گاڑیاں رواں دواں تھیں، وہ اتنی سبک، سپاٹ اور ہموار تھیں کہ گاڑیاں گویا اس پر پھسل رہی تھیں۔ فور اور فائیو اسٹار ہوٹلوں کی راہداریوں میں بچھے کارپٹ بھیگے قدموں سے گیلے ہوگئے تھے، مگر ہوٹل کے اندر کا ماحول انتہائی صاف ستھرا اور خواب ناک تھا۔ مسرور اور دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے لوگ، انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کی اشتہا آمیز مہک، نت نئے فلیور کی آئس کریم، اعلیٰ درجے کی خوش بُو اور گرم کافی سے اٹھتی ہوئی بھاپ، ہوٹل کی بند کھڑکیوں کے شیشوں سے پھسلتے ہوئے بارش کے موتی جیسے قطرے، چہروں پر چھائی ہوئی مسرت و طمانیت۔ زندگی یہاں گویا پھولوں کا ہار تھی، خوش بُو تھی، اُمنگ تھی، ترنگ تھی اور رنگین حقیقت تھی۔ ہلکی بارش رات بھر ہوتی رہی تھی۔ لوگوں نے بارش اور زندگی کو خوب انجوائے کیا تھا اور پھر رات گئے وہ پڑ کر سو گئے تھے۔ کسی میٹھی لوری کی مانند برستی رم جھم کی ردھم میں نیند بھی بہت مزے کی تھی۔

☆......☆

ان پوش علاقوں سے کچھ ہی فاصلوں پر جا بجا بڑی ہی عجیب و غریب بستیاں تھیں، جن میں لاکھوں انسان رہتے بستے تھے۔ ایک ایک صدی پرانی بلڈنگیں تھیں جواب مخدوش ہوچکی تھیں۔ ان بلڈنگوں کی تعمیر میں لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر بھی استعمال کیے گئے تھے، جواب خستہ اور بوسیدہ ہوچکے تھے۔ بعض بلڈنگوں کی دیواروں میں وقت نے دراڑیں ڈال دی تھیں۔ کچھ فاصلے پر برس ہا برس سے موجود کچی آبادیاں تھیں، جن میں سے کچھ لیز کردی گئی تھیں اور کچھ ہنوز Unauthorized تھیں۔ یہ آبادیاں بڑی ہی بے ڈھنگی اور بے تکی تھیں۔ ان میں موجود گلیاں بہت بے ترتیب، ٹیڑھی میڑھی اور تنگ تھیں۔ گھروں کا حدود اربعہ بھی کشادہ اور یکساں نہ تھا۔ زیادہ تر گھر مرغیوں کے ڈربے نما تھے، تنگ اور چھوٹے، محض چالیس اور پچاس گز پر مشتمل، جن میں مکینوں کے ساتھ ساتھ گھٹن بھی رہتی تھی۔ ان تنگ و تاریک گھروں میں آنے کے لیے ہوا دستک دیتی اور پھر اندر داخل ہونے کا راستہ نہ پاکر در و دیوار سے سر پٹختی اور واپس چلی جاتی۔ نیچی چھتوں والے ان گھروں میں سے بعض کی چھتیں ٹین کی تھیں، جس کے باعث گرمیوں وہ گھر تنور بن جاتے تھے، بعض گھروں کی دیواروں پر پلاسٹر تک نہ تھا جس کی وجہ سے خاص طور پر دیواروں کا نچلا حصہ زمین میں سیم ہونے کے باعث اپنی سالمیت مکمل طور پر برقرار نہ رکھ پاتا تھا۔ زیادہ بجری اور کم سیمنٹ کے ساتھ بنائے گئے یہ سستے بلاک ریزہ ریزہ ہوکر جھڑ رہے تھے اور دیواروں کے نچلے اور بنیادی حصوں کو مخدوش کررہے تھے۔ زندہ آدمی ہی یہاں بہ مشکل رہ پاتا تھا، یہاں مرنے کے بعد اور بھی مشکل تھی، کیوں کہ جنازہ ان تنگ اور ٹیڑھی گلیوں سے نکالنا ایک مشکل اَمر تھا۔ چوں کہ انسان نے ہر عہد میں اپنی بقا قائم رکھی ہے، سو وہ یہاں بھی باوجود حد درجہ مشکلات کے بقا کے اس قیام کو ممکن بنانے کی سعی کررہا تھا۔ یہ تقریباً دو کروڑ انسانوں کا شہر تھا، اوپر ایک آسمان تھا جو اِدھر سے اُدھر تک تا حدِ نظر ایک ہی رنگ و روپ لیے ہوئے تھا۔ اس آسمان کے نیچے پھیلی ہوئی زمین بھی ایک ہی تھی، مگر عجیب دل خراش و متضاد روپ لیے ہوئے تھی۔

☆......☆

آسمان پر کالے بادل چھاتے ہی ان بستیوں میں اندھیرا اتر آیا تھا اور اس اندھیرے نے ان بستیوں کے مکینوں میں تشویش کی لہر دوڑا دی تھی۔ بارش کہیں بارانِ رحمت بن کر برستی ہوگی، مگر ان بستیوں میں تو بجز زحمت کے اور کچھ نہ تھی۔ بادلوں کی گھن گرج اس تشویش کو خوف کا جامہ پہنا رہی تھی۔ اس گرج کے ساتھ ساتھ سیاہ بادلوں کے پیچھے چھپی بجلی جب کڑکتی تو خوف کچھ اور سوا ہو جاتا۔ اکثر گھروں میں بارش سے بھیگ کر خراب ہونے والی اشیاء کو سمیٹنے کا عمل شروع ہوچکا تھا۔ بارش سے پہلے ہونے والے حبس نے ان تنگ و تاریک گھروں میں رہنے والوں کے جسم پسینے سے شرابور کردیے تھے۔ ان کے بد رنگ پیرہن پسینے میں بھیگ کر بدبودار ہوچکے تھے۔

www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

جون آف آرک

30 مئی 1431ء کو ایک کلیسائی عدالت کے حکم پر جون آف آرک کو فاسق العقیدہ اور جادوگرنی قرار دے کر زندہ جلادیا گیا۔ جون آف آرک غریب ماں باپ کی بیٹی تھی۔ کہتے ہیں کہ بچپن میں اسے روحانی ادراک ہوا تھا کہ وہ فرانس کے ولی عہد چارلس ہفتم کی مدد کرے اور فرانس کو برطانیہ کی محکومی سے نجات دلوائے۔ 1429ء میں وہ ولی عہد سے ملی۔ اس کے بعد وہ تھوڑی سی فوج لے کر شہر اورلینز گئی جس کا انگریزوں نے محاصرہ کر رکھا تھا۔ جون کی فوج بڑی بہادری سے لڑی اور انگریزوں کو محاصرہ ختم کرنا پڑا۔ جون کی فوج نے یکے بعد دیگرے کئی علاقے فتح کرلیے جن سے صد سالہ جنگ کا رخ بدل گیا۔ مگر چارلس ہفتم کے مشیروں کے غلط مشوروں کی بدولت جون آف آرک کی پیش قدمی زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی اور 1430ء میں اسے گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کردیا گیا جنہوں نے ایک عیسائی عدالت میں جون آف آرک پر مقدمہ چلایا جہاں اسے بدعقیدہ اور جادوگرنی قرار دے کر 30 مئی 1431ء کو زندہ جلادیا گیا۔

''مجھے تو بارش سے ڈر لگتا ہے۔'' ایک عورت سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس کا شوہر سر جھکائے اس کی بات سن رہا تھا۔

''یاد ہے پچھلی برسات میں جب سیوریج لائنیں بھر گئی تھیں تو ان کا سارا غلیظ پانی گھروں میں آ گیا تھا۔ بارش تھمنے کے بعد ہر چند کہ میں نے اپنے تئیں پورا گھر اچھی طرح صاف کردیا تھا، مگر اب بھی جب میں زمین پر نماز پڑھتی ہوں تو مجھے اپنا سجدہ مشکوک لگنے لگتا ہے۔ یہ شبہ مجھے پریشان کردیتا ہے کہ پتا نہیں یہ جگہ پاک بھی ہے یا نہیں۔'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

''یہ احساس مجھے دکھی کردیتا ہے کہ میں ایسی بدنصیب کہ کسی بھی شک کے بغیر اپنے خدا کو سجدہ کروں بھی تو کہاں کروں۔ مجھے یاد ہے اس وقت تم برابر ڈول بھر بھر کر گھر میں آیا ہوا یہ گندہ پانی باہر پھینک رہے تھے، مگر باوجود اس کے بارش اس قدر موسلا دھار تھی کہ بارش کا پانی گھر میں بھرتا ہی چلا جارہا تھا، کیوں کہ یہ پانی جتنا آسمان سے برس رہا تھا، اتنا ہی نیچے گٹر لائنوں سے اُبل رہا تھا۔'' عورت نے اپنی بات ختم کرکے ایک سرد آہ کھینچی۔ شوہر اب بھی سر جھکائے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا۔ سب کچھ ناگزیر ہے، جو ہوتا ہے وہ ہوکر رہے گا۔ ہم غریبوں کی زندگی مصائب اور دکھوں کے ایک ایسے جال میں پھنسی ہوئی ہے، جس سے ہم کبھی باہر نہیں نکل سکتے۔ بارش اس بار بھی ہوئی تھی، اس بار بھی ہوگی۔ اس نے پہلے بھی ایسی بستیوں پر ستم ڈھایا تھا۔ اب بھی اس کا یہی طور ہوگا۔ اس سے فرار ممکن نہیں۔ پڑوس کے گھر میں بھی صورت حال اس سے مختلف نہ تھی، لیکن بارش سے بھیگ کر خراب ہوجانے والے سامان ان کو بچانے کے لیے سرگرداں تھے۔ ایک شور سا تھا۔

''اری او، الگنی پر سے کپڑے اتار لے۔'' ایک عورت اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھی

''اور اُدھر دیکھ، تخت پر تیری اسکول کی کتابیں پڑی ہیں، انہیں بھی سمیٹ جلدی سے، اگر بھیگ گئیں تو ستیاناس ہوجائے گا۔'' اپنی بیٹی کو ابھی یہ ہدایات دے ہی تھی کہ اس کا چھوٹا بیٹا باہر گلی سے بھاگتا ہوا اندر آیا اور اپنی ماں سے چمٹ گیا۔ ''امی آج آلو کے پراٹھے پکاؤنا۔''

''دفع ہو۔'' اسے دھکا دیتے ہوئے بولی۔ ''دو سو روپے کلو گھی ہے اور اسے ہرا ہرا سوجھ رہا ہے۔ دال پک رہی ہے، وہی کھانا۔''

''اوں، اوں، بارش میں بھی دال۔'' بچہ منہ بسور کر بولا۔

''ہاں تو کیا...... بارش ہورہی ہے، تیری اماں کی شادی تو نہیں ہورہی ہے۔ ابھی دیکھنا کیا ہوگا۔ زوروں کی بارش ہوئی تو۔'' عورت نے ابھی اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ ٹپ ٹپ موٹی موٹی بوندیں آسمان سے گرنا شروع ہوگئیں۔ بچے نے جلدی سے اپنی بدرنگی اور قدرے میلی شرٹ اتار کر ایک طرف پھینکی اور باہر گلی میں بھاگ گیا۔ باہر گلی میں شور مچاتے ننگ دھڑنگ نہاتے بچوں کی آوازوں کے ساتھ برستی موسلا دھار بارش کے شور نے مل کر فضا میں ایک ہیجان سا پیدا کردیا تھا۔ کالے بادلوں نے ڈوبتی ہوئی سرمئی شام کو سیاہ کردیا تھا۔ یوں بھی ان تنگ و تاریک بستیوں میں رات نسبتاً جلدی پھیل جاتی ہے۔ کالی رات میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ بارش کے ہوتے ہی لائٹ بھی چلی گئی تھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے سے ماحول اور پرہیبت ہوگیا تھا۔ فضا میں جیسے ہی اندھیرے کا راج ہوا تو بارش میں نہاتے ہوئے بچے بھی ایک ایک کرکے بھاگ کھڑے ہوئے۔

پیہم برستی ہوئی تیز بارش سے تنگ گلیاں پانی سے بھرنے لگی تھیں۔ بارش تیز تھی، لیکن نکاسی آب کا نظام تیز نہ تھا۔ نالے پانی سے لبالب بھرے تو سارا سیوریج سسٹم گڑبڑ ہوگیا۔ گٹر لائنوں کا پانی بارش کے پانی کے ساتھ مل کر گھروں میں داخل ہونے لگا۔ وہ لوگ جن کے گھر قدرے نیچے تھے، بھر بھر ڈول پانی گھر سے باہر پھینکنے لگے، لیکن پانی تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا، بارش ہی اتنی زوروں کی تھی۔ پرانی اور مخدوش عمارتوں کے مکین اور وہ لوگ جن کے گھر ہر چند کہ بہت پرانے نہ تھے، مگر ناقص میٹریل سے تعمیر شدہ تھے۔ بارش تھمنے کی دعا مانگ رہے تھے۔ ایسی بلڈنگوں اور گھروں کے مکینوں کی تشویش گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ فزوں ہوتی جارہی تھی، کیوں کہ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ ناتواں سے بچے جو تھوڑی ہی دیر بارش میں نہائے تھے، انہیں کپکپی لگنے لگی تھی اور اب وہ گھروں کے کونے کھدروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ سب سے زیادہ بور اور متوحش جوان لڑکیاں تھیں، جوان نیم تاریک گھروں میں اپنا وجود چھپائے پھر رہی تھیں، مبادا اگر وہ بھیگ گئیں تو گھر میں موجود بھائی اور باپ کے سامنے کیسے جاسکیں گی۔ یہ بارش بھی کیا چیز ہے، عورت کے وجود کو بھگوتی ہے تو جیسے اسے گناہ گار کردیتی ہے۔ شام کو مہیب رات نے نگل لیا تھا۔ گٹر لائنیں پانی سے بھریں تو ان میں موجود چوہے، کاکروچ اور کنکھجورے لائنوں سے نکل نکل کر گھروں میں داخل ہونے لگے تھے۔ اب بارش دھیمی ہو چلی تھی، کچھ دیر بعد لائٹ بھی آ گئی، لیکن اپنے ساتھ ایک مصیبت لے آئی۔ بے شمار چیونٹیاں جن کے پَر نکل آئے تھے، روشنی سے معمور بلبوں کو چوم چوم کر زمین پر گر رہی تھیں۔ بلب سے نزدیک ان دیواروں پر جہاں تیز روشنی پڑ رہی تھی، رینگ رہی تھیں اور روشنی کو چاٹ رہی تھیں۔ بارش ہونے کے بعد ان غار نما تاریک و تنگ گھروں میں ایک ناگوار سی بساند بھی پیدا ہوگئی تھی۔ رات ستم کی علامت ہے، ایسی آبادیوں میں رہنے والوں کے لیے وہ اس سے ستمگر ہی ہوگئی تھی۔ چھوٹے گھر ہونے کے باعث اکثر گھروں میں پلنگ تک نہیں تھے۔ حسب معمول نیند کی دیوی دن بھر کے تھکے ہارے محنت کشوں سے ہم آغوش ہونے کے لیے بے تاب تھی۔

چاروں اور مہیب سناٹے نے اپنا راج قائم کردیا تھا۔ باہر گلیوں میں بارش کے کھڑے ہوئے پانی میں مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازوں نے اس سناٹے کا راج ختم کرنے کی ٹھان لی تھی۔ ان کے اس عمل میں جھینگر بھی برابر کے شریک ہوگئے تھے۔ لائٹ ایک بار پھر چلی گئی تھی، حالاں کہ بارش رُک چکی تھی۔ مہیب اندھیرے میں مینڈکوں اور جھینگروں کی آوازوں نے مل کر ماحول پر ایک عجیب سی وحشت طاری کردی تھی۔ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ سو ان بستیوں کے مکین اس اذیت ناک صورت حال کی صلیب پر ٹنگے نیند کی بانہوں میں جھول گئے۔ اوپر نیلا فلک سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بارش برسانے والے فرشتے نے اپنے رب کی ایما پر اس شہر پر مساویانہ بارش برسائی تھی، مگر انسان نے جسے تمام مخلوقات پر شرف حاصل ہے، کس درجے کمینگی سے اس مساوات کی دھجیاں بکھیری تھیں۔ آسمان سے برسنے والی یہ مساویانہ بارش ان انسانی بستیوں پر جب برسی تو غیر مساویانہ طرز زندگی سے جو صورت حال پیدا ہوئی، اسے دیکھ کر وہ فرشتہ بھی رو پڑا تھا۔

☆......☆

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

سچی کہانیاں کا نیا سلسلہ

جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

ارشد اجمیری

گناہوں سے تائب ہونے والے ایک شخص کی خاص کہانی

آج برسوں بعد جب میں نے جرمنی کے شہر ہمبرگ میں قدم رکھا تو مجھے ایک دوست کی سنائی ہوئی داستان یاد آ گئی، جس کی ایک بات نے کسی کی زندگی کی کایا پلٹ دی تھی۔ اُس کی زبانی ہی میں اِس داستانِ حیات کو بیان کرتا ہوں، ممکن ہے کہ اسے پڑھ کر مزید کچھ لوگوں کا بھلا ہو جائے۔

ملاح کی زندگانی، جہاز کے ہمراہ ہوتی ہے، جب کہ تاحدِ نگاہ دور دور تک پھیلا ہوا پانی اور تاحدِ نظر پانی ہی پانی...... یہی ہے جہاز کے ملازمین کی زندگانی۔ ادھر کا سامان اُدھر، ادھر کا سامان اِدھر، کہیں سے غلّہ اٹھایا اور کہیں غلّہ پہنچایا۔ اس دوران جب کہ جہاز سے سامان اتارا جا رہا ہو یا لادا جا رہا ہو۔ چھٹی کے وقفے کے دوران، گھوم پھر کر شہر کی سیر کر ڈالی۔ کہیں تو وہاں کی ثقافت سے لطف اندوز ہوئے، کہیں سے کچھ یادگار اشیاء خرید لیں، انمٹ نقوش لیے اور پھر نئے دیس، نئے شہر کو چل دیے۔ اخبار کے اشتہار میں اتنی دلچسپ باتیں دیکھ کر، نگر نگر کی سیر کی آرزو میں بے دھڑک میں نے ملازمت کی درخواست دے ڈالی اور پھر چند ہی روز کے بعد مجھے پرکھ کے لیے بلا لیا گیا۔

کمپنی کو اس وقت بندوں کی اشد ضرورت تھی، چنانچہ چند سوالات اور دستاویزات کے معائنے کے بعد مجھے پروانۂ ملازمت جاری کر دیا گیا اور چند ہی روز میں سفری دستاویزات کی تیاری کے بعد میں غیر ملکی سفر پر روانہ ہونے والے جہاز پر بھیج دیا گیا۔

دورانِ سفر جہاز کے ساتھیوں سے میرا تعارف ہوا اور آہستہ آہستہ مجھے ایک دوسرے سے گھلنے ملنے کا موقع ملا۔ جہاں جہاز پر مجھ جیسے نئے شوقین جہاں گرد تھے، وہاں پرانے پاپی بھی ہم سفر تھے۔ انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ سفر 22 یا 23 یوم میں ختم ہوگا۔

دورانِ سفر منعقد ہونے والی محفلوں نے ایک دوسرے سے متعارف ہونے میں بہت مدد دی۔ کبھی کیرم بورڈ کھیل رہے ہوتے، تو کبھی تمبولا ہو رہا ہوتا اور کبھی تاش کے ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی موسیقی سے دل بہلایا جا رہا ہوتا۔

کھیلوں کے دوران ہونے والی میری جملے بازی نے ایک پرانے پاپی کو میری طرف متوجہ کر دیا اور پھر ہم یک جان دو قالب ہو گئے۔ اس کو جہاں گردی کرتے ہوئے کئی سال بیت گئے تھے۔ کچھ ملازمت کی بندش اور کچھ شوق مے نوشی و جہاں گردی اسے ہر بار خراماں خراماں

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

سفر پر مجبور کر دیتے تھے، بقول جہازیوں کے، جس نے جہاز کی ٹنکی کا پانی پی لیا، وہ جہاز کا ہی ہو کر رہ گیا۔

22 روز کی طویل مسافت کے بعد جہاز جرمنی کے شہر ہمبرگ کی حدود میں داخل ہوا اور اسی روز برتھ پر لنگر انداز ہو گیا۔ اتفاق کی بات تھی کہ جہاز کے لنگر انداز ہونے کے بعد ہم دونوں ہی فارغ تھے۔ چناں چہ محکماتی کام مکمل ہوتے ہی ہم شہر کی تفریح کو نکل کھڑے ہوئے۔ موصوف مجھے سیدھے مے خانے لے گئے۔ شراب خانے میں داخل ہوتے ہی بدبو کے مارے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا، لیکن چوں کہ میں یہاں نو وارد تھا، اس لیے ان ہی کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار شراب دیکھی اور اس کی خوش بو سونگھی تھی اور اس کا نشہ بھی چڑھتا دیکھا تھا۔

موصوف جام پر جام چڑھاتے رہے اور ہم کوک سے دل بہلاتے رہے۔

نشہ چڑھتے ہی وہ ترنگ میں آ گئے اور مجھ سے بولے "چلو تمہیں یہاں کی کبوتریاں دکھاتے ہیں۔"

"ہم نے کہا! یہاں کی کبوتریوں میں کیا خاص بات ہے۔ میرے پاس تو بہت سی کبوتریاں ہیں لاہور میں۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنس دیے! "بچو تم ابھی نئے ہو، ان انمول کبوتریوں کو دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ یہ وہ کبوتریاں ہیں جو ہمیں اُڑاتی ہیں۔"

میں ان کی بات کو اب بھی نہ سمجھا اور موصوف کے ساتھ چل دیا۔

کئی فرلانگ کا فاصلہ جوش و شوق میں پیدل ہی طے کر لیا۔ پتا ہی نہ چلا اور پھر ہم ایک بہت ہی آراستہ گلی میں جا پہنچے۔ رات پھیلنی شروع ہو چکی تھی، اندھیرا ابھی بڑھتا جا رہا تھا۔ گلی میں ہلکی ہلکی روشنی تھی جو دونوں جانب بنے ہوئے دکانوں کی کھڑکیوں کے شیشوں سے چھن کر باہر آ رہی تھی۔ جوں جوں ہم قریب جا رہے تھے، روشنی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ جیسے ہی گلی میں پہنچا تو میں حیران رہ گیا۔ روشنی جن کھڑکیوں سے آ رہی تھی وہاں دوشیزائیں برہنہ جسموں کے ساتھ کھڑی تھیں...... میں فوراً ہی پلٹا اور اپنے دوست موصوف "بابر" سے دریافت کیا...... "یہ کہاں لے آئے مجھے!"

بابر نے برہنہ کھڑی لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے کہا۔ "بھئی دیکھ لو یہی وہ کبوتریاں ہیں جن کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا، ایسی کبوتریاں تم نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہوں گی۔"

یہ سن کر میں سمجھ گیا کہ ہم لالہ زار میں گھوم رہے ہیں۔ یہ لُٹی ہوئی، بھاگی ہوئی، اغوا شدہ لڑکیوں کی منڈی تھی۔ یہ بے شرم و بے حیا اور مجبور عورتوں کا بازار تھا۔ میں نے پہلی بار اس قدر بے شرمی کے نظارے اور بے حیائی کے اشارے دیکھے تھے۔

بابر نے مجھے بتایا کہ اس بازار میں وہ قریباً 20 سال بعد آ رہا ہے۔ جب وہ 20 سال قبل کسی جہاز پر آیا تھا تو اس نے یہاں خوب عیش کیے تھے اور خوب موجیں کی تھیں۔ خوب گلچھرے اڑائے تھے اور خوب جی بھر کے شراب و شباب کے مزے لوٹے تھے۔ یہ سن کر میری اصلاحی رگ پھڑکنا شروع ہو گئی۔

میں بابر کے ساتھ ساتھ ان رنگین فضاؤں میں گلیوں گلیوں گھومتا رہا...... اب شراب کا نشہ ہلکا ہو رہا تھا اور جوانی کا نشہ چڑھ رہا تھا۔ خاصی دیر چلنے کے بعد مجھے سامنے ہی ایک بار نظر آیا، تو میں بابر کے ساتھ وہاں بیٹھ گیا۔

وہ اب بھی ان گلیوں میں جانا چاہتا تھا، لیکن میری وجہ سے رک گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ بے شک جانے کو تم پھر وہاں چلے جانا، میں یہیں تمہارا انتظار کر لوں گا، لیکن جانے سے پہلے میرے چند سوالوں کے جواب دیتے جانا۔

بابر بولا! "ضرور...... ضرور پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"

میں نے اس سے کہا! "تم 20 سال بعد یہاں آئے ہو، کیا تمہیں وہ گلی یاد ہے جہاں تم اس وقت آئے تھے اور ممکن ہے وہ گھر بھی تمہیں یاد ہو، جہاں تم نے خوب من موجی کی تھی۔"

بابر نے کہا۔ "نہیں یار گھر تو مجھے یاد نہیں ہے اور نہ ہی مجھے گلی یاد ہے۔ ہم تو نشے میں یہاں آئے تھے اور نشہ بڑھا کے واپس چلے گئے تھے۔"

میں نے اس سے کہا! "جب گلی اور گھر ہی نہیں یاد تو ظاہر ہے کہ وہ عورتیں یا لڑکیاں کس طرح تمہیں

یاد ہو سکتی ہیں، جن کے ساتھ تمہاری راتیں رنگین گزری تھیں۔"

بابر نے کہا۔ "یہ بھی تم نے ٹھیک کہا! دونوں ہی مجھے یاد نہیں ہیں۔"

پھر میں نے اس سے کہا۔ "ممکن ہے تمہارے اس قبیح فعل سے جو تم نے 20 برس قبل نشے ہی میں انجام دیا تھا، اس لڑکی کو حمل ٹھہر گیا ہو اور جس وجود نے جنم لیا ہو، وہ ایک لڑکی ہو، تو بھلا اب اس کی عمر کیا ہو گی؟"

بابر نے جواب دیا۔ "یہی کوئی 18 یا 19 برس ہو گی۔"

میں نے کہا۔ "پھر تو یہ ممکن ہے کہ آج تم جس گھر میں جاؤ اور تمہیں جو لڑکی ملے، وہ اسی عورت کی بیٹی ہو، جس کے ساتھ 20 سال قبل تم نے رات بسر کی تھی، تو اس حساب سے وہ تمہاری بیٹی ہوئی نا۔"

بابر یہ سن کر ایک دم چیخا! "ظہیر، ذرا سوچ سمجھ کر بولو۔"

میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "بابر! غصہ نہ کرو۔ ذرا ٹھنڈے دماغ سے میری پوری بات سن لو، اس کے بعد میں تمہیں نہ تو روکوں گا اور نہ ہی کچھ کہوں گا۔"

بابر بولا۔ "ٹھیک ہے...... بولو کیا بولتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "کیا تم اس روپ میں اپنی بیٹی کو گوارا کر لو گے۔"

بابر بولا۔ "ہرگز نہیں۔"

میں نے کہا! "اب تم جا سکتے ہو، لیکن سوچ لینا کہ وہ دوشیزہ کہیں تمہاری اپنی بیٹی نہ ہو۔"

میں نے اس سے پھر کہا۔ "جاؤ اور اس عورت کو تلاش کرو اور اس سے پوچھو کہ 20 سال قبل گزاری گئی رات کے فعل سے اسے بیٹا ہوا تھا کہ بیٹی۔"

یہ سن کر بابر کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور اس کی سوچوں کے تمام دریچے کھل چکے تھے۔ میرے سوالات نے اسے کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا، کافی دیر تک وہ گم صم بیٹھا سوچتا رہا، پھر سر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "آؤ ظہیر واپس چلیں، تم نے تو مجھے عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔"

ہم نے واپسی پر کھانا کھایا اور ہم لوگ جہاز پر واپس آ گئے۔

جہاز پر بابر کئی روز تک سوچوں کی بھول بھلیوں میں گم رہا اور ہم لوگوں کے اصرار پر بھی اس نے دوبارہ شہر کا رُخ نہ کیا۔

آخر مجھ سے رہا نہ گیا...... میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"بابر! کیا بات ہے، تم نے شہر جانا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔"

بابر بولا! "ظہیر تمہاری عمر کم ہے تو کیا ہوا، لیکن تم نے بات بڑی سمجھ کی بتائی ہے، جس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے، میں اب بھی پریشان ہوں اور ہر وقت اس فکر میں مبتلا رہتا ہوں، کسی کام میں دل نہیں لگتا حتیٰ کہ کیبن سے باہر بھی نکلنے کو دل نہیں چاہتا۔"

میں نے پوچھا! "مجھے بھی تو پتا چلے کیا فکر پالی ہوئی ہے تم نے، تاکہ اس کا کوئی سدباب کیا جا سکے۔"

بابر نے کہا۔ "میں نے 22-20 سال خوب عیش و عشرت میں بسر کیے، گناہ کی دلدل میں کئی جگہ ڈوبا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ نہ جانے کتنی جگہ میری اولاد ہو گی۔ جانے وہ بھی میری طرح گناہ گار ہو گی یا نیک اور نہ جانے میں بخشا بھی جاؤں گا کہ نہیں؟"

میں نے اپنی عقل و مطالعے کے مطابق اس سے کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، قدرت غفور الرحیم ہے۔ آپ سچے دل سے توبہ کیجیے، وہ بخشنے والا مہربان ہے اور وہ اپنے بندوں سے بہت پیار کرتا ہے، اس نے پہلے ہی آپ کے گناہ پر پردہ ڈال دیا ہے۔"

یہ سن کر بابر جلدی سے بولا۔ "وہ کیسے؟"

میں نے کہا! "وہ ایسے کہ قیامت کے روز بچوں کو ان کی ماں کی نسبت سے پکارا جائے گا۔ یہ اس کی کرم نوازی نہیں تو اور کیا ہے۔"

بابر میرے اس جواب سے کچھ مطمئن سا ہو گیا اور پھر وہ ہمارے ساتھ شہر گھومنے گیا تو تلاش کر کے بہت ساری کتابیں دین اسلام پر ڈھونڈ کے لے آیا اور دن رات اُن کے مطالعے میں غرق ہو گیا۔

نیک نیتی اور دل سے توبہ نے بابر کو بدل ڈالا اور وہ اللہ کا عبادت گزار بندہ بن گیا۔ اللہ اسے نیک ہدایت پر قائم و دائم رکھے، یہی میری دعا ہے۔ آمین

☆......☆

www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوسری مرد کہانی

تجھ سا ڈھونڈوں کہاں

مجید احمد جائی

ملتان سے ایک ایسے دوست کی کہانی جو محبت اور حالات کا شکار ہو گیا
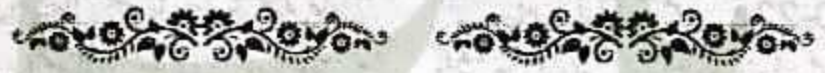
سورج اپنی کرنیں سمیٹ چکا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھانے کو تھا۔ آسمان پر بادلوں کے جھرمٹ ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ابھی ستارے کم ہی نکلے تھے جبکہ چاند اپنی چاندنی کے جلوے اندھیری رات میں روشنی بکھیرنے میں محو تھا۔ میں گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ مجھے جلدی گھر پہنچنا تھا، کیوں کہ راستہ دشوار اور کٹھن تھا۔ دن دیہاڑے وارداتیں ہو جاتی تھیں۔ امی ابو کا حکم بھی تھا کہ بیٹا اندھیرا چھانے سے پہلے گھر آجایا کرو۔ دُنیا میں سب سے زیادہ والدین کو ہی اپنی اولاد کی فکر ہوتی ہے۔ مائیں تو دعائیں مانگ مانگ کر دامن ہی گیلا کر لیتی ہیں، اولاد کو خبر تک نہیں ہوتی، ہم کہاں سے کہاں جا رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ ہمارے لیے کون تڑپتا ہے۔؟ جب بیٹا دن بھر دُنیا کی رونقوں سے نجات پا کر گھر کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔ ماں کو ہی منتظر پاتا ہے۔ ماں صدقے واری ہوتی ہے، ماتھا چومتی ہے، دن بھر کے گزرنے والے واقعات کے متعلق پوچھتی ہے پھر بڑی چاہ سے پیار سے کھانا لا کر بیٹے کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ ''لے میرے بیٹے کھانا کھا لے، دن بھر نجانے تم نے کچھ کھایا بھی ہوگا کہ نہیں۔'' بیٹا چاہے پیپسی برگر ہی کیوں نہ کھا کر آیا ہو۔ معصوم بن کر کھانا تنول فرماتا ہے۔ ماں جتنی تکلیفیں، اولاد کے لیے اٹھاتی ہے۔ اولاد کسی ایک احسان کا بدلہ بھی نہیں اتار سکتی۔ جب تک بیٹا گھر نہ آئے ماں سو نہیں سکتی، لیکن اولاد کو کہاں احساس ہوتا ہے۔

آفس سے گھر آتے ہوئے میں نے تقریباً آدھا سفر طے کیا تھا۔ کچی سڑک کے موڑ پر کھڑے نوجوان نے مجھے آواز دی۔ ''مجید بھائی۔'' میری نظریں اسی طرف اٹھیں تو سامنے میرا دوست نواز کھڑا تھا جسے لوگ ''ملکو'' کے نام سے جانتے تھے۔ ملکو کو سرائیکی دوہڑے، ماہیے، گیت بہت یاد تھے۔ اپنی گفتگو کے ساتھ ساتھ ایک دو دوہڑے بھی سنا دیتا تھا۔ اس کے اندر درد نجانے کب سے پرورش پا رہے تھے۔ وہ اندر سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا، لیکن ظاہری طور پر بہت ہنس مکھ، مسکراہٹ بکھیرنے والا تھا۔ لوگ اسے جوکر کہتے تھے۔ کوئی کتنا ہی اداس کیوں نہ ہو وہ اپنی باتوں سے لازمی اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے پھول بکھیر دیتا۔ اپنوں سے ناراض تھا، یہی وجہ تھی کہ اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس کی دوستی پا کر میں بھی کھل اٹھا تھا۔ میری تنہائی میں بھی کمی آگئی تھی۔ نواز جب بھی آتا، خوشیوں کے شامیانے لگ

جاتے، قہقہوں سے فضا میں جلترنگ سے بج اُٹھتے۔ ہماری گفتگو شروع ہوتی تو اختتام پذیر ہونے کا نام ہی نہ لیتی۔ باتیں کرتے کرتے رات اپنا سفر مکمل کر لیتی تھی۔ پرندے چہچہانے لگتے، سورج اپنی کرنیں بکھیرنے کے لیے بے تاب ہوتا تو ہم نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے، پھر ملنے کے لیے جدا ہونا لازم ہوتا ہے، اسی کے مصداق ہم جدا ہو جاتے۔

اس دن بھی نواز نے مجھے جانے نہ دیا۔ اپنی میٹھی سریلی، شیریں باتوں کے جادو میں قید کر لیا۔ ہم ادھر ہی سڑک کے موڑ پر کافی دیر محو گفتگو رہے۔ اس کی باتوں میں ایسے کھویا کہ وقت کا پتا بھی نہ چلا۔ رات، تاریکی کی چادر اوڑھ چکی تھی، تب میں نے نواز سے اجازت چاہی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہم جدا ہو گئے۔ اسی کے خیالوں میں گم میں گھر پہنچ گیا۔ حویلی کا گیٹ کراس کر ہی رہا تھا کہ میری نظریں ماں، کے چہرے پر جا ٹھہریں۔ ماں جی میرے انتظار میں تڑپ رہی تھیں۔ ''کہاں رہ گئے تھے بیٹا۔ اتنی دیر کیوں کر دی۔؟''

ماں، وہ......وہ، وہ نواز مل گیا تھا۔'' میں نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔ بجائے ماں جی مجھ سے ناراض ہوتیں، کہنے لگیں ''بیٹا اسے ساتھ ہی لے آتے۔ دیکھو! کتنا اندھیرا چھا چکا ہے۔ تمہیں کچھ ہو جاتا تو ہمارا کیا ہوتا؟ تم ہی تو ہماری کائنات ہو۔'' میں نے ماں جی کو باہوں میں بھر لیا۔ ''جب تک میری ماں کی دعائیں میرے ساتھ ہیں مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ آفتیں، بلائیں مجھ سے ڈریں گی۔'' ماں نے شفقت سے میرا ماتھا چوما اور کہنے لگیں۔ ''چلو اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ کھانا کب کا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کھانا کھا لو۔'' ماں میرے سامنے بیٹھی رہیں اور میں دیدار کرتے کھانا کھاتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد بستر کے حوالے ہو گیا۔ نیند نجانے کیوں روٹھی ہوئی تھی۔ نواز کی باتیں، اس کی مسکراہٹ میں چھپا درد مجھے بے چین کر رہا تھا۔ کروٹیں بدلتا رہا، خیالات کی جنگ جاری رہی۔ میرے ذہن کی پردہ اسکرین پر نواز چھایا رہا۔

☆......☆

میری ماضی کی کھڑکی وہاں جا کھلی، جہاں ایک دن

پارک میں بیٹھے ایسے ہی باتوں باتوں میں نواز سے میں نے پوچھا۔ ''یار ملکو! تیرے اندر اتنے درد کیوں چھپے ہیں؟ تیری آواز میں بہت درد ہے۔ تو مصنوعی مسکراہٹ سے لوگوں کے دل جیت لیتا ہے۔ لیکن اپنا درد کسی سے شیئر نہیں کرتا۔''

''بھائی مجید رہنے دو، کیوں ماحول کو اداس کرنا چاہتے ہو۔؟ یہ دُنیا ہے کسی کو خوش دیکھ کر کب خاموش

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہتی ہے۔ زخم دینا۔ اس بے وفا دنیا کا دستور ہے۔ خوشیاں چھین کر غموں کے حوالے کرنا ان کا پرانا رواج ہے۔ میں کس سے شکوہ کروں۔؟ کس کے آگے فریاد کروں؟ کوئی بھی تو نہیں میرا، جو میرے غم اپنے سمجھے۔ میری اداسیاں، خوشیوں میں بدل دے۔ میری آنکھوں سے آنسو صاف کر کے خوشیوں کے موتی بکھیرے دے؟

''میں ہوں نا'' اداسی میں ڈوبی آواز میں، میں نے کہا۔ نواز سسک رہا تھا میں نے اسے گلے لگا لیا۔ آج ایسا گویا ہوا کہ سب دل کا غبار نکال دیا۔ میں مورتی بنا سب سنتا رہا۔ نواز کہہ رہا تھا۔

''مجید بھائی! میں نے ایک متوسط گھرانہ میں آنکھ کھولی۔ ہم پانچ بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ابو کو بکریاں چراتے دیکھا۔ امی گھریلو فرائض سرانجام دیتی تھیں۔ گھر میں دوسرا نمبر میرا تھا۔ بچپن شرارتوں اور کھیلنے کودنے میں گزر گیا۔ جب سے جوانی میں قدم رکھا تو میرے اندر جذبات، احساسات، امنگیں جنم لینے لگیں۔۔۔ بے قراری بڑھنے لگی۔ آنکھیں کسی کا انتظار کرنے لگیں۔ دل کسی چہرے کے گن گانے لگا۔ نگاہوں میں کسی کی تصویر رچ بس گئی۔ ان دیکھے چہرے کا انتظار ہونے لگا۔ شاید اسی کو پیار کہتے ہیں۔ مجھے بھی کسی سے پیار ہونے لگا، لیکن اس حسین چہرے کو کہاں خبر تھی۔؟ کئی دفعہ دل نے کہا، نواز اپنی محبت کے پھول اس کے ہاتھوں میں تھما دے پھر ظالم زمانے کے ستم سے خوف کھا کر دل کی آواز اندر ہی دفن کر دیتا۔ یوں وقت گزرتا رہا۔ میں خاموش محبت کی آگ میں جلتا رہا۔ اس پری چہرے کو کیا معلوم تھا کہ کوئی اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ تو اپنی دُنیا میں مگن تھی۔

بڑے بھائی کی شادی کے بعد میری شادی کے چرچے ہونے لگے۔ نجانے وہ کون تھا جسے میرے نام سے منسوب ہونا تھا۔ گھر میں چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ جس پر ہم مرمٹے تھے وہ کسی اور کے آنگن کی رونق بن چکا تھا۔ میرے دل کے دیپ بجھ گیا تھا۔ ایک طرف اس کے نہ ملنے کا غم تھا تو دوسری طرف گھر میں آنے والی خوشیوں کا منتظر تھا۔

بدلتے موسم میں اک شام گھر میں محفل ہوئی، سبھی بڑے بزرگ جمع تھے۔ امی نے مجھے علیحدہ کر کے پوچھا۔ بیٹا ہم تیری شادی کر رہے ہیں اور ساتھ تیری بہن ایمان کا بھی رشتہ کر رہے ہیں۔ تمھاری مرضی پوچھنی تھی۔'' ماں جی! میں کیا کہوں آپ تو میری جنت ہیں۔ میری کل کائنات ہیں۔ آپ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔'' میں نے دیہاتی لڑکیوں کی طرح شرما کر جواب دیا۔ ''شاباش بیٹا! مجھے آپ سے یہی امید تھی۔'' ماں کی ممتا نے میرا ماتھا چوما اور دعائیں دیتی باہر چلی گئی۔ میری ماں کو کیا معلوم کہ اندر آگ لگی ہے۔ میرے اندر جو خاموش محبت کا دیپ جل رہا تھا۔ زمانے کی پُر زور ہواؤں سے پل بھر میں بجھ گیا تھا۔ من کا مندر مسمار ہو گیا۔ میرے خواب چکنا چور ہو گئے، سبھی جذبات خواہشات اندر اندر ہی دفن ہو گئے۔ پیار کی دیوار کو زنگ کیا لگا، ریزہ ریزہ ہو گئی۔ دل کا نگر ویران ہو گیا۔

گھر والوں کی خوشیوں کے لیے میں نے شادی کی حامی بھر لی۔ میرے انکار پر نجانے کتنے ہنگامے ہوتے۔ دوسروں کی خوشیوں کے لیے اپنی خوشیاں قربان کر دیں۔ کس کو خیال آنا تھا؟ نواز کے من مندر میں دھواں اٹھتا کس نے دیکھنا تھا۔ دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے زمین تھوڑی کانپتی ہے۔ آسمان کب آنسو بہاتا ہے، اس کی تو راکھ تک نہیں ہوتی۔ نہ جلنے کے نشان، نہ دھواں، کچھ بھی تو ظاہری آنکھ نہیں دیکھتی۔

دونوں گھروں میں شامیانے سج گئے۔ پورے گھر کو برقی بیتوں سے روشن کیا گیا تھا۔ مہمان جمع ہونے لگے۔ ڈھولک کی آواز گونجنے لگی۔ گاتی لڑکیوں، شور مچاتے بچوں کی آوازیں سماعتوں سے ٹکرانے لگیں۔ ہر چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ زمانے بھر کی خوشیاں جیسے میرے آنگن میں سمٹ آئی ہوں۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب میں دولہے کے روپ میں دوستوں کے جھرمٹ میں اپنے ہم سفر کو لینے گیا تھا۔ مہمان نوازی، رسموں رواجوں سے نجات پانے کے بعد تاروں کی چھاؤں میں دوستوں کا رقص، ڈھول کی تھاپ پر میں اپنے ہم سفر کو تنکوں سے بنی جھونپڑی میں لے آیا۔ گھر میں نئے چہرے کی آمد ہو چکی تھی۔ جہاں بہن کی رخصتی سے گھر میں اداسی کے بادل چھا گئے تھے، اب خوشیوں کے پھول کھلے اٹھے تھے۔

میری شادی وٹہ سٹہ جیسی موذی رسم پہ طے پائی تھی۔ میری بیوی رشتے میں پھوپھی زاد تھی، دوسرے لفظوں میں میری کزن تھی۔ چند دنوں میں شادی کے ہنگامے ختم ہوئے تو زندگی معمول پر آ گئی۔ ہماری نئی زندگی کا آغاز شاندار انداز سے ہو چکا تھا۔ میں اپنا ہم سفر پا کر خوش ہو رہا تھا۔ غموں کے بادل دور بہت دور جا برسے تھے۔ خوشیوں کی گھما گھمی تھی۔ اب میری محبت میری بیوی تھی۔ میرے دکھ سکھ کا ساتھی۔ شروع شروع میں خوشیوں نے گود میں بٹھا کر اپنے آنگن میں جگہ دی، لیکن یونہی وقت کی منہ زور گاڑی نے موڑ لیا۔ بہار کی جگہ خزاں رسیدہ موسم نے لے لی۔ پت جھڑ کا موسم امڈ آیا۔ گھنے شجر، ٹنڈ منڈ ہو گئے۔ کلیاں مرجھا گئیں۔ گلشن میں اداسی چھا گئی۔ بہار رخصت ہوئی، خزاں نے اپنی کالی سیاہ چادر سے کائنات کو لپیٹ لیا۔ خوشیاں روٹھ گئیں اور غموں نے بانہوں میں لے لیا۔ اداسیاں چھانے لگی۔ محبت کے پھول مرجھانے لگے، مسکراتے چہرے نفرتوں کے جال میں پھنستے چلے گئے اور خوشیوں کا چراغ گل ہوتا گیا۔ غموں نے ڈیرے کیا ڈال لیے، زندگی عذاب بن گئی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ نفرت کی اس سرد جنگ نے ایسا اثر کیا کہ سب کچھ جل کر خاک ہو گیا۔ رشتوں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ کچے دھاگے سے بنے یہ رشتے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ جان قربان کرنے والے جان لینے والے بن گئے۔ محبتوں کے پھول پیش کرنے والے زہر کے جام پلانے لگے۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ خوشیوں کا شجر خون کی ندی میں نہانے لگا۔ اس کی جڑیں دیمک چاٹ رہی تھی۔ پھر ایک دن نفرتوں کی طوفان نے اسے زمین بوس کر دیا۔ اس کی شاخیں بکھرتی چلی گئیں۔ خوشیوں کا تاج محل ویران کھنڈر کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ دلوں میں نفرتیں پھیلنے لگیں۔ آنسوؤں کا منہ زور سمندر بے قابو ہو گیا اور میرے گھر کا آخری تنکا تک بہا لے گیا۔ سب کچھ بہہ گیا۔ میری خوشیاں، میری چاہتیں، میری خونی رشتے سب چھین لے گیا، باقی صرف میں تھا اور غموں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ خوشیوں سے شروع ہونے والا حسین بندھن طلاق پر آ کر ختم ہو گیا۔ رشتے دار دشمن بن گئے، نفرتوں کی ہوا نے ایسا جال پھیلایا کہ سانس لینا دشوار ہو گیا۔ پھر اداسیاں، تنہائیاں زندگی کا حصہ بنتی گئیں۔ اب کئی سال بیت گئے ہیں زندگی اسی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔

شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ نواز درد میں ڈوبا ہوا اپنی لائف کہانی سنا رہا تھا۔ نواز خاموش ہوا تو ہم پارک سے اٹھ گئے اور ظلم صم سے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد میں بستر کی آغوش میں گیا تو آنسو آنکھوں سے بغاوت کرنے لگے۔ نواز کی باتیں، اس کی یادیں مجھے ستا رہی تھیں۔ انہی یادوں میں ایسا ڈوبا کہ معلوم نہیں ہوا کہ کس لمحے نیند نے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

وقت گزرتا رہا۔ زندگی ایسی مصروف ہوئی کہ ہماری محفلیں ختم ہو گئیں۔ نواز پردیسی ہو گیا اور میں بستر مرگ کا ہو کر رہ گیا۔ زندگی بغاوت پر اتر آئی تھی۔ سبھی مصروفیات نے معذرت طلب کر لی اور اسپتال کا روم میرا گوشہ نشین بن گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں زندگیاں تڑپتی ہیں۔ سسکتی ہیں، روتی ہیں، آنسو بہاتی ہیں، اپنوں کو آزماتی ہیں، رشتوں کی پہچان کرواتی ہیں۔ دوست، دشمن کی پہچان کرواتی ہیں۔ اپنوں کو بہت دور کر دیتی ہے۔ مختلف میڈیسن میری غذا بن گئیں۔ سکون بے قراری، درد آہوں میں بدل گیا۔ میں روز تڑپنے، سسکنے لگا۔ کئی دوست بچھڑے تھے۔ یہ زندگی کا ایسا موڑ ہوتا ہے، جہاں سبھی دعویدار آزمائے جاتے ہیں۔ جان قربان کرنے والے، آسمان سے تارے توڑنے والے، ساتھ جینے والے سبھی چھوڑ جاتے ہیں۔ ایک تنہائی ہی ہوتی ہے جو وفا کرتی ہے۔ میری زیست موت کے حوالے ہونے لگی۔ سبھی دوستوں نے، رشتے داروں، ڈاکٹروں نے امیدیں ختم کر دی۔ پیار کرنے

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

والوں نے نئے ساجن چن لیے۔

میں بستر مرگ پر ہی تھا کہ ایک شام نواز کا فون آ گیا۔ اسکرین پر نمبر دیکھتے ہی آنسو نکل پڑے۔ آنکھیں جس کا انتظار کر رہی تھیں۔ دل بہت خوش ہوا۔ میں نے روہانسی آواز میں ہیلو کہا تو نواز نے پوچھا کیسے ہو دوست۔؟ میں نے جواب میں کہا۔

"ملکو! کہاں ہو یار؟"

"میں چمن میں ہوں۔"

"اکیلے اکیلے انگور کھا رہے ہو۔ آپ کا دوست موت کے بستر پر پڑا ہے۔" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"کیا؟ کیا ہوا میرے بھائی کو؟" میں نے ٹوٹتی ہوئی سانسوں سے جواب دیا، "دیکھنا ہے تو آ کر دیکھ لو، چند دنوں کا مہمان ہوں۔ مجید بھائی کیسی باتیں کر رہے ہو؟ اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہو۔" میں نے موضوع بدلتے ہوئے نواز سے کہا۔ "میرے لیے انگور کب بھجوا رہے ہو۔؟ چمن انگوروں کا مشہور سٹی ہے، اسی کی نسبت سے میں نے نواز کو کہا۔ آپ کے لیے جان حاضر ہے، انگوروں کے ڈھیر لگا دوں گا۔"

"رہنے دو رہنے دو، زیادہ مکھن نہ لگاؤ، جب زندگی ہی نہیں رہے گی تو آپ کے انگوروں کا کیا کروں گا۔ ہاں میری قبر پر رکھ دینا۔" میں نے مایوس ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"اداسی کی باتیں چھوڑو میں جلد ہی آپ کے پاس ہوں گا۔ میرے پیارے بھائی کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔" نواز ایسے اعتماد میں کہہ رہا تھا جیسے اسے پتا تھا۔ محبت، چاہت کے جام چھلک رہے تھے۔ بہت سی باتوں کے بعد کال منقطع ہو گئی۔ میرے چہرے پر چند لمحوں کے لیے ہی سہی مسکراہٹ پھیل گئی۔ زندگی کی آخری سیڑھی پر چڑھا شخص کہاں تک خوش ہو سکتا ہے۔

گرمیوں کا سیزن تھا۔ اس وقت انگور مارکیٹ میں نہیں آئے تھے۔ فون پر بات ہونے کے دوسرے دن دوپہر کو نواز میرے پاس موجود تھا۔ ہاتھ میں انگوروں سے بھرا شاپر تھا۔ نواز کو دیکھ کر میری آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برسنے لگیں۔ آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ نواز میرے سینے سے لگ گیا۔ "نہیں یار نہیں، بہت آنسو بہا لیے آپ نے، اب میں رونے نہیں دوں گا۔" آنسوؤں کا سیلاب تھا کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ نواز مجھے دلاسے دے رہا تھا۔ میرے لبوں پر یہ شعر مچلنے لگا۔

برسوں بعد بھی ملا تو اس کے لب پہ کوئی گلا نہ تھا
اسے میری چپ نے رلا دیا جسے گفتگو میں کمال تھا

"میری زندگی آپ کو لگ جائے۔"

"نہیں یار نواز جانی ایسا نہیں کہتے۔ اپنی زندگی سدا خوشیوں کے ساتھ جیو۔ آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔" باتیں کرتے کرتے شام ہو گئی۔ اس رات نواز میرے پاس ہی رہا۔ ہمیں کیا معلوم تھا یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ زندگی نے بہت بڑا صدمہ دے دیا، جس کا مجھے وہم و گمان تک نہ تھا۔ نواز اس دن جدا کیا ہوا پھر زندگی نے دیدار کا موقع ہی نہ دیا۔ نواز گھر چلا گیا اور میں اسپتال میں بستر مرگ پڑا زندگی اور موت کی جنگ لڑتا رہا۔ میری بیماری طویل ہوتی گئی۔ اپنے سہارے اُٹھ نہیں سکتا تھا، چلنا تو دور کی بات تھی۔ میرے کانوں، یا چہرے پر بیٹھی مکھی کو اڑانے کی طاقت نہیں تھی۔ شب و روز اسی کشمکش میں گزر رہے تھے کہ ایک خبر نے میری روح تک گھائل کر دی۔ نواز بہت بیمار ہو گیا۔ اسے کچھ ہوش نہیں ہے اس کا بھائی اور والد مجھے ملنے آئے تھے۔ نواز کا والد کہہ رہا تھا مجھے کسی اچھے معالج کا پتا بتا دو۔ میں اپنے بیٹے کا علاج وہاں سے کرواتا ہوں۔ میں بھی تو چار سال سے بستر مرگ پر پڑا علاج کروا رہا تھا۔ انہوں نے نواز کے ٹیسٹ کروانے تھے اور اچھی لیبارٹری کا پوچھ رہے تھے۔

"کیا ہوا میرے بھائی کو؟" میں نواز کے بارے پوچھ رہا تھا۔ "کچھ سمجھ نہیں آتا، آخر ہوا کیا ہے، کوئی کچھ نہیں بتاتا، بہت علاج کروا رہے ہیں۔ مگر......" نواز کا والد جواب دیتے ہوئے رو پڑا۔ نواز کا بھائی اور والد کب کے معلومات لے کر چلے گئے تھے اور میری دُنیا میں ہلچل مچ گئی۔ میں نواز سے ملنا چاہتا تھا۔ نواز کو دیکھنا چاہتا تھا، اسے کہنا چاہتا تھا کہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ تجھے کچھ نہیں ہونے دوں گا، لیکن یہ کیا تم نے اپنی ہی حالت بگاڑ دی۔ میں مجبور تھا، چل نہیں سکتا تھا، نہ ہی بیٹھ سکتا تھا۔ اس حالت میں کیسے نواز کے پاس جاتا؟ بس اپنی تکلیف بھول کر نواز کی زندگی کی دعائیں

شادی مبارک

ہمارے بہت پیارے لکھاری دوست اور ساتھی مجید احمد جائی (ملتان) ماہِ مارچ میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے، ادارہ پرل پبلی کیشنز مجید احمد جائی کو شادی کی مبارکباد پیش کرتا ہے اور ان کی زندگی کی خوشیوں کے لیے دعا گو ہے۔

مانگنے لگا۔ میرے لبوں پر صرف اور صرف نواز کی زندگی کی التجائیں، آرزوئیں تھیں۔ میں بھی کتنا مجبور تھا، اپنے دوست کے کام نہ آ سکا۔ زندگی اتنے کرب میں مبتلا ہو جائے گی، کہاں معلوم تھا۔

اے مقدر تو مجھے ترسائے گا آخر کب تک
یا میری بات سمجھ یا مجھے پاگل کر دے

وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔ نواز ایک ماہ کے اندر اندر سوکھی پتلی لکڑی کی مانند ہو گیا۔ جہاں ہینڈسم سمارٹ ساڑھے چھ فٹ کا نوجوان تھا۔ جب سامنے ہوتا تھا پہلوان ہی تو نظر آتا تھا۔ اب بیماری نے اسے کمزور لاغر کر دیا تھا۔ کھانا پینا بند ہو گیا۔ لوگوں کو ہنسانے والے کتنے کرب سے گزر رہے تھے۔ کوئی درد و غم بانٹنے والا نہیں تھا۔ لوگوں کو خوش کرنے والا ایک خوشی کے لیے ترس گیا تھا۔ بوڑھے ماں باپ صدقے واری ہوتے تھے۔ ماں! کہتی یہ سیب کھا لو، لو دوائی لے لو۔ دیکھو تو تیری یہ حالت مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ دوائی کھائے گا تو ٹھیک بھی ہوگا، بس تو جلدی ٹھیک ہو جا۔ دوائی نہیں کھائے گا تو صحت یابی کیسے آئے گی، چل یہ لے فروٹ کھا لے۔

ماں، کتنے پیار و محبت سے اس کی خدمت کر رہی تھی۔ ماں! اپنی اولاد کے دکھ کہاں برداشت کر سکتی ہے۔ اس بیچاری ماں کو کہاں معلوم تھا کہ اس کا جگر گوشہ چند دنوں کا مہمان ہے۔ عنقریب اس بے وفا دُنیا سے کنارہ کرنے والا ہے۔ تب اس سے ناراض ہونے والے بھی آنسو بہائیں گے۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ صبح سویرے ابھی سورج نے اپنی کرنیں زمین پر نہیں بکھیری تھیں کہ میرے بھائی کے پاس کال آئی کہ نواز اس دُنیا میں نہیں رہا۔ کتنی دردناک صبح تھی۔ ابھی موذن اذان دے رہا تھا کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔ جب بھائی نے یہ سوگوار خبر مجھے سنائی تو آنکھیں چھم چھم برسنے لگیں۔ دل خون کے آنسو رونے لگا۔ آہائے۔ اے بے بس زندگی تجھے کیوں کر چاہوں، تو نے اتنی فرصت ہی نہ دی کہ اپنے پیارے دوست کے جنازے کو کندھا دے سکتا۔

میں رونے لگا تھا۔ میری چیخیں محلے والے بھی سن کر آ گئے تھے۔ جب غم حد سے بڑھ جائے تو انسان صرف آنسو ہی بہا سکتا ہے۔ سوائے آنسو بہانے کے کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔ امی جان، بھائی سے ناراض ہونے لگیں کہ تم نے اسے کیوں بتایا۔ اب آسمان سر پر اٹھا رہا ہے۔ امی کا شکوہ بھی بجا تھا۔ ان سے میرا رونا چیخنا برداشت نہیں ہوتا تھا۔ رات کی تاریکی میں امی کو میں نے رب کے حضور روتے دیکھا تھا۔ ان کے آنسوؤں سے مصلیٰ بھیگ جاتا تھا۔ کتنی عظیم ہستی ہے۔ ماں، بچے کو کانٹا کیا چبھا ماں بلبلا اٹھی۔ ماں تجھ پہ ساری خوشیاں قربان۔ اس ماں پر کیا گزری ہوگی جس کا لخت جگر اس کی آنکھوں کے سامنے سسکیاں بھر بھر کر دم توڑ گیا تھا۔ کتنی بے بس ماں تھی اپنے بیٹے کو زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ کاش! ماں کے ہاتھوں میں اولاد کی زندگی کی قسمت ہوتی تو کوئی ماں اپنے لخت جگر کو اپنے سے جدا نہ ہونے دیتی۔ ماں اپنے بچوں کی آنکھوں میں آنسو نہ آنے دیتی۔

نظام قدرت ہے انسان کا بس کہاں چلتا ہے۔ آخر نواز، بہن بھائیوں، والدین اور دوستوں کو روتا چھوڑ کر اس دینا فانی سے کوچ کر گیا۔ ایک نہ برداشت ہونے والا صدمہ ملا تھا۔ نوجوانی کی موت سبھی پہ گراں گزرتی ہے۔ اس دن پرندے بھی اداس تھے، جن کو نواز دانہ ڈالا کرتا تھا۔ شجر بھی صف ماتم بچھائے ہوئے تھے۔ ابر بھی برداشت نہ کر سکا اور خوب دل کھل کر رو دیا۔ ایسا رویا کہ ہر طرف جھل تھل کر دی۔ اب کون تصور کرتا کہ یہ بادل کس لیے رو رہے ہیں۔ بارش کسی کے لیے رحمت ہوتی ہے تو کسی کے لیے زحمت۔ شجر سے ٹپ ٹپ کرتا پانی بھی اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ نواز اب اس حویلی میں نہیں رہا۔

امی اور بھائی مجھے گھر میں اکیلا چھوڑ کر نواز کے گھر

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

چلے گئے تھے۔ آخری رسوم پر لوگوں کا جم غفیر جمع تھا۔ دیدار آخر کے لیے دور دور سے لوگ آئے تھے۔ شام ہونے سے پہلے نواز کو دولہے کے روپ میں سجا کر شہر خموشاں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سلا دیا گیا۔ نواز ایسی نیند سویا کہ پھر لاکھ شور و غل سے بھی آنکھ نہ کھل سکی۔ ماں غم میں نڈھال نواز کے لاشے سے لپٹ لپٹ کر روتی رہی تھی۔ باپ دیواروں سے سر مار رہا تھا۔ بھائی رو رو کر نیم بے ہوش ہو گئے تھے۔ ہر چہرہ اداس اور غم میں نڈھال تھا۔ آج ان کے گھر کا چراغ بجھ گیا تھا۔ جانے والے کو کون روک پایا ہے۔ مجبوراً سب برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کئی دن ماحول سوگوار رہا پھر زندگی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ نواز صرف دل میں یاد بن کر رہ گیا۔ ایسی یادیں جن سے پیچھا چھڑانے پر بھی نہ چھوٹے۔

شام کا اندھیرا ہر طرف اپنی چادر پھیلا چکا تھا تب امی جان اور بھائی گھر میں داخل ہوئے۔ امی آتے ہی مجھ سے لپٹ گئیں اور نجانے آنسوؤں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر کب تک بہتا رہا۔ ماں مجھے چومتی، گلے لگاتی، دعائیں دیتی، میرے سرہانے ہی سو گئی۔ رات کے پچھلے پہر میرا درد حد سے بڑھ گیا اور میں بلک بلک کر رونے لگا، تب ماں جی کی آنکھ کھل گئی۔ ماں تڑپ اٹھی، مجھے فوراً میڈیسن دی۔ پھر چند لمحوں کے دردناک عذاب کے بعد میں پُرسکون ہو کر سو گیا۔ پھر کوئی خبر نہ رہی کہ کہاں پڑا ہوں، کہاں نہیں۔

تڑپتے، سسکتے آنسو بہاتے اسپتال کے بستر پر پڑے چار سال کا عرصہ بیت گیا۔ چار سالوں میں کچھ دوست اپنی نئی زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔ کچھ دوست ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو چکے تھے۔ چار سال کے بعد معجزانہ طور پر میری زندگی پھر سے لوٹ آئی۔ جن ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا حیران تھے۔ رشتے داروں نے امیدیں چھوڑ دی تھیں۔ کہتے ہیں جہاں انسان کی سوچ اختتام پذیر ہوتی ہے وہاں سے رب تعالیٰ کی حکمت شروع ہوتی ہے۔ گھر والے بھی علاج کروا کروا کر تھک گئے تھے۔ پھر رب العزت نے انوکھا سلسلہ بنایا۔ میں زندگی کی طرف لوٹنے لگا، یوں چھ ماہ کا عرصہ مزید بیت گیا۔ میں چلنے پھرنے لگا۔ لاٹھی کے سہارے گھر کے صحن میں، باہر گلیوں میں گھومنے لگا۔ لوگ پیار و محبت سے اپنے گھر لے جاتے۔ اب یہ ان کی ہمدردیاں تھیں یا محبت یا پھر ترس کھاتے تھے۔ دلوں کے بھید اللہ تعالیٰ جانتا ہے انسان، بشر کا کیا کام۔ اس دوران میری بھابی میرے آنگن میں جلوہ گر ہو چکی تھی اور میری بہن اپنا پیا گھر سدھار گئی تھی۔ جن کے ساتھ بچپن گزرا تھا انہوں نے ٹھکانے بدل لیے تھے۔ شادی کے ہنگامے کب گزرے کچھ علم نہیں تھا۔ میں زندگی کو موت کے منہ سے چھین کر لایا تھا۔ آہستہ آہستہ میرے جسم میں نیا خون بننے لگا اور جسم جو سوکھ کر لکڑی بن چکا تھا، گوشت سے بھرنے لگا، جیسے خزاں رسیدہ شجر پر بہار نے ڈیرے ڈال لیے ہوں۔ یوں مجھے نئی زندگی مل گئی۔

وقت کا گھوڑا دوڑتا رہا اور پانچ سال کا عرصہ پل بھر میں گزر گیا۔ میں نئی زندگی پا کر دنیا کی رنگینیوں میں گم ہو چکا تھا۔ پانچویں سال اپنے پیارے دوست نواز کے علاقے میں شادی تھی۔ ہمیں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس بار بھائی کی جگہ امی نے مجھے کہا کہ بیٹا مجھے شادی والے گھر چھوڑ کر آؤ۔ اسی بہانے تم بھی سیر و تفریح کر لینا۔ مقررہ ڈیٹ کو امی اور میں نے تیاری کی اور بائیک پر شادی والے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ نہر کنارے چلتے چلتے، لہلہاتی فصلوں کو پیچھے چھوڑتے سایہ دار درختوں کے جھرمٹ سے گزرتے، کچی پکی سڑکوں سے ہوتے ہوئے مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔ امی کو شادی والے گھر چھوڑا اور میں چند دوستوں کو ملنے چلا گیا۔ وہاں نواز کے بھائی کو دیکھا تو تڑپ کے نواز کے بھائی کو آواز دی۔ جو قریب ہی اپنے کسی دوست سے گپ شپ لگا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں میرے پاس آیا۔ میں نے اس سے التجا کی کہ یار میں نے نواز سے ملنا ہے۔

”نواز......؟ آپ کون ہیں؟ نواز کو کیسے جانتے ہو؟“ اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر لیے۔ میرے بھائی میں مجید احمد جائی ہوں اور نواز کا دوست ہوں۔ مجھے اس کے پاس لے چلو، میں بعد میں آپ کو ساری داستان سناتا ہوں۔

”دوست!!!؟ بھائی نواز کو ہم سے بچھڑے پانچ سال ہونے والے ہیں۔“ ٹھنڈی آہوں کے ساتھ میں نے جواب دیا۔ ”ہاں یار! میں جانتا ہوں۔ میں اس کی آخری آرام گاہ پر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔“ نواز کے بھائی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور میرے

ساتھ بائیک پر بیٹھ کر کہنے لگا، ”چلو بھائی۔“ میں اسے لے کر نواز کو ملنے چلے گئے۔ پہلے پکی سڑک، پھر کچی سڑک اور آخر میں کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے شہر خموشاں میں پہنچ گئے۔

ایک درخت کے سائے میں نواز کا بھائی جا کر رک گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”دوست! مجھ سے آگے نہیں چلا جائے گا۔ وہ مکان دیکھ رہے ہو۔ نواز اس میں رہتا ہے۔ مٹی کے مکان میں مکین کیسے پرسکون سو رہے تھے۔ ذرا خیال سے جانا بھائی، بھائی آرام کر رہا ہوگا۔ ابھی ابھی تو دردوں سے نجات پا کر سکون سے سویا ہے۔ آپ کے اس طرح جانے سے کہیں ان کے آرام میں خلل نہ آ جائے۔“ ساتھ ہی اس کی چشم نم ہونے لگی۔ وہیں سے وہ دبے پاؤں واپس پلٹ گیا۔ ایک بھائی بھائی کا غم برداشت نہیں کر پایا تھا۔ یہی تو اس کی محبت تھی۔

میں خراماں خراماں چلتے ہوئے اس کچے مکان کے پاس جا ٹھہرا۔ وہاں مکمل سناٹا تھا، شور و غل، اٹرتی، دوڑتی زندگیوں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ بالکل سکون ہی سکون۔ زندگی میں پہلی بار ایسی جگہ ملی تھی جہاں سکون سکون ہی تھا۔ میں نے اس کچے مکان کی مٹی کو اٹھایا اور محبت یار میں بوسہ دیا۔ میری آنکھیں چھم چھم برسنے لگیں۔ کافی دیر، میں اپنے جگری دوست سے باتیں کرتا رہا۔ بہت گلے شکوے کیے۔ ایسے محسوس ہوا جیسے نواز کہہ رہا ہو دیکھ یار مجید! اتنے عرصے بعد ملنے آئے ہو۔ تیری دید کو اکھیاں ترس رہی تھیں، بہت تڑپایا ہے تو نے۔ تو نے بھی کچھ کم نہیں کیا۔ میں نے جواب دیا۔ مجھے بستر مرگ پر اکیلا چھوڑ کر چپ چاپ آ کر سکون سے سو رہا ہے۔ دیکھ میرے بھائی، اللہ تعالیٰ نے تجھے صحت عطا کر دی۔ جا لوٹ جا اپنی دنیا میں نجانے تیرے انتظار میں کتنے لوگ بیٹھے ہیں۔ جا لوٹ جا اور ہاں جا کر کبھی رونا مت، تیرے آنسو مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔ نواز یار! میری اصل دنیا تو یہی ہے۔ تو جلدی آ گیا میں بھی آنے والا ہوں، پھر میں نے نواز سے وعدہ کیا کہ نواز اب بہت ہو گیا۔ یہ جدائی اب برداشت نہیں ہوتی۔ اب مزید آپ سے دور نہیں رہ سکتا، بس بہت جلد آپ کے پاس آنے والا ہوں۔ میں بہت تھک گیا ہوں، اب مجھے بھی سونا ہے۔ دل سکون چاہتا ہے۔ آنکھیں نیند سے سرخ لال ہو چکی ہیں۔ اب ان کو سونا ہے بس میرا انتظار کرنا۔ میں تجھ سے ملنے آؤں گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کے پاس۔

بن تیرے جی کے دیکھ لیا پر جی نہ سکے ہم
تم سے بچھڑ کر اتنا روئے کہ بتا بھی نہ سکے ہم

نواز سے حال دل کہتے کہتے شام ہو گئی۔ میں عہد و پیمان کرتا ہوا نواز سے رخصت ہو گیا۔ شادی والے گھر پہنچا تو امی مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔

”کہاں چلا گیا تھا؟ کب سے تیرا پوچھ رہی ہوں؟“

”امی جی میں اپنے بچھڑے دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔ وہ تو آنے نہیں دے رہا تھا بس تھوڑی دیر کے لیے چھٹی لے کر آیا ہوں۔ چل ماں! گھر کو چلیں۔“ امی سے ابھی یہی کہہ پایا تھا کہ نواز کا بھائی کہیں سے آ گیا۔

”یار! آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ کون ہیں؟ نواز بھائی کو کیسے جانتے ہیں؟“ میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ نواز اور اپنی دوستی کی داستان اس کے گوش گزار کی اور امی کو لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ آج میں پُرسکون تھا، کیونکہ پانچ سال بعد اپنے بچھڑے دوست سے مل کر آیا تھا۔ آج نواز کو ہم سے بچھڑے آٹھ سال بیت گئے ہیں۔ قدرت کے نظام پر آج بھی حیرت زدہ ہوں کہ میں چار سال بستر مرگ پر پڑا رہا اور پھر زندگی مل گئی۔ نواز ایک ماہ کے اندر اندر زندگی کی بازی ہار گیا۔ جس کی موت کا ڈاکٹروں، رشتے داروں، دوستوں، والدین،، بہن بھائیوں نے عندیہ دے دیا تھا۔ اسے زندگی مل گئی اور جس کی موت کا وہم و گمان بھی نہیں تھا، سب کو روتا چھوڑ کر پُرسکون سو گیا۔ شاید اس کی اپنی زندگی مجھے دینے کی دعا قبول ہو گئی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے راز اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ من میں آج خلش ہے، ایک ہی حسرت ہے کہ نواز جیسا کوئی مل پاتا۔ ہزار ہا ڈھونڈا مگر کوئی مل نہ پایا، پھر لبوں پر ایک ہی آہ ابھری ”کوئی تجھ سا ڈھونڈوں کہاں؟“

بہتے ہوئے اشکوں کی روانی میں مرے ہیں
کچھ خواب میرے عین جوانی میں مرے ہیں

قارئین میرے پیارے دوست محمد نواز کے لیے دعا مغفرت ضرور کرنا۔ اللہ تعالیٰ اسے جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

☆......☆

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

تہی داماں

ثناء کنول اللہ دتہ

لودھراں سے مکافاتِ عمل کی ایک لرزہ خیز داستان

میرا نام جہاں زیب علی ہے۔ وہ بھی کیا دن تھے جب میں کالج کا ہیرو تھا اور مجھے خود پر بڑا ناز تھا، لیکن آج دوسروں کا محتاج ہوں۔ میرا گھر کیا ہے، ایک کچا کمرا، بڑا سا صحن جس میں پیپل کا بڑا سا درخت ہے، جس کے پتے صحن میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ درخت کے نیچے پڑی جھلنگا چارپائی جس پر میں سارا دن ساری رات پڑا رہتا ہوں۔ بس یہ ہی میری کل دنیا ہے۔ میں رونا بھی چاہتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو نہیں آتے۔ کہتے ہیں نا کہ انسان اپنی غلطیوں اور گناہوں سے زیادہ دیر بھاگ نہیں سکتا کہ یہ تو ہمارے تعاقب میں رہتے ہیں، پھر ایک مقام ایسا آتا ہے کہ یہ سب ہم سے آگے نکل کر ہمارا راستہ روک لیتے ہیں اور اس وقت پشیمانیاں بھی کام نہیں آتیں۔ آج میرے گناہ، میری غلطیاں میرا رستہ روکے کھڑی ہیں اور میں خود کو بے بس محسوس کر رہا ہوں، بالکل ویسے ہی جیسے ایک انسان ریگستان میں تنہا کھڑا ہو اور پیاس سے اس کے گلے میں کانٹے چبھ رہے ہوں، اس کے سامنے بڑا سا سمندر ہو مگر وہ اس میں سے پانی نہ پی سکتا ہو۔ آج میں بھی تنہا ہوں اور بے بس بھی۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے، جس دن میں کالج لیٹ گیا تھا۔ میں جلدی جلدی قدم اُٹھا رہا تھا کہ میں نے سامنے دیکھا، میرے دوست شاکر، ساجد، اجمل اور اکمل وہاں گیٹ کے ساتھ کھڑے تھے اور روز کی طرح کالج میں داخل ہونے والی لڑکیوں کو چھیڑ کر مزے لے رہے تھے۔ یہ ہم دوستوں کا مشغلہ تھا۔ میں ابھی اُن کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اجمل کسی برقع پوش لڑکی کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا تھا۔

''کیسی ہو شہزادی، آج کالج میں پہلی بار نظر آ رہی ہو، سلام دعا تو لے لو۔''

اجمل کی بات پر میں مسکرا دیا، مگر اگلے ہی پل ساکت رہ گیا۔ وہ لڑکی کچھ لمحے خاموش رہی پھر تحمل سے سلام کر کے بولی۔

''مسٹر ایک سوال کرتی ہوں میں آپ سے، کیا جواب دینا پسند کریں گے۔''

لڑکی کی بات پر میں وہیں پر رُک گیا کہ پتا نہیں یہ لڑکی کیا کہنے والی ہے، جب کہ ساجد خباثت سے مسکرا کر بولا تھا۔

''زہے نصیب...... آپ سوال کریں اور ہم جواب نہ دیں ایسا ہو سکتا ہے بھلا، پوچھیے ضرور پوچھیے۔''

''کیا آپ مسلمان ہیں؟''

لڑکی کی بات پر میں حیران رہ گیا تھا، جب کہ ساجد، اجمل، اکمل اور شاکر وغیرہ بھی حیرانی سے لڑکی کو دیکھ رہے تھے، پھر شاکر بولا تھا۔

''ہاں ہم مسلمان ہیں، اس میں کوئی شک ہے کیا؟ اگر شک ہے تو ابھی رفع کر دیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ سب مل کر ہنسنے لگے۔ وہ لڑکی بجائے گھبرانے کے ایک بار پھر بولی۔

''تو یقیناً آپ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو بھی مانتے ہوں گے اور یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اللہ ہر شخص کو اس کی کرنی کا پھل ضرور دیتا ہے۔ کالج میں پڑھنے والی ساری لڑکیاں آپ کی بہنوں کی طرح ہیں، کیا آپ لوگ اتنے بے غیرت ہو چکے ہیں کہ اپنی بہنوں کو یوں بے عزت کرتے ہیں۔''

وہ لڑکی اتنا کہہ کر کچھ قدم چل کر رُک کر دوبارہ بولی تھی۔

''اور ہاں اس سے پہلے کہ شیطان آپ کو پوری طرح گناہوں کے دلدل میں دھکیل دے، پلیز توبہ کر لیں، اس سے پہلے کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ آپ سے ناراض ہو جائیں۔''

وہ لڑکی چلی گئی، جب کہ میں حیران ہوتا ہوا اجمل کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''کون ہے یار یہ لڑکی؟ اس کا تو کچھ انتظام کرنا پڑے گا۔'' میں نے اپنے دوستوں سے وعدہ کیا کہ ایک دن اس لڑکی کو برباد نہ کر دیا تو پھر کہنا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ لڑکی میری ہی کلاس میں پڑھتی ہے۔

پھر میرے لیے کرن ایک بازی بن گئی، جسے میں ہر حال میں جیت لینا چاہتا تھا۔ میں کچھ دنوں کے لیے چھٹیوں پر چلا گیا، واپس آیا تو سب میرا حلیہ دیکھ کر حیران تھے۔ سر پہ ٹوپی، نظر نیچی، ٹخنوں سے اونچے پائنچے۔ میرے دوست مجھے دیکھ کر مسکرائے تو میں نے انہیں آنکھ ماری۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اب میرے ہاتھوں میں مذہبی کتابیں ہوتیں اور ہونٹ اکثر یوں کھلتے بند ہوتے جیسے میں کوئی وِرد کر رہا ہوں۔ میں دانستہ اپنے دوستوں سے بھی دور ہو گیا، تاکہ کرن مجھے ان کا ساتھی نہ سمجھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کرن میری پرسنالٹی سے متاثر ہو رہی ہے وہ اکثر چوری چھپے مجھے دیکھتی تھی، میں بھی کبھی اچانک نظر اُٹھا کر اسے دیکھتا تو وہ گھبرا کر سر جھکا لیتی، اب میں نے اس ڈرامے کو نیا موڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کرن کو ایک خط لکھا جو

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کچھ یوں تھا۔

میری معصوم سی محبت، ہمیشہ خوش رہو۔

اللہ آپ کی حفاظت کرے۔(آمین)

"کرن حالاں کہ اسلام ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا، لیکن میں دل کے ہاتھوں بہت مجبور ہو کر یہ خط لکھ رہا ہوں، میں نے آپ کو کالج میں دیکھا تھا بس تب سے آپ کی محبت میری رگوں میں خون کی صورت دوڑ رہی ہے۔ آپ سانس لیتی ہو تو میں سانس لیتا ہوں، آپ ہنستی ہو تو میں ہنستا ہوں۔ آپ خوش رہتی ہو تو میں بھی خوش رہتا ہوں، آپ جسم ہو تو میں جان ہوں، آپ دل ہو تو میں دھڑکن ہوں۔ آپ آنکھ ہو تو میں آنسو ہوں، دل دھڑکن کے بغیر ادھورا ہے، اسی طرح میں آپ کے بغیر ادھورا ہوں۔ میں آپ کو شرعی طور پر اپنی شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔ آپ میری اس جسارت پر ناراض نہ ہونا، کیوں کہ اسلام میں کسی کو پسند کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں، میں نے آپ کی رائے مانگی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ میری محبت کو نہیں ٹھکرائیں گی۔"

یہ خط لکھ کر میں نے موقع دیکھ کر کرن سے چوری اس کی کتاب میں رکھ دیا۔

میں ایسا بھنورا تھا جس نے نجانے کتنی لڑکیوں کی عزت کو پامال کیا تھا۔ میری ماں بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھی اور ابو اکثر بیمار رہتے تھے، بہن کوئی تھی نہیں، بس ایک بڑا بھائی تھا جو کہ دبئی میں رہتا تھا، اس نے وہیں پر شادی کرلی تھی، بس ہر مہینے رقم بھیج دیتا تھا جس کے بل پر میں عیاشی کرتا تھا۔ ابو جو کہ بیمار رہتے تھے مجھے جب بھی سمجھانے کی کوشش کرتے میں انہیں جھڑک دیا کرتا تھا۔

کرن میرے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی، اس نے مجھے جس حلیے میں دیکھا تھا شاید وہی اس کا آئیڈیل تھا اور میں تو اس کے پہلے روز کے رویے سے سمجھ گیا تھا کہ ذرا مذہبی ٹائپ کی لڑکی ہے۔

ایک روز اس نے ایک پرچہ میری طرف بڑھایا، جس پر لکھا ہوا تھا۔ "اپنے والدین کو میرے گھر رشتے کے لیے بھیج دو۔"

اس کی بات پر میں دل میں ہنس پڑا کہ واقعی لڑکیاں بے وقوف ہوتی ہیں، میرے ڈرامے سے وہ شاید متاثر ہوگئی تھی۔ میری سابقہ حرکتوں کی وجہ سے میری کچھ غلط قسم کی خواتین سے بھی دوستی تھی اور میں اکثر اپنے شکار ان کے ہی گھروں پر لے جایا کرتا تھا۔ ان میں ایک خاتون کو میں نے اپنے ساتھ شریک کیا اور انہیں اپنی والدہ بنا کے کرن کے گھر پہنچ گیا۔ کرن نے شاید میرے متعلق اپنی ماں کو بتا دیا تھا، لہٰذا ہماری بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ کرن کی امی سے دیگر معاملات اگلی ملاقات کے لیے طے پا گئے، کیوں کہ اس روز اس کے بھائی اور والد بھی گھر پر موجود نہیں تھے۔ کرن کی ماں کو میں پسند آگیا تھا اور انہوں نے میرے لیے اپنی رضامندی ظاہر کردی تھی۔ ایک روز میں نے اس سے کہا کہ میری امی اس سے ملنا چاہتی ہیں، وہ میرے ساتھ میرے گھر چلے، کرن مان گئی، پھر میں اسے ساجدہ آنٹی کے گھر لے گیا جہاں میرے دوست ساجد اکمل اور اجمل بھی موجود تھے اور اس سارے کھیل میں شیطان ہم سب کی سرپرستی کر رہا تھا۔ کرن تو انہیں دیکھ اتنی حواس باختہ تھی کہ کوئی آواز بھی اس کے منہ سے نہیں نکل رہی تھی۔ وہ تقریباً بے جان ہو چکی تھی، بس اس کی پھٹی پھٹی خوفزدہ آنکھیں مستقل مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ شیطانی کھیل سے فارغ ہو کر ہم اس زندہ لاش کو ایک ویرانے میں پھینک آئے۔ گھر آیا تو ابو کی حالت بہت خراب تھی۔ میں نے بھائی کو فون کیا تو وہ اگلی فلائٹ سے وہاں پہنچے اور اسی رات ابو کا انتقال ہوگیا۔ تب بھائی مجھے اپنے ساتھ ہی دبئی لے گئے۔ میں بھی وہاں سب کچھ بھلا کر دنیا کے معاملات میں مصروف ہوگیا۔ وہاں بھائی نے میری شادی ملالہ سے کردی اور شادی کی رات مجھے پتا چلا کہ ملالہ حاملہ ہے، وہ بھی تین مہینوں سے، میں ساکت رہ گیا۔ میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی۔

میں جو دوسروں کی زندگی برباد کیا کرتا تھا اب میری اپنی زندگی برباد ہوگئی تھی اور اس کا ذمے دار میں خود تھا۔ میں اپنی ہی نظروں سے گر گیا تھا، پھر میری ایک دن اجمل سے فون پر بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ تمہارے جانے کے کچھ دن بعد ہی کرن نے خودکشی کرلی۔ اس کے گھر والے بھی اب نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں اور تب مجھے کرن کی بے رونق دہائی دیتی آنکھیں یاد آگئیں۔ میرا گناہ کبیرہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اک لمحہ، وہ ایک پل ہماری زندگی میں کبھی نہ آتا۔ اے کاش۔

کچھ عرصے بعد کاروبار میں نقصان ہوگیا تو بھائی بھی پریشان رہنے لگے اور مجھے مشورہ دیا کہ تم پاکستان واپس چلے جاؤ اور وہاں جا کر کاروبار کرنے کی کوشش کرو، لیکن شاید کاتب تقدیر نے میری قسمت میں بُرے دن لکھ دیے تھے یا مجھے میری کرنی کا پھل مل رہا تھا۔ کاروبار میں بجائے فائدے کے نقصان ہوتا گیا اور میری ساری جمع پونجی برباد ہوگئی۔ ملالہ کی بیٹی پیدا ہوئی تو میں نے اسے کبھی نہیں پوچھا کہ یہ کس کی بیٹی ہے۔ کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی میری اس سے یہ معلوم کرنے کی، کیوں کہ ملالہ ایک بدزبان عورت تھی، وہ ہر وقت مجھ سے لڑتی رہتی تھی۔

میں جیتے جی دوزخ میں جل رہا تھا۔ ملالہ کی بڑی بیٹی ثانیہ کے بعد میری بیٹی سمیرا پیدا ہوئی۔ اسی دوزخ میں جلتے میں نے نجانے زندگی کے کتنے سال گزار دیے، پھر ایک دن رات کی سیاہی میں ثانیہ گھر چھوڑ کر بھاگ گئی۔ میں جو دوسروں کی عزتوں کو رات کی سیاہی میں گھول دیتا تھا، میری اپنی بیٹی کو کوئی بھگا کر لے گیا تھا، پھر ایک ایکسیڈنٹ میں میری ایک ٹانگ ضائع ہوگئی اور اس طرح میں دوسروں کا محتاج ہوگیا۔ ملالہ بھی پریشانیوں سے گھبرا کر گھر چھوڑ کر چلی گئی، جبکہ سمیرا نے اپنے بوائے فرینڈ سے شادی کرلی۔ آج میں تہی داماں ہوگیا ہوں۔

پڑوس والے کبھی کبھار کھانا بھیج دیں تو کھا لیتا ہوں، ورنہ بھوک ہی نہیں لگتی۔ آج مجھے میرے ربّ نے ایسی سزا دی ہے کہ اس سے موت مانگتے بھی شرم آتی ہے۔ میں کس منہ سے اب رب کو پکاروں......؟

میں نے دین اسلام کو مذاق بنایا اور شیطان کا پیروکار بن کر اپنے گندے مقاصد پورے کرنے کے لیے مذہب کا سہارا لیا۔ مجھے آج بھی کرن کی اپنی طرف دیکھتی وہ بے نور آنکھیں یاد آتی ہیں۔ وہ اس بے درد لمحے میں خاموش تو تھی، لیکن یقیناً اس کی روح اپنے رب کے آگے رو رہی تھی، گڑگڑا رہی تھی اور وہ بھلا کب کسی مظلوم کی آہ رد کرتا ہے۔ یہ اس رب کا انصاف ہے۔ مجھے میرے کیے کی سزا مل رہی ہے اور نہ جانے کب تک ملتی رہے گی۔

☆......☆

قارئین متوجہ ہوں

کیا آپ کو پرچہ نہیں ملتا؟

کچھ عرصے سے کئی شہروں سے یہ شکایات موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔

ایجنٹ حضرات کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے قارئین سے ہماری التماس ہے کہ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں

ادارے کو خط لکھ کر یا فون کے ذریعے درج ذیل معلومات فراہم کریں۔

بکس اسٹال کا نام۔ جہاں پرچہ دستیاب نہیں۔ شہر اور علاقے کا نام۔ اگر ممکن ہو تو بک اسٹال کا سیل نمبر یا لینڈ لائن نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

محمد اقبال زمان
0300-2313256

110۔ آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ / بہادر شاہ ظفر روڈ کراچی۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
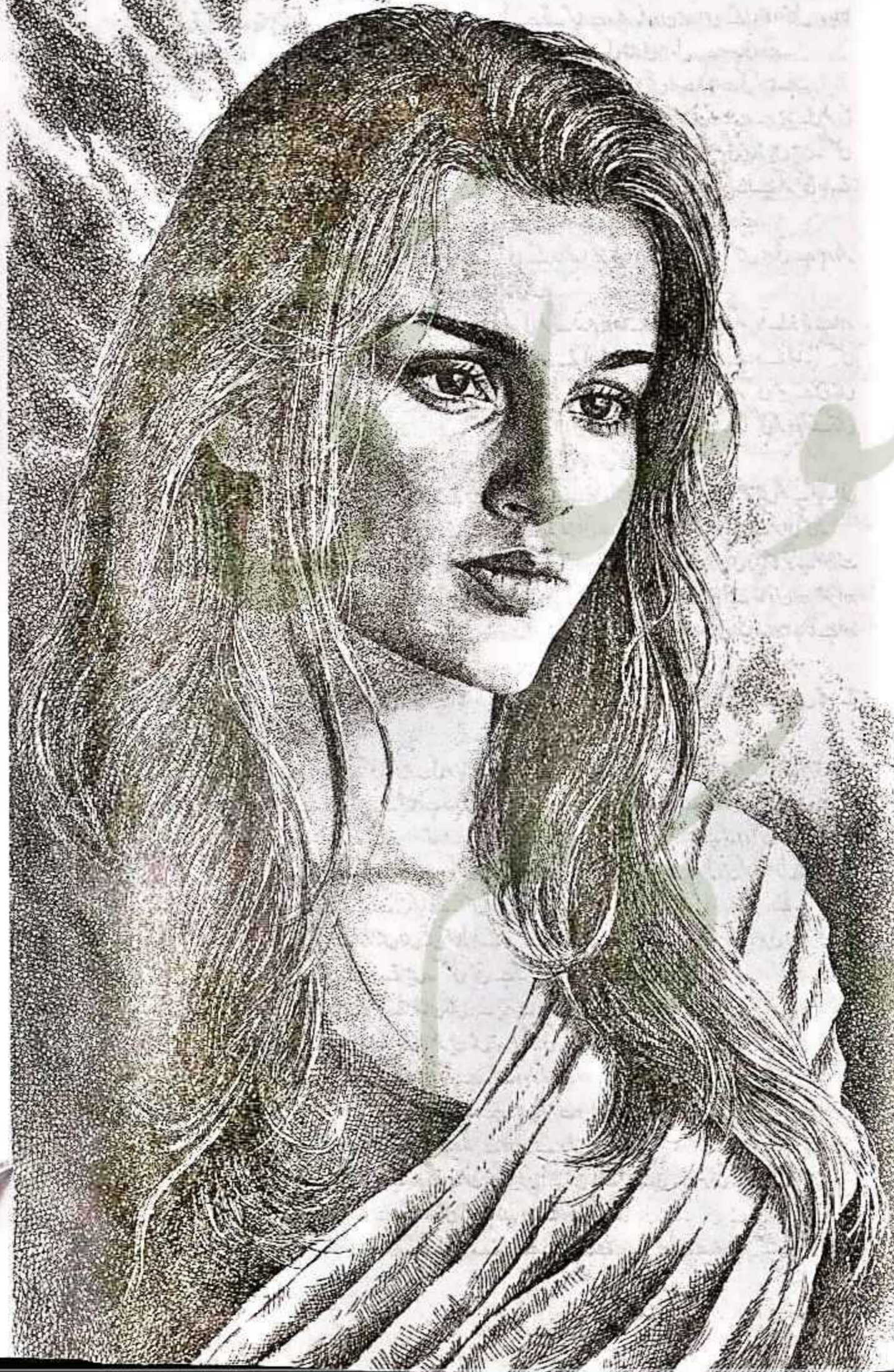
ملکھنی

ارشد علی ارشد

ابوظبی سے خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد دوشیزہ کی ایک حیرت انگیز ناقابلِ فراموش سرگزشت

ایک مافوق الفہم اسرار بھری عجوبہ داستان

قسط نمبر 12

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملکھنی ایک نہایت ذہین و سمجھدار، اوروں سے مختلف سوچ، خیالات، نظریات اور غیبی طاقت رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ، دو بھائیوں اظہر اور مظہر، ایک بہن سکھاں اور محبت میں ناکام، غیر شادی شدہ پھپھو ذکیہ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھاں کو اپنے کالج فیلو سانول سے محبت ہوگئی ہے۔ ملکھنی محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھاں کو سفید چونے کی دیوار کو اپنی غیبی طاقت سے پردۂ اسکرین بنا کر ماضی میں مجاہدین اسلام کا ایک لشکر دکھاتی ہے:ـ محبت اور عشق کی باتیں کرتی، گتھیاں سلجھاتی اور مسلمانوں کے عظیم ماضی و اسلاف کے کارنامے بتاتی اور دکھاتی ملکھنی، سکھاں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ سانول سے اُس کے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے بات کرے گی۔ ملکھنی کے بھائی اظہر کی دبئی روانگی سے پہلے شادی کردی جاتی ہے۔ ملکھنی اسی دوران میں سانول کے گھر اُس سے ملنے جاتی ہے۔ ایک روز سکھاں کالج سے لوٹ رہی ہوتی ہے تو چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا چوہدری راحیل اُسے روک کر پریشان کرتا ہے اور پھر ایک روز جب سکھاں اپنی ماں کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے تو چوہدری راحیل دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اس دوران میں سکھاں کا باپ اس کی منگنی ناظمہ خالہ کے دیور سے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز یوں بھی ہوتا ہے کہ چوہدری اللہ رکھا، ملکھنی کا راستہ روک لیتا ہے۔ ملکھنی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن ملکھنی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اس بے عزتی پر ملکھنی کو دھمکی دیتا ہے کہ اب میرے حجرے میں تیرا ناچ ہوگا اور پھر ایک روز چوہدری اللہ رکھا کے کارندے ملکھنی کو اغوا کر کے اس کی کوٹھری کی شکل میں موجود حجرے میں پہنچا دیتے ہیں۔

چوہدری اللہ رکھا کے حجرے میں ملکھنی اس کی خواہشات پوری کرنے کی بجائے موقع ملتے ہی چوہدری اللہ رکھا کی رائفل سے اسے قتل کر دیتی ہے۔ ملکھنی کو چوہدری کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا جاتا ہے اور پھر سکھاں تھانے میں آ کر بتاتی ہے کہ چوہدری اللہ رکھا کے بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے اسے پیغام بھیجا ہے کہ اگر سکھاں کے لیے چوہدری راحیل کا رشتہ قبول ہے تو ہم ملکھنی کو معافی کے بعد دیت کے قانون سے رہائی دلوا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں لیڈی انسپکٹر شبانہ کو ملکھنی سے تفتیش کے لیے بلایا جاتا ہے۔ ملکھنی اُسے دیوار پر محمد بن قاسم کا نظارہ کر کے دہلا دیتی ہے اور وہ تھانے دار کے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ ملکھنی کے معاملات سے خائف ہو کر تھانے دار اُسے لے کر گاؤں آتا ہے جہاں ملکھنی کے قاتل ہونے کے گواہ اپنے بیان سے مُکر جاتے ہیں۔ ملکھنی تھانے

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

دار سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر آتی ہے۔

گھر آ کر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا ابا فالج کے باعث چارپائی سے لگ گیا ہے، پھر کچھ دن بعد اس کے ابا کا انتقال ہو جاتا ہے، جبکہ اس کا بھائی، باپ کی موت سے پہلے ہی دبئی چلا جاتا ہے۔ اسی دوران میں اس کی شادی بلاول سے ہو جاتی ہے۔

مکھنی اور بلاول نے اپنے بیٹے کا نام معاویہ رکھا ہے، معاویہ چار سال کا ہو گیا ہے لیکن باتیں بہت ذہانت کی کرتا ہے۔

مکھنی اور بلاول ابوظہبی سے پاکستان آنے کا پروگرام بناتے ہیں۔ ایئرپورٹ پر مکھنی کو زلزلے کا احساس ہوتا ہے۔ ہر چیز بری طرح ڈول رہی ہے لیکن وہ سب کچھ بلاول کو نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ لوگ ہوائی جہاز میں سوار ہو جاتے ہیں۔ نیچے قراقرم کی پہاڑیاں ہیں۔ مکھنی اپنی ماورائی قوتوں کے ذریعے ہوائی جہاز سے قراقرم کی پہاڑیوں پر اتر گئی۔ وہ گھوم پھر کے واپس آ جاتی ہے۔ وہ لوگ اپنے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ اسی دوران میں سیلاب آتا ہے اور تباہی مچاتا گزر جاتا ہے۔ مکھنی کا گھر بھی تباہ ہو جاتا ہے۔ مکھنی کو بلاول کی فکر ہے۔

یہ ماضی کی بات ہے۔ مکھنی پھر حال میں لوٹ آتی ہے۔ مکھنی کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے، کبھی وہ کہیں ہوتی ہے اور پھر غیر محسوس طریقے سے ماورائی قوت کے تحت وہاں سے کوسوں دور جا پہنچتی ہے۔

ذہن کی اگلی جست میں وہ اپنے گھر کے نزدیک تھی، اس نے گھر کی طرف قدم بڑھائے پھر روک لیے، گھر والے ڈنڈے اور لوہے کے سریے اٹھائے اس کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ دوڑتے بلاول نے مکھنی کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مکھنی بھاگ جاؤ یہ لوگ تمہارے قتل کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔'' مکھنی کے ذہن پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ اس نے سوچا، مکھنی تیرے حق میں بھاگنا ہی بہتر ہے۔ میں انہیں کانٹے کی طرح چبھنے لگی ہوں۔ مکھنی حیران تھی کہ امی ابو میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ وہ تھک نہیں رہے۔ گاڑیوں، رکشا، موٹر سائیکلوں اور لوگوں کی بھیڑ سے بچتی بچاتی وہ بھاگی چلی جا رہی تھی۔

''میرے دشمنوں کا کیا حال ہے؟'' یہ سوچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک نیزہ اُڑتا ہوا آیا اور اس کی آنکھ میں کھب گیا۔ اس کی آنکھوں کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ شیشہ ٹوٹنے کے جھٹکے سے وہ لڑکھڑائی، اسے احساس ہوا کہ وہ پانی سے ٹکرائی تھی۔

جب مکھنی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو انتہائی آرام دہ بیڈروم میں پاتی ہے۔ وہ سوچتی ہے نہ جانے یہ کون سی دنیا کا خوب صورت کمرا ہے۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے اور کمرے میں ایک وجیہہ نوجوان ادھیڑ عمر کی باوقار سی ایک خاتون اور جینز اور جیکٹ میں ملبوس ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کمرے میں لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ سب قطار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' مکھنی خود سے سوال کرتی ہے، پھر وہ لوگ ایک ایک کر کے آگے بڑھتے ہیں اور مکھنی کے پاؤں چھوتے ہوئے کمرے سے نکلتے جاتے ہیں۔

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر مکھنی سوچوں کی دنیا سے لوٹ آئی۔ کمرے میں ایک خوب صورت نوجوان داخل ہوتا ہے جو اپنا نام امن چندرورتانی بتاتا ہے۔ وہ مکھنی سے کہتا ہے کہ اس کا نام مہک ہے اور آج اس نے پورے تیرہ ماہ اور دس دنوں بعد مکمل ہوش و حواس میں بات کی ہے۔ اس سے پہلے وہ استعارات میں گفتگو کرتی رہی ہے۔ امن اسے بتاتا ہے کہ وہ اس وقت ضلع گھوٹکی کے نواحی گاؤں گوٹھ چندھن میں ہے۔ مکھنی امن سے پوچھتی ہے کہ اس سے پہلے وہ کہاں تھی؟ امن سوال سن کر خاموش ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے تایا اور بابا نے بتانے سے منع کیا ہے۔ امن مکھنی سے کہتا ہے کہ وہ اس کی آمد کا ذکر بابا سے نہ کرے۔

مکھنی امن کے بابا سے کہتی ہے کہ ''میں اس تین کنال کے گھر سے باہر جانا چاہتی ہوں، تاکہ دیکھ سکوں باہر کی دنیا کیسی ہے، سفید یا سیاہ۔'' امن کے بابا یہ سن کر حیران ہوتے ہیں۔ مکھنی کہتی ہے کہ ''میں انسان ہوں، مجھے تم لوگوں نے خدا بنا رکھا ہے۔ میرے سامنے یوں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جیسے تم لوگ مسلمان نہیں بت پرست ہو۔'' پھر مکھنی ان سے پوچھتی ہے کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ بدھ مت کون ہیں، کیا ہیں؟ پھر وہ دیوار کو پردۂ اسکرین میں تبدیل کرتی ہے جس پر ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔ اسکرین پر ایک گول مٹول بچہ نظر آ رہا تھا۔ مکھنی بتاتی ہے کہ اس بچے کا نام گوتم ہے۔ تب وہ لوگوں کو گوتم سے بدھ تک کا سفر اسکرین پر دکھاتی ہے۔ مکھنی ان لوگوں کا ہاتھ جوڑ کر اس کے احترام میں کھڑا ہونا، اس کو حد سے زیادہ عزت دینا، دیکھ کر سوچتی ہے کہ کہیں یہ لوگ بھی گوتم بدھ کی طرح اس کی پوجا نہ شروع کر دیں۔ تب مکھنی کی ملاقات نرملا سے ہوتی ہے جو عزیز الرحمٰن سے محبت کرتی ہے اور دونوں کورٹ میرج کرنا چاہتے ہیں۔ مکھنی ان دونوں سے کہتی ہے کہ وہ گھر والوں سے اس سلسلے میں بات کرے گی۔ وہ سوچتی ہے کہ اس گھر کا کوئی فرد مجھے میری اصلیت نہیں بتا رہا، لہٰذا اس کے لیے مجھے خود ہی ہاتھ پاؤں مارنے ہوں گے۔

امن کراچی سے واپس آتا ہے اور آتے ہی مکھنی کے کمرے میں حاضری دیتا ہے وہ حسب معمول ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کرتا ہے اور دل ہی دل میں کچھ پڑھتا ہے۔ مکھنی امن سے کہتی ہے کہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپ لوگ مجھے کیا سمجھ رہے ہو۔ میرے روبرو ہاتھ کیوں جوڑے جاتے ہیں، آنکھیں بند کر کے کیا پڑھا جاتا ہے۔ وہ یہ کہتے ہوئے امن کے بے حد نزدیک ہو جاتی ہے اور رونے لگتی ہے، امن اس کے رونے سے گھبرا جاتا ہے اور بے اختیار اس کے آنسو صاف کرنے لگتا ہے۔ تب مکھنی کہتی ہے۔ دیکھو امن اس بات کا یقین کر لو کہ میں بھی ایک معمولی سی عام سی لڑکی ہوں۔ آج تم نے مجھے چھو کر بھی دیکھ لیا۔ دیکھو اپنا ہاتھ اسی طرح صحیح سلامت ہے، نہ جلا نہ کٹا نہ معذور ہوا۔

(اور اب آگے پڑھیے)

''امن میں تھک گئی ہوں۔ میری ٹانگیں معذور ہو چلی ہیں۔ میں مزید چل نہیں پاؤں گی۔ میں اپنی ذات کی پہچان چاہتی ہوں۔ مجھے شہرذات کی آگہی چاہیے۔''

''مہک جی......'' امن کے لہجہ بتا رہا تھا۔ وہ پگھل رہا ہے۔

''امن میری ساری امیدیں سارے خواب آپ کی ذات سے وابستہ ہیں۔ پلیز انہیں چکنا چور مت کرو۔''

میری آنکھیں پھر سے ڈبڈبانے لگیں، امن بھی سنبھل گیا تھا۔ یا پھر شاید پگھل گیا تھا۔ اب وہ پہلے جیسا پریشان اور خوف زدہ نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ کئی منٹ تک اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے خود ہی اس کا ہاتھ آہستہ سے چھوڑا تو پہلے اس نے ہاتھ کو دیکھا پھر میرے چہرے کو۔

''مہک...... میں تھک گیا ہوں، سفر کی تھکان سے بدن درد کر رہا ہے، تھوڑا سا سونا چاہتا ہوں۔''

''جی بھر کے سو لو امن۔ مگر جب جاگو تو پوری طرح جاگنا۔''

''ایسا ہوگا مہک...... جی......'' پہلی بار اس نے مہک کہا تھا۔ اب دوسری بار بھی جی کا لفظ بہت بعد میں ادا کیا۔'' میرا دل مجھے تسلی دینے لگا۔ اب بہت جلد شہرذات کی آگہی پا لوگی۔ سب کچھ جان جاؤ گی، فکر نہ کرو، اب تم بھی آرام کرو۔

دو دن امن نظر نہیں آیا تو میں نے پھر سے کتابیں نکال لیں اس بار وہ کتاب نکالی جو لائبریری میں پہلی بار اٹھائی تھی۔ جسے دیکھ کر مجھے دھچکا لگا تھا۔ میں اسے پڑھنے لگی تو اس کی زبان کے کچھ الفاظ مجھے سمجھ نہیں آئے۔ تاہم جملوں کی بناوٹ اور مضمون کی نوعیت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کون سی بات کہی جا رہی ہے۔

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

”جس طرح شریر میں رہنے والے پرانی کا ایک ہی جسم میں بچپن جوانی اور بوڑھاپن ہوتا ہے، اسی طرح وہ ایک شریر (جسم) کو چھوڑ کر دوسرا جسم بھی بدلتا ہے، یہ شریر کا دھرم ہے۔ شریر پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ آتما اوناشی ہے۔ اس لیے ودیگی (عقلمند لوگ) کسی کا رنج و غم نہیں کرتے۔“

چند لائنیں پڑھ کر میں انتہائی الجھن کا شکار ہوگئی۔ اس میں جسم جس میں انسان کی روح ہوتی ہے۔ اس کا باقاعدہ مذہب بتایا گیا تھا اور یہ کہ جسم انسان ایک جسم چھوڑ کر دوسرا جسم بدل سکتا ہے۔ میں الفاظ پر غور و فکر کرتی ہوئی اچانک اچھل پڑی۔ ”اوہ......“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ایک خیال پوری طاقت کے ساتھ میرے دماغ کو کھٹکھٹانے لگا۔ ”کہیں میرا جسم بھی بدل تو نہیں گیا۔“ یعنی پہلے میں کچھ اور تھی اور اب کچھ اور ہوں۔ تبھی مجھے ماضی کی کوئی بھی بات یا واقعہ مکمل سیاق و سباق کے ساتھ یاد نہیں آیا۔ اور جو مناظر میں نے دیکھے ہیں، یا امن کے گھر والوں کو کچھ بتایا ہے تو دراصل یہ میرے پرانے جسم کا کارنامہ ہے۔ میری نظریں تیزی سے کتاب پر بھاگنے لگیں۔

”یہ آتما نہ تو کسی کو مارتا ہے اور وہ کسی سے مارا جا سکتا ہے، یہ آتما نہ کبھی پیدا ہوتا ہے اور نہ مرتا ہے۔ اور یہ بات بھی نہیں کہ یہ ایک دفعہ ہو کر پھر نہ ہو، یعنی موجود سے معدوم ہو جائے۔ یہ تو اجنبھا (جنم نہ لینے والا) نینہ (آغاز اور انجام کے بغیر) پرانے سے پرانا ہے یہ جسم کے مرجانے پر بھی نہیں مرتا۔ پس اے پارتھ میں جس نے آتما کو اوناشی اجما اور نظر نہ آنے والا جان لیا ہے۔ وہ شخص کسی کو کس طرح مروائے گا یا خود مارے گا جیسے آدمی پرانے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لیتا ہے۔ ویسے ہی دیہی یعنی جسم میں ٹھہرا ہوا اس کا مالک آتما پرانے جسموں کو چھوڑتا اور نئے جسم اختیار کرتا رہتا ہے۔ اس آتما کو نہ تو ہتھیار کاٹ سکتے ہیں، نہ آگ جلا سکتی ہے، نہ پانی گلا سکتا ہے اور نہ ہوا سکھا سکتی ہے، یہ نہ کاٹا جا سکتا ہے، نہ جلایا جا سکتا ہے۔ نہ بھگویا جا سکتا ہے اور نہ سکھایا جا سکتا ہے۔“

اس بار میں خود ہی بار بار نفی میں سر ہلانے لگی۔ یہ فلسفہ میرے حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔ آگے بھی کچھ اسی قسم کی بات لکھی تھی۔

”شریر کا دھرم ہی مرنا ہے، شریر جو ستھول (نظر نہ آنے والا) ہے پیدا ہوتا ہے۔ بڑھتا اور ناش ہوتا ہے، لیکن آتما اور۔ انادی۔ انت اور اوناشی ہے۔ یہ نہ کسی کے مارے سے مرتا ہے، اور نہ کسی کو مارتا ہے۔“

میں پھر سے اٹک گئی۔ آتما یعنی روح کے بارے میں عجیب فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ جبکہ پہلی کتاب میں، میں نے پڑھا تھا۔

”اور یہ لوگ آپ سے روح کو (امتحاناً) پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے۔“

میں سوچنے لگی روح کو رب نے اپنے حکم سے بنایا تو یہ رب کون ہے۔ اس کا جواب بھی مجھے پہلی کتاب سے ملا تھا۔ اللہ ایک ہی ہے، کسی کا محتاج نہیں، سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے نہ کوئی اس سے پیدا ہوا ہے، نہ کوئی اس کے برابر ہے، وہ لاشریک۔ بے نظیر۔ ہر نقص اور کمزوری سے پاک۔ اس کے لیے نہ تھکن ہے، نہ زوال، نہ فنا، نہ موت، نہ ہلاکت، وہ بزرگ و برتر ہے، وہ زندہ ہے، اس کا تھامنے والا، اسے نہ اونگھ آتی ہے، نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ خلقت کے روبرو ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور سب اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس کا علم (کرسی) آسمانوں اور زمین کو محیط ہے اور انہیں تھامنا اسے گراں نہیں اور وہی ہے سب سے برتر عظمت والا۔ وہ ہر شے کا رب ہے، جو چاہے پیدا کرے اور جسے چاہے اضافہ کرے۔ سب اس کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ اسی کے ہاتھ میں ہر شے کی حکومت ہے۔ وہی اوّل ہے وہی آخر ہے۔ وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے۔“

میں بھاگ کر کمرے کی کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ دونوں پٹ کھول کر باہر دیکھا، وسیع و عریض آسمان۔ میرے ذہن میں الفاظ گونجنے لگے۔ اس کا علم (کرسی) آسمانوں اور زمین کو محیط ہے اور انہیں تھامنا اسے گراں نہیں۔

بے شک اتنے وسیع و عریض آسمان اور زمین کو تھامنے والا ہی رب ہو سکتا ہے، پھر اسی کتاب میں یہ بھی تو بتایا گیا۔

”اور اس نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو (اپنا) مسخر (قدرت) بنایا۔ اور ستارے (بھی) اس کے حکم سے مسخر ہیں۔“

دوسری کتاب کی چند دوسری باتیں میرے سامنے دلیل مانگنے کے لیے پیش ہونے لگیں۔

وہ شخص کسی کو کسی طرح مروائے گا ہاتھ یا خود مارے گا جیسے آدمی پرانے کپڑے اُتار کر نئے کپڑے پہن لیتا ہے

ویسے ہی دیہی یعنی جسم میں ٹھہرا ہوا اس کا مالک آتما پرانے جسموں کو چھوڑتا اور نئے جسم اختیار کرتا رہتا ہے۔ اس آتما کو نہ تو ہتھیار کاٹ سکتے ہیں، نہ آگ جلا سکتی ہے، نہ پانی گلا سکتا ہے اور نہ ہوا سکھا سکتی ہے۔

شاید یہ بات لکھنے والے کو رب کائنات کی ذات کے بارے میں آگاہی نہیں تھی، حالاں کہ اس کتاب میں لکھا ہے وہ سب اس کے مطیع و فرماں بردار ہیں، وہ جس کام کو کہتا ہے ہو جا تو بس وہ ہو جاتا ہے۔

تو جسم کو مارنا اور روح کو ختم کرنا اس کے لیے کون سی مشکل بات ہے۔ جب کہ اس کے بارے میں یہ بھی آیا ہے۔

”اور اس نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو (اپنا) مسخر (قدرت) بنایا۔“

میں نے وہ کتاب پھر سے اٹھالی۔

”کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا سو وہ اعلانیہ اعتراض کرنے لگا اور اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا اور اپنی اصل کو بھول گیا۔ کہتا ہے کہ ہڈیوں کو (خصوص) جبکہ وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں کون زندہ کرے گا۔ آپ جواب دے دیجیے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے اول بار میں ان کو پیدا کیا۔“

یہاں تو مجھے بات ختم ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، جس نے انسان کو نطفہ، جمے ہوئے گندے پانی سے پیدا کیا، جبکہ انسان کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ تو اس کے لیے اسے پھر سے زندہ کرنا اور روح کو مارنا اور جسم کو ختم کر کے پھر سے اسی حالت میں اُٹھانا ذرہ برابر مشکل کام نہیں۔

میں نے ایک بار پھر پہلے والی کتاب اُٹھالی۔ جس میں لکھا تھا۔

وشنو! آپ اپنے دہکتے ہوئے مکھوں (منہ) سے ان سب کو نگلتے جا رہے ہیں۔ آپ کا یہ ڈرانے والا سروپ سارے جگت کو اپنے تیج سے تپا رہا ہے۔ ہے پربھو! آپ ایسے تیجوان اور خوفناک روپ والے کون ہیں۔ میں آپ کو نمسکار کرتا ہوں۔ اب آپ میں آپ آدی پرش کو جاننا چاہتا ہوں۔ مگر میں آپ کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ تو بھگوان بولے اے ارجن! اس وقت ان لوگوں کا کال روپ میں ہوں اور ان لوگوں کے ناش کے لیے ہی میں نے خوفناک روپ دھارن کیا ہے۔

میں نے کتاب بند کر دی۔ جب رب کائنات نے زمین و آسمان کو مسخر کیا ہے۔ اس نے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا ہے۔ زمین سے طرح طرح کے کھانے کے لیے انواع و اقسام کے میوے پیدا کیے۔ پہاڑوں کو زمین کے ٹھہراؤ کے لیے میخوں کی طرح گاڑ رکھا ہے۔ جنگل، صحرا، نباتات، انسان، حیوان، چاند ستارے سارا نظامِ زندگی ترتیب دیا۔ جو جس کام کو کہتا ہے ہو جا، تو بس وہ ہو جاتا ہے، تو پھر وہ کیا بھگوان ہے جو خوفناک روپ دھار کر آدمیوں کو نگل رہا ہے۔ میں تقریباً دو تین گھنٹوں تک سوچتی رہی۔ اور اپنے دل و دماغ میں دونوں کتابوں کا موازنہ کرتی رہی۔ شاید میں ابھی مزید اس بارے میں سوچتی کہ نرملا کی آمد سے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ نرملا کچھ پریشان سی تھی۔

”کیا ہوا نرملا۔“

”مہک جی...... مہک جی، پلیز کچھ کیجیے میں عزیز کے بنا نہیں رہ سکتی۔“ ٹوٹے لہجے میں دنیا جہان کی اُداسی اور دُکھ تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرے کی ساری خوب صورتی پھیکی اور ماند پڑ رہی تھی۔

”بیٹھ جاؤ نرملا۔“ میرے کہنے پر وہ فوراً بیٹھ گئی۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی، عموماً گھر کا کوئی بھی فرد میرے روبرو بے تکلفی سے بیٹھا نہیں کرتا۔

”آرام سے بتا...... اب کیا ہوا۔“

”مہک جی! میں فرق سمجھ گئی ہوں۔“

”کس بات کا فرق؟“

”مار دینے اور مر جانے کا فرق۔“

”کس نتیجے پر پہنچی ہو......“

”مہک جی! میں عزیز کے بنا مر جاؤں گی۔“

نیو وکی لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ
ساؤنڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
نئے اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
دوکان نمبر 13 صدر بازار ہری پور

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میں نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ چند دنوں میں وہ بہت بدل گئی تھی، لگ رہا تھا کہ پیار نے اسے بار بار زمین پر پٹخا ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی اب وہ واقعی پیار کرنے لگی تھی۔" میں نے ایک بار پھر سے سوال دہرایا۔

"نرملا! عزیز کے بنا مر جاؤ گی یا خود کا مار دو گی۔"

خود کو مارنا میرے بس میں نہیں ہے مہک جی، مگر عزیز نہ ملا تو میں اس کی یادوں اور ہجر و فراق میں گھٹ گھٹ کے مر جاؤں گی۔ وہ مجھے ہر پل نیا دکھ دیتا ہے۔ میں ہر پل میں ٹوٹتی اور درد سہتی ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے میں یہ اذیت برداشت کرنے کی سعی میں مر ہی جاؤں گی۔"

"میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی نرملا۔"

"سچ مہک جی......"

"ہاں بالکل سچ۔ اب عزیز تمہارا ہے۔ اور تمہیں ہی ملے گا۔" نرملا نے بے اختیار خوشی میں سرشار ہو کر میرے ہاتھ تھام لیے۔ "اوہ تھینک یو مہک جی۔" تھینک...... کہتے کہتے اسے کچھ خیال لپکا۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا جنہوں نے میرے ہاتھوں کو چھپا رکھا تھا۔ اس نے جھٹک کر ہاتھ چھوڑے اور چند قدم پیچھے ہٹ کر ہاتھ جوڑ دیے۔

"چہرے کی خوشی خوف میں بدل گئی۔" اس بار بولی تو لہجے میں خوف اور ڈر تھا۔

"معافی۔ معافی چاہتی ہوں مہک جی۔ میں نے خوشی میں آپ کو چھو لیا۔"

"تو کیا ہوا......؟ مجھے چھونا نہ جرم ہے، نہ گناہ۔ نرملا تم میری چھوٹی بہن ہو میرے سینے سے بھی لگ سکتی ہو۔"

"بب۔ بہن...... یہ لفظ اتنی حیرت سے اس نے ادا کیا کہ گماں ہونے لگا، حیرت سے وہ مر ہی جائے گی۔"

"جاؤ نرملا اپنی ماں کو میرے پاس بھیجو۔" وہ جانے لگی تو میں نے اس کے ہاتھ میں ڈائری دیکھی۔

"نرملا......" میری پکار پر وہ پلٹی۔

"یہ ڈائری۔ دکھاؤ مجھے۔" چند لمحوں بعد اس نے ڈائری میری طرف بڑھائی۔

ڈائری میں کچھ یادداشتیں لکھی ہوئی تھیں اور کچھ شاعری۔ ہر تحریر کے اوپر تاریخ درج تھی، تحریر لکھنے کے لیے سرخ قلم استعمال کیا گیا تھا۔ میں نے چند اوراق پلٹے، اس میں کچھ اقوالِ زریں بھی لکھے تھے، میں نے ایک اقوالِ زریں پڑھا۔

"جس معاشرے میں سچ کو خطرے کی علامت بنا دیا جاتا ہے، وہاں آسمان سروں سے کھینچ لیا جاتا ہے اور زمین قدموں کے نیچے سے سرک جاتی ہے۔"

"میں نے نرملا کو دیکھا...... اس کی آنکھوں اور چہرے پر ہنوز خوف اور ڈر تھا۔ میں نے چند اوراق مزید پلٹے، یہاں نیلی سیاہی سے کچھ اشعار لکھے تھے، ایک شعر میرے لیے انتہائی دلچسپی کا باعث بنا۔

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

اس شعر کے آگے سرخ قلم سے لکھا تھا، بالکل لڑکیوں کی طرح......

اس سے آگے کا قطعہ بھی خوب تھا۔

حرف حرف رٹ کر بھی آگہی نہیں ملتی
آگ نام رکھنے سے روشنی نہیں ملتی
آدمی سے انسان تک آؤ گے تو سمجھو گے
کیوں چراغ کے نیچے روشنی نہیں ملتی

نرملا...... میں نے اسے پکارا تو وہ ہل سی گئی۔ شاید وہ کہیں اور نکل گئی تھی۔ فوراً بولی۔

"جی مہک...... جی۔"

"ایسی ہی ایک سادہ ڈائری مجھے لا دو گی۔ میں نے بھی کچھ لکھنا ہے۔"

"جی...... آپ نے لکھنا ہے......" مجھے اس کے سوال سے چڑ ہونے لگی۔ میری ہر بات اور ہر حرکت ان لوگوں کے لیے باعثِ حیرت ہے۔

"کیوں میں نہیں لکھ سکتی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ تلخ ہو گیا، جسے محسوس کر کے وہ خوف سے بولی۔

"جی کیوں...... نہیں...... میں لا دوں گی۔"

"ٹھیک ہے جاؤ اور اپنی ماں کو میرے پاس بھیجو، میں تمہاری شادی کی بات کرتی ہوں۔"

"آپ بات کریں گی......" وہ ایک بار پھر حیرانگی سے بولی۔ میرا جی چاہا اپنا سر پھوڑ دوں یا نرملا کا۔

"ہاں بھئی، اس میں اتنی حیران ہونے والی کون سی بات ہے۔"

"نہیں وہ۔ آپ بات کیوں کریں گی۔"

"عجیب لڑکی ہو...... ایک طرف کہتی ہو عزیز کے بنا مر جاؤ گی اور دوسری طرف پوچھتی ہو بات کیوں کروں گی۔"

میرے لہجے کی بڑھتی ہوئی تلخی سے وہ مزید گھبرا گئی۔ جلدی سے بولی۔

"مہک جی آپ تو ممی کو حکم دیں گی تو وہ بجا لائے گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے، جو بھی ہے، جاؤ ممی کو بلاؤ۔" وہ خوشی سے قلانچیں بھرتی ہوئی نکل گئی۔

چند منٹوں بعد اس کی ممی میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

"آپ نے یاد کیا مہک جی......" وہ ہمیشہ کی طرح باادب باملاحظہ تھی۔

"آپ سے ایک درخواست ہے۔"

"جی درخواست...... مہک جی آپ حکم کیجیے۔"

"نرملا کے لیے میں نے ایک رشتہ دیکھا ہے۔ آنے والے چند دنوں میں وہ رشتہ لے کر آئیں گے، پلیز انکار مت کیجیے گا۔"

"نرملا کے لیے رشتہ......" وہی ازلی حیرت۔ چند لمحوں بعد وہ سنبھل کر بولی۔ "آپ نے جو رشتہ دیکھا ہے وہ یقیناً ٹھیک ہو گا۔ میں نرملا کے ڈیڈی کو بلاتی ہوں، آپ ان کو بتا دیں۔"

"انہیں مت بلائیں، میں خود ان کے پاس چلی جاتی ہوں۔"

"آپ نہیں مہک جی...... آپ کیوں تکلیف کرتی ہو، وہ ابھی آ جائیں گے۔" کہتی ہوئی وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

کچھ دیر بعد کمل چند دوسرے بھائیوں کے ساتھ حاضر ہوا، شاید انہیں نرملا کے رشتے کا بتا دیا گیا تھا۔ وہ سب میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ کمل چند بولا۔

"آپ نے بلایا مہک جی؟" میں نے لحظہ بھر ان کا جائزہ لیا۔ جھکے ہوئے سر، بندھے ہوئے ہاتھ اور قطار، اس قدر احترام اور عزت، ذہن پھر سے بھٹکنے لگا، مگر میں نے خود کو سنبھالا اور وہی بات ان سے کہی جو نرملا کی ممی سے کہی تھی۔

"میں نے نرملا کے لیے رشتہ دیکھا ہے، لڑکے کا نام عزیز الرحمٰن ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ایک دو ہفتے میں رشتہ لے کر آئیں۔" میری بات سن کر بھائیوں نے انتہائی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"عزیز الرحمٰن!" بہت ہی آہستہ حیرت سے لبریز آواز میں تینوں نے دہرایا۔ مجھے لگا شاید عزیز الرحمٰن یا اس کے گھر والوں سے پہلے سے آشنا ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "آپ انہیں جانتے ہیں؟"

"مہک جی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" قدم چند نے لب کشائی کی جرأت کی۔

"میں نے کچھ غلط کہا......؟"

"آپ غلط کہہ نہیں سکتیں، مگر...... شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ یہ رشتہ ہمیں کس موڑ پر لا کھڑا کرے گا۔"

"میں زیادہ نہیں جانتی، مگر نرملا کے خوش رہنے کی گارنٹی دیتی ہوں۔ آپ لوگ دو تین دن سوچ لیں پھر بات ہو گی۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ وہ لوگ چند لمحے شش و پنج میں کھڑے رہے۔ میں ساتھ والے کمرے میں گھس گئی۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ میں ان کی گفتگو سنوں، مگر کمل چند کی آواز نے متوجہ کرلیا۔

''آپ لوگوں نے سنا مہک جی کیا کہہ گئی ہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہوگا بھائی صاحب......'' یہ آواز سب سے چھوٹے بھائی کی تھی۔

''اس بات کا جواب قدم سے پوچھو۔''

''میں الجھن کا شکار ہوں بھائی صاحب......فی الحال کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔''

''قدم چند......ایک بات تو واضح ہے......میں کبھی بھی نرملا کو اس لڑکے کے حوالے نہیں کرسکتا۔'' کمل چند کے ٹھوس لہجے کی آواز نے میرے اندر شدید غصے کو ابھارا۔ میرا دل چاہا واپس کمرے میں جاؤں، ہاتھ کی ساری انگلیاں اس کے پیٹ میں گھسیڑ دوں، جب وہ درد سے چیخنے لگے تو ساری آنتیں مٹھی میں بھر کر باہر کھینچ لوں۔ درد سوا ہو تو اس کی پسلیاں تڑ تڑ کر کے توڑ دوں۔ اس دردِ کربناک سے ابھی سنبھلا نہ ہو کہ کانوں میں گرم گرم سریا ڈال دوں، جب کانوں سے خون پتھر سے ابلنے والے چشمے کی طرح ابلنے لگے تو کنپٹی کے سارے بال پلاس سے کھینچ لوں۔ اس کی چیخیں جب ایک جہاں سننے لگے تو ہاتھ پاؤں کے بیسوں ناخن ادھیڑ دوں، جب وہ اذیت سے ایڑیاں رگڑنے لگے تو سر سے کھال پکڑوں اور نیچے کی طرف کھینچ کر پاؤں کے راستے سے اُتار دوں، بالکل ایسے جیسے ذبح شدہ بکرے کی کھال اُتاری جاتی ہے۔ اس درد، اذیت اور دکھ سے جب موت طاری ہونے لگے تو اس کے کانوں کے قریب جا کر اسے بتاؤں، جب کسی سے اس کا پیار چھینا جاتا ہے تو اس سے زیادہ دردناک، اذیت ناک اور خوفناک موت ہوتی ہے۔

میں نے خود پر ضبط کیا، ابھی ان باتوں کی نوبت نہیں آئی، ابھی گیند ان کی کورٹ میں ہے، ابھی انہوں نے چند دن سوچنا ہے، پھر کیا جواب ملے گا۔ دیکھا جائے گا۔

نرملا کو میں نے تسلی تشفی سے بہلا دیا تھا۔ اس نے مجھے سادہ ڈائری لادی، جس میں وہ ساری باتیں لکھنے لگی جو دونوں کتابوں سے موازنہ کر کے سوچی تھیں۔ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر میں نے دونوں کتابیں مکمل پڑھ لی تھیں اور لائبریری سے چند مزید کتابیں بھی اٹھا لی تھیں، اگلے چند دنوں میں، میں نے پوری دِل جمعی کے ساتھ کئی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ میں چپکے سے جاتی اور اسٹڈی روم سے کوئی کتاب اٹھا لاتی اور پڑھنے کے بعد اسے پھر سے وہیں رکھ آتی۔ ان کتابوں سے مجھے بہت فائدہ پہنچا اور میں بہت حد تک خود کو جان گئی تھی۔ میں تحقی پہچان تو ابھی نہیں کر پائی تھی، مگر میں اتنا جان گئی تھی کہ کس مذہب کو زیادہ پسند کرتی ہوں۔ بہت سی باتیں ایسی تھیں جو لحہ بہ لحہ میرے ذہن کی زمین پر اُتری تھیں اور دِل کو منور کیا تھا۔ مذہبی لحاظ سے میں بالکل مطمئن ہوگئی تھی اور اس گھر والوں کے بارے میں بھی جان گئی تھی، تاہم ان کے بارے میں فی الحال حتمی رائے قائم کرنا باقی تھی۔ میں نے تمام کتابوں کا نچوڑ اور جو کچھ مجھے پہلے سے یاد تھا یا میں جانتی تھی، سب کو ڈائری میں لکھ ڈالا تھا۔ امن میرے لیے اب اور بھی اہمیت اختیار کر گیا تھا اس لیے جب چند دن وہ نظر نہ آیا تو میں خود اس کے کمرے میں جا پہنچی۔

''معاف کرنا امن! آپ کے آرام میں مخل ہوئی، پچھلے چند دنوں سے آپ آئے نہیں اس لیے خود چلی آئی۔''

''روز جانے کا ارادہ کرتا ہوں مگر جا نہیں پایا۔ آیئے نا، یہاں بیٹھیے۔'' امن نے فوراً مجھے کرسی پیش کی، ''مجھے محسوس ہو رہا ہے آپ کی تھکن ابھی تک اُتری نہیں۔'' میں نے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ امن کے چہرے اور آنکھوں سے تھکاوٹ کے آثار جھلک رہے تھے۔

''میری جاب ہی ایسی ہے۔ ہر روز انتھک کام کرنا پڑتا ہے۔ رات دن مریضوں کے درمیان رہ رہ کر بدن میں کساؤ چلا آتا ہے۔'' امن میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''آپ کہیے، آپ نے کیسے تکلیف کی۔''

''امن میں گھر کی چار دیواروں میں رہ رہ کر اور دن رات ایک ہی طرح کا کھانا کھاتے کھاتے انتہائی بور ہوگئی ہوں، اس لیے چاہ رہی تھی کہ آج رات کا ڈنر ہم کہیں باہر کسی ہوٹل میں کرلیں۔'' امن کے چہرے پر سوچ کی لکیریں اُبھریں اور پھر مٹ گئیں، وہ احتیاط سے بولا۔

''یہاں کوئی ایسا ہوٹل نہیں ہے مہک جی، اس کے لیے ہمیں گھوٹکی جانا پڑے گا۔''

''تو کیا مشکل ہے......امن آپ کے پاس گاڑی ہے نا؟''

''گاڑی کا کوئی مسئلہ نہیں، ایک اور مشکل بھی ہے۔''

''وہ کیا......؟''

''ڈیڈی سے پوچھنا پڑے گا۔'' امن کی باتیں سن کر مجھے اندرونی طور سے بے حد خوشی ہو رہی تھی، کم از کم وہ راضی تھا۔ ''ڈیڈی سے میں پوچھ لوں گی۔''

''تو پھر ڈنر نہیں کل سنڈے ہے، لنچ کے لیے چلیں گے۔'' امن کے اندر میرے حوالے سے نئی تبدیلی خوش آئند تھی۔ وہ میرے ساتھ بالکل نارمل باتیں کرنے لگا تھا۔

امن کے ڈیڈی کو میں پہلے بھی دو بار جانے کا کہہ چکی تھی، اب تیسری بار کہا تو وہ انکار نہ کرسکا، البتہ امن کے نام پر وہ کچھ دیر تذبذب میں رہا، پھر امن کو اکیلے میں بلا کر کچھ ہدایت جاری کی اور ہم لنچ کے لیے شہر کی طرف چل نکلے۔ امن کا ارادہ پنو عاقل جانے کا تھا، مگر پھر گھوٹکی کی طرف ہولیا۔ تاہم ہم پنو عاقل سے ہو کر گھوٹکی آئے تھے۔ مجھے سب کچھ عجیب و غریب لگ رہا تھا۔ گھر کے گھٹن زدہ ماحول سے میں پہلی بار باہر نکلی تو دل و دماغ خوشی سے معطر ہوگئے۔ میرے انگ انگ میں خوشی سرایت کرگئی، باہر کی کھلی فضا اور امن کا نارمل انسانوں کی طرح رویہ، دونوں ہی باتیں میرے لیے باعثِ مسرت اور باعثِ تقویت تھیں، لنچ کے دوران ہم بالکل عام فہم باتیں کرتے رہے۔ میرا مقصد تھا کہ امن کو مزید اعتماد ملے اور وہ مجھے دوسری لڑکیوں کی طرح سمجھے۔ لنچ کے بعد ہم یونہی گھوٹکی شہر میں اِدھر اُدھر ڈرائیو کرتے رہے۔ گرمی ہونے کے سبب ابھی رش کم تھا۔ جیسے جیسے شام کے سائے ڈھلنے لگے، رش بڑھتا گیا۔ میری خواہش پر امن ایک پارک میں چلا گیا۔ گرمی کی حدت کافی حد تک کم ہوگئی تھی۔ شام کی ہوائیں چلنے لگی تھیں، پارک کے ایک ویران گوشے میں ہم بیٹھ گئے۔ قریب ہی سنگل بینچ بھی رکھا تھا، مگر ہم ہری بھری گھاس پر بیٹھ گئے۔ اب امن سے بامقصد بات پوچھی جاسکتی تھی۔

میں موقع کی تلاش میں رہی کہ کوئی ایسی بات نکلے کہ میں اپنی بات کہہ سکوں اور وہ موقع خود امن نے پیدا کر کے مجھے حیران کردیا۔

''مہک! مرنے کے بعد انسان کا بالکل اسی رنگ و روپ اور اسی وجود کے ساتھ پھر سے زندہ ہونا ممکن ہے۔ وہ بھی ایسے کہ مرے ہوئے کو صدیاں بیت گئی ہوں۔ اس کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر سرمہ بن گئی ہوں اور گوشت کا کہیں نام و نشان نہ ہو؟ آج تک امن اور اس کے گھر والے میری ہر بات اور عمل پر حیران و پریشان ہوتے رہے تھے، مگر آج پہلی بار امن نے مجھے حیرت کی آخری حدوں تک پہنچا دیا۔ حیرت کے شدید ترین جھٹکے سے سنبھل کر میں نے امن سے پوچھا۔

''امن پوری سچائی کے ساتھ بتایئے گا۔ یہ سوال آپ کے ذہن میں کیسے اُبھرا۔''

''آپ کی باتوں سے۔''

''میری باتوں سے......؟'' آج لگتا ہے حیران ہونے کی باری میری تھی۔

''جی ہاں، کچھ نئے روپ کی باتیں اور بہت ساری پرانے روپ کی باتیں، آپ کی ساری باتوں نے مجھے کئی کئی راتیں جاگنے پر مجبور کیا ہے۔ کل جو آپ میری تھکاوٹ کا سبب پوچھ رہی تھیں تو اس کا ایک سبب میری نیند کا پورا نہ ہونا بھی ہے۔''

''مجھے سن کر بے حد حیرانگی ہو رہی ہے امن، یہ نیا اور پرانا روپ کا کیا چکر ہے۔''

''میرا مطلب ہے جب آپ مراقبے کی کیفیت میں کہتی تھیں۔''

''اس کیفیت کی کچھ باتیں آپ مجھے بتا سکتے ہیں۔''

''اس طرح تو میرا سوال بیچ میں ہی رہ جائے گا۔''

''کبھی نہیں! اس کا جواب میں ضرور دوں گی......'' امن نے چند لمحے یوں ہی سامنے خلا میں دیکھا اور پھر میری جانب نظریں اٹھائیں، میری نگاہیں بھی اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ہماری نگاہیں باہم ٹکرائیں تو امن نے فوراً نگاہیں جھکالیں۔ امن کے کراچی سے لوٹ آنے کے بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے بدلی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے، خصوصاً جس دن ہم نے طویل گفتگو کی تھی تب دو بار اس نے مجھے صرف مہک کہہ کر پکارا تھا اور میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس کے بعد امن کی نظروں میں، میں نے کچھ اور ہی دیکھا تھا۔ امن کہہ رہا تھا۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

''مہک! آپ کی بہت ساری باتیں ایسی تھیں جنہوں نے میری سوچ کو اتھل پتھل کر دیا۔ میرے دماغ کو مٹھی میں لے کر کپڑے کی طرح نچوڑ ڈالا، میں نے ان پر بہت غور کیا۔ بہت سی باتوں پر ریسرچ کی اور بہت سی باتوں پر از خود قیاس کیا۔'' امن نے تھوڑا سا توقف کیا۔ اس کی نظریں سامنے کھیلتے بچوں پر مرکوز تھیں، توقف کے دوران اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''آپ کو یاد ہے آپ مجھے کب ملی تھیں؟'' وہ سوال جو کئی ماہ سے میرے ذہن میں ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا، امن نے خود پوچھ لیا۔

''مجھے کچھ یاد نہیں امن! میں آپ کو کب اور کہاں ملی تھی۔'' کہتے ہوئے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

''میرے دل نے جو مجھے پہلے باور کرایا تھا، تسلی دی تھی کہ عنقریب تمہیں اپنی پہچان مل جائے گی۔'' امن بولا۔

''لاہور میں میرا ایک ڈاکٹر دوست میو ہسپتال میں ڈیوٹی کرتا ہے۔ احسن محمود کا تقاضا تھا کہ میں اس کی شادی میں مع فیملی شرکت کروں۔ ڈیڈی کو عرصہ دراز سے پنجاب دیکھنے کا شوق تھا۔ جب میں نے احسن کی شادی کا تذکرہ کیا تو ان کی آتشِ شوق بھی بھڑک اٹھی، اس لیے ہم مع فیملی لاہور پہنچ گئے۔''

''حادثات در حادثات زندگی کا اہم جز ہیں۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ لاہور میں ہمارے ساتھ ایک خوب صورت حادثہ رونما ہونے والا ہے۔ شادی کے ہنگاموں کے دوران، ہم نے لاہور دیکھا نہیں، مگر شادی کے بعد اس کا کوئی کونہ چھوڑا نہیں۔ وہ ایسی ہی خوب صورت شام تھی، سائے ڈھل رہے تھے، ٹھنڈی ہوائیں اور پاؤں کے نیچے راوی کے ساحل کی چکنی ریت دل میں انوکھی فرحت جگا رہی تھی، سامنے راوی کا خوب صورت دریا تھا۔ ایک طرف لوگوں کا ہجوم اور ایک طرف من چلوں کے ہنگامے۔ ہم لوگ راوی کے کنارے زندگی کے خوب صورت لمحات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میرے ساتھ ڈیڈی ممی، بہن بھائی بھی موجود تھے۔ سمندر اور بارش میری کمزوری ہے۔ میں پانی میں اُترا ہوا تھا، باقی لوگ ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ میں پانی سے اور پانی مجھ سے اٹھکیلیاں کر رہا تھا، دفعتاً میری نظر پانی پہ تیرتے انسانی جسم پر پڑی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ لاش...... '' میرے ذہن کی دیواروں سے یہ لفظ زور سے ٹکرایا تو میں ہل کر رہ گیا۔ میں نے چیخ کر چھوٹے بھائی امر چند کو آواز دی۔

''امر یہاں آؤ جلدی۔'' حواس باختہ آواز پر ڈیڈی بھی گھبرا کر چلے آئے۔

''امن کیا بات ہے بیٹا......؟'' میں نے لاش کی طرف اشارہ کیا تو وہ لوگ بھی الرٹ ہو گئے۔ میں نے امر چند اور مہر چند کے ساتھ مل کر لاش کو باہر نکالا۔ یہ ایک خوب صورت لڑکی تھی، میں نے اسے چیک کیا تو میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھل پڑا۔ اس کے سینے میں زندگی کی رمق ابھی باقی تھی، میں نے پُر مسرت نظروں سے ڈیڈی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈیڈی یہ زندہ ہے۔''

''مہر جاؤ بیٹا گاڑی لاؤ۔'' ڈیڈی نے مہر کو فوراً بھگایا، پارو اور ممی پریشان نظروں سے لڑکی کو دیکھ رہی تھیں ارد گرد کے بہت سے لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ہم نے اسے گاڑی میں ڈالا اور فوراً قریبی ہسپتال پہنچایا، جہاں ابتدائی معائنہ اور ٹریٹمنٹ کے بعد امن کے مشورے پر اسے میو اسپتال میں منتقل کر دیا۔

وہ رات میں نے بے چینی کے ساتھ بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزاری۔ لڑکی کا معصوم چہرہ میری نگاہوں سے ہٹتا نہ تھا۔ میرا دل دعائیں مانگ رہا تھا کہ اسے موت نہ آئے۔ میں دوسرے دن صبح صبح اسپتال پہنچ گیا۔ احسن کے توسط سے اسپتال کا عملہ مجھے انتہائی عزت دے رہا تھا۔ میں لڑکی کے پاس کمرے میں گیا تو مجھے زبردست شاک لگا۔ اس کے جسم پر گہری چوٹیں آئی ہوئی تھیں، تقریباً سارا جسم پٹیوں میں چھپ گیا تھا۔ سر اور دائیں کندھے کی چوٹیں خطرناک تھیں۔ ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ یہ بلندی سے سر کے بل پانی میں گری ہے۔ سر کی گہری چوٹ کے سبب وہ گہری بے ہوشی میں چلی گئی تھی۔ وہ بیڈ پر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑی تھی اور میں اس کے پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ یہ انتہائی خوب صورت لڑکی تھی۔ بے ہوشی کی حالت میں وہ ایسے لگ رہی تھی جیسے معصوم، خوب صورت، مکھن کی طرح سفید بچہ گہری نیند سو رہا ہے۔ لڑکی کا قد چھوٹا تھا۔ متناسب جسم، سرخ و سفید رنگت

تھی۔ بند آنکھوں کی بیضوی گولائیاں بتا رہی تھیں کہ آنکھیں بڑی اور خوب صورت ہیں۔ سفید پٹیوں میں سے سر کا جو حصہ نظر آ رہا تھا، اس میں زلفیں سیاہ اور سلکی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے سر کو جھٹکا دیا اور خود کو کسی گہرے سمندر میں ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کی۔ سائیڈ ٹیبل سے فائل اُٹھا کر دیکھی۔ سر کی چوٹ گہری تھی، مگر لڑکی خطرے سے باہر تھی۔ ہم وقتاً فوقتاً اس کے پاس آتے رہے۔ لڑکی کی بے ہوشی طویل ہوتی گئی، مگر ہمیں یقین تھا کہ وہ بہت جلد ہوش میں لوٹ آئے گی۔

پچیس دنوں بعد وہ ہوش میں آئی۔ ہم سب امید سے تھے کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ اپنے بارے میں کچھ بتا پائے گی، مگر ہمیں مایوسی ہوئی۔ لڑکی اپنا نام تک نہیں جانتی تھی، چہ کہ ہمیں اپنے بارے میں تفصیل بتاتی۔ وہ ہوش میں آ کر بھی ہوش میں نہیں آئی تھی۔ وہ باتیں کرتی تھی، مگر نہ سمجھ میں آنے والی عجیب و غریب باتیں۔ کبھی کسی مایہ ناز سائنسدان کی طرح سائنسی، کبھی پروفیسروں کی طرح علمی، کبھی تاریخ دانوں کی طرح تاریخی اور کبھی عالم کی طرح مذہبی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر پورا جہاں پوشیدہ ہے۔ وہ ایک لمحے میں زمین پر ہوتی اور دوسرے لمحے میں آسمان پر...... کبھی ہوا بن جاتی تو کبھی بارش، کبھی دھوپ ہوتی تو کبھی چھاؤں۔ میری دل چسپی بڑھنے لگی، جسے ڈیڈی نے بھی محسوس کر لیا تھا۔

''امن میں دیکھ رہا ہوں، اس لڑکی میں تمہاری دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔''

''ڈیڈی آپ نے محسوس نہیں کیا۔ یہ لڑکی انتہائی عجیب و غریب اور انوکھی ہے۔''

''بیٹا، تم اپنے دوست کی شادی پر آئے ہو، ایک ماہ کی چھٹی لی تھی جو پوری ہو چکی ہے، میرا بھی بزنس کا مسئلہ ہے۔ اس لیے ایک اجنبی لڑکی کو سر درد نہ بناؤ اور واپسی کا سوچو۔''

''ڈیڈی اس طرح اسے لاوارث چھوڑ کر چلے جانا، کیا مناسب ہوگا؟''

''بیٹا! ہمارے ضمیر کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم نے اسے اسپتال پہنچایا اس کی دیکھ بھال کی۔ کل میری احسن سے بات ہوئی ہے، وہ اسے چند دنوں بعد دارالامان بھیج دے گا یا پھر کسی خواتین کی این جی او کے حوالے کر دے گا۔''

''ڈیڈی! احسن کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے، کل پرسوں وہ ہنی مون کے لیے نکل جائے گا۔ ہم چند دن رک جاتے ہیں، شاید ان دنوں میں اسے کچھ اپنے بارے میں یاد آ جائے۔ شاید اسے ہم اس کے گھر تک پہنچا سکیں۔'' میں نے ڈیڈی سے صرف پانچ دن مانگے تھے۔ مجھے تو نہیں تھی کہ لڑکی ان مختصر دنوں میں کچھ بتا سکے گی، پھر بھی ایک مبہم سی اُمید کے سہارے کچھ وقت مل گیا تھا۔ اگلے دن ہم تمام گھر والے اس کے پاس موجود تھے۔ یہ اتفاق شاید اس لیے ہوا تھا کہ اس دن لڑکی نے ہمیں حیران کرنا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی مہر چند اور بہن پارو لڑکی میں ذرہ برابر دل چسپی نہیں رکھتے تھے۔ کمرے میں دس منٹ رکنے کے بعد پارو بولی۔ ''ممی مجھے سر درد ہو رہا ہے۔ پلیز مجھے گھر چلنا ہے۔'' ہم نے پارو کو دیکھا اس کے چہرے پر اذیت کے آثار واضح تھے۔ ممی نے مجھے کہا۔

''امن بیٹا جاؤ پارو کو گھر چھوڑ آؤ۔'' میرے بولنے سے پیشتر ہی مہر بولا۔

''ممی میں چھوڑ آتا ہوں۔'' مہر کی بات سن کر لڑکی نے سر گھما کر انتہائی غصیلی نظروں سے مہر کی طرف دیکھا، پھر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''بلاول سمجھاؤ اسے، رب کے کاموں میں کیوں دخل اندازی کرتا ہے۔''

امن نے اتنا کہا تھا کہ میرے ذہن میں اسکرین روشن ہوگئی۔

میرے سامنے کچھ لوگ کھڑے تھے۔ میں نے یہ الفاظ جس شخص سے ادا کیے تھے اس کا نام بلاول تھا۔ چہرے پر داڑھی تھی، قد لمبا اور رنگ سفید تھا۔ چہرے کی خاص بات اس کی ناک درمیان سے تھوڑی سی چپکی ہوئی تھی۔

''بلاول سمجھاؤ اسے، میں نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا تھا، یہ رب کے کاموں میں میں کیوں دخل اندازی کرتا ہے۔''

''رب کے کاموں میں دخل اندازی۔'' حیرت میں ڈوبی ہوئی آوازیں۔

''ہاں رب کے کاموں میں دخل اندازی، اللہ نے اسے تم سے چھوٹا پیدا کیا ہے، مگر یہ ہمیشہ تم سے آگے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمیشہ خود کو بڑا ثابت کرنے پہ تلا ہوا رہتا ہے۔ اللہ نے اسے تم سے بعد میں پیدا کیا ہے، چھوٹا ہے تو

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

خود کو چھوٹا تسلیم کر لے۔"

"ہاں ہاں سمجھا دوں گا! تم کمرے میں جاؤ۔"

"اور یہ بھی بتانا۔ میں کئی بار کہہ چکی ہوں، اکڑی ہوئی گردنیں اللہ کو پسند نہیں ہیں۔ تباہی کے دن آنے والے ہیں۔ غرور سے تنے ہوئے سرتن سے جدا ہو جائیں گے۔ امریکہ کا مجسمۂ آزادی بھی پاش پاش ہو جائے گا۔"

ایک طرف میرے اندرا سکرین پر یہ مناظر چل رہے تھے اور دوسری طرف امن بالکل ایسی ہی باتیں مجھے بتا رہا تھا۔

ہم حیران و پریشان نگاہوں سے لڑکی کو دیکھ رہے تھے، یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ مہر چند مجھ سے چھوٹا ہونے کے باوجود ہمیشہ آگے نکلنے کی کوشش میں مگن رہتا ہے۔ میری شخصیت میں بردباری تھی، اس لیے میں ہمیشہ ہی خاموش رہا، مگر لڑکی براہِ راست یہ بات کہہ گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مہر چند اسے نفرت انگیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، مگر ڈیڈی کی نگاہوں میں حیرت تھی۔ یہ پہلا جھٹکا تھا جو لڑکی نے ہمیں دیا، دوسرے دن اس سے بڑا جھٹکا دیا۔ اگلے دن امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے جہاز ٹکرائے تھے، جیسے ہی یہ خبر ٹی وی پہ نشر ہوئی، ڈیڈی فوراً میرے پاس چلے آئے۔

"امن تمہارا کہنا بجا ہے۔ یہ لڑکی انتہائی عجیب و غریب اور انوکھی ہے، اس کے اندر ایک اور جہاں پوشیدہ ہے۔" ڈیڈی کی رائے ایک دم بدل گئی تھی، کیوں کہ چند دنوں میں لڑکی نے کئی ایسی باتیں کی تھیں جو کسی نہ کسی صورت سچ ثابت ہوئی تھیں۔

پانچ دنوں بعد جب ہم نے جانے کی تیاری شروع کی تو ڈیڈی بولے۔

"امن لڑکی ہمارے ساتھ جائے گی۔" ڈیڈی کی بات سن کر مجھے اندرونی طور سے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے ڈیڈی کے پاؤں مزید مضبوط کرنے کی غرض سے کہا۔

"ڈیڈی! آپ کی منطق میں سمجھ نہیں پایا۔ کل تک تو آپ لڑکی کو دارالامان بھیجنے کے حق میں تھے۔"

"امن بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ میں نے لڑکی کے بارے میں بہت کچھ سوچا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ راوی نے ہمیں تحفہ دیا ہے۔ لڑکی خود اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتی، مگر ہمارے بارے میں وہ کہہ رہی ہے جو ہماری زبان میں نہیں دلوں میں پنہاں ہے۔" ڈیڈی کا یہ نیا مدعا سمجھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔

"یعنی کہ یہ لڑکی......" ڈیڈی سمجھ گئے کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں، فوراً بولے۔

"امن فی الحال یہ بات خود تک محدود رکھو، کہو گے تو مسائل میں پھنس جائیں گے، تم جانے کی تیاری کرو، صرف احسن کو بتا دو کہ لڑکی کو ہم ساتھ لے جا رہے ہیں۔"

"ڈیڈی! ہم تو اس کا نام تک نہیں جانتے اوپر سے عجیب و غریب باتیں اور حرکتیں کر رہی ہے، ہم نے پنجاب سے سندھ جانا ہے، راستے میں قانونی پیچیدگیاں نہ گھیر لیں۔"

ڈیڈی نے چند لمحے سوچا اور بولے۔ "امن لڑکی مہک جیسی ہے، خوب صورت مسحور کن مہک، لہٰذا اس کا نام بھی مہک ہے۔ مہک جی۔ یہ ہمارے گھر میں ہر طرف مہک بن کر مہکے گی اور جہاں تک قانونی پیچیدگی کا مسئلہ ہے، وہ کبھی نہیں ہوگا۔"

"آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں۔"

"مہک جی ایسا ہونے نہیں دیں گی۔" ڈیڈی نے گھر کے تمام افراد کو اس کا نام اور کام بتا دیا۔ اس طرح پنجاب کے دریا راوی سے ملنے والی اجنبی لڑکی، مہک کے نام سے سندھ کے ضلع گھوٹکی کے مضافاتی گاؤں چندن پور میں پہنچ گئی۔

"امن یہ تو مجھے پتا چل گیا کہ میں یہاں کیسے آئی، مگر راوی کے دریا میں گرنے سے پہلے کی زندگی کے بارے میں آپ کو کچھ پتا چلا۔"

"نہیں مہک! دریائے راوی میں آپ کیسے گریں، کہاں سے بہتی ہوئی وہاں تک پہنچیں، ہمیں کچھ معلوم نہیں۔"

"آپ لوگوں نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔"

"سوری مہک! ہم نے لاہور میں تو تگ و دو کی تھی کہ آپ کو آپ کے گھر والوں تک پہنچایا جائے، مگر یہاں سے کوئی کوشش نہیں

کی۔ ہمارے گھر میں آتے ہی آپ نے اتنی حیران کن باتیں بتائیں کہ آپ ہر لمحے گھر کے افراد کے لیے معتبر بنتی گئیں۔" امن کی بات سن کر میں نے تاسف سے آسمان کو دیکھا۔ میرا دل اُداسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر گیا تھا۔ میرے دل میں ایک سوال گولی کی طرح ٹھاہ کر کے لگا۔ میں کون ہوں...... مجھے نہ اپنا نام معلوم ہے، نہ خاندان کا کوئی اتا پتا، میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

"مہک۔ آپ رو رہی ہیں۔"

"ایک اجنبی لاوارث لڑکی کو رونا ہی چاہیے امن...... پتا نہیں میں کس کی بیٹی ہوں، کس کی بہن ہوں، میرا خاندان کہاں ہے۔" میری آواز میرے آنسوؤں کے شور میں دب گئی تھی۔ امن نے گھبرا کر کہا۔

"مہک! میں آپ سے کچھ پوچھنے والا تھا۔ اگر آپ اس طرح اُداس رہیں تو مجھے میرے سوالوں کا جواب کیسے ملے گا؟"

میں نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے اور دل پر ضبط کے پتھر رکھ کر بولی۔

"بولو امن......" "آپ نے مجھے اتنا کچھ بتایا، تو مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اپنے دُکھ میں آپ کو نظر انداز کر دوں۔ میرا سوال وہی ہے مہک۔ مرنے کے بعد انسان کا بالکل اسی رنگ و روپ اور اسی وجود کے ساتھ پھر سے زندہ ہونا ممکن ہے، جبکہ دنیا کی مدت بہت بڑی ہے۔ کئی انسانوں کو مرے ہوئے کئی صدیاں بیت گئی ہیں۔ ان کی ہڈیاں اور گوشت بوسیدہ ہو کر سرمہ بن گئی ہوں گی، اب ان کے ملنے کا تصور بھی ناممکن ہے۔"

"امن! آپ جانتے ہو میں کس مذہب سے تعلق رکھتی ہوں۔"

"کیا آپ کو معلوم نہیں مہک۔"

"جب سے ہوش میں آئی ہوں، تب سے اسی کھوج میں لگی رہی تھی۔ شہر ذات کی پہچان پا لوں، حقیقی پہچان پا لوں اور مذہبی پہچان پا لوں۔ شہر ذات کی پہچان، ہنوز نہیں کر پائی، مگر حقیقی اور مذہبی پہچان کر چکی ہوں۔ امن میں مسلمان ہوں۔"

"جانتا ہوں مہک، یہ بات میں، بہت پہلے جان چکا تھا، جبکہ شاید آپ خود بھی نہیں جانتی تھیں۔"

"وہ کیسے......؟ آپ کیسے جان گئے تھے۔"

"آپ باتیں ہی ایسی کرتی تھیں۔"

"کون سی باتیں۔"

"مہک میرا سوال پھر بیچ میں رہ جائے گا یا پھر آپ بتانا ہی نہیں چاہتیں یا میں سمجھوں کہ اس کا کوئی معقول جواب ہے ہی نہیں۔ یہ محض ایک من گھڑت مفروضہ ہے......" امن کی بات سن کر میں نے تمام باتیں پس پشت ڈال دیں اور اس کے سوال کی طرف متوجہ ہو گئی۔

امن 1880ء میں سر فرانسس گولٹ نے تحقیق کی، اس کی تحقیق کا مرکز فنگر پرنٹ تھے۔ سر فرانسس نے ثابت کیا کہ دنیا کے کوئی سے دو اشخاص، چاہے وہ سگے جڑواں، بہن بھائی یا دونوں بہنیں ہی کیوں نہ ہوں، وہ بالکل ایک جیسے نقش انگشت نہیں رکھتے۔ یہ جدید تحقیق انتہائی تہلکہ خیز اور سود مند تھی، کیوں کہ اس نے جرائم کی روک تھام میں انتہائی مدد کی۔ آج تک پوری دنیا میں مجرموں کو پکڑنے کا یہ موثر ترین ذریعہ ہے۔ یہ تحقیق 1880ء کے بعد منظر عام پر آئی، مگر چودہ سو سال پہلے خالقِ کائنات نے یہ بات بتا دی تھی۔"

قرآن کریم کے پارہ نمبر 29 سورۃ القیمۃ کی آیات نمبر تین اور چار میں ارشاد ہو رہا ہے۔

"کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں ہرگز نہ جمع کریں گے (اور یہ جمع کرنا ہم کو کچھ دشوار نہیں)، کیوں کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کی پور پور تک درست کر دیں۔"

"اس سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں امن! ایک یہ کہ قرآن کریم آسمانی کتاب ہے، دوسرا فنگر پرنٹ کا ایک جیسا نہ ہونا، قادر مطلق کی یہ حکمت ہے کہ وہ کھلا انسان کو چیلنج کر رہا ہے۔ 6 ارب انسانوں کو اٹھا کر دیکھ لو تمام کے فنگر پرنٹ ایک دوسرے سے جدا ہیں اور اللہ تعالیٰ کہہ رہا ہے، ہم اس کی انگلیوں کی پور تک درست کر دیں گے۔ فنگر پرنٹ دیکھ لینا، تیرا جسم بھی تیرا ہوگا اور انگلیوں کی پوریں بھی تیری ہوں گی، تجھے تیرے فنگر پرنٹ بھی واپس کیے جائیں گے، تاکہ شک و شبہ کی

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔"
میں نے دیکھا۔ امن کے چہرے کی حیرت بڑھتی جارہی تھی، وہ شاید کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔
"آپ کو کچھ کہنا ہے۔"
"ایک بار پہلے بھی آپ نے درد محسوس کرنے والے خلیوں کی بات کی تھی۔"
"کیسی بات؟"
"ہمارے گھر میں کمل چند تایا کی بڑی بیٹی کی منگنی تھی۔ ڈیڈی کی ہدایت کے مطابق آپ کو ایک الگ کمرے میں چھپا دیا گیا تھا۔ ڈیڈی کا کہنا تھا۔ آپ پر کسی کی نظر پڑ گئی تو ایک نئی بحث کا آغاز ہو جائے گا۔ اس دوران آپ نے مجھے شیانگ مائے یونیورسٹی تھائی لینڈ کے اناٹومی کے ڈپارٹمنٹ کے چیئرمین پروفیسر میگا ٹیسٹ تیجاسن کے بارے میں بتایا تھا کہ انہوں نے درد کے خلیوں پر بہت ریسرچ کی تھی اور آخر قرآنی آیات سے مدد ملی تو اسلام قبول کر لیا۔"
امن نے کہا تو مجھے یاد آیا، میں کہیں قید تھی، کمرے میں گھپ اندھیرا تھا، باہر سے بہت سے لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسی دوران ایک آرے سے میرے پاؤں کاٹ دیے گئے تھے، شاید تبھی میں نے کچھ ایسی باتیں کہی تھیں
"امن میری اُن باتوں پر آپ نے کبھی غور بھی کیا۔"
"مہک اگر غور نہ کرتا تو میری راتوں کی نیندیں حرام نہ ہوتیں، نہ ہی میں کبھی آپ سے ایسے سوالات پوچھتا۔"
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہو، میرا جواب ابھی ادھورا ہے۔"
"جی بولیے۔"
"حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ مکہ میں ایک شخص عاص بن وائل ایک بوسیدہ ہڈی لے کر نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے بوسیدہ ہڈی کو چٹکی سے مسلا پھر اس کے سرمہ کو چھو کر کے پھونک سے اُڑا دیا اور کہنے لگا۔ کیا یہ ایسی حالت کے بعد بھی زندہ ہوگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں اور تو دوزخ میں جائے گا۔ اس پر قرآن اُترا، سورۂ یٰسین کی آخری آیات...... سنو گے؟"
"جی......"
"کیا آدمی کو معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفے سے پیدا کیا، سو وہ اعلانیہ اعتراض کرنے لگا اور اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا اور اپنی اصل کو بھول گیا۔ کہتا ہے کہ ہڈیوں کو (خصوص) جبکہ وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں، کون زندہ کرے گا، آپ جواب دے دیجیے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے اول بار میں ان کو پیدا کیا ہے اور وہ سب طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے۔"
"امن!" میں نے اسے پکارا تو امن گہری سوچ سے باہر نکل آیا۔ "کیا میں آپ کو مطمئن کر پائی ہوں۔ کیا اب بھی آپ کا خیال ہے کہ یہ محض من گھڑت مفروضہ ہے۔"
"مہک ہمیں گھر چلنا چاہیے۔ وقت بہت ہو گیا ہے، ڈیڈی پریشان ہوں گے۔"
"امن! ابھی تو ہماری بہت سی باتیں باقی ہیں، ابھی تو بہت سے معاملات طے کرنے ہیں۔ وہ باتیں اور معاملات گھر میں بھی طے ہو سکتے ہیں۔" امن کہتا ہوا اُٹھ گیا۔ "چلیے مہک۔"
میں نے کچھ دیر اسے دیکھا اور پھر اس کے ساتھ ہولی۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں نے کہا۔
"امن صرف اتنا بتا دو، تم نے کبھی سچ اور جھوٹ کو پرکھنے کی تمنا نہیں کی، کبھی رات اور دن کے تسلسل کو جاننے کی کوشش نہیں کی۔" کہنے کو میں کہہ گئی مگر الفاظ کے ساتھ میرے دماغ کی کھڑکی کھل گئی، شاید یہ سوالات میں نے پہلے بھی کسی سے پوچھے تھے، مگر وہ نام امن نہیں تھا۔ کھڑکی سے جواب ملا۔ وہ نام بلاول تھا۔ بلاول...... سوچ کے ساتھ بلاول زور سے ٹکرایا، یہ بلاول کون ہے......؟ ادھر امن کہہ رہا تھا۔
"مہک میں نے کوشش بھی کی اور تمنا بھی رکھی۔"

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ جواب...... بالکل یہی جواب بلاول نے بھی دیا تھا۔ بلاول امن جیسا نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر داڑھی تھی، ناک پچکا ہوا تھا۔ ”پھر امن کیا نتیجہ نکلا......؟“

”الجھن، گھپ اندھیرا، سوالات کی بوچھاڑ اور گورکھ دھندہ۔ یقین کرو آپ کی کچھ باتوں نے مجھے اتنا زیادہ سوچنے پر مجبور کیا کہ میرے دماغ کے ریشے پرزہ پرزہ ہو گئے مگر میں جواب نہ پا سکا، مگر......“ امن خاموش ہو گیا۔

”مگر کیا امن......؟“

”مگر شاید اب جواب پاؤں......“

”یقیناً امن...... میں نے ایک ڈائری لکھی ہے، گھر جاتے ہی وہ آپ کو دوں گی، آپ کی بہت رہنمائی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے مہک، ایک بات آپ سے اور بھی کہنی ہے۔“

”جی بولیے۔“

”عزیز الرحمٰن سے نرملا کی شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔ آپ پلیز تایا اور ڈیڈی کو اس آزمائش میں مت ڈالیے۔“

”آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے، مگر مجھے جو محسوس ہو رہا ہے، میں وہی کروں گی، میں نرملا کو عزیز الرحمٰن کے ساتھ خوش و خرم دیکھ رہی ہوں۔ کیا آپ لوگ نرملا کی خوشی نہیں چاہتے۔“

”چاہتے ہیں، مگر ہماری مجبوری آپ سمجھ گئی ہوں گی۔“

”سمجھنے کے باوجود میں یہی مشورہ دوں گی کہ نرملا کی شادی عزیز سے طے کر دو۔“ اس بار امن خاموش رہا۔ ہم رات گئے گھر لوٹے تھے، اگلے دن میں نے پہلا کام یہ کیا کہ ڈائری امن کو کمرے میں دے آئی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ امن کو اس وقت اس ڈائری کی بے حد ضرورت ہے۔ یہ ڈائری میں نے بہت سی کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھی تھی۔ اس میں کئی کتابوں کا موازنہ تھا اور بہت سے حوالے تھے۔

امن نے میری مشکلات میں اضافہ کر دیا۔ میں پنجاب کی رہنے والی ہوں، مگر اپنا نام تک نہیں جانتی۔ نہ اپنے خاندان کے بارے میں کچھ پتا ہے۔ میں اجنبیوں کے بیچ میں زندگی گزار رہی تھی، راوی میں گرنے سے پہلے کی زندگی اندھیرے میں تھی، ہاں البتہ مجھے ایک ڈھارس ضرور تھی۔ مراقبے کی حالت میں جس شخص کے ساتھ میں باتیں کرتی تھی، اس کا نام بلاول تھا۔ کئی واقعات میں ایک بچے کا بھی تذکرہ تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا، میری اصل زندگی میں بلاول میرا شوہر اور معاویہ ہمارا بچہ ہے، مگر اس وقت وہ کہاں ہیں، میں نہیں جانتی۔ ہر سُو اذیت ناک تھی، ہر خیال کرب انگیز تھا۔ خاندان والوں کے بارے میں جاننے کے لیے میرا لاہور کا سفر ضروری تھا، مگر اس سے پہلے مجھے ایک اور انتہائی اہم کام نمٹانا تھا۔ مجھے اس تین کنال کے گھر میں بسنے والے بیسیوں افراد کے اذہان و قلوب میں انتہائی اہم پیغام پہنچانا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے چھپ چھپ کر مزید کتابوں کا مطالعہ کیا اور جب خود کو ذہنی و قلبی طور پر خود کو تیار پایا تو اس دن کا انتظار کرنے لگی جس دن تمام لوگ خاص اہتمام کے ساتھ اکٹھے ہو کر میرے روبرو پیش ہوتے تھے۔ گھر کے سارے افراد میرے سامنے زمین پر بیٹھ جاتے اور گھر کا بڑا کمل چند ہاتھوں میں تھال اٹھائے نجانے کیا کچھ کرتا رہتا۔ پہلے میں اس ڈرامے کا مقصد نہیں سمجھی تھی، مگر اب بہت اچھی طرح سے جان گئی تھی۔ کمل چند کے ہاتھ میں جو تھال ہوتا ہے، اس میں رکھی گئی تمام اشیاء کو ان کے مکمل سیاق و سباق کے ساتھ سمجھ گئی ہوں۔ اس تھال میں بہت سی چیزیں قلیل مقدار میں رکھی گئی تھیں۔ دہی، گڑ، پان کا پتا، ہلدی، چاول، گائے کا گوبر اور سرخ رنگ کا دھاگہ رکھا ہوا تھا۔

ابتدا میں مجھے باقاعدہ دودھ سے غسل دیا جاتا تھا، بعد میں، میں نے انتہائی سختی سے منع کیا تو یہ پاگل لوگ باز آئے۔ عموماً اس دن مجھے لان میں لے جایا جاتا تھا، مگر اب کی بار میں نے لان میں جانے سے انکار کر دیا۔ بحالت مجبوری وہ ٹی وی ہال میں جمع ہو گئے۔ میں اس پر راضی تھی، کیوں کہ مجھے بھی ایک خالی سفید دیوار چاہیے تھی۔ رات کے آخری پہر اُٹھ کر میں نے اللہ تعالیٰ سے رو رو کر دعا مانگی تھی کہ وہ مجھے میرے مقصد میں کامیابی دے اور میرے لیے مزید مسائل پیدا نہ ہوں۔

ٹی وی ہال میں امن سمیت تمام لوگ موجود تھے۔ مجھے حسب معمول تخت پر بٹھایا گیا۔ دو نوجوان لڑکیاں میرے عقب میں

پنکھا لے کر کھڑی ہو گئیں۔ امن کی مما اور تائی نے لوبان اور عود جلایا، ساتھ ہی خوشبو کا چھڑکاؤ ہوا۔ اوطاق میں بڑی اگربتیاں جلائی گئیں۔ کچھ دیر بعد کمل چند ہاتھوں میں تھال اٹھائے کچھ پڑھنے لگا۔ میں اس سارے ڈرامے کی عادی ہو چکی تھی، اس لیے خاموشی سے بیٹھی رہی۔ میرے قدموں میں مختلف انواع و اقسام کے کھانوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ساتھ میں ہر قسم کا فروٹ بھی رکھا تھا۔ تمام افراد اس موقع پر خاصے بن ٹھن کے آئے تھے۔ عورتیں جیولری اور میک اپ سے لیس تھیں۔ کمل چند نے اپنا کام پورا کر لیا، پھر تھال میں سے کچھ اٹھا کر ان کی ہتھیلیوں پر رکھا جسے وہ چاٹنے لگے۔ مردوں کی کلائیوں پر سرخ دھاگہ بندھا۔

جب کھانے کی باری آئی تو میں نے چپ کا روزہ توڑا، ”کیا میں آپ لوگوں سے چند باتیں کر سکتی ہوں۔“ میرا سوال ان پر ہتھوڑے کی طرح برسا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس موقع پر یوں پورے ہوش و حواس میں بولی تھی۔ کمل چند اور قدم چند نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”میرا جی چاہ رہا ہے، آج آپ لوگوں کو ماضی کے دور میں لے جاؤں۔ ہندوستان کا ماضی۔“ کہتے ہوئے میں نے انہیں دیکھا، عورتوں کے چہروں پر خوف اُترنے لگا۔ مردوں کے چہروں پر بھی تفکر کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”گھبرائیے نہیں، کچھ انوکھا ہونے والا نہیں ہے۔“

”مہک جی! اگر آپ ناراض نہ ہوں تو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ کمل چند میرے رُوبرو آ کر بولا۔

”بولیے، مگر ایک بات کا دھیان رہے۔ میں آپ کے کسی بھی کام میں مخل نہیں ہوئی۔ اس لیے آج اگر کچھ وقت لینا چاہ رہی ہوں تو یہ میرا حق ہے۔“

”اب کہیے کیا کہنا ہے۔“

”مہک جی! آپ تو جانتی ہیں، عورتیں کمزور دل ہوتی ہیں۔ آپ تو جو چاہیں کر سکتی ہیں، جب یہ سپاٹ دیوار کو پردۂ اسکرین کی طرح روشن دیکھتی ہیں، تو خوف سے کانپ اٹھتی ہیں۔“

”گھبرائیے نہیں، میں کوئی دیوار روشن نہیں کرنے والی۔ مجھے کچھ کہنا ہے۔ توجہ سے سنا جائے گا تو آپ تمام لوگوں کے لیے سود مند رہے گا۔“ اس بار وہ چپ ہو گیا، باقی لوگ بھی خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میری آخری بات سے وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

”ہندوستان کی تاریخ 750 ق م تک جا پہنچتی ہے، مگر میں چند ضروری باتیں آپ لوگوں کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں۔ موہنجوداڑو سندھ اور ہڑپا پنجاب ان دونوں مقامات کی 1920ء میں سرجان مارشل کی آمد کے بعد باقاعدہ تہذیب و تمدن کا آغاز ہوا۔ آریا قوم نے اپنے وطن سے ترکِ سکونت کی تو افغانستان چلے گئے۔ وہاں سے ہندوکش کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سندھ طاس میں آریوں کا قیام پندرہ صدیوں پر محیط ہے۔ جب آریوں نے یہاں چڑھائی کی تھی تو ان کے کچھ قبائل نے مشرقی ہند کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے گنگا جمنا پر تسلط قائم کیا۔ وہاں سے صوبہ بہار کی طرف بڑھے، پھر جب وسطی ہند پر اپنی کامیابیوں کا جھنڈا گاڑا تو وہاں کے قدیم باشندے دراوڑوں کو جنوبی ہند کی طرف بھاگنا پڑا۔ کچھ دراوڑوں کو آریوں نے اپنے ساتھ ملا لیا۔ جو دراوڑ آریوں کے ساتھ مدغم ہوئے انہیں بندھیاچل کا جنوبی علاقہ دے دیا گیا، مگر آریوں کے لیے یہ باشندے قابل نفرت اور حقیر تھے، لیکن بہرحال یہ طے ہے کہ دو مختلف ثقافتیں ایک دوسرے میں ضم ہوئیں۔ ان دو ثقافتوں نے باہم مل کر دو اہم جز بنائے۔ ہندو مذہب کو تخلیق کیا اور آریوں کی زبان سنسکرت کو پورے ہندوستان میں اظہار خیال کا بہترین ذریعہ بنایا۔ اس طرح تاریخ کے شواہد سے میری عقل نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہندو مذہب آریا سماج سے تخلیق ہوا ہے۔ کیا میری یہ سوچ درست ہے؟

میں نے کمل چند کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ جزبز کھڑا ہوا تھا

”آپ بیٹھ جائیں...... بوڑھے آدمی ہیں، کھڑے کھڑے تھک جائیں گے۔“

”جی...... جی......“ وہ جی جی کہتا ہوا ایک طرف بیٹھ گیا...... میں نے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا۔ کمل چند تو ہنوز خاموش تھا، البتہ قدم چند بولا۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوسکتا ہے آپ درست کہہ رہی ہوں، مگر ہمیں اس بارے میں ٹھیک معلومات نہیں ہیں۔

مجھے پتا ہے کہ آپ لوگوں کے پاس درست معلومات نہیں ہیں، اس لیے میں ٹھیک ٹھیک تاریخ بتا کر آپ لوگوں کو ایک نئی سمت سے متعارف کروانا چاہتی ہوں۔

”مہک جی! ہم نے آباؤ اجداد کے زمانے سے اپنی سمتوں کا بالکل درست تعین کر رکھا ہے۔ آپ تھک جائیں گی اس لیے بہتر ہوتا کہ آپ کمرے میں جا کر آرام کیجیے۔“ یہ بات کہنے والا امن تھا، شاید وہ مجھے مزید کہنے سے باز رکھنا چاہتا تھا، مگر میں دل میں عہد کر چکی تھی، آج بدعقیدہ لوگوں کے دماغ کھول کے رہوں گی۔ میں نے امن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کو میری فکر ہے یا میری تھکاوٹ کی؟“ میرا سوال امن سمجھ نہ پایا اس لیے کوئی جواب نہ دیا، وہ چپ رہا تو میں نے کہا۔ ”صرف آدھا گھنٹہ اور لوں گی، اس کے بعد آپ لوگ آزاد ہو۔“ عورتوں نے مردوں کو اور مردوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، مگر کسی نے کہا کچھ نہیں، میں نے سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑا۔

”آریوں کا ابتدائی عقیدہ خالص توحید پر قائم تھا۔ وہ بالکل مسلمانوں ایسا عقیدہ رکھتے تھے، خاص کر ربِ کائنات کے بارے میں۔ پاتنجل ان کی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب میں سائل اپنے استاد سے سوال پوچھتا ہے۔

”وہ معبود کون ہے، جس کی عبادت سے نیک کاموں کی توفیق ہوتی ہے؟“

استاد کا جواب آتا ہے، وہ اپنی اولیت اور وحدانیت کے باعث تمام ماسوا سے مستثنیٰ ہے۔ وہ ہر قسم کے افکار سے منزہ ہے، کیوں کہ وہ تمام ناپسندیدہ اور پسندیدہ افراد سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ وہ بذاتِ خود عالم ہے اور ہمیشہ سے عالم ہے، کسی وقت بھی اور کسی حالت میں بھی جہالت اور لاعلمی اس کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتی۔

اب ہندوؤں کا عقیدہ دیکھا جائے تو وہ بھی اصل میں توحید پر مبنی ہے۔ مہابھارت ہندو دھرم کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کا ایک اہم حصہ بھگوت گیتا ہے۔ اس میں باس دیو اور ارجن کے درمیان مکالمہ ہوا۔

”میں کُل ہوں، نہ ولادت سے میری ابتدا ہوئی اور نہ وفات سے میری انتہا ہوگی۔“

یہ بات اللہ تعالیٰ پر صادق آتی ہے۔ مسلمانوں کی کتاب قرآن شریف میں ارشاد ہوا ہے۔

”اللہ ایک ہی تو ہے، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے نہ کوئی اس سے پیدا ہوا ہے۔ وہ لاشریک ہے، بے نظیر، ہر نقص اور کمزوری سے پاک۔ اس کے لیے نہ تھکن ہے نہ زوال نہ فنا۔ نہ موت نہ ہلاکت۔ اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔“

یہ سارے عقیدے توحید پر مبنی ہیں، مگر یہ ابتدا ہے۔ آگے چل کر ان عقائد میں ملاوٹ آتی گئی۔ ہندوؤں اور آریوں کے عقیدۂ توحید میں بگاڑ کہاں سے شروع ہوا۔ خدائے واحد پر ایمان لانے والی قوم میں ہزاروں لاکھوں خداؤں میں کیسے بٹ گئیں، یہ سوال میرے ذہن کے ریشے ریشے سے پتھر کی طرح ٹکرایا۔ میں اس کی ضربوں سے زخمی ہوئی، مجھے بے انتہا درد کا احساس ہوا۔ اس درد میں حیرت کا عنصر غالب تھا۔ حیرت اس بات کی ہے کہ ایسی قوم جن کا اول عقیدہ توحید پر مبنی تھا، وہ قوم انسانوں کے ساتھ ساتھ پہاڑوں، درختوں، سمندروں کو اپنا معبود ماننے لگی اور ان کے دیوتا کے ڈھیر لگ گئے۔

ڈائیوس۔ وارونا، آسورا، سوریا، اب میں کتنے نام بتاؤں......

میں نے امن کے سب سے چھوٹے بھائی آکاش کے پاس جا کر پوچھا۔

آپ کو کرکٹ بہت پسند ہے، خود ہی کھیلتے ہو...... آپ کو بتاتی ہوں۔ سری لنکا کرکٹ ٹیم کے مشہور کھلاڑی جے سوریا کا نام سوریا دیوتا کے نام پر رکھا گیا ہے، کچھ سمجھ میں آیا۔ آکاش مجھے ہونقوں کی طرح بس دیکھے جا رہا تھا۔ میں اُٹھ کر اپنی سابقہ جگہ چلی گئی، کچھ مزید دیوتاؤں کے نام بتاؤں۔

ویدوں کے دور میں سب سے اہم اور طاقت ور سمجھا جانے والا دیوتا اندرا ہے۔ اندرا دیوتا کے بارے میں لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس نے قحط سالی کو ختم کیا تھا۔ اسی دیوتا نے روشنی دریافت کی ہے اور سورج کو راستہ بھی یہی دیوتا دکھاتا ہے۔ انڈیا کی مشہور شخصیت اندرا گاندھی کا نام اسی دیوتا سے موسوم ہے۔ اندرا کو زبردست قسم کا جنگجو دیوتا مانا جاتا ہے اور جب یہ

ایک خاص قسم کی شراب سرما پی لے تو اس پر جنگی جنون سوار ہوجاتا ہے۔

اگنی...... بذاتِ خود ایک دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ اگنی دیو بھی ہے اور دیوتاؤں کا منہ بھی ہے۔ اس کے بارے میں عقیدہ ہے کہ اگنی دیو اور دیوتا قربانی کو نگل کر آسمانی دیوتاؤں تک پہنچاتا ہے۔ ان کے علاوہ وارونا اور وشنو بھی دیوتاؤں کے نام ہیں۔ اب ایک سوال، میں چل کر قدم چند کے پاس گئی۔

”آپ لوگوں کو پتا ہے کہ ہندو مذہب کی اساس کن چیزوں پر کھڑی ہے۔“ میرے سوال کے جواب میں مکمل خاموشی تھی، حتیٰ کہ قدم چند بھی جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا، شاید ان کا مدعا تھا کہ میں خاموش ہوجاؤں اور وہ لوگ کھانا شروع کریں، مگر میں نے اپنی بات پوری کرنا تھی۔

”چار باتوں پر ہندو مذہب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ نمبر ایک، روحانی دنیا ہی سب سے اعلیٰ حقیقت ہے۔ نمبر دو، ذاتی دنیا بے حقیقت ہے۔ نمبر تین، آواگون، یعنی روح کا ایک قالب سے دوسرے قالب میں جانا اور نمبر چار، کرما کا نظریہ۔ یہ دراصل نمبر تین کی تشریح ہے، چوں کہ مادی دنیا کی کوئی حقیقت نہیں، اس لیے انسان بار بار مرتا اور بار بار جیتا ہے۔ انسان جب حقیقی وجود میں ضم ہوجاتا ہے تو وہ بار بار کے مرنے سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ ایک بار مرنے کے بعد انسان دوسرے جنم میں زندہ ہوجاتا ہے۔ اس کا دوسرا جنم کسی بھی صورت میں ہوسکتا ہے۔ انسان، حیوان یا نباتاتی صورتوں میں وہ جنم لیتا ہے۔ دوسرے جنم کا انحصار اس کے پہلے جنم کی زندگی پر ہوتا ہے۔ اگر اس نے پہلے جنم میں اچھے اور نیک کام کیے تو دوسرا جنم بھی اچھا ملے گا بصورت دیگر وہ پریشانیوں، مصیبتوں اور دکھوں کا اسیر ہوگا، حالاں کہ یہ عقیدہ ہی سراسر بے بنیاد اور جاہلانہ ہے۔ میں نے دیکھا میری ان باتوں سے ان کے چہرے متغیر ہوگئے ہیں۔ کمل چند اور قدم چند نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ امن کے چہرے پر بھی کئی رنگ آکر گزر گئے، میں نے جب یہاں ڈائری میں لکھی کی باتیں، جو کہ روح، مرنے اور مرنے کے بعد پھر سے زندہ ہوجانے پر لکھی گئی تھی۔ وہ باتیں دہرائیں تو ان کی حالت بدلنے لگی لیکن کوئی نادیدہ قوت تھی، جس نے انہیں خاموش بیٹھنے پر مجبور کر رکھا تھا، ان کا خاموش رہنا میرے حق میں بہتر تھا۔

رامائن، مہابھارت اور بھگوت گیتا ہندوؤں کی اہم کتابیں ہیں۔

رامائن، رام کی کہانی ہے۔ رام کی ماں سوتیلی تھی، جس نے اپنے شوہر کو اکسایا تو اس نے رام کو بیوی سیتا سمیت جلاوطن کردیا۔ رام بیوی سیتا کو لے کر جنگل میں چلا گیا۔ وہاں لنکا کے راجہ راون نے رام کی بیوی سیتا کو اغوا کرلیا۔ اپنی بیوی کو آزاد کرانے کے لیے رام نے لنکا پر حملہ کیا اور بیوی کو آزاد کرالیا۔

مہابھارت میں کورو اور پانڈو کے درمیان لڑی گئی جنگ کا ذکر ہے۔ اس لڑائی میں کرشنا، ارجن کا رتھ بان تھا۔ بھگوت گیتا کرشنا کا کلام ہے، ارجن جو جنگ سے خوف زدہ تھا اسے کرشنا نے جنگ پر مجبور کیا۔ اس جنگ میں انسانی خون کے دریا بہے ہیں۔

آپ لوگوں کو ایک اور دلچسپ بات بتاؤں۔ ہندوؤں کی تمام کتابوں میں لفظ ہندو کہیں نہیں ملتا۔ دراصل ہندو کوئی مذہب ہے ہی نہیں، ہاں البتہ اسے شائن یا شنو مت کہا جاسکتا ہے۔

ہندو مت وہ مذہب ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں۔ یہ ہر قسم کے عقیدے اور رسم و رواج کو اپنانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ اس کے کوئی بھی خاص مقررہ عقائد یا اصول موجود نہیں ہیں۔ جس کی مرضی ہے، جس بھگوان یا دیوتا کی پوجا کرتا پھرے۔ اس مذہب میں برہمنوں کے علاوہ کسی کو خاص اہمیت حاصل نہیں۔

ذات پات کی تقسیم نے عورتوں اور نچلی ذات کے لوگوں کو برہمنوں کے مقابلے میں انتہائی نیچے کردیا ہے۔ سب سے زیادہ غیر انسانی و غیر اخلاقی سلوک شودروں سے کیا جاتا ہے، جن کا سایہ کنویں پر پڑ جائے تو کنویں کا پانی ناپاک قرار دیا جاتا ہے۔ شودر بھگوان کو قربانی نہیں چڑھا سکتا، بلکہ وہ برہمن کو دے گا اور برہمن یہ فریضہ انجام دے گا۔ کیا میں سچ کہہ رہی ہوں ماں جی۔“ اس بار میں امن کی تائی کے سامنے بیٹھ کر بولی۔ وہ جز بز ہو کر اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔ بوڑھے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ میری ذات سے ڈر تا ان کے دلوں میں سما گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی جواب نہیں دینے والی۔ جب مرد حضرات کوئی بات کرنے سے اجتناب برت رہے تھے تو عورتیں کیوں کر لب کشائی کریں گی۔ میں نے کھڑے ہو کر گفتگو جاری رکھی۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

''انسائیکلو پیڈیا آف رینگ فیتھ میں مسٹرا ے۔ ایل بوتھم نے ایک مقالہ لکھا ہے جس کا آغاز ایک دلچسپ جملے سے کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''ہر مذہب کی تعریف کی جاسکتی ہے لیکن ہندومت نہیں کی جاسکتی۔'' اس کتاب میں لکھا ہے کہ ''سمجھ نہیں آتی، پڑھے لکھے لوگ، جانور جیسے بیل، کچھوا وغیرہ اور درخت پیپل، تلسی وغیرہ کو کیسے مقدس سمجھ رہے ہیں۔''

مجھے اپنی بات روکنا پڑی، کمل چند کا بڑا بیٹا مکھن چند کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ محفل سے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں نے پوچھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' میرے لہجے کی مضبوطی اور براہ راست سوال کی چبھن نے لحہ بھر مکھن چند کو خاموش کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا۔

''مجھے ٹوائلٹ جانا ہے۔''

''بچوں ایسے بہانے مت بناؤ۔ تمہیں کچھ نہیں سننا تو جاسکتے ہو، مگر جھوٹ کا بہانہ بنا کر یہاں سے نکلو گے تو اچھا نہیں ہوگا۔'' میں نے آخری فقرہ دانستہ کہا تھا۔ میری ذات سے جو کچھ انہوں نے منسوب کر رکھا ہے، اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ کمل چند فوراً بولا۔

''بیٹا مکھن بیٹھ جاؤ، تھوڑی دیر کی بات ہے۔'' مکھن چند نے باپ کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

''ہندوؤں کے نزدیک تخلیق کائنات کا نظریہ بھی انتہائی مضحکہ خیز ہے۔''

کائنات کے ہر دن کے آغاز میں ہزاروں سروں والے شیش ناگ کی گود میں وشنو دیوتا سو جاتا ہے۔ شیش ناگ لا متناہی زمانہ کی علامت ہے اور یہ شیش ناگ قدیم سمندروں میں ایسے رہتا ہے جیسے جھولا جھول رہا ہے، جبکہ وشنو دیوتا کی ناف سے کنول کا ایک پھول اُگتا ہے۔ پھول کی تہ بہ تہ پتیاں برہما دیوتا کو جنم دیتی ہیں۔ برہما دیوتا ہی تخلیقِ دنیا کرتا ہے۔ جب برہما دیوتا دنیا تخلیق کر چکا ہوتا ہے تب شیش ناگ کی گود میں سویا ہوا وشنو دیوتا جاگتا ہے اور اس کائنات پر حکمرانی کرتا ہے۔ وشنو دیوتا کے کئی روپ ہیں، آج تک وشنو دیوتا نو مکمل مظاہر میں جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔

مچھلی، کچھوا، سؤر، شیر، پارا اور سو راما...... یہ ابتدائی چھ روپ ہیں، ساتواں اور آٹھواں اوتار وشنو دیوتا کے انتہائی اہم سمجھے جاتے ہیں۔ یہ راما اور کرشنا کے روپ میں اوتار ہوئے ہیں۔ رام کی کہانی پورے ہندوستان میں زد عام ہے، آگے کرشنا میں بھی اس کے کئی روپ ہیں، جیسے بھگوت گیتا کتاب کے ٹائٹل پر بنی تصویر۔ یہ موٹے تازہ خوب صورت آنکھوں والے شرارتی بچے کا روپ ہے، دوسرے روپ میں ایک بانکا سجیلا نوجوان نظر آتا ہے۔ اس نوجوان کے ساتھ رادھا کے عشق کی کہانی بھی بہت مشہور ہے۔ بھگوت گیتا میں ارجن کو جنگ کا درس دینے والا کرشنا کا بھی ایک روپ ہے۔

''وشنو کا نواں روپ انتہائی دلچسپ ہے۔ آج سے ڈیڑھ دو ماہ پہلے میں نے آپ لوگوں کو بدھا کی کہانی سنائی تھی...... یاد ہے......'' میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''جی یاد ہے۔ بدھ مت کی کہانی جسے ہم نے دیوار پر چلتے پھرتے بھی دیکھا تھا۔'' غیر متوقع طور پر نرملا نے فوراً جواب دیا۔ میرے چپ ہو جانے پر جو گمبھیر خاموشی چھائی تھی، اس سکوت میں نرملا کی آواز کسی بم کی طرح پھٹی تھی۔ ہر شخص نے اسے گردن موڑ کر دیکھا۔ میرے اندر خوشی کی لو پھوٹی...... امن کے علاوہ نرملا میرے لیے دوسرا امید کا دیا تھا۔ میں نے ستائشی انداز میں کہا۔

''شاباش نرملا۔ میں تمہارے لیے آنے والی زندگی میں خوشیاں دیکھ رہی ہوں، نرملا خاموش ہو گئی تھی، بڑوں کی تلخ نظریں کام کر گئیں۔ میں نے پھر سے کہنا شروع کیا۔

''بدھ مت بھی وشنو کا ایک روپ ہے۔ وشنو دیوتا کا آخری روپ ''کالکن'' ابھی باقی ہے۔''

ہندوؤں کا ایک اور بڑا دیوتا سیوا ہے۔ اس دیوتا کی شکل انتہائی خوفناک ہے۔ اس کے گلے میں انسانی کھوپڑیوں کا ہار لٹکا رہتا ہے۔ سیوا دیوتا کی بیوی دو ناموں سے مشہور ہے درگا اور پاروتی، یہ بھی اپنی جگہ بھگوان ہے۔ یہ دونوں ناموں سے الگ الگ اوصاف رکھتی ہے۔ جب خوفناک شکل میں ظاہر ہو تو اسے درگا یا کالی کہا جاتا ہے اور جب دلکش اور خوب

صورت روپ میں ظاہر ہو تو اسے پاروتی کہا جاتا ہے۔ جس طرح مجھے آپ لوگوں نے پاروتی کا ہی ایک اوتار سمجھ رکھا ہے اور مجھے مہک اس خوف سے نام دیا کہ مبادا آپ کے خاندان والے یا ذات برادری کے لوگوں کو میری کرامات کا پتا چل گیا تو بھونچال آجائے گا اور میں کئی لوگوں میں بٹ جاؤں گی، جبکہ مجھے پوشیدہ رکھ کر آپ لوگ ہی فائدہ اٹھا سکتے ہو......'' اس بار میں نے دیکھا کمل چند، قدم چند اور دوسرے مردوں میں اضطرابی بے حد بڑھ گئی تھی، اتنے بے چین جسم اور پریشان چہرے بتا رہے تھے کہ مزید کچھ سننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ میں نے امن کی آنکھوں میں بھی التجائیہ اشارے دیکھے تھے، مگر میری بات ابھی ادھوری تھی۔ میں نے ان کے جذبات اور خواہشات کی پروا کیے بغیر پھر سے بولنا شروع کر دیا۔ ''سیوا دیوتا کے تین بیٹے ہیں، سکندر، سوبرا اور گنیش۔ تینوں میں گنیش زیادہ مشہور ہے۔ گنیش کی بھی پوجا کی جاتی ہے، گنیش کا سر ہاتھی کا ہے۔ مہابھارت میں گنیش کا سر ہاتھی کا کیسے لگا، دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ شنکر بھگوان کی پتنی پاروتی نے اپنے بدن کے میل کچیل سے گنیش کو پیدا کیا۔ جب پاروتی غسل کرنے لگی تو اس نے باہر دروازے پر پہرہ دار کھڑا کیا کہ کسی کو اندر نہ آنے دینا۔ شنکر بھگوان آئے اور اندر جانا چاہا تو گنیش بولا۔ ''آپ اندر نہیں جاسکتے، اندر میری ماں نہا رہی ہے۔''

شنکر بھگوان حیرت سے بولا۔ ''تمہاری ماں...... تمہاری ماں کا نام کیا ہے۔''

''پاروتی......'' گنیش کے جواب پر شنکر بھگوان مزید حیرت سے بولا۔ ''ارے پاروتی میری بیوی ہے اور تو میرا بیٹا کہاں سے پیدا ہو گیا۔'' گنیش نے جواب دیا۔ ''مجھے آج ہی اپنے بدن کے میل کچیل سے پیدا کیا ہے۔'' شنکر بھگوان بولا۔ ''جانے دے مجھے، وہ میری بیوی ہے۔''

''نہیں جانے دوں گا۔'' گنیش نے اٹل لہجے میں کہا۔

اس بھگوان شنکر کو غصہ آ گیا۔ تلوار نکالی اور گنیش کی گردن اُڑا دی۔ اندر گیا تو پاروتی نے روتے ہوئے کہا۔ ''میرے پتر کو زندہ کرو۔ میں نے بڑی مشکلوں سے پیدا کیا ہے۔'' شنکر بھگوان بیوی کی آہ وزاری کے آگے بے بس ہو گیا اور گنیش کی گردن تلاشنے لگا، مگر گردن کہیں نہیں ملی، اس تلاش میں ہاتھی دیکھا تو اس کی گردن کاٹ کر گنیش کے جسم پر لگا دی۔ یہ قصہ مہابھارت میں لکھا ہے، مگر کتنا جھوٹا اور مضحکہ خیز ہے نا...... شنکر کیسا بھگوان ہے جسے اپنے بیٹے کا نہیں پتا کہ اسے میری بیوی نے پیدا کیا ہے، پھر جب یہی بھگوان گردن ڈھونڈنے لگا تو نہ ڈھونڈ پایا، عجیب بے بسی ہے بھگوان کی قسمت میں۔ انسانی گردن کا ہول چھوٹا اور ہاتھی کی گردن کا ہول بہت بڑا، کیسے فٹ آ گئے؟'' میرے سوالات پر گہری خاموشی تھی۔ ''اگر یہ بھگوان شنکر کی کرامت ہے تو یہ کرامت اصل گردن کیوں تلاش نہ کر سکی۔''

''آج کا ہندو گوشت نہیں کھاتا۔ ایک سے زیادہ شادی نہیں کرتا۔ کل کا ہندو یہ سب کرتا تھا۔ چار چار شادیاں کرتا تھا اور دیوتاؤں پر جانوروں کی قربانی دیتا تھا۔ اس قربانی سے گوشت کا بہترین حصہ برہمن اُڑاتا تھا اور گوشت مزے سے کھاتا تھا۔ بدھ مت نے آ کر جانوروں کی قربانی کو روکا، جبکہ اشوکا نے اپنی مملکت میں جانور کی قربانی پر باقاعدہ پابندی لگائی جو دھیرے دھیرے زور پکڑ کر باقاعدہ مذہب کا حصہ بن گئی۔

میرے پاس باتیں بہت ہیں، مگر آپ لوگوں میں مزید کچھ سننے کی سکت نہیں۔ اس لیے مختصراً چند مزید باتیں بتا کر آپ لوگوں کی جان چھوڑ دیتی ہوں۔'' میں نے دیکھا کہ ان میں سے کوئی بھی کچھ کہنے کے موڈ میں نہیں ہے تو اپنی بات جاری رکھی۔

''میں نے اتنا کچھ ہندو مذہب کے بارے میں بتا دیا ہے تو اب دل پکار رہا ہے کہ کچھ اسلام کے بارے میں بھی عرض کروں۔'' اب کی بار ان کے جسموں میں واضح اضطراب مچلتے دیکھا۔ اعلیٰ ظرفی یہی ہے کہ پانچ منٹ میری بات سنی جائے۔'' میں نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ الفاظ اور لہجے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ان کے جسم ڈھیلے پڑ گئے۔

☆......☆......☆

(اس حیرت انگیز اور اسرار بھرے ناقابلِ فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے)

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)...... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)...... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔

(3)...... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

□ رخسار۔ چونی

○ پیارے باباجی! خدا آپ کو خوش رکھے اور آپ کی عمر میں اضافہ کرے۔ میں نے آپ سے اپنی جلد شادی کے لیے براہِ راست وظیفہ مانگا جو ایک مہینے کا تھا۔ وظیفہ پڑھنے سے اب میرے سسرال والے شادی کے لیے کہتے ہیں۔ پہلے تو اس موضوع پر کوئی بات ہی نہیں کرتے تھے۔ میری نندیں تو کہہ رہی ہیں جون میں شادی کے لیے، مگر ساس، سسر نے میرے اماں، ابا کے خوف سے بات نہیں کی۔ میں چاہتی ہوں کہ اگست میں شادی ہوجائے، کیوں کہ میری بہن کی شادی بھی اسی مہینے میں عید کے بعد ہے۔ آپ کوئی چھوٹا سا وظیفہ بتادیں۔

☆ بیٹی رخسار! اللہ نے تم پر کرم کیا اور تم جو چاہتی تھیں، وہ ہوا۔ اللہ کا شکر کرو۔ پچھلے وظیفے کی زکوٰۃ ضرور نکال دینا۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۂ روم پڑھو اور حاجات بیان کرو۔ مدت 21 روز ہے۔

□ نواز عارف، کراچی

○ جناب باباجی! میں ”سچی کہانیاں“ دو سال سے پڑھ رہا ہوں۔ اس عرصے میں ”مسئلہ یہ ہے“ بھی میری نظروں سے گزرتا رہا۔ اگرچہ میرا کوئی مسئلہ نہیں تھا، مگر میں اس کا باقاعدہ مطالعہ کرتا رہا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بے شمار لوگوں کے مسائل حل ہوگئے ہیں۔ آپ ہر سوالی کو نماز ادا کرنے کی تاکید کرتے رہے اور کررہے ہیں، پھر مجھے خیال آیا کہ لوگوں کے مسائل اللہ کے کلام اور نماز کی برکت سے حل ہوتے ہیں، لہٰذا میں نے بھی نماز شروع کردی۔ بفضلِ خدا، اب میں پنج وقتہ نمازی ہوں۔ نماز کی برکت سے مجھے سکونِ قلب کے ساتھ ساتھ مالی فائدے بھی ہوئے۔ یہ خط لکھنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ آپ نے مجھے ہی نہیں بلکہ ہزاروں لوگوں کو نمازی بنادیا ہے جس کا اَجر آپ کو ضرور ملے گا۔ خدا آپ کو طویل عمر عطا فرمائے، تاکہ آپ اسی طرح لوگوں کو نمازی بناتے اور ان کے مسائل حل کرتے رہیں۔

☆ بیٹے نواز! میں تو خالقِ کائنات کا بہت ہی عاجز و ناچیز بندہ ہوں۔ مسائل حل کرنے والا تو وہی ربِ رحیم و کریم ہے۔ انسان نماز میں اسی کے حضور میں سجدہ ریز ہوتا ہے اور وہ اپنے سامنے سر جھکانے والے کی دُعا ضرور قبول فرماتا ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم پنج وقتہ نمازی بن گئے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو یہ فرض ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

□ فدا حسین، لاڑکانہ

○ جناب محترم باباجی! السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں نے براہِ راست آپ سے مالی مشکلات اور مقدمات کے سلسلے میں جو وظیفہ منگوایا تھا، وہ ابھی پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ مقدمے کا فیصلہ میرے حق میں ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی میری مشکلات بھی حل ہوگئیں۔ آپ نے اطلاع دینے کو کہا تھا اس لیے یہ اطلاع دے رہا ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اللہ پاک آپ کو اس کا اَجر دے گا۔

☆ بیٹے فدا! میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں تو عاجز و عاصی بندہ ہوں۔ کرم کرنے والی ذات پاک اللہ تعالیٰ کی ہے، اسی کا شکر ادا کرو جس کا سب سے بہتر طریقہ نماز کی ادائیگی ہے۔ حسبِ توفیق صدقہ اور خیرات بھی دینا۔

□ فرزانہ۔ حیدرآباد

○ جناب محترم باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری دور کی نگاہ کمزور ہے۔ میں نے ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ میں اکثر آپ کی جانب سے دیا گیا دور کی نگاہ کے بارے میں وظیفہ، علاج اور دُعا پڑھی ہے لیکن مجھ سے وہ مِس ہوگئی۔ باباجی! کوئی ایسی آیات یا وظیفہ پڑھنے کے لیے دے دیں کہ میری دور کی نگاہ صحیح ہوجائے اور مجھے صاف نظر آنے لگے۔ ویسے میری دور کی نگاہ کا نمبر 1.50 ہے۔ مجھے اپنے چہرے پر چشمہ اچھا نہیں لگتا۔ آپ دُکھی انسانیت کی خدمت کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عزوجل آپ کو اِس کا اَجر دے۔ (آمین!) میرا یہ مسئلہ حل کردیں۔ میں ساری زندگی آپ کو دُعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی فرزانہ! اپنی خوراک متوازن کرو۔ مچھلی، دودھ اور دہی، موسمی پھل اور کچی سبزیاں آنکھوں کے لیے بہت مفید ہیں۔ اس کے علاوہ روزانہ بعد نمازِ فجر ٹھنڈے پانی پر 7 بار یَا نُورُ پڑھ کر دَم کرو اور روئی کے پھاہے کی مدد سے وہ پانی آنکھوں پر لگاؤ۔ یہ عمل بلاناغہ

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

41 روز کرو۔ سونف بہ کثرت استعمال کرو۔

□ اُم کلثوم۔ جرمنی

o محترم بابا جی! میں اپنی بچیوں کے رشتے کے لیے بے حد پریشان تھی اور اسی لیے میں نے براہِ راست آپ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری دونوں بیٹیوں کے پاکستانی لڑکوں سے رشتے ہوگئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم لوگ جو یہاں آ کے بس گئے ہیں، بچیوں کے رشتے کے لیے کس قدر پریشان رہتے ہیں۔ خدا آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے تاکہ آپ اسی طرح ضرورت مند لوگوں کے مسائل حل کرتے رہیں۔ میں آپ کی بے حد مشکور رہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ میں جب بھی پاکستان آئی، حاضری دوں گی۔

☆ بیٹی اُم کلثوم! اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے۔ مشکل حل کرنے والی ذات اسی کی ہے جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس باری تعالیٰ کا شکر ادا کرتی رہو۔ اس کے نام پر صدقہ اور خیرات کرتی رہنا اور نماز کی پابندی کبھی نہ بھولنا۔ بیٹیوں کو بھی نماز کی تاکید کرنا۔ میرے ہاں آنے کی ضرورت نہیں کہ میں کسی سے نہیں ملتا۔

□ شاہجہاں بیگم۔ کراچی

o جناب بابا جی! آج کل میں بے حد پریشان ہوں۔ میرے تین بچے ہیں۔ میرا بیٹا پہلے پڑھنے میں بہت اچھا تھا لیکن اَب نہ جانے اُسے کیا ہوگیا ہے؟ میری پوری توجہ اپنے بچوں پر رہتی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بنانا چاہتی ہوں۔ ٹیچر کا کہنا ہے کہ یہ کلاس میں پڑھائی کے وقت توجہ نہیں دیتا، جبکہ میں نے اپنے بیٹے کے لیے 5 ہزار روپے کی ٹیوشن بھی لگائی ہوئی ہے۔ میرے مالی حالات بہت خراب ہیں۔ ٹیوشن کے پیسے میری بہن دیتی ہے۔ بابا جی! میرا بیٹا قرآن پاک بھی گھر پر حفظ کر رہا ہے۔ قاری صاحب گھر پر آتے ہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ میرے بیٹے کا ذہن کمزور ہے۔ پڑھائی کے لیے اس کے پاس بہت وقت ہوتا ہے۔ میری آپ سے التجا ہے کہ آپ میرے بیٹے کے لیے ایسا آزمودہ وظیفہ دیں کہ اس کا دل خوب پڑھائی میں لگے۔ میری آدھی زندگی بے حد پریشانیوں میں گزری ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے بچے اچھا پڑھ لکھ جائیں۔ خدارا، آپ میری مدد کریں۔

☆ بیٹی شاہجہاں! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب فرمائے۔ بیٹی! ہر نماز کے بعد الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر تصور میں بیٹے پر دَم کرو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور دیا کرو۔ بچے کو نہار منہ 6-4 بادام ضرور کھلاؤ۔ بیٹی! یہ بہت پرانی چیزیں ہیں، مگر بہت آزمودہ ہیں۔

□ شہزاد خان۔ کوہاٹ

o پیارے بابا جی! آپ کی خیریت اللہ سے مطلوب چاہتا ہوں۔ عرض یہ ہے کہ میری عمر 21 سال ہے اور سال بھر پہلے میری شادی ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اللہ نے ایک پیارا سا بیٹا بھی عطا کیا ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں بے روزگار ہوں۔ گھر میں ہم چار بھائی ہیں، اُن کی شادیاں بھی ہوچکی ہیں۔ میں سب سے چھوٹا ہوں۔ گھر میں صرف میں نے تعلیم پائی ہے، باقی بھائیوں نے تعلیم نہیں پائی، وہ اَن پڑھ ہیں، لیکن کاروبار میں اچھے چل رہے ہیں۔ ماشاء اللہ، میرے تینوں بھائی بہت اچھے اور خیال رکھنے والے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ابھی ہم موجود ہیں کہ تیرا اور تیری بیوی بچوں کا بوجھ اٹھا سکیں لیکن بابا جی! ساری عمر تو دوسروں کے سہارے نہیں گزاری جاسکتی۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی اچھی سی نوکری مل جائے یا پھر اچھا سا کاروبار شروع ہوجائے، تاکہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجاؤں۔ فی الحال تو میں ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر ہوں لیکن وہاں میری تنخواہ صرف چھ ہزار روپے ہے جو اس مہنگائی کے دور میں کچھ بھی نہیں۔ بابا جی! میں بہت پریشانی کی حالت میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ میری مدد ضرور کریں گے۔ کوئی وظیفہ یا وِرد بتائیں تاکہ میں کرسکوں۔ الحمدللہ، میں اللہ کے فضل و کرم سے پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور تلاوتِ قرآن پاک بھی کرتا ہوں۔ میں اللہ کی ذات سے مایوس بھی نہیں ہوں۔ بابا جی! برائے مہربانی میرے خط کا جواب اِسی شمارے میں دیجیے گا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی عطا فرمائے۔ (آمین)

☆ بیٹے شہزاد! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۂ رحمٰن پڑھو اور دُعا کرو۔ اللہ پر بھروسا رکھو، وہ بہتر کرنے والا ہے۔ بس اپنی جانب سے کوئی کمی مت چھوڑنا، خوب محنت کرو، ضرور صِلہ ملے گا، ان شاء اللہ۔

□ سنیعہ شاہ۔ میلسی

o پیارے بابا جی! آداب! آپ نے میرے پہلے خطوط کا بھی جواب نہیں دیا۔ میں ایک لڑکے کو بہت چاہتی ہوں، اس کے علاوہ میں کسی اور لڑکے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ اس کے گھر والے رشتہ لے کر آئیں اور میری شادی بھی اسی لڑکے سے ہو۔

☆ بیٹی سنیعہ! ان خطوط کے جواب ممکن نہیں ہوتے، جن میں نام اور شہر تحریر نہیں ہوتے۔ نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ عشاء کے بعد سورۃ الصافات آیات 9,10,11۔ 101 مرتبہ پڑھ کر حاجت بیان کرو۔ یہ وظیفہ مکمل ہونے کے بعد کچھ رقم ضرور خیرات کردینا۔ خیال رہے، 41 دن تک کوئی نماز قضا نہ ہو ورنہ حاجت قبول نہ ہوگی۔

□ حمیدہ ناز۔ ہری پور

o محترم بابا جی! السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ ہم اکثر و بیشتر آپ کا کالم پڑھتے ہیں۔ ہمیں یہ کالم بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ جس طرح مسلمانوں کو اللہ کے قریب کرتے ہیں، اللہ آپ کو اِس کا اَجر دے گا۔ بابا جی! میں اپنی بہن کے مسئلے کے لیے رابطہ کررہی ہوں۔ براہِ کرم جواب ضرور دیجیے گا۔ میری بہن کی شادی کو تقریباً 9 یا 10 سال ہوگئے ہیں۔ اُن کا شوہر باہر ملک میں کام کرتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ میری بہن کو وہیں بلانا چاہتا ہے اور کاغذات بھی بن گئے ہیں، مگر روانگی کی تاریخ سے پہلے ہی کاغذات میں کوئی رکاوٹ آجاتی ہے اور کینسل ہوجاتے ہیں۔ براہِ کرم اِس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔

☆ بیٹی حمیدہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ بہن سے کہو، نمازِ فجر اور عشاء کے بعد ایک ایک بار سورۂ مزمل پڑھے اور دُعا کرے۔ بروز جمعہ بعد نمازِ عصر سفید مٹھائی پر حضور اکرم ﷺ کے نام کی فاتحہ دے کر بچوں میں تقسیم کردے۔ یہ عمل نہایت پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرے، پھر مجھے مطلع کرے۔

□ زہرا۔ راولپنڈی

o محترم بابا جی! میں اپنا ایک مسئلہ لکھ رہی ہوں اس اُمید پر کہ بہت جلد جواب دیں گے۔ میرے گھر کے مالی حالات اتنے خراب ہیں کہ بتا نہیں سکتی۔ میں نے ایک جگہ انٹرویو دیا ہوا ہے، پانچ ماہ ہوگئے ہیں، کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس کے لیے ضرور کوئی وظیفہ بتائیں کہ کام ہوجائے۔

☆ بیٹی زہرا! رزق میں برکت کے لیے ہر نماز کے بعد 3-3 تسبیح یَا مَالِكُ کی پڑھ کر اپنے اوپر دَم کرو اور حاجت بیان کرو۔

□ شاہ بانو۔ کھاریاں

o محترم بابا جی! آپ ''سچی کہانیاں'' میں لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں۔ آپ جیسے نیک اور خدا ترس لوگوں سے دنیا آباد ہے۔ میری نند کا ایک مسئلہ ہے۔ اس کی شادی جون 2010ء میں ہوئی تھی۔ خاوند اس کا امریکہ گیا ہوا ہے۔ ساس نے بیٹے کے جاتے ہی تنگ کرنا شروع کردیا۔ ہر وقت لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ اس کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ جانے سے پہلے اس کے خاوند نے کہا تھا کہ وہاں بلوا لوں گا تو میری نند نہیں مانی کہ ساس اکیلی رہ جائے گی، لیکن حالات اب اتنے خراب ہیں کہ میری نند چاہتی ہے کہ خاوند جلدی سے بلوالے تاکہ زندگی میں کچھ سکون اور ٹھہراؤ پیدا ہو۔ خدا کے لیے، آپ کوئی جلدی اثر کرنے والا وظیفہ بھیج دیں۔

☆ بیٹی شاہ بانو! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 21-21 بار سورۂ فاتحہ پڑھ کر حاجت بیان کرو۔ وظیفہ نہایت پابندی کے ساتھ ڈیڑھ ماہ تک کرو۔ اللہ کرم کرے گا۔

□ رابعہ نور۔ کراچی

o محترم بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھ میں خود

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

اعتمادی نہیں ہے۔ میرے پاس ہر چیز اور ہر نعمت ہے۔ میں شکل، ذہانت، پڑھائی ہر چیز میں ٹھیک ہوں، پھر بھی مجھ میں اعتماد کی بچپن سے کمی ہے۔ کوئی ذرا سی سخت بات کردے تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی رونے لگتی ہوں۔ کلاس کے دوران پروفیسر کو درست جواب بھی جھجک کر دیتی ہوں کہ کہیں غلط نہ ہوجائے۔ جب تک کسی سے فرینک نہ ہوجاؤں، اس وقت تک اعتماد سے بات نہیں کرسکتی اور اگر منہ سے کوئی غلط بات نکل جائے تو بہت دن تک شرمندہ ہوتی رہتی ہوں کہ میرے ساتھ اس طرح کیوں ہوا؟ قوت فیصلہ کی کمی بھی ہے۔ اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے بھی کھل کر مطالبہ نہیں کرسکتی۔ آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میرا اعتماد بحال ہوجائے۔

☆ بیٹی رابعہ! اللہ تعالیٰ تمھیں کامیابی عطا فرمائے۔ نمازِ فجر کے بعد 41 بار سورۂ فاتحہ پڑھ کر اپنے اوپر دَم کرو۔ لوگوں سے کھل مل کر بات کیا کرو۔ یہ یقین کرلو کہ تم ایک مکمل لڑکی ہو اور بیٹی......! جب تک غلطیاں نہیں ہوں گی، اصلاح کیسے ہوگی؟ زندگی میں آگے کیسے بڑھو گی؟ وظیفہ ایک ماہ تک کرو۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے اور صرف ایک بات کا خیال رکھنا کہ کسی کو تمہاری ذات سے دُکھ نہ پہنچے۔ ہلکی پھلکی ورزش کیا کرو۔

□ ارمان بیگ۔ لالہ موسیٰ

○ بابا! آداب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری دو بیٹیاں ہیں، دونوں کی عمریں بالترتیب 23 اور 24 سال ہیں۔ اُن کی شادی کے لیے پریشان ہوں۔ رشتے تو آتے ہیں لیکن کوئی بات نہیں بنتی ہے۔ کوئی وظیفہ بتائیں جسے میں خود پڑھ سکوں۔

☆ بیٹی ارمان! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ میں نصیحت کروں گا کہ دونوں بچیوں کے لیے مجھ سے تعویذ منگوالو۔ تفصیل جوابی خط میں تحریر کی جائے گی۔

□ شاہدہ مغل۔ بہاولپور

○ محترم بابا جی! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کردیے، ان میں میرا بھی مسئلہ کریں۔ میں بہت پریشان ہوں، پریشانی کی وجہ میری نوکری ہے۔ میرے والد صاحب کو فوت ہوئے چار سال ہوگئے ہیں۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ ہم دو بہنیں بڑی ہیں۔ بھائی چھوٹے ہیں جو کہ میٹرک میں پڑھتے ہیں۔ میں نے ایف اے کرلیا تو مجھے اسکول ٹیچر کی نوکری مل گئی۔ اس سے ہمارے مالی حالات میں کچھ بہتری ہوئی۔ اس تنخواہ سے میں اپنے بھائیوں کی اسکول کی فیس اور گھر کا تھوڑا بہت خرچ چل جاتا تھا لیکن اب میری نوکری ختم ہوگئی ہے جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ میں نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی ہے۔ آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتادیں جس سے مجھے نوکری پر بحال کردیا جائے۔ میں آپ کی مشکور رہوں گی اور ساری عمر آپ کو دعائیں دیتی رہوں گی۔ میں پانچ وقت پابندی سے نماز بھی پڑھتی ہوں۔ میرا دوسرا مسئلہ ہمارے گھریلو حالات ہیں، ابو کی وفات کے بعد ہمارا کوئی کمانے والا بھی نہیں ہے۔ سارے رشتے دار بھی منہ موڑ گئے ہیں۔ ہماری ماں ہماری طرف سے بہت پریشان ہیں۔ آپ ہمیں کوئی ایسا وظیفہ بتادیں جس سے ہمارے مالی حالات اچھے ہوجائیں۔

☆ بیٹی شاہدہ! خوش رہو۔ اپنے حق کے لیے لڑنا بہادری ہے۔ تم اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ وہ سچائی کے راستے پر چلنے والوں کی ضرور مدد کرتا ہے۔ نمازِ فجر اور نمازِ عشاء کے بعد سورۃ القصص آیت 24۔ 7-7 تسبیح پڑھ کر حاجات بیان کرو۔ بیٹی! ترجمہ بھی پڑھا کرو۔ انشاء اللہ کرم ہوگا۔ مدت 41 دن ہے۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔ نذیر احمد، ہزارہ کے لیے بھی یہی مشورہ ہے۔

□ درِ شہوار۔ کوٹری

○ محترم بابا جی! سلام کے بعد عرض یہ ہے کہ یہ میرا آپ کو دوسرا خط ہے۔ امید ہے کہ آپ میرے پہلے خط کی طرح اِس کا جواب بھی ضرور دیں گے اور میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا بھی ضرور کریں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کی مشکلوں کو آسان کرے اور آپ جیسے بزرگوں کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ (آمین) میرے دو مسئلے ہیں۔ پہلا مسئلہ میرے بھائی کا ہے۔ میرے بھائی نے فوج میں درخواست بھی دی تھی جو منظور ہوگئی۔ اُس کا ٹیسٹ

وغیرہ بھی ہوا ہے جس کا جواب جلد آجائے گا۔ آپ اُسکے لیے دُعا کریں کہ وہ فوج میں بھرتی ہوجائے اور اُسے ٹریننگ میں کوئی مشکل پیش نہ آئے، کیوں کہ وہ جسامت کے لحاظ سے بہت کمزور ہے اور تھوڑا بہت کام کرتا ہے تو اُس کا سانس پھول جاتا ہے۔ آپ اُس کے لیے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ وہ فوج میں بھرتی ہوجائے۔ وظیفہ ایسا ہونا چاہیے جو ہم آرام سے کرسکیں۔ اگر فوج میں نہیں تو کہیں اچھی سی جگہ نوکری مل جائے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ دوسرا مسئلہ میرے کزن کا ہے جو میرا منگیتر بھی ہے۔ اُس کے بارے میں، میں نے آپ کو پہلا خط لکھا تھا جس کا مجھے جواب بھی ملا ہے۔ میں نے اپنے پہلے خط میں لکھا تھا کہ اُسے کہیں نوکری ہی نہیں ملتی اور اگر کہیں مل بھی جائے تو تنخواہ بہت کم ملتی ہے جس سے گھر کا خرچ بہت مشکل سے چلتا ہے۔ آپ نے ایک وظیفہ بتایا تھا جو آپ نے لکھا تھا کہ وہ خود کرے۔ وہ وظیفہ (41) دن کا تھا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کہ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جو میں خود کرسکوں۔ بابا جی! وہ آج کل کام کی تلاش میں ہے۔ جہاں بھی اُسے کام کا پتا چلتا ہے، وہ وہاں پر جاتا ہے مگر جواب میں انکار ملتا ہے۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے اُسے چھوٹا موٹا کام مل جائے اور اگر سرکاری نہیں تو کوئی اچھا سا کام مل جائے جس کی تنخواہ اُس کی ضرورت کے مطابق ہو۔ وظیفہ میرے لیے ہی ہونا چاہیے، وہ خود نہیں کرسکتا۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ اس خط کا جواب اپریل کے شمارے میں ضرور دیں، آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی درِ شہوار! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ جو وظیفہ بیٹے کو دیا تھا، وہ تم کرو اور بھائی کہو یَا فَتَّاحُ کا بہت وِرد کرے۔ مدت 41 دن ہے۔

□ رابعہ شاہین۔ سکھر

○ بزرگ بابا جی! میں نے اپنی ملازمت کے سلسلے میں آپ سے براہ راست وظیفے کی درخواست کی تھی۔ آپ کا دیا ہوا وظیفہ مکمل ہونے کے بعد بھی مجھے کامیابی نہ ہوئی تو میں مایوس ہوگئی تھی مگر دو روز پہلے مجھے مطلوبہ ملازمت مل گئی ہے جس کے لیے میں آپ کی بہت مشکور ہوں۔ جس طرح آپ ہم ضرورت مندوں کے کام آرہے ہیں، اس کا اجر اللہ پاک آپ کو ضرور دے گا۔ ہم تو صرف دُعا دے سکتے ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور لمبی عمر دے۔

☆ بیٹی رابعہ! اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ صدقِ دل سے دُعا کی جائے تو وہ ضرور سنتا ہے۔ میں تو اس کا ناچیز اور گناہ گار بندہ ہوں اس لیے میرا شکرادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی آقا کا شکر ادا کرو جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ نماز پابندی سے پڑھتی رہنا۔

□ افسری بیگم۔ چھمب جوڑیاں

○ محترم بابا جی! پچھلے ماہ بازار میں ''سچی کہانیاں'' ملا تو میں گھر لے آئی۔ جیسے ہی آپ کا کالم دیکھا، دل کو امید سی ہوگئی کہ میرا مسئلہ حل ہوجائے گا اور اَب ہمت کر کے میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ براہِ کرم آپ میرے مسائل حل کردیں۔ اللہ آپ کو اِس نیکی کا اجر دے گا۔ (آمین) میں ضلع سیالکوٹ کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئی۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ میں سب سے بڑی طلعت ہوں۔ جب تک ہم اپنے تایا کی فیملی کے ساتھ رہے، بہت خوش حال تھے، لیکن علیحدگی کے بعد تو جیسے مصیبتوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا۔ میرے ابو جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتے ہیں، ہمیں نقصان ہی ہوتا ہے۔ دو دفعہ باہر جانے کی کوشش کی لیکن نہ صرف ناکام لوٹے بلکہ اُن پر بہت سا قرض بھی چڑھ گیا۔ مزید یہ کہ میرے تین بہن بھائیوں کی نظر بھی کمزور ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ پیدائشی نقص ہے۔ میرا بھائی ماشاء اللہ، جوان ہے لیکن نظر کی وجہ سے ناکارہ ہے۔ اَب سے ڈیڑھ سال پہلے میرے ابو نے بینک سے قرض لے کے ٹریکٹر لیا تھا لیکن پھر بیچ کر ڈبل شاہ کو پیسے دے دیے اور وہ بھاگ گیا۔ اِس طرح ہم پھر ایک بار خالی ہاتھ ہوگئے۔ مہربانی کر کے کوئی ایسا عمل بتائیں کہ ہمیں ہمارے پیسے بھی مل جائیں اور ہمارے گھر میں خوش

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

حالی ہو۔ ایک بات اور بابا جی! وہ یہ کہ ابو تو نماز پڑھتے ہیں لیکن اُن کے سختی کرنے کے باوجود بھی گھر میں کوئی اور نماز نہیں پڑھتا، حالاں کہ میرے ابو کی خواہش ہے کہ تمام گھر والے نماز پڑھیں۔ گھر کا ماحول عجیب سا ہے، کوئی ایک دوسرے کی عزت نہیں کرتا ہے۔ پلیز بابا جی! ہمارے لیے کچھ کریں۔ اللہ آپ کو خوشیاں عطا کرے (آمین)

☆ بیٹی اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور بعد نمازِ فجر اور عشاء کے 7-7 تسبیح سورۃ الواقعہ آیت 7 پڑھو اول و آخر دُرود 7-7 بار، پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ خیال رہے، نماز قضا نہ ہو۔

□ عمار حسین۔ امریکہ

○ بابا جی! میں بہت دور سے آپ سے مخاطب ہوں۔ میری اُردو بہت کمزور ہے اس لیے اگر غلطی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔ میں 3 سال سے یہاں امریکہ میں ہوں۔ پہلے پڑھائی کے ساتھ جاب بھی کر رہا تھا مگر اب پڑھائی چھوڑ دی ہے۔ کچھ عرصہ قبل میری دوستی ایک انگریز لڑکی سے ہو گئی تھی۔ وہ بہت اچھی ہے اور اچھی فیملی سے ہے۔ میں اور وہ شادی کرنا چاہتے ہیں مگر میرے گھر والے تیار نہیں، حالاں کہ وہ اسلام بھی قبول کرنے کو تیار ہے۔ والد اور بھائی تو شاید مان بھی جائیں مگر امی بہت سخت ہیں۔ میں چاہتا ہوں، بڑوں کی مرضی سے یہ شادی ہو۔ مجھے تعویذ بنا دیں، تاکہ میری امی کا دل نرم ہو جائے اور وہ مجھے خوشی خوشی اجازت دے دیں۔

☆ بیٹے عمار! یقیناً مذہب تمہیں اپنی پسند کی جائز زندگی گزارنے کی اجازت دیتا ہے مگر بیٹے......! یہ بھی یاد رکھو کہ والدین کا اولاد پر بہت حق ہے۔ ماں باپ کا تجربہ اولاد کو بہت سارے مسائل سے بچا لیتا ہے اگر اولاد فرماں بردار ہو تو۔ تم اپنی والدہ سے خود بات کرو اور پوچھو کہ وہ کیوں اس رشتے پر تیار نہیں؟ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ لڑکی اسلام قبول کر لے گی تو یہ بات درست نہیں۔ تمہاری وجہ سے وہ مذہب بدل سکتی ہے تو کل کسی اور وجہ سے اسلام کے دائرے سے باہر بھی نکل سکتی ہے۔ ہاں، اگر وہ دینِ اسلام کو سمجھے اور اچھی طرح سمجھنے کے بعد اس فیصلے پر پہنچے کہ یہی سچا اور اللہ کے آخری نبی ﷺ اور محبوب کا پھیلایا ہوا دین ہے تو درست ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ پڑھے اور سمجھے اور پھر اپنا رہن سہن اور چال ڈھال سب اسلامی شریعت کے مطابق کر لے، پھر یقیناً تمہاری والدہ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میری نصیحت ہے کہ اگر دنیا میں عزت چاہتے ہو تو ماں باپ کے فرماں بردار رہنا۔ نماز پابندی سے ادا کیا کرو اور بکثرت یَاقُدُّوسُ کا وِرد کرو۔

□ فضا نور۔ اٹک

○ محترم بابا جی! امید ہے، آپ خیریت سے ہوں گے۔ آٹھ سال ہو گئے ہیں میرے شوہر کو فوت ہوئے، اُس وقت سے میں ماہنامہ "سچی کہانیاں" پڑھ رہی ہوں۔ ایک دو دفعہ میں نے خط لکھا تھا، مگر جواب نہ ملنے کی وجہ سے ناامید ہو گئی تھی۔ میں بہت زیادہ پریشان عورت ہوں۔ زندگی کا پتا نہیں چلا، کب جوانی آئی اور کب ختم ہو گئی؟ شادی ہوئی، انیس سال سخت تکلیفیں دیکھیں۔ خاوند بھی ہمدرد نہیں تھا۔ تین بچے تھے، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ جب الگ ہوئے تو خاوند فوت ہو گیا۔ کافی جائیداد تھی مگر بچے بہت نافرمان تھے، خاص کر بیٹا۔ میرے دیور نے زمین بیچ کر سارہ پیسا لے لیا۔ پچھلے سال میرا بیٹا اغوا ہو گیا تھا۔ اس کے ہم نے 25-20 لاکھ روپے قرض لے کر دیے ہیں۔ سال ہو گیا ہے، اب ہم نے وہ پیسے واپس دینے ہیں۔ ہماری فیکٹری ہے، وہ اچھی قیمت پر نہیں بک رہی۔ قرض کی ادائیگی کے لیے کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ قرض ختم ہو جائے۔ میرا بیٹا آٹھ سال تک فیکٹری چلاتا رہا، مگر ایک پیسے کا بھی حساب نہیں دیتا تھا۔ اگر کبھی حساب مانگتی تو مجھ سے مہینوں بات نہیں کرتا اور بہنوں سے بہت زیادہ نفرت کرتا ہے۔ نہ آتے سلام کرتا ہے اور نہ جاتے۔ اس نے مجھے بہت زیادہ تھکا دیا ہے۔ آٹھ سال میں جس نے جو بتایا، پڑھتی رہی مگر کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ جب حساب کروایا تو کہتے ہیں، اس کا ستارہ بہت سخت ہے۔ بڑی بیٹی کی شادی

کر دی ہے۔ اَب بیٹے کی منگنی کی ہے۔ اگر یہ ایسا کرتا ہے اور کل بیوی آئے گی تو وہ بھی ایسی ہوگی۔ بہت پریشان ہوں۔ آٹھ سال بہت دوڑی ہوں مگر کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا۔ سخت تکلیفیں دیکھی ہیں اپنوں سے اور اولاد سے۔ گھر آتا ہے نہ ہمارے ساتھ کھانا کھاتا ہے نہ بات کرتا ہے، بس ہر وقت غصے میں رہتا ہے۔ اس نے کبھی بھی عزت نہیں کی۔ سال ہو گیا ہے، اس نے ابھی تک کوئی کام نہیں شروع کیا۔ تیار سب کچھ ملتا ہے پھر بھی خوش نہیں ہے۔ بس اَب میرے دل سے بالکل دُعا نہیں نکلتی۔ خاندان میں سب کو دیکھتی ہوں، سب اپنی ماؤں کی اتنی عزت کرتے ہیں۔ سب سمجھا کر بھی تھک گئے ہیں مگر کچھ فائدہ نہیں۔ اِن آٹھ سالوں میں ایک پیسا بھی نہیں کما کر دیا۔ دو دفعہ میں نے خود لاکھوں روپیا دیا مگر نقصان ہو جاتا تھا مگر پھر بھی اس نے کوئی سبق نہیں لیا۔ اَب تو میرے پاس بھی کچھ نہیں۔ ابھی ان دو بہن بھائیوں کی شادی کرنی ہے۔ اب میرے دل سے بالکل اُس کے لیے دُعا نہیں نکلتی۔ جس دن اغواء ہوا، گھر سے نکل رہا تھا۔ بات تو خود نہیں کرتا۔ سلام بھی نہیں کیا مگر کیوں، میرے دل سے آہ نکل گئی تھی۔ اُس نے مجھے بہت دُکھی کیا ہوا ہے۔ بابا جی! بہت امید سے خط لکھ رہی ہوں۔ کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ بیٹا میرا اور بہنوں کا فرماں بردار ہو جائے۔ بہنوں کو تو پوچھتا بھی نہیں۔ ہمارا اللہ کے بعد اس کا آسرا ہے اور قرض بھی اُتر جائے۔ اس دوران چچا نے پوچھا بھی نہیں۔ یہ بہت خودسر ہو گیا۔ ہمارے ساتھ تو بات بھی نہیں کرتا۔ آپ مہربانی کر کے استخارہ کریں کہ یہ ٹھیک ہو جائے گا کیا ساری زندگی میری ایسے ہی گزرے گی؟ چچا آتا ہے، زمین بیچ کر پیسا لے جاتا ہے۔ میں نے تو سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ بس میرا بیٹا ٹھیک ہو جائے۔ اگر اس کو کچھ ہو گیا تو دکھ میرا ہے۔ بہت پڑھتی ہوں مگر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ پانچ وقت نماز، قرآن پاک، اپنے گھر میں مدرسہ کھولا ہوا ہے۔ شکر ہے، اللہ نے اپنی طرف لگایا ہوا ہے۔ قرآنِ پاک تفسیر کے ساتھ پڑھ رہی ہوں۔ کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ میرا بیٹا بہنوں کا ہمدرد اور محبت کرنے والا بن جائے۔ میں اپنے اللہ سے بہت راضی ہوں۔ جتنا شکر کرو، کم ہے۔ پتا نہیں کس وجہ سے اُس پر کچھ اثر نہیں ہوتا؟ اگر آپ تعویذ دیں کہ گھر کا ماحول ٹھیک ہو جائے۔ گھر میں آپس میں کوئی بھی بات نہیں کرتا۔ اتنا بڑا گھر ہے مگر بہت خموشی رہتی ہے۔ کبھی گلے لگاتی ہوں بیٹے کو، کبھی پیار کرتی ہوں مگر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ جائیداد کے لیے بھی کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ صحیح فیصلہ ہو۔ ہر ایک کو اپنا ٹھیک حصہ مل جائے کیوں کہ قیامت کے دن نہ بیٹے نے بخشوانا ہے اور نہ بیٹی نے اور میرے حصے میں جو آئے تو دُعا کریں کہ ایک حصہ میرا، باقی اللہ کے نام کے۔ بس یہ دُعا کریں، اللہ مجھے بیٹے کا محتاج نہ کرے۔ کوئی ایسا سخت مؤثر وظیفہ دیں کہ میرے بچے میرے تابع دار ہو جائیں۔

☆ بیٹی فضا! تمہارا دُکھ میں سمجھ سکتا ہوں۔ اَب اولاد کو مت آزماؤ۔ جو شخص خود اغوا ہو جائے اور پھر ماں سے پیسا نکال لے، تم ایسی اولاد سے کوئی امید مت رکھو۔ سارا پیسا اور جائیداد اپنے نام رکھو اور اپنے بعد شرعی تقسیم کر دو۔ شادی کے سلسلے میں بھی وہ خود جب کما کر لائے، تب کرو۔ چلتے پھرتے "یَا رَحْمٰنُ" کا بہت وِرد کیا کرو اور بچوں سے صرف ضرورت کے تحت بات کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ زرک خان۔ پشاور

○ بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اب سول انجینئر میں سیکنڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہوں، میں نے فرسٹ ایئر کا امتحان دیا تھا اور میرا ایک پیپر کمپارٹ ہو گیا۔ میں نے بہت محنت کی تھی۔ میرے دوسرے بھائیوں میں سے کسی ایک نے بھی نہیں پڑھا ہے اور صرف مجھے تعلیم کے لیے وقف کیا ہے۔ انہوں نے مجھ پر بہت اعتبار کیا ہے کہ ہمارا بھائی پڑھ لکھ کر انجینئر بنے۔ اس بار جب میرا پیپر کمپارٹ ہو گیا تو سب بھائیوں نے مجھے اتنا ڈانٹا کہ میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ اب مجھے پھر ڈر لگ رہا ہے کہ میرا پیپر پھر رہ نہ جائے۔ مجھے کوئی ایسا حل بتائیے کہ میں کامیابی حاصل کروں۔ انجینئر تک مکمل کرتے ہی مجھے کوئی اچھی جاب مل جائے۔

www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆بیٹے زرک! اللہ تمہیں کامیابی دے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر کے بعد 700 بار پڑھو رَبِّ زِدنِی عِلماً پھر دُعا کرو۔ خوب محنت کرو۔ انشاء اللہ ضرور کامیابی ملے گی۔ وِرد نتیجہ آنے تک جاری رکھنا ہوگا۔

□ روبا شمیم۔ لاہور

○ بابا جی! اللہ آپ کو صحت دے۔ میں بہت پریشان ہوں، میرا مسئلہ ہے ہی بہت سنگین۔ میری شادی کو سات سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر میں نے ایک دن بھی سکون کا نہیں دیکھا۔ شوہر بہت پیسے والے ہیں مگر بے انتہا تنگی اور ہاتھ چھوڑ ہیں، مجھے بے تحاشا مارتے ہیں۔ بچے اب بڑے ہو رہے ہیں۔ ایک بیٹی ہے جو پانچ سال کی ہے اور بیٹا ڈھائی سال کا ہے۔ دونوں باپ کے قدموں کی آواز سن کر سہم جاتے ہیں۔ ان سات سالوں میں، میں جتنا اپنے آپ کو بدل سکتی تھی، بدل لیا مگر اب مار نہیں سہی جاتی۔ جسم میں جان ہی نہیں ہے۔ اُن کے لیے منہ پر تھپڑ مارنا تو کوئی بات ہی نہیں، ایسے کوئی جانوروں کو بھی نہیں رکھتا میں جیسے دن گزار رہی ہوں۔ خدا کے لیے بابا جی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ میری اس شخص سے جان چھوٹ جائے۔

☆بیٹی روبا! تمہارا تفصیلی خط پڑھا، بہت دُکھ ہوا اگر بیٹی! ایک بات جو نا قابلِ برداشت ہے کہ وہ شخص تمہیں مارتا ہے اور تم برداشت کرتی ہو۔ مرد کا اگر ایک دفعہ ہاتھ اُٹھ گیا تو پھر وہ نہیں رُکتا۔ تم سات سالوں سے یہ سب برداشت کر رہی ہو، غلط ہے۔ میں کسی بچی کو ایسے شخص کے ساتھ رہنے کا مشورہ نہیں دوں گا، کیوں کہ ذہنی بیمار کے ساتھ رہنا نقصان دہ ہوتا ہے۔ تمہیں ہمت کرنی ہوگی، اپنے بڑوں کو درمیان میں ڈالو۔ بچوں کی فکر مت کرو، وہ تمہارے ہی ہیں اور تمہارے ساتھ ہی رہیں گے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد یَا رَحِیمُ کا بہت وِرد کرو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ عذرا۔ حیدر آباد

☆بیٹی عذرا! تمہاری خواہش پر مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم پر کرم کیا۔ یاد رکھو جو لوگ سچے دل سے اللہ سے مدد مانگتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشا کے بعد 7-7 تسبیح پڑھو۔ ''نصر من اللہ و فتح قریب'' اول و آخر درود شریف پھر دعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے، انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ حیا۔ KPK

☆بیٹی حیا! اللہ تمہیں بے شمار کامیابیاں عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ زندگی میں اگر کامیابی چاہتی ہو تو الحمد شریف کو بکثرت پڑھا کرو۔ اس کا ترجمہ بھی پڑھو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ اللہ جب تمہیں کامیاب کر دے تب اس کی راہ میں خوب صدقہ خیرات کیا کرنا کبھی کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں ہوگا۔

□ علینہ پروین۔ صادق آباد

○ محترم بابا جی! آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ جب کوئی بات کرنے والا نہ ملا تو آپ سے مشورہ کرنے کا ارادہ کیا۔ امید کہ آپ مایوس نہیں کریں گے۔ میرے خط سے آپ میری ذہنی اذیت کا اندازہ لگا سکیں گے۔ اپنے مسئلے کے حل کے لیے میں نے خدا سے بہت دُعائیں مانگی ہیں۔ ابھی تک کوئی دُعا قبول نہ ہوئی۔ وظیفے پڑھے لیکن قبولیت کی منزل تک نہ پہنچ سکے۔ حالات اتنے خراب ہو گئے کہ لکھنے بیٹھوں تو خط بہت لمبا ہو جائے گا۔ اپنے رشتے داروں نے میرے کردار پر گند اچھالنا شروع کر دیا۔ پہلے تو چپ رہی لیکن اب برداشت سے باہر ہو رہا ہے۔ خدا گواہ ہے کہ یہ سارے الزامات جھوٹے اور بے بنیاد ہیں۔ خدا کو یاد کرتی ہوں، اس کو دل کے قریب محسوس کرنا چاہتی ہوں لیکن نہ جانے کیوں سکون نہیں ملتا۔ یَا حَیُّ یَا قَیُّوم بہ کثرت پڑھتی ہوں لیکن پریشانی کم ہو جانے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ چار سال منگنی کو ہو گئے ہیں لیکن شادی ایک تماشہ بن کر رہ گئی ہے۔ زندگی بے مقصد ہو کر رہ گئی ہے۔ نوکری کے لیے بہت دُعا کی لیکن وہ بھی نہ ملی۔ میں زندگی کی 29 بہاریں دیکھ رہی ہوں۔ سب دوست چلے گئے، اب میں اور میری تنہائی اور اذیت

ناک باتیں رہ گئی ہیں۔ بابا جی! مجھے جلد ایک ایسا وظیفہ عنایت کریں کہ میں اپنے رب کے قریب ترین ہو جاؤں۔ وہ مجھ پر اپنی خاص عنایت کر دے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ اگر آپ اس مشکل گھڑی میں میرے لیے وسیلہ بن جائیں گے۔ ساری عمر آپ کے لیے دعا گو رہوں گی۔

☆بیٹی! تمہارا خط پڑھ کر بہت دُکھ ہوا۔ اگر چاہتی ہو کہ تمہیں دُکھ دینے والے عبرت کا نمونہ بنیں تو معاملات اللہ کے سپرد کر دو۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 3 تسبیح یَا حُجَّۃُ القائمُ کی پڑھو اول و آخر دُرود شریف 3-3 بار پھر دُعا کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ وظیفے کی مدت ایک ماہ ہے۔

□ حلیمہ خاتون۔ کالا ڈھاکہ

○ بابا جی! ہم اپنی بہنوں کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ ہم سات بہنوں میں سے صرف میری شادی ہوئی ہے۔ مجھ سے بڑی بہنیں بھی بیٹھی ہیں اور چھوٹی بھی۔ بابا جی! ہمارے والدین بہت پریشان ہیں کیوں کہ ہم پٹھانوں میں بہت کم عمری میں شادی ہوتی ہے لہٰذا ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ ملنے جلنے والے بھی ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ آپ اپنی بیٹیوں کی شادی کیوں نہیں کرتے؟ بابا جی! اب کوئی خوشی سے تو بیٹیوں کو نہیں بٹھاتا؟ ہم نے اکثر آپ کے کالم میں پڑھا ہے کہ شاپ شادی کے لیے تعویذ دیتے ہیں۔ ہمیں بھی تعویذ بنا دیں تاکہ یہ مسئلہ حل ہو۔ ہمارے والدین بوڑھے ہیں، وہ اپنی زندگی میں سب بہنوں کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ تعویذ منگوانے کا طریقہ بتا دیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ خط میں کوئی بات بری لگی ہو تو معاف کر دیں۔

☆بیٹی حلیمہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ بہنوں سے کہو، نماز کی پابندی رکھیں اور بعد نمازِ فجر ایک بار سورۂ احزاب ضرور پڑھیں۔ والدہ سے کہو، روزانہ چڑیوں کو دانہ پانی ضرور دیں۔ حسب حیثیت صدقہ خیرات ضرور نکالیں۔ تعویذ کے لیے مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو تاکہ تعویذ گھر کے پتے پر ارسال کیا جا سکے۔

☆......☆

علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆اگر آپ اپنے حلق اور گلے کے مسائل اور دوسری جلدی بیماریوں سے پریشان ہیں؟

☆اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆اگر آپ دانتوں کی گونا گوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

☆اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

نعت نبی ﷺ

سید الانبیاء تُو ہے محبوبِ خدا تُو ہے
بعد خُدا کے سب سے بڑا تُو ہے
طالب کو جو چاہیے تھا وہ مطلوب تُو ہے
بڑھ کر ساری خلقت سے محبوب تُو ہے
تیرا رتبہ کیا کہنا، تیرا مقام کیا کہنا
خدا خود بھیجے جس پر درود و سلام کیا کہنا
ہادیٔ برحق تُو ہے بڑا راہنما تُو ہے
ثمر مستجابی و دعائے خلیل خدا تُو ہے
شادماں رہے دل کہ اُداس رہے
شاملِ قسمت تیرا لطف خاص رہے
ہر حال ناموسِ عشق نبی ﷺ کا پاس رہے
میرا ہر فعل سیرت پاک کا عکاس رہے
سید الانبیاء تُو ہے محبوب خدا تُو ہے
بعد خُدا کے سب سے بڑا تُو ہے

شاعر: ڈاکٹر صغیر احمد عاجز۔ جہلم

محبت اور ہی شے ہے

بھلا دو خواب کے قصے
حقیقت اور ہی شئے ہے
نہیں جینا ہے یوں آساں
محبت اور ہی شئے ہے
یہ سانسوں کا تسلسل ہے
اسے آنے دو جانے دو
اگر تم روک لیتے ہو
تو دم گھٹنے کا اندیشہ
اگر تم چھوڑ دیتے ہو
تو غم بڑھنے کا اندیشہ

شاعرہ: نسیم سکینہ صدف۔ ڈسکہ، سیالکوٹ

مَنّت

جب تم!
شام وداع کا آخری منظر
میری آنکھوں کو سونپ کر
دور جا چکے تھے
تو میں نے دیکھا کہ میری قمیص کے دامن پر
تمہاری زلفوں کا اک بال رہ گیا تھا
میں وہ بال چوم کر
وہیں کسی پیڑ کی جھکی ہوئی شاخ پر باندھ کر
اپنے تاریک شکست خوردہ
مقدر کے ساتھ لوٹ آیا تھا
اب سُنا ہے کہ لوگ
اس پیڑ کی ٹہنیوں پہ
سیاہ رنگ کے دھاگے
باندھ کر جاتے ہیں
اور......
جانے والوں کی واپسی کی
منت مانگتے ہیں

شاعر: ظفر اللہ رند۔ ڈیرہ مراد جمالی

تیری خاطر

زندگی ہار بن گئی تیرا انتظار کرتے کرتے
ہم لٹ گئے تجھے پیار کرتے کرتے
وہ کون سا وقت تھا جب ملے تھے ہم

نیندیں اُڑ گئیں تجھے یاد کرتے کرتے
نہ تھا تجھ کو مجھ پہ اعتبار
اور میں چڑھتا رہا سولی تجھ پہ اعتبار کرتے کرتے
گر ہونا تھا جدا تو ہمدم کہہ دیتی مجھے
میں تجھے روکتا نہیں، تیرا احترام کرتے کرتے
تُو نے یہ ستم کیوں کیا مجھ پہ
اگر ہوں لفظ تو کہہ دے احساس کرتے کرتے
غازی اپنی طبیعت بھی عجیب سی ہے
اس نے مانگی جدائی تو
ہم نے اجازت دے دی انکار کرتے کرتے

شاعر: وفا صدا حسین غازی تنیو۔ حیدر آباد

غزل

پتھر دل ہیں پتھر لوگ
ایسے ملے ہیں اکثر لوگ
لفظوں سے وہ مارتے ہیں
ہنس ہنس کر یاں خنجر لوگ
سچا کون ہے، جھوٹا کون
ظاہر ہوں گے کمتر لوگ
کیونکر اپنا چنتے ہیں
جھوٹوں کو یہ رہبر لوگ
فٹ پاتھوں پہ کاٹتے ہیں
راتیں اپنی بے گھر لوگ
ہم بھی کرتے پیار نوید
مل جاتے گر بہتر لوگ

شاعر: نوید سہیل لاکھو۔ ہوسڑی

فریب

دکھوں کے یہ روگ کیسے ہوتے ہیں
جو رگِ جاں کے قریب ہوتے ہیں
نہیں معلوم اُسے شاید!
کہ رشتوں کے نجوگ کیسے ہوتے ہیں
ظلم کرتا ہے وہ ظالم!
نہیں مانتا ہے پھر!
غموں کے یہ روگ کیسے ہوتے ہیں
زباں سے ظلم کرتا ہے......
نگاہیں پھیر لیتا ہے!
یہ کیسا پیار ہے اُس کا
نہیں جانتے!!
یہ کیسے لوگ ہوتے ہیں
ہم نے تو گزاری ہے یہ سادہ زندگی
نہیں جانتے یہ فریب کیسے ہوتے ہیں

شاعرہ: ثمینہ ناز۔ اورنگی، کراچی

غزل

تو بنی ہے جب سے میری زندگی
مل گئی ہے اس جہاں کی ہر خوشی
تھا کبھی ویران اس دل کا نگر
تیرے آنے سے ہوئی ہے روشنی
جب سے تھاما ہے تمہارے ہاتھ کو
ہر کسی سے ہوگئی ہے دشمنی
تم کسی کے درد کو سمجھو گے کیا
تم نے دیکھی ہی نہیں ہے مفلسی
اپنے مطلب سے یہاں ملتے ہیں سب
کون کرتا ہے کسی سے دوستی
کب تلک آخر سہیں گے ہم ترا
یہ تغافل، یہ ستم، یہ بے رخی

شاعر: ریحان آفاق۔ حیدر آباد

یاد کرو!!

یاد کرو وہ بیتے لمحے
وہ بیتی یادیں
وہ بیتے موسم
وہ ساون میں رم جھم کا برسنا
وہ ہواؤں میں پتوں کا کھنکنا
وہ باغوں میں بلبل کا چہکنا

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ فضاؤں میں خوشبو کا مہکنا
وہ چاندنی راتیں
وہ تپتے دن
وہ ویراں گلیاں
وہ مہکتے بَن
یاد کرو وہ بیتے لمحے
وہ بیتی یادیں
وہ بیتے موسم......

شاعر: محمد آصف ریاض۔ جھنگ

غزل

آج میں قصہ غم لکھ رہا ہوں
کہیں خوشی کہیں آنکھ نم لکھ رہا ہوں
دشت میں تھا تنہا محوِ رواں
خوش روشن چاند کو مدہم لکھ رہا ہوں
ویرانیاں، تنہائیاں اور یہ ابر بہار
ٹوٹے لفظوں سے داستان الم لکھ رہا ہوں
اپنی زندگی سے ہے کس کو شناسائی
یہ سب ہے اُن کا عطائے کرم لکھ رہا ہوں
بہت خوشی ملی ہے زندگی سے شاد
جتنی ملی ہے پھر بھی کم لکھ رہا ہوں

شاعر: نبی بخش شاد پندرانی۔ کوئٹہ کینٹ

راہوں سے پوچھتی ہوں......

منزل میری کہاں ہے راہوں سے پوچھتی ہوں
پاؤں کی پھول کیسے خاروں سے پوچھتی ہوں
افسردگی نے اب تو لاچار کر دیا ہے
بچھڑے سکوں کا مسکن آہوں سے پوچھتی ہوں
معلوم یہ تو ہے ہی ہوگی سحر لیکن
راتوں کو چمکتے ہوئے تاروں سے پوچھتی ہوں

شاعرہ: عصمت پروین عظمی۔ کراچی

رُک جاؤ

ابھی رک جاؤ کہ جی ابھی بھرا نہیں
کچھ دیر اور ٹھہر جاؤ کہ جی ابھی بھرا نہیں
بہت سی باتیں ہیں جو کرنی ہیں تم سے
ابھی نہ جاؤ کہ جی ابھی بھرا نہیں
کہاں گئے تھے تم کہاں رہے تھے تم
آؤ بیٹھو یہاں کہ جی ابھی بھرا نہیں
گئے دنوں میں کیا تم مجھے یاد کرتے تھے
کچھ اپنی باتیں ہیں بتانے کی، جی ابھی بھرا نہیں
میں نے آج بھی سنبھال رکھے ہیں تیری قربت کے لمحے
اِن لمحوں کی ایک خاص بات کہ جی ابھی بھرا نہیں
تم مدتوں مرے پاس رہو پھر بھی ہر دھڑکن یہ کہے گی
نہ جاؤ کہ جی ابھی بھرا نہیں کہ جی ابھی بھرا نہیں!

شاعر: ابراہیم شہزاد شاذی۔ کراچی

غزل

چاندنی پھیلی ہوئی ہے ضوفشاں ہے ماہتاب
پھر تصور میں کسی کی یاد آئی بے حساب
پھر کھلیں دل میں میرے ماضی کی ساری کھڑکیاں
مجھ کو تنگ کرنے لگے تیری محبت کے سراب
رات دن گزرے میرے کچھ اس طرح بے چین سے
بھر گئی دُکھ اور غم سے میرے جیون کی کتاب
جس نے توڑا دل مرا اس سے بھی تو پوچھے کوئی
مجھ سے ہی کیوں مانگتے ہیں سب خطاؤں کے حساب
یہ دلِ مضطر میرا تو اس طرح مرجھا گیا
جیسے رکھا ہو کتابوں میں کوئی سوکھا گلاب
اب تو باقی پاس میرے عمر کی نقدی نہیں
کیسے کروں اس دُکھ کی لمبی سی مسافت کا حساب
آگے کا سفر ہے اب، اور رب سے پچی لو میری
تم کو چاہ کر پایا میں نے کتنے نفلوں کا ثواب

شاعرہ: رضوانہ کوثر۔ لاہور

سنو! عشق میں......

سنو عشق میں ہر ستم سہنا پڑے گا
ہر غم کو دل سے لگانا پڑے گا
کئی بار آئیں گے ایسے بھی لمحے
جب اشکوں کا سمندر بہانا پڑے گا

خوشی بھی روٹھ جائے گی دُکھوں کا صحرا ہو گا
جب بھی جدائی کا غم تمہیں اُٹھانا پڑے گا

شاعر: ملک ضیاء الرحمٰن اعوان۔ خانیوال

غزل

ہیں بارشیں اور مکاں شکستہ
پناہ ڈھونڈے کہاں شکستہ
بھٹک نہ جاؤں مثالِ مجنوں
ہے چاہتوں کا جہاں شکستہ
قفس میں قسمت پہ رو نہ بلبل!
ہیں پَر شکستہ، اُڑاں شکستہ
اثر دکھائیں یہ تیر کیسے؟
ہیں ہاتھ شل اور کماں شکستہ
مسافروں کی ہو خیر یارب!
ہوا ہے تند، بادباں شکستہ
عدالتِ عشق میں تم آ کر......!
سنبھال رکھنا زباں شکستہ
پلٹ نہ آئیں دعائیں فائق
ہے دل کی آہ و فغاں شکستہ

شاعر: عمران فائق۔ کامل پور، موسیٰ، اٹک

غزل

خود اپنا آپ بھی ہم نے بھلایا تھا
اُسے کس کس طرح ہم نے منایا تھا
مرے زخموں پہ سب ہنستے رہے لیکن
کسی کی آنکھ میں آنسو بھی آیا تھا
کلیجہ نوچ کر قصہ ختم کرتے
تماشا کیوں محبت کو بنایا تھا
جسے بھی حالِ دل کہتے وہ رو دیتا
جدائی نے اثر ایسا دکھایا تھا
ضرورت کے تحت دنیا ملی ہم سے
ضرورت کے تحت سب نے بھلایا تھا
سزا ملنی ضروری تھی گناہوں پر
گلابوں کو کتابوں میں چھپایا تھا
مجھے آمد طلب تھی درد کی، یارو
ارے بابا! تمہیں تھوڑی بلایا تھا
ابھی تک یاد کرتے ہو اُسے عادل
تمہارے پیار کو جس نے بھلایا تھا

شاعر: عادل حسین۔ کراچی

کہانی پوچھو تم

بہت ہی درد ہے اس میں
کبھی تم حالِ دل پوچھو
سبھی تم کو بتاؤں گا
میں دل کی رنجشیں ساری
کیوں تم سے
دور رہتا ہوں
کبھی خاموشی میں جا کر
جو پل تنہا بتاتا ہوں
تمہیں وہ سب بتاؤں گا
کہیں جو لب رکیں میرے
وہاں تم جان لینا خود
کبھی کچھ کہہ نہ پاؤں تو
خود ہی محسوس کر لینا
ذرا سے اشک جو آئیں
تمہاری گول آنکھوں میں
میرے سینے پہ سر رکھ کر
ذرا سا تم بھی رو دینا
لپٹ کر مجھ سے پھر جاناں
اظہارِ عشق کر لینا
وہ برسوں کی کہانی کو
اسی پل بھول جاؤں گا
نیا اک موڑ دے دوں گا
بس اتنا تم کرم کرنا
اظہارِ عشق کر لینا

شاعر: حبیب الوہاب۔ سوات

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھٹمل

سرور شاذ

مجتبیٰ آباد سے جاگیردارانہ نظام کے راز آشکار کرتی، ایک حسینہ کی لرزہ خیز داستانِ الم کا پہلا حصہ

عشاء کی اذان سے کچھ وقت بعد ہمارے گھر کے باہر والے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت میں اور اماں دونوں ہی جاگ رہی تھیں۔ اماں بڑبڑاتے ہوئے اپنی چارپائی سے اٹھی اور کوٹھے کا دروازہ کھول کر باہر والا دروازہ کھولنے کے لیے چل دی۔ میں نے اٹھنا چاہا تھا، پر لتاں مجھ سے پہلے ہی اٹھ پڑی۔

سردیوں کی ٹھنڈی راتیں تھیں۔ میں رضائی سے سر باہر نکال کر کوٹھے کی کچی دیوار پر ٹنگی لالٹین کو دیکھنے لگی، جس کو سونے سے پہلے ہم بجھا دیتے تھے۔ کوٹھے میں لالٹین کی مدھم سی ملگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ گنتی میں چار افراد تھے، جو اماں کو کوٹھے کے دروازے تک دھکیلتے ہوئے لائے تھے۔ دروازے پر آ کر انہوں نے اماں کو زور سے اندر کی طرف دھکا دیا تو وہ لڑھکتی ہوئی میری چارپائی کے قریب آ کر گری۔ میں ایک دم سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور پھر کانپتے ہوئے چارپائی سے نیچے آئی اور چیختی ہوئی اماں کی طرف بڑھی تو ان چاروں میں سے دو آدمیوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس ناگہانی آفت کے نزول پر میں زور زور سے چیخنے چلانے لگی۔ ان میں سے ایک نے میری چیخ کو روکنے کے لیے میرے منہ پر اپنا کھردرا ہاتھ سختی سے رکھ دیا۔ میرا بدن اس کے ہاتھوں میں شدت سے کسمسایا تو دوسرے شخص نے آگے بڑھ کر رومال نما کپڑے سے میرے بازو اور ٹانگیں باندھ دیں اور ایک چھوٹا رومال میرے منہ میں زبردستی ٹھونس دیا گیا۔ اس وقت میں بالکل بے بس ہو گئی تھی، پھر میں نے آنسو بھری آنکھوں سے اماں کو دیکھا، جو نیچے سے اٹھنا چاہ رہی تھی۔ ان میں سے ایک شخص نے اٹھتی اماں کے سر پر بندوق کا بٹ اس زور سے مارا کہ میری بوڑھی ماں نیچے گر کر بالکل ساکت ہو گئی، جیسے کہ مر گئی ہو۔ میں نے سر ہلا کر فریادی اوں آں کی، لیکن انہوں نے میری اوں آں کی ذرہ بھر بھی پروا نہ کی اور پھر ساکت اماں کے سر پر دوسری بار بھی بٹ مار دیا۔۔۔۔۔

جب اماں ایک بٹ سے ساکت ہو گئی تھی تو اس ظالم نے دوسری بار ان کے سر پر بٹ کیوں مارا؟ میں نے اپنے دل میں سوچا، غالباً وہ چاروں لفنگے اماں کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ شاید اماں نے ان میں سے ضرور کسی کو پہچان لیا تھا۔ ان کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے، اس کے باوجود میں نے ان میں سے دو کو پہچان لیا تھا۔ ایک تو اکو اور دوسرا شوکا مچھل تھا۔ یہ دونوں چوہدری طالب کے بندے تھے، باقی دونوں بھی ضرور اسی کے ہی بندے ہوں گے۔ یہ کافی اثر و رسوخ والا بندہ تھا۔ اس کے پاس دوسرے علاقوں سے اکثر

کارندے آتے رہتے تھے۔ یہ چاروں غنڈے مجھے اٹھا کر باہر گلی میں لائے تو میں نے دیکھا کہ گھر کے باہر سیاہ رنگ کی ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ یقیناً یہ جیپ چوہدری کی ہی تھی۔۔۔۔۔ میں نے دل میں سوچا کہ آخر انہوں نے چہروں پر ڈھاٹے کیوں باندھے ہوئے تھے اور وہ کس سے خود کو چھپانا چاہتے تھے؟ یہ اور اسی طرح کے کئی سوال میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

اماں کا خیال ذہن میں آیا تو میری آنکھوں سے

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوبارہ آنسو جاری ہوگئے۔ اماں تو پہلے ہی بیمار تھی اور اوپر سے انہوں نے؟ آخران لوگوں نے اتنی بے دردی سے ان کے سر پر بندوق کا بٹ کیوں مارا تھا؟ اماں بھلا بندوق کا بٹ کہاں سہ پائی ہوگی؟ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہے۔

انہوں نے جیپ کا پچھلا دروازہ کھولا اور مجھے پچھلی سیٹوں کے درمیان لٹا دیا۔ ان میں سے دو آدمی جیپ کی فرنٹ سیٹ پر چلے گئے اور دو پچھلی سیٹوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے، ان کے قدموں میں۔ میں ان کے درمیان زمین پر بے بس و لاچار پڑی تھی۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور اس کے بعد وہ رات کے سرد اندھیرے میں نجانے کہاں چل دی؟

☆......☆

میں پچھلی سیٹوں کے درمیان بندھی ہوئی پڑی تھی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ اگر مجھے سمت کا علم ہو بھی جاتا تو میں کر بھی کیا سکتی تھی؟ میں ان درندوں کی گرفت میں قید تھی۔ جیپ اونچے اونچے راستے پر چلتی رہی اور پھر آدھ پون گھنٹے کے بعد ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس کے دروازے کھلے۔ انو اور شوکا نے مجھے گھسیٹ کے سیٹوں کے درمیان سے نکالا اور پھر شوکا مچھل نے مجھے پٹھوں کے پنڈ کی طرح اپنے کندھے پر اُٹھا لیا، پھر خالی جیپ کے دروازے بند کر دیے گئے۔ انو اور باقی دونوں غنڈے شوکا کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

میری آنسو زدہ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئی تھیں۔ میں نے اپنی آنکھیں گھما کر اردگرد دیکھا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ مجھے جگہ اور سمت کا صحیح علم نہ ہو رہا تھا، لیکن شوکا اور انو کی موجودگی سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ مجھے چوہدری طالب نے ہی اُٹھوایا ہے...... جس تنگ راستے پر وہ مجھے کندھے پر اُٹھائے ہوئے چل رہے تھے، تو وہ یقیناً چوہدری طالب کا رقبہ تھا، کیوں کہ اس نے حال ہی میں بارڈر ایریا میں کافی رقبے خریدے تھے۔ سرحدی علاقے والے رقبے پر اس نے اپنا ڈیرہ بھی بنا لیا تھا۔ جس رستے پر وہ لوگ چل رہے تھے، وہ ضرور اس ڈیرے کی طرف ہی جا رہا تھا۔ میرے حواس اب بدحواس ہونے لگے تھے۔ چلتے ہوئے چاروں آپس میں کیا باتیں کر رہے تھے، مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی، حالاں کہ میں اس وقت ہوش میں تھی۔ اب بھی میرا سارا ذہن اماں کی طرف تھا کہ نجانے اس پر کیا بیتی ہوگی؟ اماں کا خیال آتے ہی میں نے غم سے آنکھیں بند کر لیں اور پھر کئی آنسو میری آنکھوں سے بہہ گئے۔

جس وقت شوکا مچھل نے مجھے اپنے کندھے سے نیچے اُتارا تو میں ایک بڑے کمرے میں چارپائی پر پڑی کسمسا رہی تھی۔ اس کمرے میں گیس کے دو لیمپ جل رہے تھے۔ میں نے نظریں گھما کر دائیں طرف دیکھا تو وہ چاروں غنڈے مجھے خباثت زدہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ میں نے دکھ سے آنکھیں بند کر لیں، کچھ ہی دیر کے بعد کمرے میں بولنے اور ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو وہ چاروں میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے مجھے ہی گھور رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کانچ کے گلاس تھے، جن میں یقیناً شراب تھی۔ کمرے میں شراب کی ناگوار بو پھیل چکی تھی ان چاروں میں تو ایک چوہدری طالب تھا اور دوسرا آدمی کسی دوسرے گاؤں کا نمبردار تھا چوہدری خداداد، جب کہ تیسرا تھانیدار جاوید اقبال تھا اور چوتھا آدمی کوئی نیا تھا، جو کہ اس علاقے کا نہیں لگ رہا تھا۔

چوہدری طالب اپنے علاقے کا ایک ظالم ترین شخص تھا۔ اس کے دوست اسمگلر اور درندے تھے۔ ان چاروں کے علاوہ ساتھ والی چارپائی پر شوکا مچھل، انو اور باقی دو شخص ابھی تک بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر شوکا نے ان تینوں غنڈوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ انو اور باقی دو جو میرے لیے اجنبی تھے، کمرے سے اُٹھ کر باہر چلے گئے تو اس نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔ اب وہ چار نہیں بلکہ پانچ ہو چکے تھے۔ شوکا مچھل چوہدری طالب کا خاص بندہ ہی نہیں اس کا منظورِ نظر بھی تھا۔ اس کا وہ کارندہ کم اور دوست زیادہ لگتا تھا، کیوں کہ چوہدری اسے اپنا ایک بازو سمجھتا تھا۔

وہ بھی ان چاروں کے ساتھ مل کر شراب پینے لگا، ان پانچوں کو شراب پیتے دیکھ کر میری آنکھوں میں اپنی بے بسی کے آنسو آ گئے تھے۔ آنسو وقفے وقفے سے میری آنکھوں میں آ رہے تھے۔ میں ان پانچوں سے نظریں ہٹا کر کمرے کی چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ مجھ میں خدا سے کہنے کا جتنا حوصلہ تھا، وہ میں نے چپ کی زبان سے کہہ دیا تھا۔ جب تک وہ پانچوں شراب پیتے رہے، میری آنکھوں کے آنسو نیلی چھت والے سے فریاد کرتے رہے۔ میں خدا سے اپنی موت کی دُعا کر رہی تھی۔ موت تو مجھے نہ آئی، لیکن وہ پانچوں اُٹھ کر ضرور میرے قریب آ گئے تھے۔ ان کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ شوکا نے میرے پاؤں اور ہاتھ آزاد کر دیے۔ اس نے میرے منہ سے وہ رومال بھی نکال دیا، جو انہوں نے مجھے اغوا کرتے وقت میرے منہ میں زبردستی ٹھونس دیا تھا۔ کپڑا منہ سے نکلتے ہی میں چیخنے چلانے لگی، پھر جب میں اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی تو وہ پانچوں مجھ پر ایسے ٹوٹ پڑے، جیسے کتے قصائی کے پھینکے ہوئے چھیچھڑے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اُن کتوں اور اِن انسانوں میں فرق صرف اتنا تھا کہ کتے ایک چھیچھڑے کی خاطر ایک دوسرے سے لڑتے ہیں، جبکہ یہ انسان عقل والے تھے، اشرف المخلوق تھے، ان میں اتفاق تھا۔ ایک شکار کرتا تو سب مل کر کھاتے تھے۔ یہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے نہ تھے۔ میں بری طرح سے چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی، لیکن میرے چیخنے چلانے کا ان پر کوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے میرے کپڑے تار تار کر دیے تھے۔ وہ تو بھیڑیوں کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے۔

☆......☆

تمام رات پانچ انسان نما بھیڑیے میرا ماس نوچتے رہے۔ اب میرے حواس میرا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں برہنہ پڑی بڑبڑا رہی تھی۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے میں مر رہی ہوں، پھر جب میرے حواس بالکل ہی میرا ساتھ چھوڑ گئے تو مجھے ایسے لگا کہ جیسے میں مر گئی ہوں اور مجھے پانچ درندوں سے نجات مل گئی ہے، لیکن مجھے موت کہاں آنی تھی، میں تو صرف بے ہوش ہوئی تھی۔ اگلے دن بارہ بجے مجھے ہوش آیا تھا۔ جب میں نے اپنے آپ پر نظر ڈالی تو میرے وجود پر لباس نام کو بھی نہ تھا۔ میرے لباس کے ٹکڑے کمرے میں جابجا بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ جب میں نے اپنے سراپے کا جائزہ لیا تو میرے ننگے بدن پر اَن گنت دانتوں کے نشان لگے ہوئے تھے اور کئی جگہوں سے خون رس رس کر جم چکا تھا۔ ان درندوں نے میرے جسم کو اپنے دانتوں سے جھنجھوڑا اور ناخنوں سے خوب نوچا تھا۔ جب میں ہلی جلی تو میرے وجود سے دردناک ٹیسیں اُٹھیں اور میں درد سے بلبلانے لگی۔ مجھ سے چارپائی سے اُٹھا نہ گیا۔ میرا لباس مکمل طور پر پھاڑ کر چیتھڑوں میں بدل دیا گیا تھا۔ انسانی درندوں نے میرے لباس کے پُرزے پُرزے ہوا میں اُڑا دیے تھے۔ میری عزت قتل ہو چکی تھی۔

اب میرا جینا کسی کام کا نہ تھا۔ مجھے پیاس اور بھوک شدت سے لگی ہوئی تھی۔ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود میں زندہ کیسے تھی؟ میں اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی۔ مجھے تو مر جانا چاہیے تھا...... میں سارا دن اسی اُدھیڑ بن میں مبتلا اپنی قسمت کو روتی رہی۔

شام کو چار بجے کمرے کا دروازہ کھلا اور شوکا مچھل مسکراتا ہوا کمرے کے اندر داخل ہوا، اس کے ساتھ اس کا جوڑی دار انو بھی تھا۔ انو کے ہونٹوں پر عجیب سی خباثت مسکراہٹ تھی۔ انو نے مجھے اس حالت میں دیکھ کر زور کا قہقہہ لگایا تو شوکا نے اسے ایک سیدھے ہاتھ کا جڑ دیا، تب جا کے اس کے شیطانی قہقہے بند ہوئے۔ انو کے ایک ہاتھ میں میرے لیے کپڑے اور دوسرے میں کھانا تھا۔ مچھل کا ہاتھ پڑتے ہی کھانے والی چنگیر انو کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی، پھر اس نے چنگیر میرے آگے رکھ دی۔ شوربے سے بھری روٹیاں دیکھ کر بھی میری بھوک نہ مری۔ اپنے آپ کو برہنہ حالت میں دیکھ کر مجھے ابکائی تو آئی، لیکن روٹی میرے آگے پڑی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ مجھے کھاؤ...... میں آنکھوں کی زبان سے اسے کہہ رہی تھی کہ میں تمہیں کیسے کھاؤں؟ میں تو بالکل ننگی ہوں......

"روٹی کھا لے اور کپڑے بھی پہن لے۔ ہم تجھے لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ آج رات نمبردار خداداد کے ڈیرے پر......"

"نہیں...... نہیں۔" میں ایک دم چلا اُٹھی۔ شوکا نے میری بے بسی پر زوردار قہقہہ لگایا۔

"اب بھی چیخ رہی ہے؟ تیرے پاس اب بچا ہی کیا ہے؟" شوکا مچھل بے غیرتی کے لہجے میں بول رہا تھا۔

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"آج کی رات تجھے روکھی سوکھی ہی گزارنی پڑے گی، لیکن کل ہم تجھے واپس تیرے گاؤں چھوڑ آئیں گے۔ اوکھاویلا تو گزر گیا۔ اب تو...... اب تو۔" میں بے بسی سے رونے لگی تھی، پھر میں روتی ہوئی بولی۔ "مجھے ماردو، میری جان لے لو تم لوگ، میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ ماردو مجھے...... ماردو......" شوکا شیطانی مسکراہٹ کے بعد بولا۔

"آج ہی کی رات کی تو بات ہے ساری بے شک، کل پھر تم چاہے مرجانا، لیکن آج ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے...... اب تم سیدھے سے کپڑے پہن لو اور روٹی بھی کھالو، کیوں کہ تمام رات تمہیں جاگ کر گزارنی ہے۔"

اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے کے بعد میں نے کپڑے بھی پہن لیے اور روٹی بھی کھالی۔ شوکا اور انو سامنے چارپائی پر بیٹھے مجھے بے حیائی سے دیکھتے رہے...... روٹی کھانے کے بعد میں نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

"یہ کپڑے تو اپنی بہن کے لایا ہے کیا؟" شوکے مچھل کو امید نہیں تھی کہ میں اس سے ایسا سوال کردوں گی...... اس نے ایک زور کا شیطانی قہقہہ لگایا پھر بولا۔

"بہن؟ میری کوئی بہن وہن نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کبھی کوئی بنائی ہے۔ یہ کپڑے کسی تیری جیسی کے ہوں گے۔"

میں نے جواب میں اسے غلیظ قسم کی تین چار گالیاں سنادیں، شوکا اور انو بے غیرتوں کی طرح ہنسنے لگے اور ہنستے ہی چلے گئے۔ ان کو تو جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ میری گالیاں سن کر میری بے بسی پر اتنا ہنسے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"بہت گالیاں دے لیں تُو نے، بس اب تُو نے کپڑے پہن لیے اور روٹی بھی کھالی۔ چل اب اُٹھ جا۔" شوکا نے مجھے بالوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور پھر مجھے زبردستی اپنے کندھوں پر اُٹھالیا۔ وہ جانتا تھا میں ایسے نہیں جاؤں گی۔

☆......☆

چوہدری طالب کے ڈیرے کے باہر نمبردار خداداد کی جیپ کھڑی میرا انتظار کررہی تھی۔ جیپ کے ساتھ ہی لگ کر اس کے دو کارندے بھی کھڑے تھے۔ جیپ کا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شوکا نے مجھے پچھلی سیٹوں کے درمیان لٹادیا، پھر انو اور نمبردار کا ایک کارندہ آمنے سامنے سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ شوکا ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ان کے ساتھ کوئی مزاحمت نہ کی، کیوں کہ میں جانتی تھی کہ مزاحمت کی صورت میں انہوں نے مجھ پر تشدد ہی کرنا تھا...... اور جواب میں، میں ان کا کیا بگاڑ سکتی تھی؟ ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں اور ویسے بھی وہ چار مرد تھے اور میں ایک کمزور اور لاچار تنہا عورت تھی۔

جیپ اسٹارٹ ہونے کے بعد اونچے نیچے رستے پر کافی دیر چلتی رہی۔ جب رات کا ابتدائی اندھیرا جیپ کے اندر آیا تو جیپ کی چھت کے ساتھ لگا ہوا بلب جل اُٹھا۔ اندازاً گھنٹہ بھر جیپ چلتی رہی تھی، اس کے بعد رُک گئی تھی، غالباً نمبردار خداداد کا ڈیرہ آچکا تھا۔ میں نے خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا، کیوں کہ میں اب زندگی سے بالکل ہی مایوس ہوچکی تھی۔ جیپ کا پچھلا دروازہ کھلا اور اور پھر شوکا مچھل نے مجھے جیپ سے نکال کر اپنے کندھے پر اُٹھالیا۔ جب شوکا نے مجھے اپنے کندھے کے اوپر اُٹھایا تو انو اور باقی دونوں کارندوں نے زور زور سے قہقہے لگائے۔ اس وقت مجھے اپنی بے بسی پر رونا آیا تھا۔

نمبردار خداداد کا ڈیرہ بھی چوہدری طالب کے ڈیرے ہی کی طرز کا تھا۔ اس کے ڈیرے پر تو گیس لیمپ تھے، جب کہ نمبردار خداداد کے ڈیرے پر بجلی لگی ہوئی تھی اور اس کی حویلی برقی قمقموں سے روشن تھی۔ شوکا مچھل مجھے کندھے پر اُٹھاتے ہوئے ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں لے آیا اور اس میں بڑے بیڈ پر اس نے مجھے لٹادیا۔ نیچے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور اس کے گرد گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ان تکیوں کے ساتھ ٹیک لگائے وہی چار آدمی بیٹھے تھے، شاید وہ میرا ہی انتظار کررہے تھے، شوکا بھی ان کے ساتھ ہی جاکر بیٹھ گیا۔ میں بیڈ پر بیٹھی ان پانچوں کو لاچار نظروں سے دیکھ رہی تھی، وہ مجھے دیکھ کر ایک دوسرے سے فحش مذاق کرنے لگے۔ نمبردار خداداد نے اپنے سامنے بیٹھے شخص سے معذرت خواہانہ لہجے سے کہا۔

"شرما جی! مال ہے تو باسی، پر ہے بڑا لذیذ۔ آج تو آپ کو اس پر ہی گزارا کرنا پڑے گا، کل نیا مال کھلائیں گے۔ آج کی رات تو آپ کو اس کے ساتھ ہی روکھی سوکھی گزارنی پڑے گی۔"

جس شخص سے نمبردار خداداد بات کررہا تھا، اس کا نام شرما تھا اور وہ ہندو تھا۔ یقیناً وہ ہندوستان سے آیا ہوا کوئی بڑا اسمگلر ہوگا۔ پانچوں نے مل کر خوب شراب کے جام ٹکرائے...... وہ بدمست شراب پیتے رہے اور مجھے ہوس زدہ نظروں سے دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہے۔ ہندو شرما تو مجھے کچا کھاجانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ہوس کے چاقو چلتے نظر آرہے تھے۔ شراب پینے کے ساتھ ساتھ وہ کاروباری باتیں بھی کررہے تھے۔ مال لے جانے اور ہندوستان سے لانے کی باتیں ہورہی تھیں۔ یہ چاروں مل کر ہندو شرما کی خوب چاپلوسی کررہے تھے، کیوں کہ وہ ہندوستان کا بڑا نامی گرامی اسمگلر تھا، تبھی تو چاروں اس کی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ اسی اثناء میں باہر سے ایک لمبا چوڑا نوجوان کمرے میں آیا۔ اس کے کندھے پر ایک گن لٹک رہی تھی۔ آنکھیں اس کی بڑی بڑی تھیں، جن میں لالی تیر رہی تھی۔ اس کی مونچھیں تھوڑی سی اُوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت اس نے ایک نظر مجھے دیکھا۔ میری لاچار آنکھیں اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں تو اس نے جلدی سے مجھ سے نظریں پھیرلیں۔

"دادا! میں جیپ لے کر حویلی جارہا ہوں۔ صبح سویرے بی بی جی کو شہر چھوڑنے جانا ہے۔ اس کی چھٹیاں ختم ہوگئی ہیں۔" اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہوگیا۔ جواب میں نمبردار خداداد بولا۔

"ٹھیک ہے شمشیر! تم جیپ لے جاؤ اور سنو...... صبح سویرے نکل جانا اور مریم کو شہر کالج کے ہوسٹل میں چھوڑ کر فوری واپس آجانا۔ دیر بالکل مت کرنا، کیوں کہ شرما جی آئے ہوئے ہیں، ان کی سیوا بھی کرنی ہے، پھر تمہیں ان کے ساتھ ہندوستان بھی جانا ہے اور وہاں سے لاکھوں کا مال لانا ہے۔ شرما جی اس بار ہماری توقع سے بھی زیادہ مال ہمیں دیں گے......" نمبردار خداداد اتنا کہنے کے بعد چپ ہوگیا۔

نوجوان جس کا نام شمشیر تھا، واپس مڑنے لگا تو تھانیدار جاوید اقبال خباثت سے بولا۔ "ارے شیرے! اگر موج مستی کا موڈ ہے تو آجاؤ، شراب کے ساتھ کباب بھی ہے۔ آ دَنا! پر تم تو اُن موج مستیوں سے ہی الرجک ہو۔"

ان کے کلمات سن کر میری آنکھوں میں بے بسی کے آنسو آگئے۔ سامنے کھڑے نوجوان شمشیر کو میں نے بھیگی آنکھوں سے دیکھا۔ اس نے بے حسی سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ جب وہ واپس جانے کے لیے مڑا تو اس وقت نمبردار خداداد نے اسے پکارا۔ اس کے اُٹھتے ہوئے قدم ایک دم رُک گئے۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا اور بولا۔

"جی دادا! مریم بی بی کو خیر خیریت سے شہر لے جانا۔ آج کل حالات بڑے خراب ہیں اور سنو، دو چار بندے بھی ساتھ لیتے جانا۔" یہ سن کر شمشیر کے چہرے پر ناگواری آکر گزر گئی، لیکن وہ بولا کچھ بھی نہیں۔ اس نے اس بار غور سے مجھے دیکھا۔ اس مرتبہ اس کی آنکھوں میں میرے لیے بے بسی تھی، پھر میں نے اپنے آنسو پونچھ لیے، کیوں کہ وہ جاچکا تھا۔

مجھے اس کی مردانگی نے متاثر کیا تھا۔ میں باوجود کوشش کہ اس سے نفرت نہ کرسکی، حالاں کہ وہ نمبردار خداداد کا خاص بندہ تھا، پر میں کرتی بھی کیا؟ اس کی شخصیت میں بڑی انفرادیت تھی۔

جاتے وقت جب میں نے اس کی طرف بے بسی سے دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ مجھے اس وقت ایسے لگا جیسے اس کی آنکھوں نے مجھ سے کہا ہو کہ میں مجبور ہوں۔ میں تیرے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔

اس کے جانے کے بعد پانچوں درندے میرے قریب آگئے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کے نوکیلے ناخنوں سے میرا لباس نوچ ڈالا۔ میں چیختی چلاتی رہی، مگر ان کے چاقو جیسے تیز دانت میری عزت کو نوچتے رہے۔ میری عصمت کو تار تار کرتے رہے۔ میں پہلے نیم بے ہوشی کی حالت میں فریادی انداز میں بڑبڑاتی رہی، پھر میں بے ہوش ہوگئی تھی۔

☆......☆

جب مجھے اگلے دن ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے اوپر صرف ایک پرانی چادر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ میرے جسم پر کوئی لباس نہ تھا۔ میرے جسم کا پور پور درد کررہا تھا۔ تمام جسم پر پانچوں بھیڑیوں کے خنجر

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

جیسے دانتوں کے نشان گڑے ہوئے تھے۔ میرے جسم کے کئی حصوں پر جما ہُوا خون میری بے بسی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ میری آنکھیں کمرے کی چھت کو انتہائی مایوسی کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود میں مری نہیں تھی...... اپنی لاچار حالت کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آنکھوں کے آنسو تھے کہ ختم ہی نہیں ہو رہے تھے، نہ جانے کتنی دیر میرے آنسو میرے رخساروں کو دھوتے رہے۔ پھر میں نے آنسو پونچھنے کے بعد شدت غم سے آنکھیں بند کر لیں...... اس وقت میرا جسم بخار سے تپنے لگا تھا۔

یہاں میرا کوئی والی وارث نہ تھا۔ میری عزت کی ایک دھجی بھی نہ بچی تھی۔ میرے وجود کا لباس ٹکڑے ٹکڑے فرش پر پڑا ہوا ماتمی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور میں آنکھیں بند کرنے میں بار بار ناکام ہو رہی تھی۔ اب آنکھیں بند کرنے سے کیا ہونا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ مجھے سخت بھوک اور شدید پیاس لگ رہی تھی، تکلیف کی وجہ سے مجھ سے بیڈ کے اوپر سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا، اگر میں اُٹھ پاتی تو دروازے تک ضرور جاتی اور اسے دیکھتی کہ کھلا ہوا ہے یا بند، لیکن دروازے نے کیا کھلا ہونا تھا، میں بُت بنی بے بسی سے ماتمی آنکھوں سے کمرے کی اونچی چھت کو دیکھتی رہی۔ نجانے چھت کے ساتھ ایسا کیا تھا کہ میری نظریں اس سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔

کمرے کا دروازہ کھلا تو میری نظریں چھت سے ہٹیں، شوکا مچھل اور انو دروازہ کھول کر اندر آ گئے تھے۔ انو کے ایک ہاتھ میں روٹی والی چنگیر اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا جگ تھا اور شوکا کے ہاتھ میں لباس تھا۔ اس نے بے پروائی سے لباس میری طرف پھینکا اور ساتھ ہی بے حیائی سے بولا۔ ”اسے پہن لے اور روٹی بھی کھا لے۔“ انو نے میرے آگے روٹی والی چنگیر رکھ دی۔ شوکا اور انو شیطانی قہقہہ لگاتے ہوئے میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔ ”کپڑے پہن لو۔“ شوکا نے دوبارہ مجھ سے کہا۔ ”اچھا! ہمیں اپنے قریب دیکھ کر اگر شرم آ رہی ہے تو یہ لو ہم آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اوئے انو خبیث! آنکھیں بند کر، اپنی بہن کو کپڑے پہننے دے۔“

شوکا اور انو نے واقعی اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میں چادر اُتار کر کپڑے پہننے لگی تو درد سے میری چیخیں نکل گئیں۔ شوکا اور انو نے میری چیخ سنی تو جلدی سے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا، لیکن میری بھیگی آنکھوں کے سامنے دونوں کے چہرے چھپ گئے۔ درد کی شدت کو بڑی مشکل سے سہتے ہوئے لباس پہنا، پھر جب میں کپڑے پہن چکی تو اس وقت شوکا نے مجھ سے پوچھا۔ ”رات کی سُنا کیسی گزری؟“ میں نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے آنسو پونچھے اور شوکا کے بے ہودہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس وقت میری تمام توجہ روٹی کی طرف ہو چکی تھی۔ روٹی کھانے کے دوران میں نے ان کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ کھانے کے بعد مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی اور میں اول فول بکنے لگی۔ ”خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو، مجھے مار دو یا مجھے چھوڑ دو۔“

میں اسی لیے تو آیا ہوں۔ تم نے کپڑے پہن لیے ہیں اور روٹی بھی کھا لی ہے، اب میں تم کو تمہارے گاؤں چھوڑ آؤں گا، تمہاری رہائی کا حکم جاری ہو چکا ہے، چل اُٹھ۔“ شوکا نے مجھے سختی سے اُٹھنے کا حکم دیا۔ باوجود کوشش کے مجھ سے اُٹھا نہ گیا، شوکا خباثت سے ہنستے ہوئے بولا۔ ”سمجھ گیا تم سے اُٹھا کیوں نہیں جا رہا؟ انو! تم سمجھے کہ نہیں؟“

شوکا نے انو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔ ”ایسے موقع پر میں تو کیا میرے دادے پردادے بھی سمجھ جایا کرتے ہیں، ہم روز کرتے کیا ہیں؟ اچھا، اچھا اب زیادہ بک نہیں، مختصر جواب نہیں دے سکتا۔ آئندہ احتیاط کروں گا مائی باپ!“ پھر شوکا نے ہنستے ہوئے مجھے اپنے کندھے کے اوپر اُٹھا لیا، اذیت سے میں بلبلا اُٹھی۔ شوکا مچھل مجھے اُٹھائے ہوئے کمرے سے باہر لے آیا تو اس وقت دن کے بارہ ایک بجے کا وقت تھا۔ نمبردار خداداد کے کچھ کارندے ڈیرے کی چارپائیوں پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ سب کے پاس اسلحہ پڑا تھا۔ مجھے شوکا کے کندھے پر دیکھ کر وہ تمام مسکرانے لگے۔ شوکا نے مجھے پہلے کی طرح جیپ کی دونوں سیٹوں کے درمیان بوری کی طرح ڈال دیا اور ایک گن مین پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں اس کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی، پھر جب جیپ کا پچھلا دروازہ بند ہوا تو شوکا آگے ڈرائیور کے پاس چلا گیا

اور جیپ ایک جھٹکے سے چل پڑی۔

میں جیپ کی چھت کو بڑے دُکھ سے دیکھ رہی تھی، جیپ چلتی رہی اور کافی دیر چلنے کے بعد ایک جھٹکے سے رک گئی، جیپ کے دروازے کھلے، پھر شوکا نے مجھے اُٹھا کر جیپ سے نکالا اور پھر کندھے پر اُٹھایا اور چند قدم دور کھجور کے ایک پیڑ کے تنے کے ساتھ بٹھا دیا، پھر خود واپس جا کر جیپ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ لوگ مجھے گاؤں کے قبرستان میں پھینک کر جا رہے تھے۔ جیپ جب چل پڑی تو شوکا نے اپنا ہاتھ جیپ سے باہر نکال کر ہلایا تھا، وہ برابر میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میں دُکھ بھری نگاہوں سے جیپ کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھتی رہی، پھر جب وہ میری نظروں سے پوری طرح سے اوجھل ہو گئی تو میں کھجور کے تنے کے ساتھ لگی اپنی بے بسی پر سوچے جا رہی تھی۔ دو راتیں میری عزت لٹتی رہی، لیکن خدا کی خدائی میں کوئی تبدیلی دیکھنے کو نظر نہ آ رہی تھی۔ اس کی رسّی دراز ہی رہی تھی۔ میں بالکل بے گناہ تھی۔ میرا اگر کوئی جرم تھا تو وہ یہ کہ میں ایک غریب مزدور کی بیٹی تھی......

نجانے اماں کس حال میں ہو گی؟ اماں کا خیال آیا تو غم سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ مجھ سے اور میری اماں سے کیا خطا ہوئی؟ آنکھیں بند کیے میں نے قبرستان کے سناٹے سے پوچھا، لیکن مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ میں بار بار ایک ہی سوال پوچھ رہی تھی اور مجھے کوئی جواب نہ مل رہا تھا۔ اچانک اس سناٹے ویران تاریک قبرستان میں کسی نے مجھے میرے نام سے پکارا۔ ”رضیہ! بیٹی تم یہاں کب آئیں؟“ میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے سامنے بابا چراغ دین کھڑا مجھے غور سے دیکھ کر اپنی تسلی کر رہا تھا۔

بابا چراغ دین گاؤں کے ڈھور ڈنگر چراتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی۔ بابا چراغ دین میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”بیٹی! تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔“

”کک...... کیا ہوا؟“ آواز جیسے میرے حلق میں دب کر رہ گئی۔ ”تمہاری اماں کو ہم سب گاؤں والوں نے مل کر دفنا دیا۔ ہم نے شام تک تمہارا انتظار کیا، تم نہ آئیں تو تمہاری اماں کو مجبوراً دفنانا پڑا۔ تم کدھر چلی گئی تھیں بیٹا؟ گاؤں میں تو یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ تمہیں چوہدری طالب کے بندے اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ بیٹی! کیا یہ سچ ہے؟“ میں بدحواسی کی حالت میں بابا چراغ دین کے جھریوں والے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی، پھر ایک دم میں سسک اُٹھی۔

”نہیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا...... میری اماں نہیں مر سکتی۔ میرا تو اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے، پھر وہ کیسے مر سکتی ہے؟ بابا جی! میں بہت دُور سے آئی ہوں...... میں بہت تھک چکی ہوں۔ یہاں تو میں صرف ستانے کے لیے بیٹھ گئی ہوں۔ میں گاؤں تو کب کی چل دیتی، لیکن مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ اماں! اماں!“

میں اماں کو پکارتی ہوئی سسکیاں لے کر رونے لگی۔

”بیٹی! چپ کر، اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا...... مت رو۔“ بابا چراغ دین نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”بابا جی! مجھے اماں کے پاس لے چلو۔“ میں ایک دم جسمانی تکلیف جھٹک کر اُٹھی تو بابا چراغ دین نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں اس کے ساتھ چلنے لگی۔ میرے قدموں میں لڑکھڑاہٹ سی تھی اور مارے درد کے میرے جسم سے ٹیسیں سی اُٹھ رہی تھیں۔ بابا چراغ دین نے مجھے ایک نئی، تازہ بنی ہوئی قبر کے پاس بٹھا دیا۔ جس کی مٹی بھی ابھی نہ سوکھی تھی اور اس پر ڈالے گئے پھول بھی تازہ تھے۔

”بیٹی! لے تیری اماں کی قبر آ گئی۔“ بابا نے مجھ سے اشارہ کر کے کہا۔

”بابا جی! بس اب آپ چلے جاؤ۔ مجھے اپنی اماں سے ملنے دو۔ میں تنہائی میں اپنی اماں سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“ میں بولتی ہوئی اپنی اماں کی قبر پر ڈھے گئی۔ ”اماں! میں تیری لاڈلی بیٹی رضیہ سلطانہ آ گئی ہوں، ابھی ابھی بابا چراغ دین مجھے تمہارے پاس چھوڑ گیا ہے...... یہ تو اچھا ہوا کہ بابا چراغ مجھے مل گیا اگر وہ نہ ملتا تو پہلے میں گاؤں جاتی، پھر تیرے پاس آتی۔ گاؤں چلی جاتی تو میں ہر گھر میں تجھے ڈھونڈتی پھرتی۔ اماں! مجھے دیکھ تو سہی۔ میرا کیا حال ہو گیا ہے؟ اُن درندوں نے میرا کیا حال کر دیا ہے؟ گزری دو راتوں میں مجھے بار بار قتل کیا گیا ہے۔ اماں! مجھے دیکھ تو سہی۔ میرے تمام جسم پر بھیڑیوں کے پنجوں کے نشان ہیں، اماں! میں اپنے دل پر لگے زخم اور جسم پر جما ہوا لہو کس کو دکھاؤں؟ نہ کوئی دیکھنے والا ہے اور نہ کوئی سننے والا۔ اماں! مجھے بہت اذیت دی گئی ہے، میں پل پل ذبح ہوتی رہی

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوں۔ اماں! جواب دو۔ جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟ اماں! مجھے بتاؤ میرا کیا قصور ہے؟ اماں! اماں!'' قبر میں سوئی ہوئی اماں کیا جواب دیتی؟ میں بے بس، لاچار، لٹی ہوئی روتی رہی۔ آج میں اپنے تمام آنسو آنکھوں سے نکال دینا چاہتی تھی۔ میری آنکھیں رو رو کر سوج چکی تھیں۔

شام ڈھلے کسی نے آ کر مجھے قبر سے اُٹھایا اور اُٹھانے کے بعد میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے بھیگی آنکھوں سے کندھے پر ہاتھ رکھنے والے کی طرف دیکھا تو وہ میرا محبوب آفتاب تھا۔ تمام گاؤں کو علم تھا کہ آفتاب مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور میں بھی آفتاب سے محبت کرتی تھی۔ جب وہ مجھ سے پیار بھری باتیں کرتا تو میں اس کی باتوں میں کھو جاتی تھی۔ اس نے مجھے بہت سے خواب دکھائے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ ہماری شادی ہوگی اور پھر ہماری زندگی کا ہر لمحہ ایک دوسرے کے ساتھ بسر ہوگا۔ ہماری زندگی میں ہمیشہ خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔

اتنی پیار بھری باتیں کرنے والا آفتاب میرے کندھے پر ہاتھ رکھے خاموش کھڑا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ میں نے اپنے کندھے سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ پہلے مجھے اس کی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں اور میرے دل کو گدگداتی تھیں، لیکن مجھ کو چھونے کا اس میں کبھی حوصلہ پیدا نہ ہوا تھا۔ اس لیے کبھی میرا ہاتھ نہ تھاما تھا۔ وہ مجھ سے صرف باتیں کرتا تھا نہ جانے وہ کیسی محبت کرتا تھا مجھ سے، اب وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کیا باور کرانا چاہتا تھا؟ یہ سوچتے ہوئے میں تھک کر نیچے بیٹھ گئی تو وہ بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

میں اس کی طرف دیکھنے سے احتراز کر رہی تھی۔ میری تمام توجہ اماں کی قبر پر تھی۔ میں اماں کی قبر کی مٹی کو بار بار اپنے ہاتھوں میں لے رہی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اب وہ اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھے یا میرے ہاتھ کی طرف بڑھائے۔ چند ماہ پہلے میں نے اس کی پیار بھری باتوں کے جواب میں کہا تھا۔ ''تابی! اگر تم مجھ سے اتنی زیادہ محبت کرتے ہو تو جلدی سے مجھ سے شادی کر لو۔'' اور پھر اس نے ایک دم چونک کر کہا تھا۔ ''شادی؟'' پھر وہ شادی کے نام پر نہ جانے کیا کچھ سوچنے لگا تھا اور پھر نہایت ہی دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

''رضیہ! ابھی نہیں، میں ابھی تم سے شادی نہیں کر سکتا، کیوں کہ ابھی میں پڑھ رہا ہوں، پہلے میں پڑھ لکھ کر اپنا مستقبل بناؤں گا، پھر اپنی تینوں بہنوں کی شادیاں کروں گا، اس کے بعد پھر میں تم سے شادی کروں گا۔''

''تب تک چاہے میں بوڑھی ہو جاؤں؟'' جواب میں آفتاب ہنس دیا تھا۔ میں نے آفتاب سے کہا تھا کہ ''بہت پڑھ لیا۔ اتنی تعلیم ہی بہت ہے...... زیادہ پڑھ جاؤ گے تو پھر تمہیں زیادہ پڑھی لکھی لڑکیاں پسند آئیں گی۔ پانچ جماعت پاس رضیہ کہاں اچھی لگے گی؟'' جواب میں آفتاب کچھ نہیں بولا تھا۔ بس ہنستا رہا تھا۔ گویا وہ ہنسی میں میری باتوں کو ٹال گیا تھا۔ اب وہی آفتاب میرے پاس خاموش بیٹھا تھا۔ وہ میری چُپ اور بے اعتنائی سے تنگ آ کر بولا۔ ''رضیہ! میری طرف دیکھو تو سہی یہ میں ہوں، تمہارا آفتاب، تمہارا تابی...... میری طرف دیکھو تو سہی۔'' میں نے اماں کی قبر سے اپنی نظریں نہ اُٹھائیں۔ تو وہ بولا۔ ''مجھے تمہاری اماں کی وفات کا بے حد افسوس ہے۔''

''وفات؟ وفات نہ کہو، قتل کہو۔''

''آفتاب، قتل...... میری اماں اپنی موت نہیں مری، اسے بے دردی سے مارا گیا ہے۔'' میں ایک دم پھٹ پڑی۔

''مجھے بہت دُکھ ہوا ہے۔'' آفتاب غم زدہ لہجے میں بولا۔

''تمہاری اماں کو کس نے مارا؟'' آفتاب نے پوچھا۔

''اگر میں تمہیں بتا دوں تو تم کیا کر لو گے؟'' یہ سن کر آفتاب خاموش ہو گیا۔ ''تمہیں اب بہت دُکھ ہو رہا ہے، بتاؤ میں کیا کروں تمہارے دُکھ کا؟ اگر تم مجھ سے شادی کر لیتے تو آج......'' پھر میں سسکنے لگی۔ ''اس طرح اماں قتل نہ ہوتی اور نہ اس طرح میری عزت کو ذبح کیا جاتا۔ جانتے ہو میرے ساتھ کیا ہوا؟ تمہیں بتانے کے لیے مجھے اپنے کپڑے اُتارنے پڑیں گے...... پھر جونہی میرے کپڑے اُتریں گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ میرے گالوں پر یہ پنجوں کے نشان نظر نہیں آ رہے ہیں نا...... یہ دیکھو۔'' میں نے گردن کے نیچے ایک زخمی جگہ پر انگلی رکھی۔

''نظر آ رہے ہیں یہ...... یہ انسانی دانتوں کے نشان ہیں، اس جیسے سیکڑوں نشان میرے بدن پر دیکھنے کو مل جائیں گے تمہیں، مگر میں اور نشان تمہیں نہیں دکھا سکتی، کیوں کہ اب مجھ سے کپڑے نہیں اُتارے جائیں گے...... کپڑے پہنتے وقت میں بڑی اذیت سے گزری ہوں...... اب اگر اُتاروں گی تو مجھے کتنی تکلیف ہوگی؟ اس کا تمہیں اندازہ نہیں ہے، اس لیے خدا کے لیے واپس چلے جاؤ آفتاب بابو! لوٹ جاؤ اپنی دنیا میں، جا کر اپنی بہنوں کی شادیوں پر سوچو، مجھ پر اب سوچنا چھوڑ دو۔ اب مجھ میں اور اماں کی قبر میں کوئی فرق نہیں۔''

''پر رضیہ؟''

''کیا رضیہ رضیہ لگا رکھی ہے۔ کیا تم جاننا چاہتے ہو؟ جو مجھ پر بیتی ہے؟ کیا تم میں سننے کا حوصلہ ہے۔'' میں ایک دم چیخ کر بولی۔

''رضیہ! پتا ہے میں تم کو کتنا چاہتا ہوں؟'' آفتاب پیار جتاتے ہوئے بولا۔

''مجھے بہت چاہتے ہو؟ اس لیے سر جھکائے بیٹھے ہو نا...... خیر کوئی بات نہیں، آخر کو تم مجھے بہت چاہتے رہے ہو، اس لیے اب تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہیے...... تو سنو......''

پھر اماں اور میرے ساتھ جو کچھ بیتی تھی میں نے وہ صاف صاف بتا دیا۔ میں نے اس سے کچھ نہ چھپایا اور میں چھپا بھی کیا سکتی تھی؟ اب میرے پاس بچا ہی کیا تھا؟

میں نے سب کچھ بتانے کے بعد آفتاب کی طرف دیکھا۔ آفتاب کا چہرہ جھکا ہوا ہی تھا۔ میں اس کے جھکے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں اب بولو۔ خاموش کیوں ہو گئے؟ اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم دونوں مل کر ان انسان نما درندوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ تم تو مرد ہو، طاقت ور ہو...... میں تمہارے ساتھ ہوں۔ آفتاب! میری طرف دیکھو۔'' لیکن آفتاب کا سر جھکا ہی رہا...... ''اب تمہارا سر اُٹھ کیوں نہیں رہا؟ جواب دو نا؟'' آفتاب نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف نمایاں تھا۔ وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''رضیہ! وہ ڈاہڈے لوگ ہیں اور ہم غریب لوگ۔ ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم ان کا کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں بھلا؟ وہ اس علاقے کے وڈیرے ہیں اور ہم غریب لوگ...... میرے ماں باپ بوڑھے ہو چکے ہیں اور میری بہنیں جوان ہو چکی ہیں۔ میں واحد ان کا سہارا ہوں اور میں نے ہی ان کی شادیاں کرنی ہیں۔''

آفتاب نے اتنا کہنے کے بعد دوبارہ سر جھکا لیا۔ میں جواب میں غصے سے بولی۔ ''اگر تمہیں اپنے رشتوں کا اتنا ہی خیال تھا تو آ کر میرے کندھے پر ہاتھ کیوں رکھا؟ مجھ سے محبت کیوں کی تھی تم نے؟ اور اب یہاں کیوں آئے ہو تم؟ مجھ سے ہمدردی کرنے یا مجھ پر ترس کھانے کے لیے؟ چلے جاؤ یہاں سے، مجھے تمہاری ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تمہاری بہنیں جوان ہو چکی ہیں، جب تمہیں پتا تھا کہ تمہاری بہنیں جوان ہو چکی ہیں تو پھر تم نے مجھ سے محبت کیوں کی؟ کیوں میرے عاشق بنے تم؟ جاؤ...... چلے جاؤ...... تمہاری بہنیں اب جوان ہو چکی ہیں، تم نے ان کی شادیاں کرنی ہیں، تمہارے ماں باپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ مجھے تو ایسے بتا رہے ہو جیسے مجھے کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ میری بوڑھی ماں کو قتل کر دیا گیا اور زبردستی پانچ انسان نما درندوں نے میری عزت لوٹی...... وہ تمہیں یاد نہیں؟ اپنے رشتے بڑے یاد ہیں...... واہ آفتاب بابو واہ...... اُٹھو اور چلے جاؤ میری نظروں کے سامنے سے...... دور ہو جاؤ...... میں مزید اب تمہیں اپنے سامنے بیٹھا نہیں دیکھ سکتی۔ چاہے تم مجھ سے جتنی بھی محبت کرتے رہے۔ تمہاری محبت میری ماں کے قتل اور میری عزت لٹنے سے پہلے تک تھی، لیکن اب نہیں ہے، اس لیے...... میں اپنی آنکھیں بند کر رہی ہوں، جب میں آنکھیں کھولوں تو تمہیں اپنے سامنے نہ دیکھوں اور اب میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور یہاں سے دور چلے جاؤ۔''

میں نے روتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں، کچھ دیر کے بعد جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو میرے سامنے آفتاب نہیں تھا، وہ اپنے گھر کی طرف جا چکا تھا...... میں اماں کی قبر کے پاس سے اُٹھی...... آسمان کی طرف دیکھا تو شام ہو چکی تھی، پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کی جانب اُڑے چلے جا رہے تھے، میں نے قبر میں سوئی ہوئی ماں کو خدا حافظ کہا اور بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے قبرستان سے باہر آ گئی۔

☆......☆

گاؤں کی طرف جانے والا رستہ کسی لٹی ہوئی بیوہ کے نصیب کی طرح اُجڑا ہوا لگ رہا تھا۔ میں اس سنسان رستے پر چلتی ہوئی جب گاؤں کی حدود میں داخل ہوئی تو

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

رات ہو چکی تھی۔ اندھیرا گاؤں کی گلیوں میں پوری طرح سے پھیل چکا تھا۔ میں چلتی ہوئی اپنے گھر کی گلی میں آ گئی...... گلی میں مجھے کوئی نہ ملا...... شاید سردی کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے، میں اپنے گھر کے سامنے آ کر رُکی اور جب باہر والے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا۔ میں باہر والا دروازہ کھول کر صحن میں آ گئی۔ تھوڑی دیر صحن میں کھڑی ہو کر بھیگی آنکھوں سے اپنے گھر کے در و دیوار کو دیکھتی رہی، پھر چلتی ہوئی کچے کوٹھے کے دروازے کے پاس آ گئی۔ کوٹھے کے دروازے کو کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں نے کنڈی کھولی اور کوٹھے کے اندر داخل ہو گئی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔

جس چارپائی پر میں سوتی تھی، اس پر آ کر بیٹھ گئی اور کچھ دیر میں سوگوار حالت میں بیٹھی رہی۔ جب میرے حواس کام کرنے لگے تو میں نے اُٹھ کر ماچس تلاش کی، پھر اس سے لالٹین جلائی۔ روشنی ہو جانے کے بعد میں پھر خاموشی سے اپنی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی، میری آنکھوں کے سامنے اماں کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ اماں کی خالی چارپائی دیکھ کر میں نے رونا چاہا، پر میری آنکھوں نے رونے سے انکار کر دیا۔ میری آنکھیں تو پہلے ہی رو رو کر تھک چکی تھیں، میں بھی تھک کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس وقت اماں مجھے شدت سے یاد آ رہی تھی...... میں اماں کے قتل پر بہت افسردہ تھی...... میری ہر سانس میں سوگواریت تھی۔ میری بوڑھی اماں کو قتل کرنے والے بہت بڑے ظالم تھے۔ میں بھی ان کے ظلم کا شکار ہو چکی تھی۔ انہوں نے بڑی بے رحمی سے مجھے اپنی بربریت کا نشانہ بنایا تھا۔ میں گھنٹوں ان ظالموں کی بے رحمی پر سوچتی رہی، پھر نجانے کب میری آنکھیں بند ہوئیں اور میں سو گئی......

☆......☆

اگلے دن میں سو کر اُٹھی تو مجھے لگا کہ میں بہت کمزور ہو گئی ہوں۔ جسمانی درد سے میرا بُرا حال تھا۔ اس درد کے علاوہ میرا پیٹ بھی خالی تھا۔ بھوک سے مجھ پر تھوڑی تھوڑی نقاہت سی طاری ہو رہی تھی۔ میں چارپائی سے اُٹھی تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ گیا۔ میں نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔ جب میری آنکھوں کے آگے آیا اندھیرا چھٹ گیا، تو میں چلتی ہوئی کچے کوٹھے سے باہر آئی اور کوٹھے پر ایک الوداعی نظر ڈالی۔ شاید میں اپنے گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہی تھی۔ میں چلتی ہوئی گھر سے باہر آ گئی، پھر باہر آ کر میں نے گھر کے در و دیوار پر آخری الوداعی نظر ڈالی اور گلی میں چل پڑی۔ میں اس گھر کو چھوڑ کر جا رہی تھی جس گھر میں اماں نے مجھے جنم دیا تھا اور ابا نے مجھ سے شدید پیار کیا تھا۔ جہاں انہوں نے میرا نام رضیہ رکھا تھا، بعد میں اماں نے پیار سے مجھے رضیہ سلطانہ بنا دیا تھا۔ اماں کو جب مجھ پر بہت زیادہ پیار آتا تھا تو مجھے پیار سے کہتی تھی کہ ”تُو تو ہماری رضیہ سلطانہ ہے۔ ہمارے دلوں کی سلطنت پر حکمرانی کرنے والی۔“ اب اُس رضیہ سلطانہ کا اس دنیا میں اللہ کے سوا کوئی نہ تھا۔ میں نے چلتے ہوئے گاؤں کے کسی گھر کی طرف غور سے نہ دیکھا تھا۔ گھروں کے دروازے کھلتے رہے اور مجھے دیکھ کر چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ میں نے گاؤں والوں کی باتوں پر ذرا نہ سوچا، بلکہ اس طرف کوئی دھیان ہی نہ دیا اور سر جھکائے چلتی ہوئی گاؤں سے باہر آ گئی۔

میں پیچھے ہر زبان پر اپنا نام چھوڑ آئی تھی۔ مجھے اب اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ کون مجھ پر کیا سوچ رہا ہے اور میرے متعلق کیا باتیں ہو رہی ہیں...... میں گاؤں کے لوگوں کے لیے ایک تماشا بن گئی تھی، جس نے مجھے دیکھا وہ تماشائی بن گیا تھا اور تماشائی ہی میرے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ وہ باتوں کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہ سکتے تھے۔ میں ان بزدلوں کو اپنے اُوپر ہونے والی بربریت کی داستان نہیں سنانا چاہتی تھی اور اگر سناتی بھی تو وہ کیا کر لیتے؟ آفتاب میرے لیے کیا کر سکا؟ جو مجھ سے شدت کی محبت کرتا تھا۔ کیا کر لیا اس نے؟ کچھ بھی تو نہیں، وہ تو صرف مجھے اپنی مجبوریوں کے دُکھڑے سنانے لگا۔ اس نے آگے کی سوچی، وہ عقل مند تھا۔ میں یہی کچھ سوچتے ہوئے چلتی رہی، اب گاؤں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

اب میری آنکھوں میں گاؤں کے تمام نقش و نگار آنسوؤں سے مٹتے جا رہے تھے۔ آفتاب کی محبت کا کبوتر میرے ہاتھوں میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ آخر میں نے اس کی گچی مروڑ دی۔ میں آفتاب کی محبت کو اس طرح مار کر افسردہ نہ تھی۔ مجھے اس بات کا دُکھ ضرور تھا کہ آفتاب نے میرا ہاتھ نہ تھاما۔ مجھ پر بہت ظلم ہوا۔ میرے ساتھ بربریت کی تاریخ دہرائی گئی۔ اُسے تو چاہیے تھا کہ وہ میرا ساتھ دیتا، میرا ہاتھ تھامتا اور میرا سہارا بنتا۔ ان درندوں سے میری بے عزتی کا بدلہ لیتا، لیکن اب اسے اپنی بہنوں کی جوانیوں کا خیال آ گیا۔ پہلے اس نے مجھ سے اپنی بہنوں کی شادیوں کا ذکر تک نہ کیا تھا۔ میں تھی کہ بس سوچتے ہوئے چلتی رہی، پھر سوچوں کے سلسلے دراز ہوتے چلے گئے، جو آفتاب سے شروع ہوئے اور آفتاب پر ہی ختم ہو گئے۔

میں آفتاب کو اپنے دل سے نکال کر پیچھے قبرستان میں پھینک آئی تھی۔ اب میں آفتاب کو مکمل طور پر بھول چکی تھی۔ اب میں نے خود سے پوچھنا شروع کیا۔

”یہ آفتاب کون ہے؟“

اس کا جواب تھا۔ ”کون آفتاب؟ میں کسی آفتاب کو نہیں جانتی۔ کوئی ہوگا ہرجائی، بے وفا، لیکن میں اُسے نہیں جانتی، آئندہ مجھ سے آفتاب کے متعلق کچھ نہ پوچھنا۔ میں آفتاب نامی کسی شخص کو نہیں جانتی۔ سمجھی۔“

میرے قدم چل چل کر تھک گئے تھے اور پیٹ کی بھوک بھی پہلے سے بڑھ گئی تھی، شام ڈھل رہی تھی۔ میں تمام دن چلتی رہی تھی۔ کافی دور چلنے کے بعد راستے کے ساتھ آگے بیری کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے سورج کو مغرب کی جانب ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ ایک اور رات اپنا خاتمہ کرانے کے لیے آنے والی تھی۔ میں نے اب آنکھیں گھما کر شمال کی طرف دیکھا تو شام کے سرمئی اندھیرے میں مجھے نمبردار خداداد کا ڈیرہ نظر آ رہا تھا۔ میرے قدم ایک بار پھر اسی جانب کو اُٹھنے لگے جہاں میرے ننگے بدن کو بھنبھوڑا گیا تھا۔

نمبردار خداداد کا ڈیرہ قریب آتا جا رہا تھا۔ میں جب اس کے ڈیرے میں داخل ہوئی تو نمبردار کے ڈیرے میں بیٹھے کارندوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ ان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنے قدموں سے چل کر دوبارہ ڈیرے پر آ گئی ہوں...... نمبردار خداداد کے ڈیرے پر کبھی اپنی مرضی سے چل کر کہاں کوئی لڑکی آئی ہوگی۔ شاید اب میں لڑکی نہیں رہی تھی، کیوں کہ اب میں ایک عورت بن چکی تھی۔

انو نے مجھے دیکھا تو خوشی سے ناچنے لگا۔ نمبردار کے تمام کارندے مجھے دیکھ کر اور ساتھ انو کو ناچتے دیکھ کر خباثت سے مسکرا رہے تھے۔ میں چپ کھڑی ان خبیثوں کو دیکھے جا رہی تھی، پھر یکدم انو نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ گیس لیمپ کی روشنی ڈیرے کے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں ناچتے ہوئے انو مجھے بالکل بھوت کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کے نعرے کی آواز بڑے کمرے میں پہنچی تو دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا شوکا مچھل تھا۔ میں نے شوکا کو دیکھا تو نفرت سے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ شوکا نے مجھے حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ انو شوکا کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر خوشی سے چلّایا۔ اوئے شوکے! دیکھ تو سہی، اپنی شہزادی واپس لوٹ آئی ہے۔ شوکا چل کر میرے قریب آیا، پھر اس نے مجھے ہلا جلا کر دیکھا۔ اسے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں واپس آ گئی ہوں، جب اسے یقین آ گیا تو وہ خوشی سے ہنسنے لگا۔

اگر وہ چوہدری طالب کا خاص بندہ نہ ہوتا تو وہ بھی انو کی طرح خوشی سے ناچنے لگتا۔ نمبردار خداداد کے تمام کارندے مجھے حریص نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایسے ہوس زدہ درندوں کی نظروں کی اب کوئی پروا نہ تھی۔ اب میرے پاس بچا ہی کیا تھا؟ ایک اماں تھی جو قتل ہو گئی اور دوسرا آفتاب تھا جو اپنی مجبوریوں کا رونا رو کر مجھ سے جان چھڑا چکا تھا۔

میں اسے اپنے من سے نکال کر پیچھے گاؤں کے قبرستان میں پھینک آئی تھی۔ میں بہت تھکی ہوئی تھی۔ مجھے آرام کی ضرورت تھی۔ میں نے شوکا کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں میرے بدن کی ہوس بیدار ہو چکی تھی۔ میں شوکا کے پاس سے گزر کر بڑے کمرے میں آ گئی اور آ کر گر سی گئی۔ میرے پیچھے شوکا مچھل بھی اندر آ گیا اور اس کے پیچھے انو اور نمبردار خداداد کے پانچ کارندے بھی آ گئے۔ ”ان سب کو باہر نکالو۔“ میں نے شوکا کو حکم دیا۔ اس نے سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا تو سب مجھے گھورتے ہوئے کمرے سے باہر جانے لگے، لیکن انو دروازے پر ہی کھڑا ہو گیا۔ ”تُو بھی باہر چل میراثی کی اولاد۔“ شوکا انو کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر حقارت سے بولا تو انو بھی باہر چلا گیا۔

کمرے میں دو گیس لیمپ جل رہے تھے، شوکا مچھل اُٹھا اور اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا پھر واپس میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں پرانے طرز کے بنے اس

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کمرے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ کمرے کی چھت کے قریب ہی ایک بڑا روشن دان تھا، اتنا بڑا روشن دان کہ اس سے انسان آسانی سے گزر سکتا تھا۔ میں اتنے بڑے روشن دان کو دیکھ کر حیران تھی کہ آخر اس کا کیا فائدہ ہے، اور اس کی یہاں کیا ضرورت ہے؟ اس کے علاوہ کمرے کی چھت اتنی اونچی بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں کمرے کو چاروں طرف سے دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی کمرہ تھا، جس میں مجھے رکھ کر بربریت کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

میں نے اُس رات پر سوچا تو مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ شوکا کے ہاتھ میرے وجود کی طرف بڑھے تو میں اس کے ہاتھ کو پیچھے ہٹا کر بولی۔ ''شوکے! میں اپنے ہاتھوں سے کپڑے اُتار دوں گی، کچھ صبر تو کرو۔ میں اپنے گاؤں سے پیدل چل کر اتنی دور سے یہاں تک آئی ہوں۔ اس وقت میں بہت تھکی ہوئی ہوں، مجھے آرام کی بہت سخت ضرورت ہے، اس لیے تم ابھی جانور مت بنو۔ تمہیں اب جو کچھ کرنا ہے، انسان بن کر میرے ساتھ کرنا، میں تم کو بالکل منع نہیں کروں گی...... لیکن مجھ پر اب جسمانی تشدد بالکل نہ کرنا۔ میں بہت تھک کر آئی ہوں اور اب میں صرف تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ تمہاری جو مرضی میرے ساتھ برتاؤ کرو، میں جواب میں کوئی مزاحمت نہیں کروں گی۔'' یہ سن کر شوکا کے بڑھتے ہوئے ہاتھ پیچھے کو ہٹ گئے اور اس کی آنکھوں میں ہوس بھی کم ہونے لگی۔

میں جانتی تھی کہ اس کی ہوس کبھی ختم نہیں ہوگی۔ شوکا مچھل ایک انتہائی درجے کا کمینہ اور بے غیرت آدمی تھا۔ وہ میری اماں کا قاتل تھا، لیکن میں اس قاتل کی جھولی میں خود ہی پکے ہوئے آم کی طرح آ گری تھی۔ میں اور کیا کرتی؟ اس کے علاوہ تو خودکشی ہی بچی تھی، لیکن خودکشی سے کئی گنا بڑی موت تو میں مر چکی تھی۔

وہ نمبردار خداداد کا بندہ...... وہ...... کون؟ شمشیر! ہاں...... وہ نظر نہیں آ رہا۔ میں نے شوکا سے پوچھا۔ ''وہ شرما جی کے ساتھ انڈیا کا پھیرا لگانے گیا ہے، کل پرسوں تک واپس آ جائے گا۔ اس کی وجہ سے تو میں اور اتو یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ آئے گا تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ نمبردار خداداد نے ہمیں یہاں اسی لیے روک لیا ہے۔''

شمشیر انڈیا سے مال لے کر آئے گا اور پھر شاید ہمیں کراچی کا چکر لگانا پڑے۔ وہ جب بھی انڈیا سے مال لے کر آتا ہے تو ہمیں کراچی ضرور جانا پڑتا ہے۔ ہم بڑے خبیث لوگ ہیں۔ تم واپس ہمارے پاس کیا سوچ کر آ گئی ہو؟'' وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ میں جواب میں شوکا کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''تم یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہے ہو؟'' میں نے اس سے کہا۔

''بس ویسے ہی، وقت گزاری کرنے کے لیے۔ ہمارا چوہدری تو واپس گاؤں چلا گیا ہے اور نمبردار خداداد اپنی حویلی میں بیٹھا جام پر جام چڑھا رہا ہوگا۔ شکر کرو کہ تم شام کے بعد آئی ہو اور وہ شام سے کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے گیا ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو تمہاری خیر نہیں ہونی تھی۔'' میں شوکا کی باتوں کو خاص توجہ سے نہیں سن رہی تھی۔ میں تو اس وقت کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔

''شوکے! اب میں مکمل طور پر تمہارے حوالے ہوں، تم میرے ساتھ جو جی چاہے کر سکتے ہو۔ میں تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہوں؟ کچھ بھی نہیں۔ میں واپس بھلا کیوں آئی ہوں؟ کیوں کہ میں اب کسی کے قابل نہیں رہی...... اب مجھے کوئی نہیں اپنا سکتا۔ اب میں صرف تمہاری بن کر رہنا چاہتی ہوں۔ یہاں تمہارے علاوہ مجھے کوئی تحفظ نہیں دے سکتا۔ بھلے تم مجھ سے شادی نہ کرو، لیکن مجھے دوسرے لوگوں سے بچا لو۔ مجھے تم صرف اپنے لیے حاصل کر لو، میں تمہاری لونڈی بن کر تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تم مجھے صرف اتنی عزت دے دو۔ کیا تم میرے لیے اتنا نہیں کر سکتے؟ تم لاکھ بُرے سہی، لیکن مجھے اچھے لگے ہو۔'' میں اب لڑکی سے عورت بن چکی تھی۔ شوکا مچھل پوری طرح سے میری پیار بھری باتوں کے حصار میں آ چکا تھا۔ میری زبان سے ادا ہونے والے الفاظ نے اس پر جادو سا کر دیا تھا۔ اب تو شوکا یہ تک بھول گیا تھا کہ اس نے میری اماں کو قتل کیا ہے۔ میری اماں کا قاتل اب میرا اسیر ہو چکا تھا۔ یہی تو میں چاہتی تھی، شوکا مجھے اپنا بنا کر سرشار تھا اور میں اسے اپنے جال میں گھیر کر خوش تھی، اس کے منہ سے شراب کی بُو مجھے سخت ناگوار لگی، پَر میں نے اس پر ظاہر نہ ہونے دیا اور میں نے مکمل طور پر خود کو شوکے مچھل کے حوالے کر دیا۔

☆......☆

اگلے دن جب میں سو کر اُٹھی تو میں شوکا کو تسخیر کر چکی تھی۔ وہ میرے جھوٹے پیار کا مکمل طور پر غلام بن چکا تھا۔ زندگی میں اس سے کسی نے اتنی پیار بھری باتیں نہ کی ہوں گی جتنی میں نے گزری رات کو کی تھیں۔ چوں کہ میں اب مزید اپنے وجود کی توڑ پھوڑ نہیں چاہتی تھی، اسی لیے تو میں نے شوکا کی آڑ لی تھی اور اس کی صورت میں مجھے کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی، کیوں کہ اس طرح میں نمبردار خداداد کے دوسرے کارندوں کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچ گئی تھی۔ اب شوکا کے علاوہ میرے بدن کی طرف کسی کے ہاتھ نہ بڑھے تھے۔ نمبردار کے ڈیرے پر مختلف گاؤں کی لڑکیاں اُٹھا کر لائی جا رہی تھیں...... ان درندوں کی بربریت میں اب کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ روزانہ اپنے جیسی حوا کی بیٹیوں کی تذلیل دیکھ دیکھ کر مجھے مردوں سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ اب اس کے علاوہ مجھے کوئی گھور کر دیکھتا تو میں اُسے گالیوں سے نوازتی تھی۔ میں جنہیں گالیاں دیتی وہ میری گالیاں سن کر خباثت سے مسکراتے رہتے۔ میں اب ہر وقت شوکا مچھل کے ساتھ ہوتی تھی۔

جب شوکا مچھل کراچی چلا جاتا تو میں چوہدری طالب اور نمبردار خداداد کے ڈیرے کے کسی کمرے میں خود کو قید کر لیتی۔ کسی سے کوئی بات نہ کرتی، اپنے آپ میں گم رہتی۔ سب لوگ مجھے ذہنی مریضہ سمجھنے لگے تھے۔ میں جو پلان اپنے گاؤں سے سوچ کر آئی تھی، اس میں مجھے کافی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ شوکا مچھل سے تو مجھے سب سے زیادہ نفرت تھی، مگر میں اس کے ساتھ رہنے پر مجبور تھی۔ میں ان درندوں کے غول میں دوبارہ ایسے ہی نہیں آئی تھی، بلکہ بہت کچھ سوچ سمجھ کر آئی تھی۔ میرے جینے کا مقصد تو فوت ہی ہو چکا تھا، لیکن میں مرنے سے پہلے ان تمام درندوں کا بھی خاتمہ کرنا چاہتی تھی۔ ان تمام لوگوں کو جہنم میں پہنچانے سے پہلے میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

میرے ہاتھ میں تھا ہی کیا، میں خود بڑی کمزور سی عورت تھی، پَر میرے ارادے بڑے پختہ تھے۔ یہاں رہ کر اب میری آنکھوں میں انتقام کے شعلے اور بھی تیزی سے بھڑکنے لگے تھے۔ میں ان تمام بھیڑیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتی تھی۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں ان تمام درندوں کی بوٹی بوٹی کر دیتی، لیکن میرے ہاتھوں میں ابھی اتنی طاقت کہاں تھی؟ میں بے سہارا تھی اور مجھے کوئی سہارا نہیں مل رہا تھا۔ شوکا مچھل میری عزت لوٹ رہا تھا اور میں لُٹ رہی تھی، میں اس لیے لُٹ رہی تھی کہ میں تو پہلے ہی لُٹ چکی تھی۔ لُٹ لُٹ کر اب مجھ میں اتنا حوصلہ پیدا ہو چکا تھا کہ وقت آنے پر میں ان میں سے کئی ایک کو مار سکتی تھی۔ میں ان سب کو مارنا چاہتی تھی جنہوں نے مجھے اپنی درندگی کا نشانہ بنایا تھا۔

میں نے شوکا مچھل سے پستول اور بندوق چلانا سیکھ لی تھی۔ شوکا اب میرے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے اپنے پیار کا اس پر اس طرح سے جادو جگایا تھا کہ میں جب چاہتی اس کے دل میں خنجر گھونپ سکتی تھی۔ اب میں اسے باآسانی مار سکتی تھی، لیکن میں صرف اسے ہی نہیں بلکہ ان تمام درندوں کو مارنا چاہتی تھی۔ مجھے ان کے پاس رہتے ہوئے قریباً چھ ماہ ہو چکے تھے۔

شوکا مجھ سے درجنوں بار شادی کا کہہ چکا تھا، لیکن میں اسے پیار سے انکار کر دیتی اور اس سے کہتی کہ ''شادی میں کیا رکھا ہے؟ ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں۔ ٹھیک ٹھاک عیاشی ہو رہی ہے۔ ہمیں شادی کی ضرورت ہی کیا ہے؟'' میں چھ ماہ کے عرصے میں شوکا ہی نہیں، بلکہ نمبردار خداداد اور چوہدری طالب کا بھی اعتماد حاصل کر چکی تھی۔ یہ تمام لوگ مجھ پر پورا اعتبار کرنے لگے تھے، بلکہ مجھے اپنا ساتھی سمجھتے تھے۔ اس لیے مجھ سے اپنا کوئی راز نہ چھپاتے تھے۔ میں واحد لڑکی تھی جو ان کے ہمراہ رہتی تھی اور ان کو اپنے مفید مشوروں سے نوازتی۔ ان کے درمیان اپنا مقام بنانے میں مجھے ایک عرصہ لگا تھا اور اس دوران میں بڑی اذیت سے گزری تھی۔

شوکا مچھل میرے بدن سے کھیلتا رہا۔ میں نے اسے کبھی نہیں روکا تھا...... میں اسے روکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں اسے اپنا دیوانہ بنا چکی تھی۔ یہی تو میں چاہتی تھی، میری آنکھوں میں انتقام کی آگ بھڑک بھڑک کر الاؤ بن چکی تھی۔ میں شمشیر کو دکھا دکھا کر شوکا سے اپنی عزت لٹاتی رہی تھی۔ میں شوکا کو نمبردار خداداد کے ڈیرے پر ہفتے میں دو تین بار ضرور لے جاتی تھی اور شمشیر کو دکھاتی تھی کہ دیکھے کسی بے بس لڑکی کی عزت اس طرح لٹتی ہے۔ وہ مجھے شوکا کے ساتھ دیکھتا تو نفرت سے منہ پھیر لیتا۔ وہ ڈیرے پر ہمیں دیکھ کر ایک پل نہ ٹھہرتا تھا۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ ایسا کیوں کرتا تھا؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ عزت میری لٹتی تھی تو اسے کیا تکلیف ہوتی تھی؟ اس سے ضبط کیوں نہیں ہوتا تھا؟ شمشیر کے لیے ہی تو میں نے خود کو زندہ رکھا ہوا تھا، اس کے لیے ہی تو میں واپس ان درندوں کے پاس آئی تھی اور اس کے لیے ہی میں نے خود کو شوکا کے حوالے کیا تھا، تاکہ وہ مجھے لٹتا دیکھے۔ وہ مجھے لٹتا دیکھ رہا تھا اور مجھ سے نفرت کر رہا تھا۔ میں اس کی نفرت کو انتہا پر لے جانا چاہتی تھی...... مجھے اس دن کا انتظار تھا جب شمشیر کی نفرت نے انتہا کو چھو لینا تھا۔ میں نے اُس دن کے لیے ہی تو خود کو ذلت کے گڑھے میں گرایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ذلت کے اس گڑھے سے ایک نہ دن شمشیر ہی نے مجھے نکالنا تھا۔ اس ظالم کی خاطر ہی تو میں نے خود کو زندہ رکھا ہوا تھا اور واپس ان جانوروں کے جنگل میں آ گئی تھی۔

☆......☆

ان دنوں شوکا اور انو مال لے کر کراچی گئے ہوئے تھے۔ میں نمبردار خداداد کے ڈیرے پر تھی اور ڈیرے کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔ میری سوچوں کا مرکز اس وقت شمشیر تھا۔ مجھے پہلی نظر میں ہی وہ بہت اچھا لگا تھا، لیکن اب تو مجھے اور بھی زیادہ اچھا لگنے لگا تھا۔ جب شوکا کراچی چلا جاتا تو میں خود کو کمرے میں قید کر لیتی تھی۔ مجھے کوئی قید نہ کرتا تھا بلکہ میں خود ہی ایسا کرتی تھی اور خود کو کمرے میں بند کر کے دروازے کو دیکھتی رہتی تھی۔ مجھے کسی کا انتظار ہوتا تھا...... جس کا مجھے انتظار تھا وہ دروازے تک ابھی نہیں آیا تھا، لیکن مجھے یقین تھا کہ اس نے ایک نہ ایک دن آ جانا ہی ہے اور اس نے کمرے کے دروازے پر ہی نہیں بلکہ میرے دل کے در پر بھی دستک دینی ہے۔ مجھے اس دن کا شدت سے انتظار تھا، میں انتظار کرتے کرتے ابھی تھکی نہیں تھی اور میں ابھی تھکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ مجھے اُس وقت تک شدت سے اُس کا انتظار کرنا تھا جب تک اس نے آ نہیں جانا تھا۔ مجھے روز محسوس ہوتا تھا کہ اب وہ آنے والا ہے۔

جس دن کا مجھے شدت سے انتظار تھا، آخر وہ دن آ گیا اور دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سے مجھے ایسے لگا کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئی ہیں۔ وہ آ چکا ہے...... دروازے سے زیادہ میرے دل پر دستک ہوئی تھی۔ میں چارپائی سے اُٹھ کر فوراً دروازے کے پاس آئی۔ میں نے کچھ پوچھنے کی بجائے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ باہر شمشیر کھڑا ہوا تھا۔ میں حیرانگی کا بُت بنے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا، جبکہ میرا دل یقین کی طاقت سے دھڑک رہا تھا۔ جو میں روز سوچتی تھی ویسا ہو گیا تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں نے میری آنکھوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی اور بڑی مونچھوں کے اُوپر سرخ سرخ آنکھیں میرے چہرے پر چبھ رہی تھیں۔ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر میں نے اسے اندر آنے کا بولا۔ شمشیر میرے پیچھے چلتا ہوا کمرے کے اندر آ گیا۔ ایک چارپائی پر وہ اور دوسری پر میں بیٹھ گئی۔ ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہی بیٹھ گئے تھے۔ شمشیر بیٹھتے ہی بولا۔ ”میں یہاں تم سے مذاکرات کرنے نہیں آیا ہوں، بلکہ صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ تم شوکا کے ساتھ ہی نہیں، چاہے جس کے ساتھ مرضی ہے تمہاری رہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ پر مجھے دکھا کر نہیں۔ جب میں تمہیں شوکا کے ساتھ دیکھتا ہوں تو مجھے کچھ ہونے لگتا ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ تم جان بوجھ کر مجھے یہ سب کچھ دکھاتی ہو۔ جب میں تمہیں شوکا کے ساتھ دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے اور میں بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتا ہوں۔ جس طرح کی اب میری حالت ہو چکی ہے، کہیں میں تم دونوں کو قتل ہی نہ کر دوں۔ شوکا کے ساتھ تم مجھے بہت بے حیا لگتی ہو۔ دیکھنے سے تو تم مجھے کسی شریف باپ کی بیٹی لگتی ہو، لیکن پھر تمہیں کیا تکلیف ہے؟ جو تم اپنے ماں باپ کی عزت کو خاک میں ملا رہی ہو...... جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا تم اُسے بھول بھی سکتی تھی۔“ میں نے شمشیر کو درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”یہ تم کہہ رہے ہو، مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا، کتنی آسانی سے تم نے یہ سب کچھ کہہ دیا بغیر سوچے سمجھے اور مجھے جانے بغیر۔ یہاں تمہارے آنے کا مقصد کیا ہے؟ جو تم نے ابھی ابھی کہا ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟ میں شوکا کے ساتھ تمہیں بے حیا لگتی ہوں۔ اگر میں تمہارے ساتھ ہوتی تو......“ شمشیر کا ایک زوردار تھپڑ میرے چہرے پر پڑا۔ ظالم کا ہاتھ بڑا بھاری تھا، ایک تھپڑ نے ہی میرا دماغ سن کر دیا۔ میری آنکھوں کے آگے تارے سے ناچ گئے۔ مجھے یہ اُمید نہ تھی کہ شمشیر مجھے تھپڑ مار دے گا۔ میری آنکھوں سے بے بسی کے آنسو بہنے لگے۔ میں سسکتی ہوئی بولی۔ ”تم نے پہلے مجھے بے حیا کہا اور پھر تھپڑ بھی مار دیا، کس لیے؟ تمہیں بے حیا کہنے اور تھپڑ مارنے کا اختیار کس نے دیا ہے؟ میں تمہاری کیا لگتی ہوں؟ میرا تم سے کیا رشتہ ہے؟ کیوں میرے چہرے پر تھپڑ مارا تم نے؟ اس لیے نا کہ میں ایک بے بس اور کمزور عورت ہوں؟ میں تمہارے سامنے لٹتی رہی، بھیڑیے مجھے نوچتے کھسوٹتے رہے، اُس وقت تو تم نے مجھ سے یہ نہ پوچھا کہ میں کون ہوں؟ کس شریف باپ کی بیٹی ہوں؟ اُس وقت تو میری کسی نے آہ و فریاد نہ سنی۔ اب جب کہ میں مکمل طور پر لٹ چکی ہوں تو تم مجھے اپنا وعظ سنانے کے لیے آ گئے ہو۔ اب میرے ہمدرد بن رہے ہو۔ تم اپنی ہمدردی کو اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے تمہاری ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تم کو نجانے کیا سمجھا تھا اور تم کیا نکلے؟ بغیر سوچے سمجھے مجھے بے حیا کہہ دیا۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ مجھے زبردستی اُٹھا کر لایا گیا تھا اور پھر زبردستی میری عزت لوٹی گئی، میں بار بار لوٹی گئی، کیا اُس وقت تم نہیں تھے؟ تمہارے سامنے سب کچھ ہوا، اس وقت تمہارا یہ وعظ کہاں تھا؟ اب میں تم کو بے حیا لگنے لگی ہوں۔“ میں ہذیانی انداز میں ہنسی۔ ”چھوڑو میری بے عزتی اور ذلت کو۔ مجھے یہ بتاؤ، آخر تمہارا مجھ سے رشتہ کیا ہے؟ میں تمہاری کیا لگتی ہوں؟“ میں نے غصے سے پوچھا تو شمشیر کی سرخ آنکھیں مجھے ٹکٹکی باندھے گھورنے لگیں۔ ”مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم شوکا جیسے بدکردار انسان کے ساتھ رہو۔ میں مانتا ہوں کہ تم میری آنکھوں کے سامنے لٹتی رہی ہو اور میں کچھ نہ کر سکا۔ میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا، کیوں کہ میں مجبور تھا۔ میں درندوں کے جنگل میں رہتا ہوں، پر درندہ نہیں ہوں۔ میں نے کبھی ان کا ساتھ نہیں دیا، نجانے کتنی بار انہوں نے مجھے ایسی دعوتوں کے موقعے دیے...... میں ان کا شوکا چھل سے بھی زیادہ خاص بندہ ہوں، لیکن میں ان خرافات سے بہت دُور رہا ہوں...... میرے سامنے سیکڑوں بار لڑکیوں کی عزتیں لٹی ہیں، لیکن مجھے کبھی کسی پر رحم نہ آیا...... لیکن تمہارے چہرے میں نجانے کیا ایسا ہے کہ میں تم پر نہ سوچتے ہوئے بھی سوچنے لگتا ہوں...... تم لٹتی ہو تو مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔ تمہاری آنکھیں میری آنکھوں سے بہت کچھ کہتی ہیں۔ تم میری کیا لگتی ہو؟ تم نے مجھ سے یہی پوچھا ہے نا؟ میں نہیں جانتا تم میری کیا لگتی ہو؟ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم میری کچھ نہ کچھ ضرور لگتی ہو۔ میرا تم سے کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے دل میں تمہارے لیے نفرت کا جذبہ ہو، آخر تم ہو کون؟ مجھے اپنے متعلق بتاؤ۔ میں تمہارے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں؟“ یہ کہہ کر شمشیر چپ ہو گیا۔ میں چند لمحے چپ رہنے کے بعد اسے بتانے لگی اور پھر جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا، وہ میں نے شروع سے لے کر آخر تک شمشیر کو بتا دیا۔ میں نے شمشیر سے کچھ بھی نہ چھپایا تھا۔ پہلے آفتاب کو اپنی لٹی عزت کا نوحہ سنایا تھا اور اب شمشیر کو بھی سنا دیا تھا۔ سنانے میں حرج ہی کیا تھا؟ میں نے تو اپنے دل کی بھڑاس نکال دی تھی۔ شمشیر کی سرخ آنکھیں میری بھیگی آنکھوں کے سامنے جھکیں تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے شمشیر نادم ہے۔ شاید یہ میرا خیال تھا۔ وہ چوہدری خداداد کا خاص بندہ تھا۔ اس کو بھلا مجھ سے کیسے ہمدردی ہو سکتی تھی؟ لیکن اس کی آنکھیں؟ شمشیر سر جھکائے ندامت سے بولا۔

”میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ مجھے تم کو اس طرح تھپڑ نہیں مارنا چاہیے تھا...... پتا نہیں کس جذبے کے تحت میں نے تم کو تھپڑ مار دیا۔ میں نے تم پر کوئی بُری نظر تو نہیں ڈالی، ایک تھپڑ ہی تو مارا ہے۔ خیر جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا مجھے اس کا دُکھ ہے۔ یہ دُکھ والا جذبہ زندگی میں پہلی بار میرے دل میں بیدار ہوا ہے۔ تمہاری کہانی سن کر میرا دل افسردہ ہے، میں پہلے کبھی اتنا افسردہ نہیں ہوا تھا، اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“ شمشیر چارپائی سے اُٹھتے ہوئے اُداس لہجے میں بولا۔ پہلے تو مجھے اس کا آنے کا یقین نہیں آ رہا تھا اور اب اس کے دل کو یوں موم ہوتے دیکھ کر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کیا یہ وہی شمشیر ہے، جب مجھے اُٹھا کر لایا گیا تھا تو اس نے مجھے بڑی ناگواریت سے دیکھا تھا۔ اب وہی شمشیر میری دُکھ بھری کہانی سن کر اتنا غمگین ہو چکا تھا کہ وہ مجھے اپنا نجات دہندہ لگ رہا تھا۔ جانے سے پہلے وہ بولا۔ ”آج کے بعد تم مجھے شوکا چھل کے ساتھ نظر نہیں آؤ گی، بلکہ میرے ساتھ نظر آؤ گی، مجھے تم اچھی لگتی ہو۔“ اتنا کہہ کر وہ دروازے سے گزر کر باہر جا چکا تھا۔ مجھے مبہوت و محجوب چھوڑ کر۔ میری آنکھوں کے آگے ابھی تک اس کے سر کے بڑے بڑے بال اُڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ کب کا جا چکا تھا، یقیناً وہ

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرے پاس کسی اور مقصد سے آیا ہوگا، لیکن اب وہ مجھے اپنی زندگی کا مقصد بنا کر چلا گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی ملاقات میں اتنا بڑا فیصلہ کر کے، مجھے تو وہ حیران کر گیا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو بند نہیں ہو رہے تھے۔ شمشیر نے جاتے سمے جو کچھ مجھ سے کہا تھا، یہ آنسو اُس کا خراج تھے۔ میرے یہ آنسو تشکر کے تھے...... مجھے ایک ایسے مرد کا ساتھ مل رہا تھا جو حقیقت میں ایک مرد تھا اور اُس میں وہ تمام صفات تھیں، جو ایک انسان میں ہو سکتی ہیں۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ شمشیر جاتے وقت جو کچھ کہہ گیا، اس پر تو مجھے بالکل ہی یقین نہیں آ رہا تھا، لیکن مجھے اس پر یقین کرنا تھا، کیوں کہ اب میرے دل کو محسوس ہو چکا تھا کہ مجھے شمشیر کے مضبوط بازوؤں کا سہارا مل جائے گا، بلکہ مل چکا ہے۔

میں یہی تو چاہتی تھی...... میں دوبارہ ان درندوں کے اس جنگل میں شمشیر کے لیے ہی تو واپس آئی تھی۔ گو کہ میرا زندہ رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن میں ایسی بزدلی کی موت نہیں مرنا چاہتی تھی۔ مجھے زندہ رہنے اور اپنے اُوپر ہونے والے ظلم کا انتقام لینے کے لیے شمشیر جیسے ہی مرد کا سہارا چاہیے تھا۔ اب مجھے شمشیر کے مضبوط بازوؤں کا سہارا مل چکا تھا۔ میں شمشیر کو جیت چکی تھی اور میں شمشیر کی نیام بننے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اب میں نے شمشیر کو اس نیام سے باہر نکالنا تھا، تا کہ شمشیر بے نیام ہو کر ان درندوں کو کاٹنے لگے، جنہوں نے میری اماں کو قتل کیا تھا اور مجھے اپنی درندگی کا نشانہ بنایا تھا۔ میں ان کو تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ میرے خیالات آگ کی طرح تپ چکے تھے اور میری آنکھوں میں انتقام کے الاؤ جل اُٹھے تھے۔

☆......☆

اب مجھے شوکا کے آنے کا انتظار تھا، آخر شوکا چھل بھی کراچی سے آ گیا۔ اس دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسم کافی خوشگوار تھا۔ شوکا نے آتے ہی مجھے بانہوں میں لینا چاہا تو میں چکنی مچھلی کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی۔ شوکا قہقہہ لگا کر بولا۔ ”اچھا تو اب تم مجھ سے بدلہ لے رہی ہو۔ بہت دنوں کے بعد آیا ہوں نا، اس لیے مجھ سے مخول کر رہی ہو۔ اب غصہ تھوک بھی دو۔ باہر تو دیکھو موسم کتنا پیارا ہو رہا ہے اور تم ایسے موسم میں......؟“ میں غصے سے بولی۔ ”میرے قریب مت آؤ، میں تم سے شدید نفرت کرتی ہوں۔“ شوکا کے میری طرف بڑھتے قدم ایک دم رُک گئے۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں پھڑکنے لگیں۔ اس کے چہرے پر نفرت عود کر آئی اور نفرت سے اس کی آنکھیں کچھ اور بھی بڑی ہو گئی تھیں۔ اس کو مجھ سے اس بات کی کہاں اُمید تھی کہ میں اس کی اتنی ہتک کر دوں گی۔ وہ نفرت سے چلایا۔ ”سالی! بے حیا، کنجری، مجھ سے کہہ رہی ہو کہ میرے قریب نہ آؤ، مجھے؟ دو ٹکے کی فاحشہ میں تیری بوٹی بوٹی کر کے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔“ وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

”زیادہ بھونک مت...... میں تیرے اس خبیث چہرے پر تھوکتی ہوں۔ آخ تھو......“ میں نے حقارت سے شوکا کے چہرے پر تھوک دیا۔ وہ باؤلے کتے کی طرح مجھ پر جھپٹا، لیکن میں ایک طرف ہو گئی۔ ایک طرف ہونے کے بعد میں نے اسے زور سے دھکا دیا تو وہ چارپائی پر جا گرا اور مجھے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ میں بھاگ کر کمرے سے باہر آ گئی، شوکا چھل میرے پیچھے تھا۔ میں بھاگتی ہوئی شمشیر کے پاس آ گئی۔ شمشیر اپنے دوسرے کارندوں کے ساتھ اس انتظار میں کھڑا تھا کہ میں بھاگ کر اس کے پاس آؤں، کیوں کہ میں نے اور شمشیر نے مل کر ہی یہ منصوبہ بنایا تھا۔ مجھے اس پر ہر طرح سے بھروسا تھا۔ اب میں نے اسے اپنا محافظ بنا لیا تھا اور اس نے ہی یہ منصوبہ بنایا تھا کہ جب شوکا چھل آئے تو تم اس پر تھوک کر میرے پاس آ جانا...... میں نے شمشیر کے بنائے ہوئے منصوبے پر عمل کر دیا تھا۔ اب میں مکمل طور پر شمشیر کے تحفظ میں تھی۔ شوکا درندے کی طرح میرے پیچھے بھاگ کر آیا تھا۔ شمشیر اسے میرے قریب آتے دیکھ کر پھنکارا۔ ”شوکے! یہیں رُک جا، آگے ایک قدم نہ اُٹھانا...... ورنہ میں تجھے بھون کر رکھ دوں گا۔“ شمشیر نے گن کی نالی شوکا چھل کی طرف کر دی۔ شوکا جہاں تھا، وہیں رُک گیا اور رُک کر غصے سے بولا۔ ”شمشیرے! یہ میری لونڈی ہے، تم اسے میرے حوالے کر دو۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم نے میری طرف گن کر دی ہے......؟“

☆......☆

فیوڈل سسٹم کے راز آشکار کرتی، اس خوب صورت آپ بیتی کا دوسرا اور آخری حصہ ماہِ مئی میں ملاحظہ فرمائیے۔

☆......☆

www.paksociety.com

www.paksociety.com